قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 27 ❖ شمارہ 09 ❖ اکتوبر 2017ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ❖ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS
CPNE

قارئین کرام!

السلام علیکم!

میں ہر ماہ آپ کو ایک منی کہانی سنایا کرتا تھا اس بار ایک نظم کہانی سنانا چاہتا ہوں، عنوان ہے اجڑی محفل:

"اماں خوش تھی
ہونٹوں پر مسکان سجی تھی
آنکھ میں چمک رہے تھے تارے
مدت بعد جمع تھے سارے
پیاری بیٹیاں، بیٹے پیارے
بہتے تھے باتوں کے دھارے
یک دم کسی نے فون اٹھایا
"چل گیا نیٹ" کا نعرہ لگایا
بس اک پل میں اجڑی محفل
ساتھ ہی اجڑا اماں کا دل

عثمان جامعی کی یہ نظم پڑھ کر میں سوچ رہا ہوں کہ ہماری ایک تہذیب ہے، اعلیٰ معاشرہ ہے۔ نئے دور میں انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے طوفان میں یہ ساری اقدار بہہ جائیں گی؟ کیا یہ سب ختم ہو جائے گا؟ اجتماعیت کا جو اسلامی پیغام ہے وہ سب بکھر جائے گا؟

معراج رسول

مصنفہ

اس نے لکھنو کے ایک علم داں گھرانے میں آنکھ کھولی۔ وہ ایک نوعمر ماں اور نوجوان باپ کی تیسری بیٹی کہلائی۔ والد بے روزگار تھے اس لیے گھر میں ہی وقت گزارتے لیکن اس کی پیدائش کے تیسرے روز اس کے والد کو ملازمت کا بلاوا آ گیا۔ ان کی تقرری ایک قصبہ میں ہوئی تھی۔ وہ نوکری پر چلے گئے۔ لوگوں نے کہا۔ ”بٹیا بھاگوان ہے، آتے ہی باپ کی نوکری ہو گئی۔“ نوکری بھی ایسی کہ کبھی اس ضلع میں تو کبھی اس ضلع میں۔ یہ پھرکی کی طرح گھومتے رہنے کا اثر بچوں پر پڑ رہا تھا۔ انہیں اسکول میں داخل کرانے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا، اسے بھی بہنوں کے ساتھ پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ تین مختلف استاد دو دو گھنٹے کے وقفے کے ساتھ آتے اور بچیوں کو پڑھاتے۔ پہلے ایک مولوی صاحب آئے اور قرآن کی تعلیم دیتے۔ پھر ان کے جاتے ہی ایک دوسرے استاد آ جاتے جو انہیں فارسی کی تعلیم دیتے۔ ایک تیسرے استاد آ جاتے جو اسکول کا مروجہ نصاب پڑھاتے۔ ان تینوں استادوں کی نظر میں وہ کند ذہن بچی تھی۔ پڑھائی میں اس کی دلچسپی صفر تھی۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی تھی اس کی کند ذہنی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے صرف کھیلنے سے دلچسپی تھی کہ ایک دن اس کی بڑی بہن نے اسے ”سنڈریلا“ کی کہانی پڑھ کر سنائی۔ یہ کہانی اسے اتنی اچھی لگی کہ وہ بار بار فرمائش کر کے سنتی لیکن اس کا بڑھتا ہوا تقاضا بڑی بہن کو ذرا بھی پسند نہ آتا۔ دو تین بار کے بعد بہن نے کہانی سنانے سے انکار کر دیا اور کہا۔ ”کہانیاں سننے کی بجائے خود پڑھو۔ گھر میں کہانی کی کتابوں کی کمی نہیں ہے۔“ بہن کی بات اسے پسند آئی اور اس نے کہانیاں پڑھنا معمول میں شامل کر لیا۔ گھر میں بہت سے پرچے آتے تھے۔ ان میں بچوں کی کہانیاں بھی ہوتیں۔ اسے کہانی سمجھ میں آتی یا نہ آتی لیکن وہ پڑھتی ضرور۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ گھر میں پرچہ آتا تو وہ اسے چھپا دیتی۔ اس بات پر اس کی بہن خدیجہ کو غصہ آ جاتا اور وہ لڑنے پر اتر آتی۔ زمانہ کروٹ بدل رہا تھا۔ جنگ عظیم اوّل زور و شور سے جاری تھی۔ ملک میں سیاسی ہنگامے بھی بڑھ رہے تھے اسی دوران اسے شوق نے گھیرا کہ وہ بھی کچھ لکھے۔ اس نے اڑتے پرندوں نیلے آسمان، رنگین پتنگوں پر لکھی۔ اختتام میں اس نے لکھا کہ کیا ایسی حالت میں آسمان تلے بم برسانے والے جہاز کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اڑے۔ یہ وہ پہلی تحریر ہے جسے اس نے اپنی ایک سہیلی کے نام پر ایک اخبار میں بھیج دیا۔ اخبار نے اس تحریر کو نمایاں طور پر چھاپا۔ جب وہ اخبار اس نے بہن خدیجہ کو دکھایا تو وہ حیران رہ گئی۔ اب اس نے کھل کر لکھنے کو کہا اور اس کا قلم چل پڑا۔ اب وہ دونوں بہنیں مقابلے میں لکھنے لگیں۔ اس نے انہی دنوں پہلا افسانہ لکھا جو ایک فقیر پر تھا۔ وہ سڑک پر جیا اور سڑک پر ہی مر گیا۔ خدیجہ نے بھی ایک مضمون لکھا۔ دونوں کی تحریریں چھپ گئیں۔ ان دونوں کے افسانوں کا موضوع دبی دبی محبت تھا۔ ایسے افسانے پڑھ کر لوگوں نے مشورہ دینا شروع کر دیا کہ ایسے موضوع کا انتخاب غلط ہے کیونکہ پڑھنے والے اسے قلم کار کی خود بیتی سمجھے گا لیکن اس نے حوصلے سے ان کو جواب دیا اور لکھتی رہی پھر ایک افسانہ ساقی میں بھیجا جو چھپ گیا۔ اتنے بڑے پرچے میں چھپنا معمولی بات نہ تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی کی حوصلہ افزائی بھی ملی۔ پھر اس نے ایک دوسرے بڑے ادبی پرچے ”ادبی دنیا“ میں بھی افسانے بھیجے۔ وہاں بھی خوب پذیرائی ملی۔ مدیر صلاح الدین احمد نے ادبی نوٹ لگا کر حوصلہ افزائی کی لیکن جب تیسرے بڑے ادبی پرچے ادب لطیف میں اس نے افسانے بھیجنا شروع کیے تو احمد ندیم قاسمی نے بھی بھرپور حوصلہ دیا۔ اب وہ اس کے لیے احمد ندیم قاسمی کی بجائے ندیم بھائی ہو چکے تھے۔ اسی دوران قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا اور وہ بھی اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آ گئیں۔ کراچی پہنچیں اور پھر لاہور کا رخ کر لیا۔ لاہور ان کے لیے جو ایک بالکل نیا شہر تھا وہاں کے ادبی حلقے نے بھرپور مدد دی اور صرف دو دن کے اندر انہیں وہ گھر الاٹ ہو گیا۔ جوان کا میکہ کہلایا۔ اسی گھر سے اس کی ڈولی اٹھی اور احمد علی خان کے گھر جا پہنچی۔ احمد علی خان جو پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ ایک تو وہ پہلے ہی اچھا لکھتی تھی احمد علی خاں کی حوصلہ افزائی سے اب وہ مزید اچھا لکھنے لگی اسی طرح وہ ادبی دنیا کی ایک نامور افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانی جانے لگی جسے ہم حاجرہ مسرور کے نام سے جانتے ہیں۔

☆☆☆

☆رضا احمد اعوان کا تجزیہ بھکر سے۔ ’’پوری قوم اس سال 70 واں یوم آزادی منا رہی ہے۔ چھوٹے بڑے، بوڑھے جوان عورت مرد سب ہی شاداں و فرداں ہیں۔ گلی، کوچے، بازار، سڑکیں، ہر طرف سبز ہلالی پرچموں کی بہار ہے۔ کوئی سندھی ہے نہ پنجابی، نہ بلوچی ہے نہ پٹھان۔ سب ’’پاکستانی قوم‘‘ بن کر جشن منا رہے ہیں۔ ہر قسم کا نسلی امتیاز مٹ چکا ہے۔ ہنسی ہے، خوشی ہے، امن ہے، محبت ہے، فضائیں ملی نغموں سے گونج رہی ہیں اور میں اپنے کمرے میں رکھی آرام دہ کرسی پر ٹیک لگائے آنکھیں موندھے، ان سارے مناظر کو ایک ایک کر کے اپنے ذہن میں لا رہا ہوں اور یہ سوچ سوچ کر فرحت و خوشی کا یہ احساس میرے قلب و ذہن کو معطر کر رہا ہے کہ ان دنوں کا ہر منظر، واقعی بڑا دلکش اور حسین ہے۔ بلاشبہ وہ پُرخلوص جذبات اور پُرلطف احساسات، قابلِ دید اور قابلِ ستائش ہیں جو جشنِ آزادی کے احساس سے پاکستانی قوم میں اُمڈ آئے ہیں لیکن ایک ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر نمودار ہوتی ہے اور اگلے ہی لمحے ایک گہرا دکھ اور افسوس ساری خوشی پر غالب آجاتا ہے۔ میرے خوابوں کا محور و مرکز پاکستان ہے اور رہے گا لیکن کیسا پاکستان؟ وہ پاکستان جو میرا ہے، ہم سب کا ہے جہاں دنیا کے بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ وادیاں ہیں، گلیشیئر زہیں، جہاں کی جھیلوں کا شفاف پانی، آپ چلو میں بھر کر پی سکتے ہیں۔ پاکستان میں پانچ دریا اور پانچ ہی موسم ہیں۔ جو خوبانی سے لے کر کھجور تک میں ہمیں خود کفیل بناتے ہیں۔ زمین سونا اگلتی ہے یہ پاک وطن عظیم المرتبت ہستیوں کا عظیم خواب تھا جو ان کی محنت شاقہ کی بدولت تعبیر پا گیا لیکن اس مادرِ وطن کے لیے دیکھے جانے والے آج کے خوابوں کا تقابل، ان عظیم خوابوں سے کروں جو اس مادرِ وطن کے لیے دیکھے جانے والے آج کے خوابوں کا تقابل، ان عظیم خوابوں سے کروں جو اس کے بانیان نے دیکھے تو ندامت کا احساس قلم کی روانی میں حائل ہو جاتا ہے خواب تو ہم نے ایسے ہی پاکستان کا دیکھا تھا اور ابتدا میں یہ خواب تعبیر ہوتا بھی دکھائی دیا لیکن رفتہ رفتہ ہم عجیب اندوہناک صورتِ حال کا سامنا کرنے لگے۔ کیوں؟ وہ پاکستان کہ جس کی اقتصادی ترقی کی رفتار دنیا کے بہت سے ممالک کے لیے قابلِ تقلید نمونہ تھی جس کے ماہرین معاشیات کوریا، ملائیشیا اور انڈونیشیا جیسے ممالک کے ترقیاتی منصوبے تیار کرتے تھے۔ جس کی جامعات، طب اور زراعت میں اعلیٰ تحقیقات کی حامل تھیں۔ ایئر لائن باکمال لوگ لاجواب سروس کے سلوگن کی حامل اور جدید دور کی منافع بخش کمپنیز کی معمار تھی۔ جس کی ٹیکسٹائل انڈسٹری کا ایشیا بھر میں کوئی ثانی نہ تھا۔ دنیا بھر کے کھلاڑی سیالکوٹ کے تیار شدہ سامان کے ساتھ میدان میں اترا کرتے تھے۔ وزیر آباد کے آلات جراحی، مغرب کے جدید ترین شفاخانوں کی ضرورت تھے۔ جس کے ٹی وی ڈرامے، انتہائی کم وسائل کے باوجود پڑوسی ملک کی جدید ترین انڈسٹری پر حاوی تھے۔ وہ پاکستان کہ جو عالمِ اسلام میں اعتدال اور رواداری کا نشان سمجھا جاتا تھا جس کا گورنر جنرل ایک انکم ٹیکس آفیسر کو اس لیے ڈانٹتا ہے کہ اس نے اسے وقت پر انکم ٹیکس ادا نہ کرنے پر نوٹس کیوں جاری نہیں کیا؟ جی ہاں یہی ہے میرے خوابوں کا پاکستان، جو ماضی میں ایک حقیقت تھا لیکن اب یہ مستقبل کے لیے میرے خوابوں کا پاکستان ہے۔ لیکن ذرا سوچیے! آج یہ پاکستان اس قدر کسمپرسی کی حالت میں کیوں ہے؟ مائیں اپنے بچوں سمیت خودکشی پر مجبور ہیں، تو دوسری طرف دندناتے دہشت گرد ماؤں کی گودیں اجاڑ رہے ہیں۔ خلقِ خدا کو کوڑے کے ڈھیروں سے رزق تلاش کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ سونا اگلنے والی زمینوں کے ہوتے ہوئے بھی قوم غذائی کمی کا شکار ہے۔ بجلی پیدا کرنے کے لامحدود ذرائع ہیں لیکن پھر بھی اندھیرے ہمارا مقدر بن چکے۔ جہالت کے اندھیرے، اس پر مستزاد یہ کہ اب ہمارا طالب علم ڈگری رکھنے کے باوجود اپنے وطن کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور ناپ تول میں کمی اب باعثِ شرم نہیں رہی۔ آزادی کی نعمت سے کون واقف نہیں لیکن آزادی کا بھی اپنا ایک ضابطہ اخلاق ہے جیسے فرد کی آزادی لیکن تدبر کے ساتھ جذبوں کی آزادی، دوسروں کے احساسات سمجھتے ہوئے تعلقات کی آزادی لیکن

اخلاقی اقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی بات کہنے کی آزادی اوروں کی بات برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوئے صبر و برداشت اور محنت سے کام کرنے کی آزادی، اس اعتماد کے ساتھ کہ عزت نفس مجروح نہیں کی جائے گی۔ خوف سے آزادی ماسوائے رب کائنات کے سامنے پیشی کے خوف سے خوابوں کی ایک طویل اور نہ ختم ہونے والی فہرست ہے۔ جسے کھلی ہوا میں سانس لینے کی آزادی، ملاوٹوں سے پاک اللہ کا عطا کردہ رزق صبر و شکر سے کھانے کی آزادی۔ اب ہم کیسے پاکستان کے خواب دیکھتے ہیں۔ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ صرف اشرافیہ ہی نہیں ہم سب بھی اپنے خوابوں کے قاتل ہیں۔ ہم نے ترقی اور خوش حالی کے ان حقائق کو دوام دینے کی کوشش ہی نہیں کی جن کی بنیاد پر میرے خوابوں کا پاکستان دنیا کے لیے قابل تقلید بن سکتا۔ گمراہ اشرافیہ، آسمان سے اتری ہے نہ سیاسی جماعتیں دہشت گرد زمین سے اگتے ہیں نہ غدار وطن۔ یہ سب طبقے ہم ہی میں سے ہیں۔ لہٰذا میرے خوابوں کا پاکستان کسی کو موردِ الزام ٹھہرانے، کسی پر انگلی اٹھانے یا پھر کسی کو کوسنے سے ہرگز وجود میں نہ آئے گا۔ اعلیٰ و ارفع خوابوں کا پاکستان تب وجود میں آئے گا جب ہم الزام تراشی کے اس رویے کو ترک کرکے دل و جان سے اس پاک وطن کے لیے خلوص اور چاہت سے کام کریں گے۔ ہم سب کو اپنے اپنے گریبانوں میں جھانک کر سوچنا ہوگا کہ خوابوں کے پاکستان کے حصول کی منزل دور ہونے میں ہم انفرادی طور پر کس حد تک قصوروار ہیں؟ برس ہا برس سے نام نہاد قائدین کو آزماتے اور مسلسل دھوکے کھاتے چلے آرہے ہیں اگر ہم نے عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو پھر متحد ہونا ہوگا۔ مسلک، فرقے، عقیدے سے قطع نظر صرف ایک پاکستانی کا طرز فکر اختیار کرنا ہوگا۔ دیانت داری اور محنت دو ایسے ہتھیار ہیں کہ جن پر تکیہ کیا جائے تو بڑے سے بڑا پہاڑ بھی سر کیا جاسکتا ہے۔ خواب لامحدود ہیں لیکن ان کا مفہوم صرف آزادی ہے اور تعبیر بھی صرف ایک لفظ میں پنہاں ہے اور وہ ہے خود احتسابی۔ ہمیں صرف اپنے حصے کا کام کرنا ہے۔ فرد کی سوچ جب قوم کی سوچ میں ڈھلے گی تو انشاء اللہ یہ سوئی ہوئی قوم ایک نئے عزم اور ولولے لے کر بیدار ہوگی۔ اب آتے ہیں ستمبر کے شمارے کی طرف۔ سب سے پہلے اپنے پسندیدہ اداکار وحید مراد پر انور فرہاد کا مضمون ''لیڈی کلر'' پڑھا۔ عروج و زوال تو زندگی کا حصہ ہے لیکن جن پُراسرار حالات میں ان کی موت ہوئی اور جس طریقے سے ان کی میت کو کراچی سے لاہور لایا گیا اور یہ بات تو بے حد دکھی کرگئی کہ کراچی ایئرپورٹ پر کسی کو خبر نہیں تھی کہ یہ میت پاکستان کے ایک عظیم اداکار کی ہے اور تو اور کسی نے کراچی میں نہ ان کی میت کو غسل دیا اور نہ نماز جنازہ پڑھائی۔ ان کا بہت اچھا دوست اور منہ بولی بہن ممتاز۔ یہ کس قسم کے ہمدرد تھے جو میت کو غسل بھی نہ دلوا سکے اور لاوارث کی طرح تابوت کو کراچی سے لاہور پہنچا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوگئے۔ ہر وقت لوگوں کے ہجوم میں رہنے والا شخص کیسے تنہائی کی موت مر گیا۔ وہ شخص جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ٹریفک جام ہوجایا کرتی تھی۔ کیسے کراچی کے ایئرپورٹ پر لاوارث میت کی صورت پڑا تھا اور جن پُراسرار حالات میں ان کی موت واقع ہوئی اپنے پیچھے بہت سے سوال چھوڑ گئی جن کے جواب ڈھونڈنا بہت ضروری ہیں۔ یقین کریں مجھے بار بار ان کی میت کی کراچی سے لاہور روانگی کا منظر دیر تک رلاتا رہا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ زویا اعجاز کی مشعل راہ، شکیل صدیقی کی ہلاکت خیز، خالد قیوم کی دیوار گریا، کاشف زبیر کی پرائی کوکھ خاصے کی چیزیں تھیں۔ سچ بیانیوں میں ٹھکرائی ہوئی لڑکی، جذبہ، گناہ گار بالترتیب پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر رہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اور ''ناسور'' تو اپنی مثال آپ ہیں۔ دونوں روز اوّل سے اب تک اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ روحی بانو، طارق عزیز اور طاہرہ نقوی کے بارے میں بھی مضامین لکھیں۔ ''شہرِ خیال'' میں سید امتیاز حسین بخاری، حنیف ادیب، رانا محمد شاہد کے خطوط پسندیدہ تھے۔ مجموعی طور پر ستمبر کا شمارہ اچھا تھا لیکن انور فرہاد سب پر بھاری رہے اور ان کا مضمون ''لیڈی کلر'' ستمبر میں ستم گر ثابت ہوا۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کورنگی کراچی سے لکھتے ہیں۔ ''چنگیزی خون اور شاعری، بہادر شاہ ظفر اور واجد حسین یگانہ حقیقت ہیں۔ ''شہرِ خیال'' میں سعید احمد چاند کا خط اور ان کی رحلت دنیا کی بے ثباتی کو دوچند کررہی تھیں۔ خدا ان کی مغفرت اور لواحقین کو صبر عطا کرے۔ ہماری دعاؤں میں ان کے لیے ہی نہیں اپنے جانے والے ہر ساتھی ہر لکھاری کے لیے ہمیشہ جگہ رہے گی۔ ایاز راہی اور بشریٰ افضل کو دیکھ کر احساس پختہ ہوگیا کہ دعائیں مراد پانے میں صرف خلوص ہی شرط ہے۔ رانا محمد شاہد اور اعجاز حسین سٹھار کو اگر اسثنٰی دے دیا جائے تو سدرہ بانو ناگوری کا خط اس مرتبہ سب سے شاندار تھا۔ بی بی سدرہ ہمارا دل جلانا اس لیے ضروری ہے کہ اپنی حد اور اپنے فرائض کے معاملے میں الرٹ رہیں۔ قیصر خان ہم صرف محسن کش ہی نہیں خودکش بھی بنتے جارہے ہیں۔ اپنی انا اپنی قومی حمیت و غیرت اور انسان کے اجتماعی مفاد سب کا تو قلع قمع کردیا ہے۔ اب لے دے کے اگر آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے آزاد وطن کی نعمت مرقبہ میسر ہے تو اسے بھی ہم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ''متنبی'' ضیاء تسنیم بلگرامی کا تحفہ تھا۔ حمد، نعت اور منقبت جس کے بھی ذہن کے ذریعے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوجائے وہ ہم سب سے اعلیٰ و ارفع ہے بھلے گمنام ہی ہو۔ بات اگر شاعری کی ہے تو جمیل مظہری کی آشفتہ سری نے اپنی شاعری کے ذریعے شاعری کے کئی غیر واجب الادا قرض بھی چکا رہے ہیں۔ زویا اعجاز کی ''اسپاٹ فکسنگ'' نے بور کیا۔ اخباری خبروں کو یکجا کردیا گیا تھا۔ (اسپاٹ فکسنگ، اعتزاز زریاب وصلی کی تھی زویا اعجاز کی ''مشعل راہ'' تھی) ''پرائی کوکھ'' نے حیرت زدہ کردیا۔ ''ہلاکت خیز'' بھی پسند نہیں آئی۔ البتہ بابائے جغرافیہ، قلم کار کی بیگم، دیوار گریہ اور نہ قصہ نہ کہانی اچھی لگیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' تک کے بارے میں اگر ہماری رائے جاننا ہو تو ''شہرِ خیال'' میں لاہور کے حنیف ادیب کے خط کو پڑھ لیا جائے۔ ہم بھی اسی سلوک کے

مستحق ہیں۔ ایاز راہی کا نظریہ مبہوت کیے دے رہا تھا۔ ''شہر خیال'' میں آکر ہماری بات رکھنے کا شکریہ۔ ''ناسور'' ٹھیک ہو گیا ہے۔ ''ٹھکرائی ہوئی لڑکی'' سے زیادہ سمندر، جذبہ اور گدھ اچھی تھیں۔ اب ذکر ہو جائے شمارے کی سب سے خوب صورت تحریر کا۔ ''لیڈی کلر'' وحید مراد کو شاندار خراج عقیدت تھا۔ اتنے شاندار فنکار کو سراہے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ پراسرار موت کا دکھ بھی کم نہیں ہوگا۔ مدیر نگار کے مرحوم الیاس رشیدی، وحید مراد کے غم میں اتنے نڈھال تھے کہ وہ واقعی نہیں سمجھ سکے وحید مراد کے دوست قادر موسانی کے بیان کو کہ وہ وحید مراد کی وفات کے دن یعنی 23 نومبر کو کہہ رہے تھے کہ ان کی وحید سے چار روز پہلے ملاقات ہوئی تھی اور وحید مراد اپنے بیٹے عادل مراد کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منانے کا کہہ رہے تھے۔ کس طرح ممکن ہے کہ اتنا نفیس اور با اصول آدمی اپنے بیٹے کی سالگرہ کا دن بھول جائے جب کہ انتقال سے 10 دن پہلے یعنی تیرہ نومبر کو عادل مراد کی سالگرہ گزر بھی چکی ہو اور بقول قادر موسانی، وحید مراد 19 نومبر کو کہہ رہے تھے کہ وہ اس مرتبہ اپنے بیٹے کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائیں گے۔''

☆ اعجاز حسین سٹھار کا تجزیہ نور پور تھل سے۔ ''کتنے خوشگوار اور ناقابلِ یقین لمحات تھے جب صرف دو دن میں طویل سفر کر کے پرچہ ہمارے ہاتھ میں آگیا۔ نصیر اشرفی نے محبت سے خوب صورت خط لکھا وہ اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ شکر ہے قیصر خان کو دکانداری اور ناپ تول سے فرصت مل گئی کہ رونمائی کرادی۔ سرگزشت میں کتنے سلسلے اور مضامین ہیں، تھوڑا ہی لکھا جائے تو یہ کالم بلبلانے لگے گا۔ چند منتخب اور پسندیدہ سلسلوں پر ہی لکھنا ممکن ہو سکے گا۔ ''مشعل راہ'' کی شخصیات میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے (ایک پاکستانی دوشیزہ بھی شامل جسے الگ سے شائع کرنے کے لیے روک لیا ہے)۔ ''لیڈی کلر'' میں وحید مراد سے متعلق انور فرہاد نے لکھنے کا حق ادا کر دیا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا۔ سلمیٰ مراد سے سینہ ناراضگی اور اس کے تاثرات کمال سچائی سے قارئین کے سامنے پیش کر دیے۔ واقعی ہم نے انہیں کھو دیا ابھی عمر ہی کیا تھی کتنے ریکارڈ بننے اور ٹوٹنے تھے، ناظرین نے تفریح حاصل کرنا تھی نئے تجربے ہوتے، فن عروج پر پہنچ کر داد وصول کرتا، مداحوں کا سیروں خون بڑھتا اور ناقدین کی انگلیاں منہ میں رہ جاتیں لیکن تقدیر کے ایک ہی وار نے خوابوں کو مٹی میں ملا دیا اور ایک دنیا سوگوار ہوگئی۔ کتنے حیرت کی بات ہے کہ ان کی جگہ پُر نہ ہو سکی۔ ایسی محنت اور خداداد صلاحیت ہر کسی کے حصے میں کہاں آتی ہے بس اب ان کی بخشش کے لیے دعا ہی کی جاسکتی ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں شکر ہے کیپسول والے معاملے سے مکمل جان چھوٹی اور پریشان کرنے والا ''رپھڑا'' انجام کو پہنچا لیکن نسرین والا سیاپا سامنے آگیا ہے، دیکھیں وعدوں اور دل لگی کا بوجھ سنبھالے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، اگلے ماہ تک سب کچھ سامنے آجائے گا۔ ''ناسور'' پڑھتے ہوئے دلچسپی اور تجسس سے ہٹ کر دل کو مضبوط رکھنا پڑتا ہے۔ سچ بیانیوں میں ''ٹھکرائی ہوئی لڑکی'' میں اللہ سیما جیسی بیٹیاں سب والدین کو دے۔ بات ٹھکرائے جانے سے شروع ضرور ہوئی ہے لیکن اس میں سیما کی مستقل مزاجی، عزم، محنت اور کچھ کر کے دکھانے کا جذبہ شامل ہے۔ وہ زمین سے اٹھ کر بلندی پر چلی گئی لیکن اپنی اصلیت نہیں بھولی۔ شوخی، بننے سنورنے اور مردوں سے میل ملاقات سے دور رہی اور خود کو اپنی صلاحیتوں سے منوایا یہی وجہ ہے کہ آج قابل فخر مقام پر ہے۔ ہر رشتے کو اپنے مقام پر عزت و احترام دیا والدین کی دعائیں ہر قدم پر شامل حال رہیں اور خاوند بھی خلوص نیت سے احسان مند ہے جس گھر میں ایسی بیٹی، بہن اور بہو ہوگی وہاں خوشیاں قدموں میں آکر لوٹ پوٹ ہوتی رہیں گی۔ ''فرشتہ انکل'' میں بچے نے راہ دکھائی اور سدھرنے کا بہانہ بنا اور انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھالیا لیکن اصل بات ہے کہ دونوں میں شریف والدین کا خون تھا وہ کسی مجبوری میں پھنسے ہوئے تھے یہ ان کا شعبہ ہی نہ تھا بس ارادہ کیا اور قسمت مہربان ہوگئی۔ ''سیلانی'' میں فیروز کی لاابالی طبیعت، غیر ذمہ دارانہ رویہ اور قیمتی وقت کی بربادی دیکھ کر یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ سنبھل کر زندگی سے پیار کرنے لگے گا اب کاروبار سے دلچسپی، شادی اور بچوں کا پڑھ کر دل کو تسلی ہوئی ہے کہ وہ اب پھسلنے سے باز رہے گا اس نے ہر کام ناپسندیدہ اور الٹ کیا لیکن کوئی نیکی ایسی تھی کہ بگڑی سنور جاتی گویا وہ رب کی رحمت کے حصار میں رہا اور آج اپنے حصے سے بڑھ کر مسرتیں دامن میں سمیٹ رہا ہے۔ ''سمندر'' میں فوزیہ کی حد تک مان لیتے ہیں کہ عورت کا ظرف وسیع ہے لیکن کبھی ایسے تماشے سامنے آتے ہیں کہ انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔ کئی عورتیں اپنی فطرت اور جلاپے میں سوتیلی اولاد کو دردناک موت سے ہمکنار کرتی ہیں، عدالتیں اور وکلا ایسی کتنی وارداتوں کے گواہ ہیں پھر منافقت، جلا کٹا رویہ، بچا کھچا کھلا کر داد سمیٹنے کے چکر میں رہنا ایسی کتنی حقیقتوں کی اپنی آنکھیں گواہ ہیں اور سوتیلی بیٹیوں کو غلط راہ پر لگانا بھی دور پرے کی بات نہیں ہے بس اپنی اپنی فطرت اور مزاج کی بات ہے۔ ''جذبہ'' پڑھ کر خشوع وخضوع سے دعا مانگی ہے کہ زیبی جیسے ڈھیروں ڈھیر لاکھوں کروڑوں بیٹے پیدا ہوں جو دشمنوں کے دانت کھٹے کر کے انہیں ڈھول چٹائیں اور پاک سرزمین کی طرف بری نظر سے دیکھنے اور سوچنے سے پہلے کانپتے کانپتے ڈھے جائیں، (آمین)۔ ''گناہ گار'' میں جو قدم اٹھایا اگر میرے سامنے اریشہ ہوتی تو میں ایسی قابل فخر بیٹی کا ماتھا چوم لیتا اگر ہم سب دوسرے کی عزت کو اپنی عزت سمجھیں تو خود ہماری چار دیواری کسی شر اور بدنامی سے محفوظ رہے گی جو نقصان کی نیت سے قدم بڑھائے گا۔ ایسی گڑبڑ ہو جائے گی کہ گر کر اپنا منہ متھا تڑوا بیٹھے گا کیونکہ ایسے ایماندار اور نیک دل لوگوں کی اللہ خود حفاظت کر کے صدمات اور شیطان کے چیلوں کی حرکات سے محفوظ اور پاک رکھتا ہے۔ ''سچ یہ ہے'' میں سارا قصور اسماء کا ہے وہ اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر غیر محرم مرد سے ملاقاتیں کرتی رہی جس مقدس رشتے کی بنیاد پر وہ ملتے تھے شرعی طور پر کوئی جواز نہیں ہے نہ معاشرہ قبول کرتا ہے۔ سلیم کا شک کرنا مرد کی فطرت کے عین مطابق تھا اگر وہ تیز مزاج ہوتا تو خون خرابہ دور کی بات نہ تھی پھر

کتنی بربادی ہوتی کون زندگی سے جاتا اور کوئی جوانی زنداں میں گزار دیتا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ اسماء کا گھر بن گیا ہے اور شکوک کے بادل ٹل گئے ہیں لیکن غلط فہمی پیدا کرنے میں خود اسما کا ہاتھ تھا اور یہ سب تقدیر میں لکھا جا چکا تھا۔''

☆صفدر معاویہ کا خط خانیوال سے۔''ستمبر کا شمارہ 22 کو ملا۔ اس سے پہلے تین تبصرے بھیجے مگر پتا نہیں وہ کدھر گئے (حیرت ہے کہ تبصرے ایک بھی نہ ملے) انکل کی مختصر بیانی سوچنے اور سمجھنے والوں کے لیے بہت سے دروا کرتی ہے اور زندگی کو آسان اور ملک کو ترقی کرتا ہوا بتاتی ہے۔ قرآن پاک پر عمل کر کے انسان کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ یگانہ شاعر کے بارے میں معلومات ملیں جو اچھی لگیں۔ دوستوں کی محفل ''مشہرِ خیال'' آئے تو آفتاب احمد نصیر اشرفی کو بہترین تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر پایا، مبارکاں جی۔ فقیر غلام حسین ضیاء کا بھی بہترین تبصرہ، سدرہ بانو ناگوری کی عمدہ انٹری، رومی انصاری بھی سرگزشت میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ شاہد نقوی کی بھی اعلیٰ کاوش، بشریٰ افضل صاحبہ کا تبصرہ دیکھ کر دل کو سکون ہوا اور بے اختیار کہا الحمدللہ جاسوسی اور سسپنس سے وہ ایسے غائب ہوئیں کہ میں پریشان ہو گیا کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہو گا پر آج تبصرہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سب خیر خیریت ہے۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی اچھے رہے کہانیاں شروع کیں۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے ''حقیقی'' کی زندگی مسائل کا شکار رہی اگر وہ ایک جگہ ٹک کر رہتا تو اس کی عزت بنی رہتی اور ساتھ میں دوسروں کو بھی برداشت کر لیتا مگر اس کی انانے اس کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔'' آشفتہ سر'' زین مہدی تاریخ کے بڑے نام جمیل مظہری جو بیک وقت کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ زویا اعجاز کی ''مشعل راہ'' بہت ہی عمدہ تحریر و کاوش ہے واقعی یہ تمام لوگ دنیا کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے باوجود کئی مشکلات کے جو آڑے آئیں پر وہ گھبرائے نہیں۔ اعتزاز زریاب وصلی ''اسپاٹ فکسنگ'' لائے واقعی اس اسپاٹ فکسنگ نے کئی نامور اور اپنے وقت کے بہترین کرکٹرز کو تباہ کر دیا۔ کاشف صاحب مرحوم کی بہت ہی عمدہ تحریر ''پرائی کوکھ'' پڑھی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ ہلاکت خیز شکیل صدیقی کے قلم سے اچھی تحریر تھی۔ انور فرہاد کی وحید مراد پر تحریر ''لیڈی کلر'' پڑھی سچ کہا وحید مراد جیسا انسان اور اداکار قسمت سے پیدا ہوتے ہیں وحید مراد کی ان گنت فلمیں ہیں جن کی ابھی تک دھوم ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں سرجی کی شہباز کے ساتھ منہ ماری فقرے بازی بہت مزہ دیتی ہے۔ سیما فیصل آبادی کی ''ٹھکرائی ہوئی لڑکی'' پڑھی۔ بالکل ٹھیک بات ہے کہ انسان کو کوئی محبت کرتے ہوئے یکدم ٹھکرا دے تو انسان ٹوٹ کے رہ جاتا ہے۔ سیما نے ٹوٹنے کی بجائے خود کو سنبھلنے کی راہ پر ڈالا اور خود کو اپنے چچا کے خاندان سے بھی اوپر لے گئی اور آخر میں اس کا شادی کا فیصلہ بھی ٹھیک تھا۔ (خط مختصر اور جامع لکھیں۔ بے جا کی طوالت خط کا حسن گھٹا دیتی ہے)''

☆رانا محمد شاہد کا اظہاریہ بورے والا سے۔''اداریہ میں معراج رسول نے جو بات لکھی، اس کا خلاصہ یہی ہے کہ وہ معزز تھے زمانے میں مسلمان ہو کر اور تم خوار ہوئے تارک قرآن ہو کر۔ پرویز بلگرامی صاحب بڑے عرصے سے مدیر چلے آ رہے ہیں۔ ان کا نام پہلی بار ادارتی صفحے پر دیکھا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا صدارتی خط تلخ و شیریں جملوں میں لکھا، اچھا لگا واقعی پھر جس شخص کو اپنے جائز کام کے لیے بھی رشوت دینی پڑے، ذلیل و رسوا ہونا پڑے۔ اس میں تحمل کیسے اور کیونکر آئے گا۔ سدرہ بانو ناگوری بیٹی کی سالگرہ پر مبارک کے لیے شکریہ۔ باپ کے حوالے سے آپ کے تاثرات حقیقت پر مبنی تھے۔ قیصر خان، ہم واقعی اپنے محسنوں کو بھولتے جا رہے ہیں اور ہمارے زوال کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے۔ عبدالجبار رومی قصور سے۔ شاید غم روزگار نے شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہو۔ شاید نقوی کا خط دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ رؤف خالد کا کشمیر کے حوالے سے لکھا ڈراما سیریل ''انگار وادی'' نہ صرف ہم شوق سے دیکھتے تھے بلکہ اس ڈرامے نے کشمیر پر بننے والے دیگر ڈراموں سے منفرد شناخت بنائی تھی۔ یقیناً آپ نے جن اداکاروں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی زندگیوں کے بارے میں سرگزشت کے خاص نمبر میں پڑھنے کو ملے گا۔ شاہد اقبال شاہد! آپ تو واقعی کافی عرصے بعد آئے ہیں اگر سرگزشت باقاعدگی سے پڑھتے رہے ہیں تو تھوڑا بہت ٹائم نکالا جا سکتا تھا۔ خیر اب باقاعدگی سے آئیے گا۔ ''مشہر خیال'' کی افسوسناک خبر سعید احمد چاند کا انتقال تھا۔ بس یہی زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ سعید احمد چاند کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل دے (آمین)۔ بشریٰ افضل کافی مہینوں کے بعد آ ہی گئیں۔ ضیاء تسنیم بلگرامی، ڈاکٹر ساجد امجد کا ساتھ خوب دے رہی ہیں کہ اب کبھی ان کی اور کبھی ساجد صاحب کی تحریر پڑھنے کو ملتی ہے۔ عرب کی تاریخ کے ایک بڑے شاعر کا عبرت انگیز زندگی نامہ دلچسپ رہا۔ زویا اعجاز نے علم سے محبت کرنے والوں پر لکھا اور خوب لکھا۔ ایسے لوگ ہی کسی بھی قوم کے حقیقی ہیرو ہیں جو اپنے علم کے ذریعے لوگوں کی زندگیوں میں آسانیاں لاتے ہیں اور انہیں شعور دیتے ہیں۔ اعتزاز زریاب کے ''اسپاٹ فکسنگ'' والے مضمون میں مکالمہ اضافی تھا۔ کہتے ہیں کہ انسان دنیا سے جانے کے بعد بھی اپنی تحریروں کی صورت اپنے پڑھنے والے کے دلوں میں زندہ رہتا ہے۔ کاشف زبیر بھی انہی میں سے ہیں ''پرائی کوکھ'' ان کی ایک اور منفرد موضوع پر دلچسپ تحریر تھی۔ ندیم اقبال کا ''شمشال سے ٹورنٹو'' دلچسپ واقعات و باتوں کی وجہ سے قارئین میں پسندیدگی کی سند لیے ہوئے ہے۔ اس مرتبہ موقع کی مناسبت سے سفرنامہ میں عید کا حوالہ بھی اچھا لگا۔ سلمیٰ اعوان ایک مقبول سفرنامہ نگار تو ہیں ہی، شخصیات پر بھی زبردست لکھتی ہیں۔ ایک بڑے رائٹر کی زندگی کی کہانی دلچسپ رہی۔ خالد قیوم کی ''دیوار گریہ'' اور افتخار مجاز کی ''نہ قصہ نہ کہانی'' بھی پڑھنے کے لائق تھیں۔ افتخار مجاز کا شمار تو سینئر لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔''

☆سلیم رشید کا توشہ لاہور سے۔''میں اس رسالے کو ابتدا سے پڑھ رہا ہوں اور اس میں شائع شدہ مضامین، تراشے اور آپ

کے تبصرے حالات حاضرہ کے مطابق بہت معلوماتی ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ جو تبصرہ پاکستان کے لوگوں پر معراج رسول نے تحریر کیا ہے، وہ ان کی زندگی کا نچوڑ دکھلائی دیتا ہے اور ملکی لوگ جس طرح مختلف قوموں میں تقسیم ہو چکے ہیں اور قومیت سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ تباہی اور بربادی کی نشاندہی کر رہا ہے۔ ہم لوگوں کو پہلے پاکستانی ہونا چاہیے بعد میں کسی مذہب اور ذات کی بات کرنی چاہیے۔ اس جذبہ سے پاکستانیوں نے بھارت کو 6 ستمبر 1965ء کی جنگ میں شکست دی تھی۔ جب قوم تقسیم ہو جاتی ہے تو مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن جاتا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ پاکستان کے لوگوں کو اس ملک کی عظمت اور وقار کے لیے کام کرنا چاہیے۔ رسالہ کے مضامین جو پڑھے ان پر تبصرہ کہ تمام مضامین اور تراشے بہت معلوماتی اور سبق آموز ہیں۔ ''نہ قصہ نہ کہانی'' بہت خوب صورت اور عبرت ناک سبق آموز واقعہ ہے۔ افتخار مجاز صاحب نے کمال کر دیا کہ ایک پاگل انسان اور جو پاکستان سے نفرت کرنے لگا تھا دوبارہ پاکستانی بنا دیا۔ اگر ایک ہدایت کار پاگل شخص کو صحیح کر سکتا ہے تو کیا قوم کے علماء، عالم فاضل، مفکر اور سیاسی شخصیات جو اپنی لچھے دار باتوں سے ووٹ اور عہدے حاصل کرتے ہیں۔ وہ پاکستانی قوم کو اس مملکت پاک کی عزت اور سربلندی کے لیے تیار کیوں نہیں کرتے؟ کیا یہ لوگ صرف لمبی لمبی گاڑیوں اور کوٹھیوں کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکے ہیں؟ میں کوئی ناصح نہیں ہوں صرف اپنی رائے دے سکتا ہوں اور دعا کر سکتا ہوں کہ پاکستان کی سلامتی اور آزادی ہمیشہ قائم رہے، (آمین)۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ایک دلچسپ مضمون ہے اگلی قسط کا انتظار رہتا ہے۔ وحید مراد پر انور فرہاد کی تحریر بہت تفصیل سے بیان کردہ ہے اور واقعی ایک خوب صورت فنکار کی زندگی آخری دنوں میں تکالیف میں گزریں اور کسی نے سچ کہا ہے کہ دکھوں میں اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ میں نے وحید مراد سے کنیز، عندلیب فلموں کی شوٹنگ کے دوران ملاقات کی تھی۔ وہ ایک سلجھے ہوئے اداکار تھے اور عوام کے ساتھ بہت پیار سے پیش آتے تھے۔ رسالے میں جو تراشے موجود ہیں ان سے بیماریوں کی وجوہات اور ان کا تدارک بہت عمدہ تحریریں ہیں اور اس ماہ کا رسالہ واقعی بہت عمدہ اور لوگوں کو اپنے پاکستانی ہونے کا احساس جگانے کا ایک ذریعہ ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید عمدہ کاوشوں پر گامزن رکھے، (آمین)۔''

☆ عبدالحکیم ثمر کا خط کراچی سے۔ ''سرگزشت کے دیرینہ ساتھی سعید احمد چاند کا اظہاریہ موجودہ شمارے میں پڑھتے پڑھتے اچانک ان کی رحلت کی اطلاع کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ جس نے میرے ہوش وحواس کے چیتھڑے بکھیر دیئے چونکہ میں دل کا مریض ہوں اس لیے سنبھلتے سنبھلتے طبیعت سنبھلی۔ میں دعا گو ہوں اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرماتے ہوئے انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا کرے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل دے، (آمین)۔ سعید احمد چاند کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی منتخب کردہ آخری شعر کے جواب میں پروین شاکر کا ایک ایسا شعر پیش کر رہا ہوں جو میرے خیال میں مرحومہ کی سفرِ آخرت کا اشارہ کر رہا تھا۔ اسی طرح سعید احمد چاند کا پسند کیا ہوا آخری شعر ان کی رخصتی کا پیغام دے رہا ہے۔''

☆ فضل رؤف مروت لکی مروت سے لکھتے ہیں۔ ''میں آپ کے ماہانہ سرگزشت کا سات سال سے باقاعدہ قاری ہوں۔ اپنی ایک تحریر جو عرق ریزی کے بعد تحریر کی ہے۔ بھیج رہا ہوں امید ہے اس ماہ کے شمارے میں جگہ دیں گے۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری نے ملیر کراچی سے لکھا ہے۔ ''اداریئے میں یہ کیسا افسانچہ تھا انکل یہ فسانہ یقیناً ہمارے لیے نہیں تھا یہ تو شاید بھولے سے آپ کے ہاتھ لگ گیا ورنہ ہم کہاں ان فسانوں پر پورا اترتے ہیں۔ ہم تو چوٹ کھائی ہوئی قوم ہیں۔ خبروں کے ذریعے یقیناً آپ کو بھی علم ہوا ہوگا کہ وطن عزیز میں حج کے نام پر کتنا بڑا افراڈ ہوا ہے۔ کتنے ہی لوگوں نے خدا کے مقدس گھر کی زیارت کے خواب آنکھوں میں سجائے تھے مگر وہ سب لٹ گئے۔ ان میں میرے بھی کچھ عزیز تھے دعوتیں ہوئیں مبارک بادیں وصول کیں مگر جب جانے کی گھڑیاں آئیں تو سبھی نے سر تھام لیے۔ فراڈ نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا یہ دھوکے اگلے سال بھی ہوں گے۔ امیدیں اگلے سال بھی ٹوٹیں گی یہی ہوتا رہے گا۔ ''شہرِ خیال'' میں آفتاب احمد نصیر اشرفی اپنے خوب صورت خلوص نامے کے ساتھ مسند صدارت پر نظر آئے۔ آپ نے ٹھیک فرمایا واقعی یہ بڑا احسان ہے کہ بڑے بڑے نامی گرامی شعراء ہمارے حصے میں آئے جو وطن عزیز کی شان اور اس کی پہچان کہلائے۔ سعید احمد چاند ایک سادہ، مخلص اور ''شہرِ خیال'' کا دیرینہ ساتھی ہم سے رخصت ہوا خدا ان کی مغفرت کرے ان کے لواحقین کو صبر دے یہ جاتے جاتے بھی سرگزشت سے اپنی محبت کو زندہ رکھ گئے۔ ایاز راہی آپ کی تحریریں ہمیشہ ہی دلچسپ ہوتی ہیں۔ خوب صورت تبصرے کے ساتھ ''شہرِ خیال'' میں رونق افزائی کا شکریہ۔ سلمٰی اعوان نے عظیم قلم کار کی عظمت کو زبردست لفظوں میں ڈھالا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کی یہ قسط بہت خوب رہی۔ آج کل فلم نگری پر بہار آئی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے شاہکار اپنے جوہر دکھا رہے ہیں گو کہ ان کی اداکاری کو برسوں گزر چکے ہیں مگر ہمارے لیے تو ہر فنکار ہی نیا ہوتا ہے۔ یہ انور فرہاد کا بڑا پن ہے کہ وہ آج کی نسل کو ماضی سے جوڑے رکھے ہوئے ہیں۔ چاکلیٹی ہیرو وحید مراد کا نام بچپن میں سنتے تھے تو منہ میں مٹھاس بھر آتی تھی مگر جب ان کی داستان حیات پڑھی تو رونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ لازوال اداکار کس زوال کا شکار ہو گیا۔ اپنوں کی سازشوں نے اسے وقت سے بہت پہلے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ اس کی موت کس کرب میں ہوئی مگر وہ اب بھی ذہنوں میں زندہ ہے۔ زویا اعجاز کی کاوش بھی عمدہ رہی۔ مجھے فوزیہ کا کردار پسند نہیں

آیا۔ نعمان جیسے ہیرو کی ہیروئن تو زنیرہ کو ہونا چاہیے جس کے حوصلے بلند اور عزائم چٹان کی طرح مضبوط ہیں۔ فوزیہ کا کیا ہے وہ تو پہلے بھی اکیلی تھی بعد میں بھی تنہا رہ جاتی تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ ''ٹھکرائی ہوئی لڑکی'' اگر ٹھکرائی نہ جاتی تو اس سچ بیانی کا انداز بیان ہی بدل جاتا۔ ''فرشتہ انکل'' آنکھوں میں نمی بھر گئی۔ ''لب بام'' میں ایک اجڈ اور گنوار عورت نے اپنے گھر کو بچانے کے لیے کیا چال چلی کہ ایک پڑھی لکھی اور بظاہر سمجھدار عورت کو مات دے دی۔ سچ یہ ہے کہ سچائی نے دہلا دیا انسان کیسی کیسی غلط فہمیاں پال لیتا ہے جس کا وہ تا عمر مداوا نہیں کر پاتا کچھ منزل تک پہنچ جاتے ہیں تو کچھ ہمیشہ کے لیے بے نشان رہ جاتے ہیں مرگِ ناگہاں نمبر کا عنوان دل کو بے چین کیے ہوئے بس انکل جی اب انتظار کی گھڑیاں ختم بھی کر دیجیے۔''

☆ انجم فاروق ساحلی نے لاہور سے لکھا ہے۔ ''میری جانب سے عید الاضحیٰ مبارک ہو۔ گھر محلہ و بازار بکروں سے سجے ہوئے ہیں۔ بچوں کی دلچسپی اور شوق کا عجیب عالم ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ میری کہانیوں کی طرف توجہ فرما دی جائے اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔ جاسوسی میں شائع ہونے والی کہانی ''تجربے کی ذہانت'' نے پذیرائی حاصل کرلی۔ امید ہے مرگِ ناگہاں نمبر آپ کی محنت سے پسندیدگی حاصل کرے گا۔''

☆ قیصر خان بھکر سے رقم طراز ہیں۔ ''اداریہ ہمیشہ کی طرح بہت بڑے مسئلے پر لکھا ہوا تھا لیکن اس پر عمل کون کرے گا۔ اللہ تعالیٰ مالک ہے اس کی طرف سے جب حکم ہوگا تب ہی کوئی اچھا نگران ملے گا، یہ سب تو لٹیرے ہیں۔ چنگیزی صاحب کے بارے میں پڑھا واقعی وہ چنگیزی تھے۔ ''مشہر خیال'' کے باسیوں کو عید مبارک۔ جناب اشرفی صاحب کا شاندار تبصرہ تھا اور دو تبصرے شامل تھے ایک صفحہ نمبر 8 اور دوسرا 13 پر تھا (صفحہ تیرہ پر جو خط ہے وہ کمپیوٹر کی غلطی کا شاخسانہ ہے۔ یہ خط محمد ایاز راہی کا ہے جو دو حصوں میں بٹ گیا) ان کے علاوہ غیر حاضر لوگوں میں دونوں ڈاکٹر صاحبہ، معظم علی، محمد عامر ساحل خالد صاحب بتائیں کہاں ہیں۔ ہمارے محترم ساتھی سعید احمد چاند وفات پا گئے۔ ان کا پیار تھا کہ انہوں نے تبصرہ لکھا۔ یہ ان کی علم دوستی کا ثبوت تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ مقام دے، (آمین)۔ زین مہدی، زویا اعجاز، اعتزاز زریاب، کاشف زبیر، شکیل صدیقی، سلمیٰ اعوان، خالد قیوم اچھے مضمون لے کر آئے تھے۔ انور فرہاد صاحب نے وحید مراد کے بارے میں لکھ کر حق ادا کر دیا۔ وہ بے شک نامور ہیرو تھے، ہیں اور رہیں گے۔ اللہ ان کو جنت عطا کرے۔ سرندیم اقبال کے سفرنامہ کے کیا کہنے جواب نہیں۔ اس بار اگست والا مضمون ستمبر میں لگا لیکن ستمبر بھی دفاع پاکستان کا مہینا ہے وہ یہ کہ افتخار مجاز صاحب کا واقعی وہ پاگل بندہ غلط نہیں تھا۔ حساس طبیعت کے لوگ ایسے ہوتے ہیں لیکن آپ کے جواب نے اس کو لاجواب کر دیا اور یہ حقیقت ہے وطن ماں کی طرح مقدم ہے۔''

☆ ظفر اقبال ظفر نے کامرہ مشرقی سے لکھا ہے۔ ''معراج رسول صاحب نے ٹھیک کہا ہے کہ قائداعظم کی جیب میں کھوٹے سکے تھے جنہوں نے ملک کی قسمت اب بھی کھوٹی کر رکھی ہے۔ عظیم قائد کے ان کھوٹے سکوں نے ملک کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ جو بھی آمر، ڈکٹیٹر آتا ہے۔ سب سے پہلے مسلم لیگ کو جھولی میں ڈال لیتا ہے۔ یگانہ چنگیزی کا اصل نام معلوم ہوا۔ اعجاز حسین نے اچھا تبصرہ کیا۔ ''متنبی'' کے بارے میں پڑھ کر سبق ملا علم بغیر ایمان کے زہر ہے۔ ''اسپاٹ فکسنگ'' نے کرکٹ کو کھیل نہیں رہنے دیا۔ ''لیڈی کلر'' پڑھ کر وحید مراد کی یادیں تازہ کیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میرا سب سے پسندیدہ سفرنامہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''ناسور'' دلچسپ ہے۔ سچ بیانیوں میں ''ٹھکرائی ہوئی لڑکی'' اور راحت وفا راجپوت کی ''لب بام'' بہت پسند آئی۔ اپنے آپ کو چالاک سمجھنے والی آمنہ کو سیدھی سادی عابدہ نے زبردست مات دی۔''

☆ کلیم اللہ ایڈووکیٹ ہائیکورٹ بہاولپور سے لکھتے ہیں۔ ''مشہر خیال میں میرا خط شائع ہوا، شکریہ۔ عشروں سے وطن عزیز کے تاریخی حقائق کو مسخ سیاسی بونوں کو مصنوعی سہاروں، بیساکھیوں سے قد آور ثابت کرنے کی مذموم جستجو کے تواتر کے خلاف مجھے احتجاج ریکارڈ کرانا تھا۔ یہ منفی رجحان قیام پاکستان سے بھی پہلے روبہ عمل تھا۔ قوم کے سب سے بڑے مدرس سرسید احمد خان کے لیے .... شاعر مشرق علامہ اقبالؒ، بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور جدید ایٹمی پاکستان کے معمار ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے لیے کفر کے فتوؤں کی سنگ باری، دشنام طرازی، کردار کشی کی مہم مسلسل جاری ہے۔ زیر تعلیم طلبہ کے لیے مسخ شدہ تاریخی حقائق پر مبنی نصاب۔ ذرائع ابلاغ پر نقب زن خود ساختہ دانشوران و پیکران علم و عقل، مکمل منفی استقلال سے عشروں سے قومی مزاج کو اپنے ذاتی تخیلاتی سانچوں میں ڈھالنے کے لیے ہٹلر کی روح کو بھی شرمندہ کرتے آرہے ہیں۔ بدنصیبی یہ ہے کہ آج تک ایک بھی قومی ادارہ ایسا تعمیر نہیں ہو سکا جو ثقہ و مصدقہ تاریخی حقائق کی تائید، کذب و افترا، قومی دشمنوں اور قوم کے محسنوں کے درمیان تفریق اور حد فاصل بیان کر سکے۔ نتیجتاً دشمنان وطن، مخالفین قیام پاکستان، قائداعظم پر قاتلانہ حملہ کرانے والے ان کے اہل خانہ کو جلسوں میں گالیاں بکنے والے، ستر سالوں سے پاکستان میں ہمہ وقت باوقار اور معتبر ہیں۔ ان کا بلند آہنگ وطن عزیز میں نقار خانہ بنا ہوا ہے۔ میں ایگزیکٹوز سرگزشت کا اس لیے بھی سپاس گزار ہوں کہ میرا موقف شائع ہونے سے ہزاروں قارئین تک تھوڑا سا سچ پہنچ گیا۔ میں پاکستان کے سچے دوستوں آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی، رانا محمد شاہد اور بشریٰ افضل کو کبھی بھلا نہیں سکتا جنہوں نے ستمبر کے ''مشہر خیال'' میں میری ہمت بندھائی ہے۔ اگرچہ میری فیلڈ مختلف ہے مگر قومی معاملات پر میرا قلم امانت ہے۔''

☆نزابت افشاں کی آمد مہورہ فتح جنگ سے۔ ’’اداریہ حسب معمول ہلا دینے والا تھا۔ یگانہ چنگیزی معروف شاعر تھے۔ اپنی شاعری سے زیادہ وہ غالب و اقبال کے ناقد کے طور پر بھی مشہور ہوئے۔ یگانہ نے دیوانگی کے عالم میں وفات پائی۔ احسان دانش کی سوانحِ حیات ’’جہانِ دگر‘‘ میں ان کے بارے میں تفصیلاً درج ہے۔ معروف عرب شاعر ’’متنبی‘‘ پر ضیاء تسنیم بلگرامی کی تحریر پڑھی۔ ’’آشفتہ سر‘‘ علامہ جمیل مظہری کے حوالے سے اچھی تحریر تھی۔ ’’مشعل راہ‘‘ بہترین تحریر تھی لیکن کاش وطن عزیز کے کسی فرد کا ذکر بھی اس میں ہو جاتا کیونکہ یہاں بھی ایسے کئی آدمی گزرے ہیں۔ ’’اسپاٹ فکسنگ‘‘ نے تو وطنِ عزیز کو بدنام کر دیا ہے۔ اتنی اچھی تنخواہیں پانے کے باوجود نہ جانے کیوں کھلاڑی حضرات لالچ میں آجاتے ہیں۔ لیڈی کلر، بابائے جغرافیہ، دیوارِ گریہ، ہلاکت خیز، قلم کار کی بیگم، نہ قصہ نہ کہانی بھی بہترین تحریریں تھیں۔ ’’شمشال سے ٹورنٹو‘‘ اب بہترین موڑ پر ہے اور اپنی گرفت قائم کیے ہوئے ہے۔ ’’ٹھکرائی ہوئی لڑکی‘‘ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ سیما کے چچا اور چچی نے اسے ٹھکرایا لیکن اس کی اعلیٰ ظرفی کہ اعلیٰ عہدہ پر پہنچ کر بھی وہ بہت باظرف نکلی اور انہیں معاف کر دیا۔ ’’سیلانی‘‘ اچھی تحریر تھی شکر ہے فیروز کو کوئی منزل مل گئی۔ ’’سمندر‘‘ زبردست اور سبق آموز کہانی تھی۔ ’’جذبہ‘‘ بھی قابلِ تعریف تھی۔ ’’گناہ گار‘‘ میں اریشہ نے بہت اچھا فیصلہ کیا کاش ہم سب کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے۔ ’’گدھ‘‘ بھی اچھی تحریر تھی۔ اقتباسات اور پارچے بہت معلوماتی تھے۔ ’’شہرِ خیال‘‘ میں صدارت آفتاب احمد نصیر اشرفی کے حصے میں آئی۔ جناب آپ نے درست کہا۔ اقبال کا ہم کو نصیب ہونا ہماری خوش قسمتی ہے لیکن افسوس کہ آج ہم کو ہماری آنے والی نسل کو اقبال سے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت دور کیا جا رہا ہے۔ خصوصاً درسی نصاب سے اب اقبال کو نکالا جا رہا ہے۔ فقیر غلام حسین ضیاء، سدرہ بانو ناگوری، رانا محمد شاہد، عبدالجبار رومی، شاہد نقوی، شاہد اقبال شاہد، اعجاز حسین سٹھار اور سید امتیاز حسین بخاری عمدہ اور بھرپور تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ باجی بشریٰ افضل شکر ہے کہ آپ نے دو چار سطریں لکھ کر خود کو حاضر کر دیا۔ قبائے منافقت، فریب زن کے عنوان سے دو کہانیاں اور ایک تحریر اقبال کے حوالے سے دے رکھی ہے کب تک شائع ہو جائیں گی۔

(آپ کی کہانیاں مارچ میں موصول ہوئیں اور بورڈ نے مسترد کر دیا، وہ پرچے کے مزاج کی نہ تھیں۔ اقبال کے حوالے سے ’’دفاعِ فکرِ اقبال‘‘ اشعار پر تبصرہ ہے۔ سرگزشت میں واقعات و روداد کو ترجیح دی جاتی ہے آپ سرگزشت کے مزاج کی لکھیں)۔‘‘

☆عبدالجبار رومی انصاری کا تبصرہ قصور سے۔ ’’ہائے ہائے قائداعظم نے فرمایا میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔ وہ کتنے دور اندیش تھے آج کی بات انہوں نے اس وقت کہہ دی تھی جب وہ خود اپنی کابینہ کے لیے چائے بنانے پر ملازم کو سرزنش کر رہے تھے کہ قوم کا پیسا ہے اسے اس طرح کی فضول خرچیوں میں ضائع نہیں کرنا لیکن ان کی جیب کے کھوٹے سکے آج تک سچے نہ ہو سکے۔ ان کھوٹے سکوں نے ہی شاہ خرچیوں سے اور قوم کی دولت لوٹ کر اثاثوں کے انبار لگا لیے افسوس صد افسوس۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تبصرہ زبردست رہا۔ فقیر غلام حسین کی آمد بھی اپنی مثال آپ تھی۔ سدرہ بانو کا بھرپور تبصرہ اچھا رہا۔ مقدس جہاں، محمد ابراہیم درانی، جینا اور محمد ایاز راہی بھی عمدہ رہے۔ سعید احمد چاند کا تبصرہ عمدہ تھا۔ ان کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ ’’متنبی‘‘ کی سرگزشت دلچسپی سے بھرپور تھی۔ ’’ٹھکرائی ہوئی لڑکی‘‘ نے اپنی ہمت سے دس سالوں میں اپنی خواہش کے مطابق سب کچھ حاصل کر لیا جب کہ مخالفین وہیں کے وہیں رہے۔ ثابت قدمی ہی کامیابی سے ہمکنار کراتی ہے۔ ارسلان کی باجی نے اپنے گناہ گار بھائی کو پولیس کے حوالے کر کے اچھا فیصلہ کیا۔ ’’گدھ‘‘ اچھی لگی۔ کوکھ پرائی تھی مگر ممتا کا جذبہ تو خالی نہیں تھا جو زینو کو جنم دینے والی سیلی نے بین جوائے کو اپنی اولاد دینے سے انکار کر دیا۔ فلم نگری سے ’’لیڈی کلر‘‘ چاکلیٹی ہیرو وحید مراد پر تحریر نادر و نایاب ثابت ہوئی۔ بے حد پسند آئی۔ ’’شمشال سے ٹورنٹو‘‘ میں اس دفعہ نسرین کا ساتھ بہت اچھا لگا اور عید کی مناسبت سے عید کی یادیں بھی اچھی لگیں۔ مختلف لوگوں کی سرگزشت جو مشعلِ راہ ہے عمدہ لگی۔ شاہ زیب عرف زیبی نے انڈین آفیسر راون اور اس کے ساتھیوں کو جہنم رسید کر کے خود بھی شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے ’’جذبہ‘‘ اچھی تحریر تھی۔‘‘

☆سیف اللہ کا تبصرہ ملک وال سے۔ ’’شہرِ خیال‘‘ کے ساتھی سعید احمد چاند کے اس دنیا میں نہ رہنے کی خبر اداس کر گئی۔ ہم سب پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ مرحوم کے تبصرے بھی اچھے ہوتے تھے اور ’’بیت بازی‘‘ میں شعر بھی معیاری بھیجتے تھے۔ ضیاء تسنیم کی تحریر ’’متنبی‘‘ اور زین مہدی کی تحریر آشفتہ سر نے زیادہ متاثر نہیں کیا ایک وجہ تو میری کم علمی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ جن دو شخصیات کا تذکرہ ہے مجھے پہلی دفعہ پتا چلا ہے۔ مشعل علم تھام کر مثال بننے والے لوگوں سے زویا اعجاز نے متعارف کرایا۔ ’’اسپاٹ فکسنگ‘‘ پڑھنے سے یہ تو پتا چل گیا کہ کون کون سے کھلاڑی اس کا شکار ہوئے لیکن اچھا ہوتا اگر تحریر کے شروع میں یہ بتا دیا جاتا کہ ’’اسپاٹ فکسنگ‘‘ ہے کیا چیز اور یہ عمل میں کیسے آتی ہے۔ سرگزشت پڑھنے والے میرے جیسے بھی ہوتے ہیں جنہیں مکمل آگاہی نہیں ہوتی۔ ’’پرائی کوکھ‘‘ پڑھی۔ کاشف زبیر مرحوم کی تحریر ایسی ہی ہونی چاہیے۔ کیونکہ تحریر انوکھی چبھتی ہوئی اور پُر اثر ہے جو کہ جلدی بھولنے والی نہیں۔ انور فرہاد صاحب کی تحریر ’’لیڈی کلر‘‘ واقعی تعریف کے قابل ہے۔ معلومات کا خزانہ پڑھنے والوں کے لیے، اور وحید مراد کو چاہنے والوں کے لیے سرگزشت کے صفحات پر انڈیل دیا ہے۔ کہاں تک تعریف کی جائے آخری صفحہ پر مصنف ہدایت کار پرویز کے خط کی چند سطریں کیا کہنے۔ وحید مراد تک نہ پہنچنے والے اس خط نے ہر قاری تک پہنچ کر اسے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ مضمون کا اختتام اس سے زیادہ پراثر طریقے سے ہو ہی نہیں سکتا۔ انور فرہاد صاحب اللہ آپ کو خوش رکھے۔ عرصہ بعد سلمیٰ اعوان کی حسب سابق گہرائی والی تحریر قلم کار کی بیگم پڑھی اور پوری طرح سمجھنے کے

لیے تحریر کو دوبارہ پڑھا۔ ندیم اقبال صاحب نے اس دفعہ سرجی اور شہباز کی چٹ پٹی باتوں کے علاوہ نسرین سے پارک میں ملاقات کو Love spot بنا کر ایسا ماحول بنا دیا ہے کہ ندیم صاحب نے قاری کے دماغ کو اپنے کنٹرول میں جکڑ لیا ہے اور آخر میں پھر اسی نسرین نے پل صراط پر لا کھڑا کیا ہے۔ اللہ خیر کرے۔ ''نہ قصہ نہ کہانی'' نے ایک الجھن میں ڈال دیا ہے۔ نظریہ، دیوارِ گریہ کو چھوٹی چھوٹی تحریریں ہیں لیکن اچھی ہیں مگر دیوار گریہ میں صفحہ 158 پر لائن 13 میں لکھا ہے کہ ماں چبوترے پر چڑھ کر دیوار کی مغربی جانب نگاہیں جما دیتیں اور لائن 27 میں لکھا ہے کہ باپ کی قبر مشرقی طرف ہے۔ سلسلہ وار کہانی ''ناسور'' پرتجسس واقعات کے ساتھ دکھائی دے رہی ہے لیکن شروع میں سیٹھ ستار کے بلائے گئے تینوں لوگوں کو کالیا اور نعمان نے ٹھکانے لگا دیا لیکن گیٹ والے گارڈ کو کیوں نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ ڈرائیور نے گارڈ کو اندر کے حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ تین لوگوں کو مارنے سیٹھ کی آنکھ ضائع کرنے کے بعد لڑکی کو ساتھ لے کر کالیا اور نعمان آرام سے باہر چلے گئے۔ ایسی غلطیوں سے پرہیز لازمی ہے۔ طارق عزیز کی ''بابائے جغرافیہ'' محنت کا نتیجہ ہے۔ یونانی سائنسدان ایراتو کارس زمانے میں خط استوا پر زمین کا محیط بتانا حیران کن تو ہے ہی لیکن صاحب تحریر نے بگ بینگ دھما کا، نظام شمسی کا وجود میں آنا کرۂ ارض کی پیدائش ٹیک ٹونک پلیٹس کی حرکت۔ اس کی ٹوٹ پھوٹ بتا کر کائنات کو سمجھنے میں بہت مدد کی ہے۔''

☆ آرٹسٹ محمد عامر ساحل نے ڈیرہ اسماعیل خان سے لکھا ہے۔ ''مصروفیاتِ زندگی کی وجہ سے ''مشیرِ خیال'' میں شامل ہونا دشوار ہو جاتا ہے۔ میں قیصر خان آف بھکر کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری کمی کو محسوس کیا اور مصروفیت میں بھی مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ ندیم اقبال بھائی کا سفر نامہ دلچسپ چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں زندگی کے ہر سفر میں کامیابیاں عطا کرے، آمین ثم آمین۔''

☆ ندیم اقبال کا مشی گن امریکا سے خلوص نامہ۔ ''ستمبر 2017ء کا شمارہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ ہر بار کی طرح میں نے ابتداء قارئین تبصرہ نگاروں کے خطوط سے کی۔ یہ آپ سب کے خطوط ہیں جو مجھے اس گوروں کے دیس میں اردو لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ آپ کے خطوط ہی ہیں جو مجھے ایک نئی توانائی بخشتے ہیں۔ جب میں پڑھتا ہوں کہ ''سفر نامہ پسند آیا'' تو گویا مہمیز ملتی ہے۔ بیتے لمحے ذہن کے کینونس پر تازہ ہو جاتے ہیں۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی کا خط واقعی پہلے نمبر پر آنے کا حقدار تھا۔ بہت عمدہ اور باریک بینی سے تبصرہ کیا ہے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہیں ''شمشال سے ٹورنٹو'' پسند آ رہا ہے۔ جناب نے صحیح کہا کہ داستان گو مسافر کو اپنی بشری کمزوریوں کا اعتراف بھی کرنا چاہیے۔ ہم آپ سب بشر ہیں اور بشر خطا کا پتلا ہے۔ اگر سہواً کہیں کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا اعتراف ضرور کرنا چاہیے تاکہ آئندہ وہ غلطی نہ ہو۔ فقیر غلام تحسین ضیاء کا خط بھی پسند آیا۔ سدرہ بانو ناگوری کا شکریہ کہ وہ اتنی باریک بینی سے سفر نامہ پڑھتی ہیں۔ آپ کے سوال کا جواب تفصیل کا طالب ہے۔ آپ جس ملک میں بھی رہیں وہاں کے قانون کا احترام کرنا ضروری ہے۔ رانا محمد شاہد بورے والا کا بھی شکریہ کہ انہوں نے یاد رکھا۔ عبدالجبار رومی آپ کا بھی شکریہ کہ سفر نامہ انہماک سے پڑھ رہے ہیں۔ سرگزشت کے جن افراد کے تبصرے میں غور سے پڑھتا ہوں ان میں ایک آپ بھی ہیں۔ سیف اللہ ملک وال آپ جیسے افراد کے توصیفی کلمات مجھے مہمیز کرتے ہیں۔ بہت بہت شکریہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ سرگزشت کے تبصرہ نگاروں کو میرا سفر نامہ اچھا لگ رہا ہے۔ شاہد اقبال شاہد کا یہ جملہ ''شمشال سے ٹورنٹو پر کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے'' میرا ڈھیروں خون بڑھا گیا۔ یہ آپ جیسے لوگ ہی تو مجھے تصنیف کی دنیا میں آگے بڑھا رہے ہیں۔ محمد ایاز راہی کا تبصرہ بھی مدلل ہوتا ہے اس لیے پسند آتا ہے، ان کی تحریر بھی الگ انداز کی ہوتی ہے۔ سعید احمد چاند کے انتقال کا سن کر دل غم سے بھر اٹھا۔ ان کا تبصرہ مجھے ہمیشہ پسند آتا تھا۔ اعجاز حسین سٹھار نے جن نکتوں کو اٹھایا پسند آیا، بہت شکریہ۔ سید امتیاز حسین بخاری کا بھی شکریہ کہ انہیں میری تحریر اتنی زیادہ پسند آ رہی ہے۔ بشریٰ افضل، عزیز مئے اور ان تمام دوستوں کا شکریہ جنہیں شمشال سے ٹورنٹو پسند ہے۔''

تاخیر سے موصول خطوط

تبسم عرفان قریشی، ابرار احمد، سہیل مشہدی، ناصر حسنین (کراچی)۔ زاہد حسین قادری (فیصل آباد)۔ عامر علی عامر (دینہ)۔ اشرف علی (لاہور)۔ نیاز شاہ، غازی عباس (سرگودھا)۔ یاسین قادری (سکھر)۔ انعم (حیدرآباد)۔ ذیشان مصطفیٰ (کوئٹہ)۔ قسیم احمد (ڈی جی خان)۔ کائنات مرزا (ربوہ)۔ اشفاق چنوٹی (چنیوٹ)۔ ایاز امام (شادی پور)۔ ارشد عثمانی (شجاع آباد)۔

علامہ ابن جوزی

ضیاء تسنیم بلگرامی

ماضی کے جن بڑے علمی لوگوں نے اپنے دور کو انتہائی متاثر کیا اور وفات کے بعد صدیوں ان کا کام نسلِ انسانی کو متاثر کرتا رہا۔ ان میں عبدالرحمن ابن جوزی کی ذات بہت نمایاں تھیں۔ یہ بیک وقت مفسر، محدث، مؤرخ، خطیب، مصنف اور ناقد تھے۔ ان کی حالاتِ زندگی اور جدوجہد آنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اپنے مشاہیر سے لاعلم اور ناواقف ہیں۔ مولانا شبلی کے بقول "مغرب نے ہمارے زندوں کو تو مفتوح بنا لیا ہے مگر اس سے بھی زیادہ ظلم اور ستم ظریفی یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے مُردوں کو بھی فتح کرلیا ہے۔" آج ہم علم کے کسی بھی شعبے سے متعلق باتیں کرتے ہیں تو ہمیشہ مغربی مشاہیر کے حوالوں میں نام لیتے ہیں۔ ہمیں اپنے مشاہیر کا علم ہی حاصل نہیں اور اگر کچھ ناموں سے واقف ہیں تو ان کے بارے میں اتنی سرسری اور معمولی معلومات رکھتے ہیں کہ انہیں ہم کسی مغربی مشہور ہستی کے نام کے ساتھ حوالے میں استعمال نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنے بڑے لوگوں کے بارے میں بس نام کی حد تک واقفیت حاصل ہے۔ حالانکہ ہمیں ان کے کام کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہونی چاہیے۔

اس شخصیت کا احوال جو نیکی کی طرف بلاتا رہا۔

وہ 508 ہجری بمطابق 1114 عیسوی میں پیدا ہوئے۔ یعنی عبدالقادر جیلانی سے ستائیس سال چھوٹے تھے۔

باپ کا سایہ بچپن ہی میں اٹھ گیا تھا اس لیے ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ان کی ماں پر آ گئی تھی۔

چھٹی صدی ہجری کو تصور میں لائیں اور سوچیں کہ اس عہد کی عورت کا معاشرے میں کیا مقام تھا اور اس کا اپنے گھر کے باہر، بیرونی دنیا سے کتنا ربط و تعلق ہوتا ہوگا اور اسے کتنی معاشی اور معاشرتی دشواریوں کا سامنا اور مقابلہ کرنا پڑتا ہوگا۔

شوہر کا وفات پا جانا اور اپنے پیچھے ایک صغیر سنِ بچے کا چھوڑ جانا ذمہ داری کا ایک بحر بیکراں تھا پھر بھی بیوہ نے یہ ذمہ داری قبول کرلی اور اس بچے نے جیسے ہی شعور کی دنیا میں قدم رکھا ماں کو بیٹے کی تعلیم کی فکر لگ گئی۔

اس زمانے میں مسجدوں میں مدرسے قائم تھے چنانچہ اس عہد کے ایک مشہور محدث ابن ناصر نے مسجد میں مدرسہ قائم کر رکھا تھا اور یہاں حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی، قرآن مجید کو حفظ کروایا جاتا تھا قرآن پاک کی تعلیم میں تجوید پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔

ماں نے عبدالرحمٰن کو ابن ناصر کے مدرسے میں داخل کر دیا اور بیٹے کو نصیحت کی کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح بے کار مشاغل میں پڑ کے وقت ضائع نہ کرے کیونکہ بچپنے کا یہ زمانہ اگر بے کار مشاغل میں پڑ کے ضائع کر دیا گیا تو گیا ہوا وقت واپس نہیں آئے گا اور بے کار مشاغل کی عادتیں پختہ ہوتی چلی جائیں گی اور پوری زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی۔

ماں کی نصیحتوں اور ہدایتوں کا ان پر کتنا اثر ہوا یہ بتانا مشکل ہے لیکن یہ بچہ خدا کی طرف سے ایسی فطرت لے کر آیا تھا کہ جس کا بچے کی ابتدائی زندگی کے مشاغل سے خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔

بچے کو درس گاہ سے اتنی محبت اور دلچسپی تھی کہ مدرسے کے ان کی عمر سے بڑے لڑکے ان کے مقابلے میں پیچھے ہو

گئے۔ ان کے وجود میں علم کی پیاس سمائی ہوئی تھی۔ دوسرے لڑکے مدرسے کی طرف اطمینان سے جاتے ہوئے نظر آتے مگر عبدالرحمٰن کو عموماً اس حال میں دیکھا گیا کہ وہ گھر سے مدرسے کی طرف دوڑتے ہوئے نظر آتے، بالکل ایسا لگتا تھا گویا عبدالرحمٰن نامی یہ بچہ کسی دور نکل جانے والی شے کا ذوق وشوق کی کیفیت میں پیچھا کررہا ہو۔

راستے میں دریائے دجلہ کے قریب تفریح کرنے والے نظر آتے اور ان تفریح کرنے والوں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں فروخت ہورہی ہوتیں اور یہیں بازی گر اپنے کھیل تماشے دکھاتے اور ان کے آس پاس ہر عمر کے لوگ موجود دلچسپی سے تماشا دیکھ رہے ہوتے۔

مدرسے کے لڑکے بھی ان میں نظر آتے مگر عبدالرحمٰن نامی یہ بچہ ان سب کی طرف سے آنکھیں بند کیے مدرسے کی طرف دوڑ لگاتا ہوا نظر آتا۔

ہم جماعت لڑکوں کو جستجو رہتی کہ آخر عبدالرحمٰن میں یہ بے چینی کیوں پائی جاتی ہے۔ وہ عبدالرحمٰن کو راستے میں روک کر یہ نہیں پوچھ سکتے تھے کہ تمام لڑکے مدرسے کی طرف معمول کی چال چل کے پہنچتے ہیں اور وقت پر مدرسے پہنچ جاتے ہیں مگر عبدالرحمٰن دوڑ کر پہنچنا ضروری سمجھتے ہیں آخر ایسا کیوں ہے؟

کئی بار لڑکوں نے ان کو راستے میں روکا اور پوچھا۔ ''یہ تم دوڑ کر مدرسے کیوں پہنچتے ہو کیونکہ تمہارے جلدی پہنچ جانے کا آخر فائدہ کیا ہے استاد اسی وقت پڑھاتے ہیں جو درس کا وقت مقرر ہے۔''

عبدالرحمٰن نے راستے میں روکنے والے طالب علموں کو جواب دیا۔ ''تم لوگ یہ سوال مدرسے میں بھی کرسکتے ہو اس وقت میرے سامنے سے ہٹ جاؤ تاکہ میں مدرسے کا کام اپنے وقت مقررہ میں انجام دے لوں۔''

ایک لڑکے نے پوچھا۔ ''اے عبدالرحمٰن! کیا تمہیں استاد محترم کچھ الگ درس دیتے ہیں ہم نے تو وقت مقررہ پر ہی ان کو پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے۔''

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ''تم لوگ صرف استاد کی دی ہوئی تعلیم پر انحصار کرتے ہو جب کہ میں اپنے طور پر بھی تدریسی عمل جاری رکھتا ہوں۔''

لڑکوں کو عبدالرحمٰن کے اس جواب پر ہنسی آگئی اور ان کی اپنے طور پر درس جاری رکھنے کی بات بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔

انہی لڑکوں میں سے ایک نے ان سے پوچھا۔ ''دوست عبدالرحمٰن تم اپنے طور پر کس طرح پڑھتے ہو ہمیں بھی بتاؤ تاکہ ہم اپنی اصلاح کریں اور استاد کے علاوہ بھی پڑھائی شروع کردیں۔''

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ''میرے کچھ بتانے سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا تم مدرسے میں میری طرح جلدی پہنچو اور دیکھو کہ میں اپنے طور پر کس طرح تعلیم حاصل کرتا ہوں۔''

لڑکے ان کی باتیں بے دلی اور بے توجہی سے سنتے اور مسکرا کر خاموش ہوجاتے جبکہ ان کو دوڑنے کا راستہ مل جاتا اور یہ دوڑتے اور ہانپتے ہوئے مدرسے پہنچ جاتے۔

استاد ابن ناصر انہیں ہر روز دوڑ کر مدرسے میں داخل ہوتے دیکھتے اور یہ بھی محسوس کرتے کہ عبدالرحمٰن ہانپ رہے ہوتے۔

لیکن استاد نے ان کے اس طرح مدرسے میں آنے کے بارے میں کبھی کوئی پرسش نہیں کی۔

دجلہ کے کنارے بھیڑ لگی ہوئی تھی اور اس دن کوئی نیا بازی گر لوگوں کو شعبدے دکھانے میں مشغول تھا اور دیکھنے والوں کو مزہ آرہا تھا۔ لڑکے بھی بازی گر کے آس پاس موجود مزے لے رہے تھے۔ ان میں سے کسی کی نظر عبدالرحمٰن پر پڑ گئی اور وہ بھاگ کے عبدالرحمٰن کے قریب پہنچ کے کہنے لگا۔ ''عبدالرحمٰن آج تو تجھے رکنا ہی پڑے گا ایک بازی گر شام سے آیا ہوا ہے اور بڑے مزے کے شعبدے دکھا رہا ہے۔''

عبدالرحمٰن نے کوئی جواب تو نہیں دیا لڑکے کو دونوں ہاتھوں سے ایک طرف ہٹا کے دوڑ لگانی شروع کردی۔

اس طالب علم کو بھی غصہ تو بہت آیا کہ یہ اس کا ہم درس عمر میں اس سے چھوٹا طالب علم دنیا کے دوسرے مشاغل میں معلوم نہیں کیوں کوئی حصہ نہیں لیتا۔ اس لڑکے نے عبدالرحمٰن کے پیچھے دوڑ لگائی یہ دیکھنے کے لیے کہ عبدالرحمٰن مدرسے میں داخل ہونے کے بعد اپنے طور پر کس طرح پڑھتا ہے۔

عبدالرحمٰن نے اپنی جماعت میں داخل ہونے کے بعد کچھ لکھنا شروع کردیا تھا۔

ان کے پیچھے ان کا ہم جماعت بھی داخل ہوا اور عبدالرحمٰن پر جھک کے دیکھنے لگا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔

ایک دن پہلے استاد نے جو درس دیا تھا اور احادیث بیان کی تھیں وہ سب اس وقت لکھی جارہی تھیں۔

ساتھی طالب علم نے پوچھا۔ "انہیں لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ احادیث سن لیں، زبانی یاد رکھو اور اگر انہیں محفوظ ہی کرنا ہے تو استاد کے لکھے ہوئے مجموعے احادیث کو لے کر ان کی نقل کر لو۔"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ "مسئلہ احادیث کے یاد کرنے کا نہیں ہے۔ میں استاد کے کسی مجموعے سے انہیں نقل کر سکتا ہوں مگر یہ مسئلہ سالوں کا ہے اور میں انہیں لکھنے کے لیے ہر روز استاد سے کتابیں مانگا کروں، اس کے مقابلے میں یہ بہتر ہے کہ میں اپنے حافظے میں محفوظ کر کے فرصت کے اوقات میں انہیں لکھ لیا کروں لکھنے کا مجھے یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ میرا حافظہ بہت اچھا کام کرنے لگا ہے۔"

ہم درس ساتھی کی سمجھ میں ان کی باتیں نہیں آئیں، وہ کوئی مزید سوال کیے بغیر ان کے پاس سے اٹھ گیا اور اپنے ساتھیوں کو ان کے بارے میں بتایا۔ "عبدالرحمٰن کے دل و دماغ میں ایک قسم کا خبط پایا جاتا ہے اور یہ پڑھے ہوئے اور سنے ہوئے اسباق کو حافظے میں محفوظ کرنے کے لیے انہیں لکھتا رہتا ہے اور کہتا ہے کہ اس طرح اسے سب کچھ سنا اور پڑھا ہوا یاد ہو جاتا ہے۔"

اس کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اور اس کا خود یہ بیان ہے کہ معاشی کمزوری نے اسے بہت پریشان رکھا مگر وہ اس بات کا ہمیشہ خدا کے شکر گزار رہا کہ اسے کسی کا احسان نہیں لینا پڑا۔

مدرسے میں درس احادیث کا دیا جاتا تھا اور قرآن پاک کے حفظ کرنے کے دوران تجوید کو بھی حافظے میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ حلق سے آوازیں نکالنے کی مشق بھی کرنا پڑتی تھی۔ کون سا حرف کس طرح ادا کیا جائے گا اور اس کے صوتی صحیح اظہار کے لیے حلق کے مخرج پر بھی دھیان دینا پڑتا تھا چنانچہ اس جدوجہد میں ان کے چوبیس گھنٹے مشغولیت میں گزر جاتے تھے۔

ان کے ہم درس طلباء کو حیرت تھی کہ دوڑ کر مدرسے پہنچنے والا یہ طالب علم مدرسے کے بعد بھی کہیں نظر نہیں آتا گویا کھیلنا کودنا اس کے لیے غیر ضروری مشغلہ تھا۔

اس کے ساتھیوں کو اس کی مصروفیت سے چڑ سی پیدا ہو گئی تھی اور وہ اس کے الگ تھلگ رہنے میں اپنی بے عزتی محسوس کرتے تھے اسی کیفیت نے حسد کی شکل اختیار کر لی اور وہ عبدالرحمٰن ابن جوزی کے خلاف الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگے۔

اس کے کئی ہم درسوں نے یہ بھی دیکھا کہ ابن جوزی مروجہ نصاب کے علاوہ بھی کتابیں پڑھتا کبھی تاریخ میں گم نظر آتا اور کبھی تذکروں میں غرق دکھائی دیتا۔

اس ہمہ جہتی مطالعہ نے اس میں غیر معمولی لیاقت اور قابلیت پیدا کر دی اور دوسرے طالب علم اس معاملے میں اس سے بہت پیچھے رہ گئے اساتذہ ابن جوزی پر بھرپور توجہ دیتے پھر بھی ان کو کبھی کبھی ابن جوزی پر یہ اعتراض ہوتا کہ وہ مروجہ نصاب کے علاوہ کتابیں کیوں پڑھتا ہے۔

ایک استاد نے پوچھا۔ "مجھے تمہارے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمہیں تاریخ کے واقعات پڑھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔"

ابن جوزی نے جواب دیا۔ "بے شک مجھے تاریخ

کیمائس (Chamois)

ہرن کی طرح کا ایک جانور۔ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا میں پایا جاتا ہے۔ قد میں بکری کے برابر لیکن پھرتیلا اس قدر کہ مشکل سے قابو میں آتا ہے۔ بیشتر پہاڑوں میں رہتا ہے اور چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں کو آسانی سے پھلانگ جاتا ہے۔ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے اور اس کی کھال سے کیمائس چمڑا بنتا ہے۔ جس سے دھاتی چیزوں کو پالش کر کے چمکایا جاتا ہے۔ نر اور مادہ اکتوبر اور نومبر میں اختلاط کرتے ہیں اور مئی اور جون میں بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک دن کے بعد ہی بچے اپنی ماں کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ اس عجیب جانور کی عمر طبعی 20، 25 برس ہوتی ہے چونکہ اس کے گوشت اور چمڑے کی مانگ زیادہ ہے۔ اس لیے اس کے شکار پر پابندیاں لگائی گئی ہیں تاکہ کہیں معدوم نہ ہو جائے۔ شمالی ایران اور روس کا کیمائس عمدہ قسم کا ہوتا ہے۔

مرسلہ: حسین فرجاد، لاہور

سے بڑی دلچسپی اور لگاؤ ہے کیونکہ تاریخوں میں قوموں کے عروج وزوال کے واقعات محفوظ ہیں اور مجھے تاریخ کے ان لوگوں سے بھی دلچسپی ہے جو بہت مشہور ہوگئے کیونکہ ان کی شہرت کے پیچھے بے انتہا لگن، جوش وخروش اور لگاتار عمل پایا جاتا ہے اور ان کے واقعات سے مجھے یہ ترغیب ملی کہ اگر مجھے ان لوگوں کی طرح بڑا آدمی بننا ہے تو مجھے ان کی پیروی کرنا پڑے گی۔''

استاد کو ابن جوزی کی یہ باتیں مطمئن نہیں کرسکیں اور انہوں نے پوچھا۔''اے عبدالرحمٰن! چلو ہم نے تمہاری بات مان لی اور ماضی کے بڑے آدمیوں کو پڑھ کے تم بھی ایک نہ ایک دن بڑے آدمی بن جاؤ گے مگر مجھے یہ تو بتاؤ کہ اگر تمہیں تاریخ کے جس بڑے آدمی کو اپنے لیے مثال بنا کے اس کی پیروی کرنا شروع کردی تو تاریخ کا وہ بڑا آدمی سپہ سالار ہو گا، وزیر ہوگا یا کسی طرح غاصب حکمران بنا دیا گیا ہوگا، کیا تم بھی انہی میں سے کچھ بننا چاہتے ہو۔''

ابن جوزی نے جواب دیا۔''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ بڑے آدمیوں میں دنیا حاصل کرنے کے لیے اپنی آخرت کو کس حد تک نقصان پہنچایا اس کے علاوہ کئی کتابوں کے مطالعوں کے بعد میں نے بڑے آدمیوں کی غلطیاں بھی پکڑی ہیں اور مجھے انہیں پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ وہ شہرت کے بلند مینارے تک پہنچنے کے باوجود بہت غیرمحتاط اور غیر ذمہ دار لوگ تھے۔ انہیں لکھنے سے پہلے جھوٹ اور سچ کو ضرور پرکھنا چاہیے تھا۔ استاد محترم میں خود بھی تصنیف وتالیف کے کام کرنا چاہتا ہوں۔ بڑے آدمیوں کی بھول چوک، غلطیوں اور لغزشوں سے میں نے عبرت پکڑی اور چوکنا ہوگیا آئندہ میں خود وہ غلطیاں نہیں کروں گا۔''

استاد کو ان کی باتوں میں بڑی جستجو محسوس ہوئی اور وہ ابن جوزی سے یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر وہ بڑے لوگ کون ہیں جنہوں نے مذکورہ غلطیاں کیں اور جو ابن جوزی نہیں کرنا چاہتا۔

استاد نے پوچھا۔''مجھے بھی ان غلطیوں کے بارے میں بتاؤ تاکہ میں تمہاری باتوں سے اتفاق یا انحراف کروں لیکن میں پھر بھی کہوں گا کہ تمہیں ہر موضوع پر کتابیں نہیں پڑھنا چاہئیں۔''

ابن جوزی نے نہایت ادب سے عرض کیا۔''استاد محترم! آپ مجھ پر مطالعے کی قدغنیں مت لگائیں کیونکہ اس قسم کی قدغنوں سے عالم ادھورا رہ جاتا ہے۔ کیا آپ میرے لیے یہ پسند کریں گے کہ میں ناقص عالم کہلاؤں؟''

استاد کی سمجھ میں ان کی باتیں نہیں آرہی تھیں چنانچہ استاد نے زور دیا کہ وہ استاد سے جو کچھ کہہ رہے ہیں کتابوں کے حوالوں سے ان کی وضاحت بھی کریں۔

ابن جوزی نے امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم کی تاریخی فروگزاشت کا ذکر کیا۔''جناب غزالی نے اپنی اس کتاب میں مختلف واقعات اور تواریخ کو اس طرح جمع کردیا ہے کہ انہیں تاریخی حقائق سے رد کیا جاسکتا ہے۔ غزالی نے لوگوں کے حوالوں سے جو باتیں لکھ دیں وہ تاریخ کے گہرے مطالعے سے جھٹلائی جاسکتی ہیں، وہ جن دو آدمیوں کو ایک جگہ جمع کرکے ان کے حوالے سے کوئی واقعہ یا کوئی بات بتاتے ہیں تو اس وقت انہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دونوں کے زمانوں میں طویل زمانی فاصلہ موجود ہے اور وہ کس طرح ایک ساتھ اور ایک جگہ موجود ہوسکتے ہیں۔''

استاد نے حیرت سے ابن جوزی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔''کسی مثال سے اپنی ان باتوں کو ثابت کرو۔''

ابن جوزی نے جواب دیا۔''غزالی نے اپنی کتاب منظہری میں لکھا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک نے ابو حازم سے کہلایا کہ مجھے اپنے ناشتے میں سے کچھ تبرکاً بھیجو۔ ابو حازم نے ان کے پاس اگلا ہوا چوکر بھیجا۔ سلیمان نے اس چوکر کا ناشتا کیا اور پھر اپنی بیوی سے ہم بستر ہوا۔ اس سے عبدالعزیز پیدا ہوئے اور عبدالعزیز سے عمر بن عبدالعزیز پیدا ہوئے۔ اس واقعے میں سخت مغالطہ موجود ہے کیونکہ غزالی نے عمر بن عبدالعزیز کو سلیمان بن عبدالملک کا پوتا قرار دیا ہے جب کہ وہ سلیمان کے چچا کے بیٹے تھے اسی طرح شیخ ابوالمعانی جوینی نے اپنی کتاب ''الاشامل'' میں لکھا ہے کہ اہل باطن کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے کہ منصور حلاج، جبائی قرمطی اور ابن المقفع نے سلطنتوں کے نظام کے الٹنے، مملکت کی تخریب اور عوام کی استمالت کی سازش کی اور ہر ایک نے ایک ایک ملک کی ذمہ داری قبول کرلی۔ جبائی نے احسا میں سکونت اختیار کی ابن المقفع نے ترکستان کی حدود میں قیام کیا اور منصور حلاج نے بغداد کو اپنا مرکز بنایا اس پر اس کے دونوں ساتھیوں نے یہ فیصلہ کردیا کہ وہ ہلاک ہوجائے گا اور اپنے مقصد میں ناکام رہے گا۔ اہل بغداد دھوکا نہیں کھاتے اور وہ بڑے مردم شناس اور سمجھ دار لوگ ہیں جب کہ میں اگر شیخ ابولمعانی کے قریب ان کے دور میں

ہوتا تو انہیں بتاتا کہ منصور حلاج اور ابن المقفع کا زمانہ ایک نہیں تھا۔ ابن المقفع کے قتل کا منصور نے ایک سو چوالیس ہجری میں (761 عیسوی) حکم دیا تھا اور وہ قتل کر دیا گیا جب کہ ابوسعید جبائی کا ظہور 286ھ (899 عیسوی) میں ہوا ہے اور رہ گیا منصور حلاج تو یہ تین سو نو ہجری (921 عیسوی) میں قتل کیا گیا اس طرح منصور حلاج اور جبائی قرمطی کا زمانہ تو قریب ہے لیکن ابن المقفع بہت پہلے گزر چکا ہے۔ اسی لیے یہ دونوں مل کر کس طرح سازش کر سکتے تھے۔ میں اسی لیے یہ کہتا ہوں کہ ہر صاحب علم کو چاہیے کہ وہ دوسرے علوم سے بھی تعلق رکھیں اور اس کا مطالعہ ہمہ گیر ہونا چاہیے۔ ہر علم کا دوسرے علم سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے۔ استاد محترم، کسی محدث کے لیے یہ بات کتنی معیوب ہوگی کہ کسی واقعے کے مطابق اس سے فتویٰ لیا جائے اور وہ جواب نہ دے سکے۔"

ابن جوزی کی حوالوں کے ساتھ گفتگو نے استاد کو لاجواب کر دیا اور وہ خاموش ہو گئے۔

انہوں نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مطالعہ پر بہت زیادہ توجہ دی۔ بغداد کے کتب خانے کتابوں سے مالا مال تھے۔ وہ کسی خاص فن یا موضوع کی کتابیں نہیں پڑھتے تھے بلکہ ان کے مطالعے میں ہر موضوع کی کتاب رہتی تھی اور ان کی مطالعے سے سیری نہیں ہوتی تھی۔

کوئی نئی کتاب نظر میں آتی تو انہیں ایسا لگتا جیسے کوئی دفینہ ہاتھ لگ گیا ہے، ان کے بقول کتابوں کے مطالعے سے سلف کے حالاتِ واخلاق ان کی عالی ہمتی، قوت حافظہ، ذوق عبادت اور علوم نادرہ کا ایسا اندازہ ہوا جو ان کتابوں کے مطالعے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس مطالعے کے نتیجے میں انہیں اپنے زمانے کے لوگوں کی سطح پست معلوم ہونے لگی اور اپنے عہد کے طلباء کی کم ہمتی ان پر ظاہر ہوتی۔ وہ پڑھنے کے علاوہ لکھنے میں بھی مشغول رہتے تھے۔

وہ لوگوں کے سامنے تقریر کرتے تو سامعین پر ان کی تقریر کا بہت اثر ہوتا۔

ان تقریروں نے حکام اور امراء کو ان کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ ان کی خدمت میں حاضریاں دینے لگے۔ ملاقات کے لیے حاضری دینے والوں کو وہ منع بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ منع کر دینا بد اخلاقی سمجھا جاتا ہے یہ امراء اور حکام ان کی تنہائی اور خلوت پسندی میں حارج ہونے لگے جو وقت وہ اللہ کی یاد میں خشوع وخضوع سے دیتے تھے وہ اس سے محروم ہونے لگے۔

اس کے علاوہ یہ امراء اور حکام دنیاداروں کے لیے بڑی چیز تھے اور ان کا کسی سے ملنا عزت وتوقیر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ شروع شروع میں ابن جوزی نے بھی امراء اور حکام کو اپنی طرف ملتفت دیکھا تو انہیں بھی خوشی اور فخر محسوس ہوا۔ وہ لوگوں کے سامنے وعظ کہتے تو اس میں بڑے بڑے حاکم اور امیر بھی موجود ہوتے اور سب ہی ان کی تقریر سے متاثر ہوتے۔ مشغولیت اور مصروفیت اللہ کے بجائے اس کے بندوں کی طرف ہو گئی تو انہیں اپنے اندر بڑی تکلیف دہ تبدیلی محسوس ہوئی۔

اب وہ اگر اللہ کی طرف رجوع ہوتے، دعائیں کرتے تو انہیں اپنے دل میں پہلے جیسی لذت اور حلاوت محسوس نہ ہوتی اس کے علاوہ اللہ کی یاد اور دعا کے دوران حکام اور امراء بھی یاد آنے لگے جس سے ان کی ارتکازی کیفیت میں نمایاں کمی پیدا ہو گئی۔ وہ پہلے جن حکام اور امراء کی حاضری، ملاقات اور صحبت کو فخر ومباہات کا ذریعہ سمجھتے تھے اب دل کی یکسوئی کے ختم ہو جانے سے ان سب کو بارگراں محسوس کرنے لگے۔

لیکن امراء اور حکام سے تعلقات بڑھا لینے کے بعد ان سے کھنچاؤ اور کنارہ کشی اختیار کرنا بھی زیادہ اختیاری بات نہیں تھی لیکن وہ دل کی جس دولت سے ان امراء اور حکام کی وجہ سے محروم ہوئے تھے وہ اس دولت سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی بھی اختیار نہیں کر سکتے ہیں۔

اسی کشمکش میں کچھ عرصہ گزر گیا اور ابن جوزی کوئی فیصلہ نہیں کر سکے کہ انہیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ دل و دماغ متصادم تھے دل انہیں یہ مشورہ دیتا کہ وہ دنیاداری سے گریز اختیار کریں اور اللہ کی طرف یکسوئی سے رجوع ہو جائیں مگر دل کا ساتھ ان کا دماغ نہیں دے رہا تھا۔ دماغ کہتا کہ اے ابن جوزی تو امراء اور حکام سے گریز کرے گا، کیا یہ تیرے اختیار کی بات ہے تو لوگوں کے سامنے دینی تقریریں کرتا ہے اور ان تقریروں سے سامعین فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سامعین میں امراء اور حکام بھی موجود ہوتے ہیں اور تیری توجہ ہر خاص وعام کے لیے یکساں اور مساوی ہوتی ہے، جن امراء اور حکام کو تو اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھتا ہے کیا انہیں عوام کی مجلس سے نکل جانے کا حکم دے سکتا ہے۔ تیرے وعظ اور تقریر سے جس طرح عوام فائدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح خواص کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اس

لیے امراء اور حکام سے بغض و عناد رکھنا فضول اور کارِ عبث ہے۔

دماغ کی دلیلوں اور تاویلوں نے دل کو شکست دے دی اور وہ لوگوں میں تقریریں کرتے رہے۔

انہیں ماضی کے لوگوں کا مطالعہ کرنے سے ایک خاص بات معلوم ہوگئی تھی۔ ماحول اور معاشرے کے کسی معمولی خاندان کے معمولی آدمی نے بلند و بالا مقام کیونکر حاصل کر لیا، سب ہی ایسے بڑے آدمیوں میں یہی تو مشترک نظر آئی کہ انہیں بلند ہمتی حاصل تھی اور وہ غیر معمولی لوگ تھے۔

دماغ نے اتنا سمجھانے کے بعد ابن جوزی کو مشورہ دیا کہ وہ بھی بلند ہمتی کا مظاہرہ کریں۔

دماغ کے اس مشورے پر عمل کرتے رہنے کے دوران وہ آہستہ آہستہ یہی محسوس کرتے رہے کہ جب تک وہ دل کے مشوروں پر عمل کرتے رہے ان کا دل اللہ کے ذکر و مناجات اور دعاؤں سے لذت حاصل کرتا تھا مگر دماغ کے بلند ہمتی سے متعلق مشورے پر عمل کرنے کے بعد وہ دل کے سوز اور کیف و سرور سے محروم ہوگئے تھے۔

دماغ نے اس مرحلے پر انہیں مشورہ دیا کہ وہ ماضی کے بڑے لوگوں کی زندگی کا مطالعہ بغور کریں اور انہیں کسی طرح بلند ہمتی سے کام لے کر اپنے دور کے غیر معمولی آدمی بن جائیں۔

بڑے لوگوں کے مطالعے کے دوران ان کی نظر ابو مسلم خراسانی کی حالاتِ زندگی پر پڑ گئی۔ اس شخص کو بھی غضب کی بلند ہمتی عطا ہوئی تھی۔ یہ شخص اپنی جوانی کے زمانے میں بہت کم سوتا تھا کسی نے ابو مسلم سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ ''اے سوال کرنے والے، جسے روشنِ دماغ 'بلند ہمت' بلندیوں کا حریض نفس ملا ہو وہ پست اور محدود زندگی پر قناعت نہیں کر سکتا اور اسے کس طرح نیند آئے گی۔''

ابو مسلم خراسانی بھی اسی کشمکش میں زندگی بھر بتلا رہا۔ وہ عباسیوں کی طرف سے عساکر اسلامی کا سپہ سالار مقرر کیا گیا تو دل و دماغ میں سلطنت حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور اس کے آس پاس موجود لوگوں نے بھی اس کو یہی مشورہ دیا کہ وہ سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اس مرحلے پر ابو مسلم خراسانی نے اپنے لوگوں سے کہا۔ ''تم لوگ جس شے کی حصولیابی کا مشورہ دے رہے ہو وہ خطروں میں پڑے بغیر اور جان کی بازی لگائے بغیر ممکن نہیں۔''

مشورہ دینے والوں نے ابو مسلم خراسانی کی بات جیسے سنی ہی نہ ہو انہوں نے خراسانی سے پوچھا۔ ''جب تجھے یہ معلوم ہے کہ سلطنت خطروں میں پڑے بغیر اور کوششیں نہ کرنے سے نہیں ملے گی تو تجھے بلند ہمتی سے کام لے کر خود کو خطرات میں ڈال دینا چاہیے۔''

ابو مسلم خراسانی مذبذب تھا جواب دیا۔ ''دوستو! میری عقل مجھے سلطنت کی حصولیابی سے باز رہنے کا مشورہ دے رہی ہے بتاؤ میں کیا کروں۔''

لوگوں نے جواب دیا۔ ''اے بے مثل سپہ سالار اور بلند حوصلہ انسان، ہم تجھے کیا مشورہ دیں گے۔ تجھے جیسا دل اور جیسی عقل عطا ہوئی ہے وہ ہم جیسے چھوٹے لوگوں کے مشورے پر کیا عمل کرے گی اب تو خود فیصلہ کر کہ تجھے کیا کرنا چاہیے۔''

ابو مسلم خراسانی کچھ دیر تو سوچتا رہا کہ واقعی اسے کیا کرنا چاہیے۔ کافی دیر غور و فکر کرنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''اب میں دل و دماغ کے مذبذب مشورے پر عمل نہیں کروں گا۔ اس وقت مجھے اپنی باگ ڈور نادانی کے ہاتھ میں دے دینا پڑے گی۔ نادانی کہتی ہے کہ میں خطرہ مول لوں اور جہاں عقل کے بغیر کام نہیں چلے گا وہاں عقل سے بھی مشورہ کرلوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میں نے کم ہمتی سے کام لیا تو گمنامی میں چلا جاؤں گا گمنامی اور افلاس لازم و ملزوم ہیں۔''

ابو مسلم حکومت حاصل کرنے کی کوششوں میں دیوانہ رہا اور اس مقصد کے لیے اس نے بہت خون بہایا، کتنے ہی بے گناہ لوگ قتل ہوئے اور بالآخر اس کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ اس کی عقل نے کوئی بندوبست نہیں کرنے دیا۔

ابو مسلم خراسانی کے بلند ہمتی سے متعلق واقعات کو پڑھ کر ابن جوزی سوچ میں پڑ گئے، اسی غور و فکر کے درمیان دل نے ان کو بتایا کہ ابو مسلم خراسانی نے جو کچھ بھی کیا لیکن اس کی بلند ہمتی نے سب سے اہم مسئلے کی بیخ کنی کر دی تھی۔ اس مسئلے کا تعلق آخرت سے ہے اس نے اپنی بلند ہمتی سے دنیاوی لذتوں کا قلیل حصہ حاصل کیا اسے آٹھ سال سے زیادہ اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ ملا اور وہ دنیا سے بڑی بری حالت میں رخصت ہوگیا۔ ابن جوزی یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ابو مسلم خراسانی کو محض دنیا کی ہوس تھی۔

اسی مطالعے کے دوران ان کی نظر شریف رضی نامی شاعر کے ایک شعر پر گئی ''ہر جسم کی لاغری کا ایک سبب ہے اور میری جسم کی مصیبت میری بلند ہمتی ہے۔''

ابن جوزی نے اپنی بلند ہمتی کا جائزہ لیا تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ علم کا وہ درجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں تک پہنچنے کا انہیں خود بھی یقین نہیں ہے وہ تمام علوم کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ موضوعات سے انہیں کوئی بحث نہیں تھی۔ وہ سوچتے کیا میں ہر علم کی تکمیل اور اس کا احاطہ کرسکتا ہوں۔ اس سوال کے بعد انہوں نے اپنی چھوٹی سی عمر پر بھی غور کیا تو وہ انہیں بہت ہی مختصر نظر آئی۔ وہ اپنے آس پاس یہ دیکھ رہے تھے کہ کسی کو کسی فن میں کمال حاصل ہے اور دوسرا کسی دوسرے فن میں کمال رکھتا ہے۔ یہ دونوں دوسرے فنون میں ناقص اور بے بہرہ تھے۔

ایک محدث فقہ سے محروم تھا اور ایک فقیہ حدیث سے بے خبر تھا۔

وہ انہی الجھنوں میں مبتلا رہے، ان کے سامنے ایسے بلند ہمت لوگوں کے حالات زندگی بھی تھی جنہوں نے احتیاط اور زہد کی زندگی گزاری تھی۔ وہ کتابوں کے مطالعے اور بندگان خدا کو تعلیم دینے کا کام بیک وقت کرتے تھے اور اسی لیے انہیں عام لوگوں کے ساتھ رہنے سہنے کے مشاغل بھی اختیار کرنا پڑتے تھے۔ وہ اللہ کی مخلوق سے دور رہنا چاہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ ان پر کوئی احسان نہ کرے اور یہ دوسروں پر احسان کرنے کے قابل اور لائق ہوجائیں۔ گویا الجھنوں ہی میں ان کی زندگی بسر ہوتی رہی۔ انہوں نے شادی کرلی تھی اور انہیں اولاد کی خواہش بھی تھی۔ بیوی اور اولاد کے لیے کسب معاش بھی ضروری اور لازمی ہے اور یہ بھی دنیاداری کا اہم حصہ ہے، وہ اپنے معاشی معاملات میں دوسروں کے ممنون ہونے سے نہیں بچ سکتے تھے جب کہ وہ دوسروں کے سلوک اور تحفوں کو قبول کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ انہیں بلند پایہ کتابیں لکھنے کا بھی شوق تھا۔ وہ اپنی تصانیف کو اپنی یادگار سمجھتے تھے کہ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد یہی تصانیف ان کی قائم مقام ہوں گی۔ اب اگر وہ اس کا اہتمام کرتے تو اس سے دل کے پسندیدہ اور محبوب مشغلے خلوت وتنہائی میں فرق آتا اور طبیعت میں انتشار پیدا ہوتا۔

انہیں دنیا سے جائز لطف لینے کا بھی شوق تھا لیکن یہاں بھی مال کی کمی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ سوچتے کہ اگر انہیں مال کی کمی نہ ہو اور وہ جو کچھ چاہتے ہیں انہیں وہ سامان بھی مل جائے تو اس سے دل کی آسودگی رخصت ہو جائے گی۔ وہ اچھے کھانے پینے کے بھی شوقین تھے۔ وہ صحت کی طرف سے بھی ہوشیار اور چوکنا رہتے تھے۔ ان کا جسم نفاست پسند تھا لیکن یہاں بھی مال کی کمی رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ وہ یہ سب کچھ سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں درحقیقت وہ سب کچھ اضداد کو جمع کرنے کی کوشش ہے اس عالی ہمتی کا مقابلہ وہ لوگ نہیں کرسکتے جنہیں صرف دنیا مطلوب ہو۔

ان کی خواہش تھی کہ انہیں دنیا اس طرح حاصل ہو جائے کہ ان کے دین پر آنچ نہ آئے اور وہ بالکل محفوظ رہیں۔ ایک طرف تو انہیں شب بیداری عزیز تھی۔ احتیاط اور تقویٰ کا اہتمام تھا۔ دوسری طرف علم کی اشاعت تصنیف و تالیف اور جسم کے لیے مناسب غذائیں مطلوب تھیں۔ وہ لوگوں سے ملنا جلنا اور ان کی تعلیم کو بھی ضروری سمجھتے تھے مگر دوسری طرف خلوت اور تنہائی کی دعا اور مناجات کی حلاوت میں کمی کو بھی افسوس اور رنج سے برداشت کرنا پڑتا تھا۔ کافی کشمکش اور تکلیف کے بعد وہ راضی بہ رضائے الٰہی ہوگئے وہ ایک سانس بھی کسی فضول کام میں صرف کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ مجالس وعظ کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ خلفہ، سلاطین، وزراء اور اکابر علماء اگر ان کی وعظ کی مجلس میں شرکت کریں گے تو یہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔

انہوں نے اپنے سامنے وعظ سننے کے لیے جمع ہونے والوں کا اندازہ لگایا تو انہیں بتایا گیا۔ ''ایک لاکھ سے کچھ زائد ہی لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔'' وہ دل سے وعظ کہتے۔ تاثیر کا یہ عالم تھا کہ لوگ غش کھا کھا کر گر جاتے تھے۔ وجد و شوق میں اپنے کپڑے پھاڑ دیتے تھے ان کی چیخیں نکل جاتیں آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں۔

وعظ کے بعد لوگ ان کی طرف بڑھتے۔ کئی بار شروع شروع میں تو ان کا جی چاہا کہ وہ اپنی طرف آنے والوں کو روک دیں۔ انہوں نے وعظ کے سلسلے میں جو تقریر کی تھی اسی کو سامعین مناسب سمجھیں اور اس پر عمل کریں لیکن ان کی طرف بڑھنے والوں کو کوئی روک بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ لوگ لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے شوق کے عالم میں ابن جوزی کی طرف بڑھتے تو ابن جوزی کے ارادت مندوں کو شبہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ ابن جوزی کو نقصان نہ پہنچا

دیں۔

ارادت مند اتنے طاقت ور بھی نہیں تھے کہ وہ ابن جوزی کی طرف بڑھنے والوں کو حصار بنا کے روک دیتے۔ آگے بڑھنے والے لوگ والہانہ جذبے اور شوق سے آگے بڑھتے رہے اور شیخ کے قریب پہنچ کے والہانہ جذبے سے کہا۔ ''ہم آپ کے ہاتھوں پر توبہ کرنے آئے ہیں اس طرح خدا ہماری توبہ قبول فرمائے گا اور اللہ کی طرف سے آپ کو اجرِ عظیم عطا ہوگا۔''

ابن جوزی ان سے توبہ کرواتے اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے۔ اللہ سے دعا کرتے کہ خدایا انہیں تو معاف کردے اور توبہ پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما، اس میں بھی ابن جوزی کو بہت وقت دینا پڑتا۔

توبہ کرنے والوں کے بعد دوسرے بہت سے لوگ ابن جوزی کے پاس جانے کے منتظر نظر آئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو دور سے توبہ کرنے کے منظر کو دیکھ رہے تھے اور خود ابن جوزی تک پہنچنے کی نیت و ارادہ رکھتے تھے۔

یہاں بھی ابن جوزی کے ارادت مند آڑے آئے اور انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کردی اور جب ارادت مندوں کو ان لوگوں کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں ان کا تعلق دوسرے مذاہب سے ہے اور اس وقت وہ ابن جوزی کے وعظ سے متاثر ہو کر ابن جوزی کے ہاتھوں مسلمان ہونا چاہتے ہیں تو انہیں ابن جوزی کے پاس جانے کی اجازت مل گئی۔

ہر مجلس وعظ کے بعد ہزاروں غیر مسلم ان کے ہاتھوں مسلمان ہوتے رہے۔

اس عمل سے بھی ابن جوزی کو اپنے قلب میں فخر اور بڑائی کا جذبہ محسوس ہوتا اور وہ گھر پہنچنے کے بعد سجدے میں گر کر توبہ و استغفار کرتے کہ خدایا مجھے تکبر اور غرور سے دور رکھ کیونکہ تیری توفیق کے بغیر میں اس پر قابو نہیں پا سکتا۔

ابن جوزی کے بارے میں لوگوں نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے بیس ہزار یہودیوں اور عیسائیوں کو مسلمان کیا اور ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں نے ان کے ہاتھوں پر توبہ کی۔

☆......☆

ابن جوزی نے اپنی تصنیف تلبیس ابلیس میں اپنے زمانے کے مسلم معاشرے کا جائزہ لیا ہے اور مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر جماعت کو سنت اور شریعت کے معیار سے پرکھا ہے۔ ان کی کمزوریوں، بے اعتدالیوں، غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کی نشاندہی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ شیطان نے کس کس طرح اس امت کو دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے۔ انہوں نے کسی طبقے اور کسی شخص کی رعایت کے بغیر یہ بتایا ہے کہ شیطان نے کن کن راہوں سے مسلمانوں کے عقائد، اعمال اور اخلاق میں رخنہ اندازی کی ہے۔ اس میں علماء، محدثین، فقہ، واعظین، ادیب، شاعر، سلاطین، حکام، عابد، زاہد، صوفی اور عوام کی الگ الگ کمزوریاں غلط رسوم اور اعداد بے اعتدالیاں اور مغالطے بیان کیے ہیں۔

ابن جوزی نے واعظوں پر تنقید کی اور لکھا۔ ''یہ لوگ بڑی پُرتکلف اور آراستہ عبارت بولنے کے شائق ہوتے ہیں جو اکثر بے معنی ہوتی ہے۔ ہمارے زمانے میں وعظ کا بڑا حصہ حضرت موسیٰ کوہ طور اور یوسف زلیخا کے قصے بیان کرنے سے متعلق ہوتا ہے۔ یہ لوگ فرائض کا ذکر نہیں کرتے اور گناہوں سے بچنے کا بھی ذکر ان کے وعظ میں نہیں ہوتا۔ سوچیں کہ ایسے وعظ سے ایک زانی، سود خور کو توبہ کرنے کی ترغیب اور توفیق کیسے ہوسکتی ہے یہ مواعظ ان مضامین سے خالی ہوتے ہیں۔ انہوں نے شریعت کو پس پشت ڈال دیا جس سے ان کا بازار خوب گرم ہے اس لیے کہ حق ہمیشہ طبیعتوں پر بھاری ہوتا ہے جب کہ باطن بالکل ہلکا اور خوشگوار۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وعظ کہنے والا سچا اور خیر خواہ ہونے کے باوجود اس کے دل میں جاہ طلبی موجود ہوتی ہے اور وہ دل سے چاہتا ہے کہ اس کی عزت و تعظیم کی جائے۔ اگر اس کے مقابل کوئی دوسرا مقرر اور واعظ کہنے والا قائم مقامی کے لیے آجائے یا اس کے کاموں میں مدد کرنا چاہے تو یہ قائم مقامی کرنے والا اسے ناگوار گزرتا ہے حالانکہ یہ شخص مخلص ہوتا ہے۔

اگر طالب علم اپنے مدرس کے علاوہ دوسرے کے پاس چلا جائے اور یہ دوسرا مدرس پہلے مدرس سے زیادہ لائق اور فائق ہو تب بھی پہلے مدرس کو اس سے بڑی تکلیف پہنچتی ہے۔ انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ ان کی مثال اطباء جیسی ہوتی ہے جو اللہ کی مخلوق کا خلوص دل سے علاج کرتے ہیں۔ اگر کسی مریض کو کسی طبیب کے ہاتھ سے شفا ہو جائے تو دوسرا طبیب خوش ہوتا ہے۔

ابن جوزی نے سلاطین اور حکام پر بھی زبردست تنقید کی ہے۔ ''یہ حضرات شریعت کی پرواہ کیے بغیر اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں اور یہ اس شخص کا بھی ہاتھ کاٹ دیتے ہیں جس کا ہاتھ کاٹنا جائز نہیں، اس شخص کو قتل کر دیتے ہیں

جس کا قتل جائز نہیں اور اپنی جگہ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ یہ سیاست ہے حالانکہ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ گویا شریعت ناقص ہے۔ یہ اپنی رائے سے اس نقص کو دور کر کے خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ انہیں سمجھنا چاہیے کہ شریعت، سیاست الٰہی ہے اور خدائی سیاست میں کوئی خلل یا کوئی کمی نہیں ہوسکتی اور اللہ کی مخلوق کو سیاستِ الٰہی میں تبدیلی کی ضرورت نہیں محسوس کرنا چاہیے۔ اللہ نے خود فرمایا ہے کہ ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی اور تاکہ اس کے حکم کو کوئی مٹانے والا نہیں ہے جو بھی اس سیاست کا مدعی ہے وہ دراصل شریعت میں خلل اور کمی کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ کفر کی بات ہے۔''

حکام، امراء اور سلاطین کی دوسری عام کمزوری اور مغالطے کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ ''گناہوں پر اصرار کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو صالحین کی ملاقات کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے۔ یہ لوگ ان سے ملتے ہیں اپنے حق میں دعائیں کرواتے ہیں۔ شیطان نے ان کو سمجھا رکھا ہے کہ اس طرح وہ اپنے گناہوں کا پلڑا ہلکا کرلیں گے، انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اس خیر سے اپنے شر کو ختم نہیں کر سکتے۔''

دوسری جگہ فرمایا۔ ''ان امراء اور دنیا داروں کو عالموں اور فقیہوں سے زیادہ خلاف شرع پیروں، گانے بجانے والوں اور صوفیوں سے محبت اور عقیدت ہوتی ہے اور وہ ان فضول لوگوں پر بڑی فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں حالانکہ اہل علم پر ایک پیسا خرچ کرنا بھی ان کو بار ہوتا ہے یہ علماء، اطباء کی طرح ہیں۔ دوا میں خرچ کرنا انسان کو بوجھ معلوم ہوتا ہے ان پیروں اور قوالوں پر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسے گانے والی عورتوں پر خرچ کر دینا یہ لوگ ان کے لیے گویوں اور مداریوں کی طرح سامان تفریح اور لازمۂ ریاست ہوتے ہیں یہ لوگ بناوٹی زاہدوں اور تارک دنیا درویشوں کے بہت جلد معتقد ہوجاتے ہیں اور انہیں علماء پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ یہ اگر دنیا کے سب سے بڑے جاہل کے مجسم پر بھی درویشی کا لباس دیکھ لیں تو اس کے فوراً معتقد ہوجائیں گے۔ اگر وہ سر کو جھکانے اور بناوٹی خشوع و خضوع کا اظہار کرے تو یہ اس پر فوراً فریفتہ ہوجائیں گے اور کہیں گے بھلا اس درویش اور فلاں عالم کا کیا مقابلہ یہ تارک دنیا وہ طالب دنیا یہ نہ تو اچھی غذائیں کھاتا ہے اور نہ شادی کرتا ہے حالانکہ یہ کہنا محض جہالت ہے اور اس سے شریعت محمدی کی تحقیر ہوتی ہے۔''

انہوں نے عوام پر بھی تنقید کی ہے۔ ''شیطان نے عوام کی اکثریت کو یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ وعظ اور ذکر کی محفل میں شریک ہوجانا اور متاثر ہو کر رو دینا ہی سب کچھ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ محفل خیر میں شرکت اور رقعت ہی کافی ہے وہ واعظوں سے اس کے فضائل سنتے رہتے ہیں اگر ان کو کسی طرح یہ بتا دیا جائے کہ یہ مخصوص عمل ہے تو یہ سننا اور عمل کرنا وبال جان ہوگا۔ میں ذاتی طور پر بہت سے ایسے آدمیوں کو جانتا ہوں جو سالہا سال سے وعظ کی محفلوں میں شریک ہوتے، روتے اور متاثر ہوتے ہیں لیکن وہ نہ تو سود لینا چھوڑتے ہیں اور نہ تجارت میں دھوکا دینے سے باز آتے ہیں۔ وہ ارکانِ صلاۃ سے پہلے بھی بے خبر تھے اور اب بھی بے خبر رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی غیبت، والدین کی نافرمانی میں جس طرح پہلے مبتلا تھے۔ وعظ سننے کے بعد بھی اس میں مبتلا رہتے ہیں۔ شیطان نے ان کو یہ فریب دے رکھا ہے کہ محفل وعظ کی حاضری اور گریہ و بکا ان کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گی۔ ان میں سے بعض خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ عالموں اور صالحوں کی محبت ہی مغفرت کا ذریعہ ہے۔''

جو دولت مند اپنی دولت کو حصول ثواب کی خاطر زمانے کے مروجہ مدوں میں خرچ کرتے ہیں ان پر بھی انہوں نے سخت تنقید کی ہے۔ دولت مندوں پر تبصرہ اس طرح فرمایا۔ ''ان میں سے اکثریت مساجد اور پلوں کی تعمیر میں بہت کچھ خرچ کرتے ہیں وہ یہ کام خلوص سے نہیں کرتے ان کا مقصد ریا اور شہرت ہوتا ہے اس طرح انہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ ان کی یہ بنوائی ہوئی چیزیں ان کا نام زندہ رکھیں گی۔ مساجد اور پلوں کی تعمیر پر وہ اپنا نام کندہ کروا رہے ہیں اگر انہیں صرف اللہ کی رضا مقصود ہوتی تو وہ اس قسم کی تعمیرات کو کافی سمجھتے ان کے لیے اللہ کا دیکھنا اور جاننا ہی کافی ہوتا یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ان سے ایک ایسی دیوار کی تعمیر کی درخواست کی جائے جس پر ان کا نام کندہ نہ ہو تو وہ ایسا کام نہیں کریں گے۔''

''یہی وہ لوگ ہیں جو رمضان المبارک میں شہرت کے لیے مسجدوں میں موم بتیاں بھیجتے ہیں حالانکہ ان کی مسجدوں میں سال بھر اندھیرا پڑا رہتا ہے وہ جانتے ہیں کہ محض رمضان میں موم بتی بھیج دینے سے وہ نمازیوں کی نظر میں آجاتے ہیں۔''

ابن جوزی اپنے نفس سے مکالمے فرمایا کرتے تھے

بعض اوقات ان کے دل میں عجیب سی کشمکش پیدا ہو جاتی تھی اور وہ اپنا محاسبہ کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ ایک بار وہ اپنے کسی مقصد کے لیے دعا کر رہے تھے کہ ان کے قریب ہی ان کے ایک صالح دوست اور بزرگ بھی ان کی دعا میں شریک ہو گئے۔ دعا تو قبول ہو گئی لیکن دونوں میں سے کس کی دعا قبول ہوئی یا کس کے طفیل دعا کو شرف قبولیت حاصل ہوا وہ اسی الجھن کے شکار ہو گئے اور ان کا اپنے نفس سے مکالمہ ہونے لگا۔ ان کا نفس انہیں بتا رہا تھا کہ دعا کو شرف قبولیت اس بزرگ کی وجہ سے حاصل ہوا ہے جو دعا میں ان کے شریک تھا کیونکہ ان کے نفس کے بقول ان کی دعا کو شرف قبولیت حاصل نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ خود نفس کو سمجھ رہے تھے کہ یہ دعا میری وجہ سے قبول کی گئی کیونکہ ابن جوزی اپنے گناہوں اور غلطیوں سے آگاہ تھے اور انہیں ان کی وجہ سے شرمندگی کا احساس شدید رہا اور وہ ندامت بھی محسوس کرتے رہے۔ اللہ کو ان کا اعتراف اور احساسِ شرمندگی دل شکستگی اللہ کو پسند آئی ہو گی اور اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی لیکن انہیں یہی احساس شریک دعا صالح بزرگ کے بارے میں بھی ہوتا رہا اور انہیں یہ احساس ہوا کہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنے اعمال کی بنا پر فضل کا طالب نہیں ہو سکتا خود انہوں نے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ندامت سے گردن جھکا کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”خدایا! مجھے محض اپنے فضل سے عطا فرما کیونکہ میرے اعمال ایسے نہیں ہیں کہ مجھ پر تیرا فضل ہو، میں بالکل خالی ہاتھ ہوں لیکن مجھے اُمید رہی کہ میری سن لی جائے گی۔ میرا ساتھی بزرگ اگر اپنے اچھے اعمال کا خیال کرے اور یہ اسے یقین ہو جائے کہ اس کے حسن عمل کی وجہ سے دعا کو شرف قبولیت حاصل ہونا چاہیے اس کی یہ سوچ اس کے لیے رکاوٹ بن سکتی ہے وہ اپنے نفس سے کہتے رہے کہ میرا دل زیادہ نہ توڑ وہ تو پہلے ہی ٹوٹا ہوا ہے میں اپنی توقیروں کا اعتراف کر چکا ہوں، ان کے ہوتے ہوئے میں نے اللہ سے جو مانگا ہے اس کا میں بے حد محتاج ہوں اور جس سے میں نے سوال کیا ہے مجھے اس کے فضل کا یقین ہے۔ خدایا! یہ ساری باتیں جو میں سوچ سوچ کے بیان کر رہا ہوں میرا ساتھی صالح بزرگ اس طرح نہیں سوچتا ہو گا خدایا اس کی عبادت میں برکت دے میرے لیے اعتراف تحقیر ہی بڑے کام کی چیز ہے۔“

ابن جوزی اپنے آس پاس کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے تھے۔

برمودا ٹرائی اینگل کو دنیا کے چند پر اسرار ترین خطوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے جہاں بحری جہازوں اور طیاروں کے حیران کن طور پر غائب ہونے کی رپورٹس سامنے آتی رہتی ہیں اور اب اس خطے میں سمندر سے ابھرنے والے ایک جزیرے نے اس کے اسرار کو مزید بڑھا دیا ہے۔

برطانوی اخبار انڈیپینڈنٹ کی رپورٹ کے مطابق امریکا کے ساحلی علاقے شمالی کیرولائنا کے قریب ایک نیا جزیرہ نمودار ہوا ہے جو کہ مہم جو سیاحوں اور فوٹو گرافرز کو اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔

یہ جزیرہ موسم بہار میں ابھرنا شروع ہوا جس کے بعد یہ بتدریج نمایاں ہوتا چلا گیا۔ وہاں کے مقامی رہائشیوں کے مطابق یہ جزیرہ جسے شیلی آئی لینڈ کا نام دیا گیا ہے، کو ماہرین نے خطرناک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہاں جانے سے گریز کیا جائے۔ ان کے بقول اس جزیرے کے ارگرد پانچ فٹ لمبی شارکیں اور اسٹرنگ ریز کو تیرتے دیکھا گیا ہے۔ ہلال کی شکل کا یہ جزیرہ ایک میل لمبا اور چار سو فٹ چوڑا ہے۔ یہ جزیرہ سمندر میں اس جگہ ابھرا ہے جو کہ برمودا ٹرائی اینگل میں شامل ہے جس کے اندر سمندر کا چار لاکھ چالیس ہزار میل کا رقبہ آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اوسطاً ہر سال یہاں چار طیارے اور بیس کشتیاں گم ہو جاتی ہیں جن کا نام و نشان نہیں ملتا۔

مرسلہ: ثمینہ خانم۔ ملتان

وہ کہیں جا رہے تھے، انہیں دوران سفر دو مزدوروں کی آوازیں سنائی دیں۔ دونوں ایک بھاری شہتیر اٹھا کر لیے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کوئی فقرہ ادا کرتا تھا دوسرا ترنم میں جواب دیتا۔

ابن جوزی نے ان دونوں کے معاملات پر غور کیا اور دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ دونوں یہ کیا کہہ رہے ہیں اور اس سے ان کا مقصد کیا ہے۔

بہت کچھ سوچنے کے بعد انہیں اپنے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ انہیں معلوم ہوا کہ اگر وہ دونوں ایسا نہ

کریں تو انہیں اپنی محنت اور بوجھ کا بہت زیادہ احساس رہے گا لیکن اس ترکیب سے ان کا دھیان محنت اور کام کی طرف سے ہٹ جاتا ہے اور شہتیر کو لے جانے میں انہیں آسانی ہوتی ہے۔ وہ دیر تک دونوں کے معاملے پر غور کرتے رہے اور انہیں یقین کے ساتھ معلوم ہوگیا کہ یہ دونوں جو کلمات ادا کرتے ہیں ذہن اتنی دیر دوسرے کام میں لگ کر ستا لیتا ہے اور کچھ سرور بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

جب ایک کچھ گا کر با آواز بلند خاموش ہو جاتا ہے تو اسے دوسرے کی جوابی آواز سے دھیان کے بٹ جانے سے بوجھ کے اٹھانے کا احساس زائل ہو جاتا ہے اور شہتیر کو اٹھائے رکھنے کا احساس جاتا رہتا ہے۔

اب ابن جوزی سوچ رہے تھے کہ انسان نے بشری ذمہ داریوں اور فرائض کا بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے ان میں سب سے بڑا بوجھ اپنے نفس کی سیاست کا ہے اور اس میں اہم کام یہ ہے کہ نفس کو اس کے مرغوبات سے روکا جائے اور جن چیزوں سے اس کو رغبت نہیں ہے ان پر اسے قائم رکھا جائے۔ اب وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ سفر کے راستے کو تسلی اور نفس کی جائز دلداری کی مدد سے قطع کردیا جائے انہیں اس موقع پر کسی شاعر کا ایک شعر یاد آگیا۔ ''رات بھر چلتے رہنے سے سواریاں تھک جائیں اور وہ فریاد کریں تو صبح کی روشنی کی امید دلا اور ان سے دن چڑھے آرام کرنے کا وعدہ کر۔''

اس موقع پر ابن جوزی کو مشہور صوفی بشر حافی کی ایک حکایت یاد آگئی۔ بشر حافی اپنے چند ارادت مندوں کے ساتھ کہیں جارہے تھے ان کے ایک ساتھی کو راستے میں پیاس لگ گئی۔ ان سب کے سامنے ایک کنواں تھا مگر بشر حافی نے سفر جاری رکھنے کی تلقین کی اور کہا۔ ''آگے بھی ایک کنواں ہے جلدی کیا ہے آگے بڑھتے رہو اگلے کنویں سے پیاس بجھالیں گے۔''

بشر حافی سے کسی نے اختلاف نہیں کیا اور ان کا سفر جاری رہا۔ کافی دیر بعد وہ کنواں بھی انہیں نظر آیا جس کا ذکر بشر حافی نے کیا تھا۔ ان کے ساتھیوں نے اس کنویں کے قریب رکنے کی خواہش کی تو بشر حافی نے کہا۔ ''تم لوگ سفر کو تکان سے کھوٹا کردو گے پانی پینا بھی ضروری ہے لیکن دوستو! اس کنویں کو بھی نظر انداز کردو اور سفر جاری رکھو ہمارے راستے میں کئی کنویں ہیں ہمیں اگلے کنویں پر اپنی پیاس بجھانی ہوگی۔''

ساتھیوں نے بشر حافی کی بات مان لی اور اس کنویں سے بھی پانی نہیں لیا اگلے کنویں کی جستجو ان کی پیاس پر غالب آئی اور بشر حافی بھی یہ دیکھ رہے تھے کہ اگلے کنویں کی جستجو اور پیاس کی شدت نے ان میں بے چینی اور اضطراب پیدا کردیا ہے اور سفر کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی اور بشر حافی اپنے ساتھیوں کو لیے ہوئے کئی کنوؤں کے پاس سے گزر کر آگے بڑھتے چلے گئے اور یہ سفر بہت جلد ہی طے کرلیا گیا۔ آخر کار جب وہ اپنے سفر کے اصل مقام پر پہنچ گئے تو اپنے ساتھیوں کو سمجھایا۔ ''دوستو دیکھو ہمیں اسی طرح دنیا کا سفر طے کرنا چاہیے یاد رکھو کہ جس نے اس نکتے کو سمجھ لیا وہ اس دنیا سے با آسانی سفر کر جائے گا۔''

ارادت مندوں کو آپ کے ان نصائح آمیز مشورے اور باتوں سے بے حد خوشی اور سکون حاصل ہوا وہ سمجھ چکے تھے کہ اپنے نفس کو بہلانے اور دل جوئی کرنے اور اس سے وعدہ کرتے رہنے سے ان کا بوجھ ہلکا ہوتا رہے گا۔

ابن جوزی کو یاد آیا کہ بعض بزرگان سلف فرمایا کرتے تھے اور اپنے نفس کو مخاطب کرکے کہتے تھے۔ ''اے نفس میں تجھے تیری مرغوب چیزوں سے روکتا ہوں اور یہ عمل شفقت اور خوف کی وجہ سے ہوتا ہے۔'' انہیں بایزید بسطامی کا یہ قول یاد آیا۔ ''اپنے نفس کو جب میں خدا کی طرف لے جارہا تھا تو وہ رو رہا تھا پھر رفتہ رفتہ ہنستا کھیلتا اللہ کی طرف بڑھنے لگا۔''

ابن جوزی نے کہا۔ ''اے نفس تجھے یاد رہنا چاہیے کہ خاطرداری اور ملاطفت بھی ضروری ہے اور راستہ اسی طرح سے ہو جاتا ہے۔''

ابن جوزی نے آبادی کے بہت سے کتوں کو بھونکتے ہوئے دیکھا انہیں جستجو ہوئی کہ یہ کتے بے تحاشا کیوں بھونک رہے ہیں۔ جستجو کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ وہیں کہیں قریب سے شکاری کتے گزر رہے ہیں اور یہ کتے جن کے ساتھ ہیں وہ اپنے کتوں کی بڑی عزت کرتے ہیں ان پر جھول پڑی ہوئی ہے اور ان کے چلنے کے انداز میں وقار پایا جاتا ہے یہ شکاری کتے آبادی کے کتوں میں حسد پیدا کررہے تھے اور شکاری کتوں نے محلے کے کتوں کے بھونکنے کو نظر انداز کردیا تھا۔ شکاری کتوں کے رویوں سے لگتا تھا کہ وہ محلے کے کتوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے بھونکنے کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ دونوں کتے یہ شعور بھی رکھتے ہیں کہ دونوں کی قومیں الگ ہیں۔ مقامی کتے موٹے موٹے بھدے اعضاء

کے ہیں ان میں امانت کی صفت نہیں پائی جاتی جب کہ شکاری کتے نازک، پھرتیلے اور چست و چالاک نظر آتے تھے۔

اب ابن جوزی ان دونوں کے تاثرات پر غور کررہے تھے۔ شکاری کتے مہذب لگ رہے تھے اور ان کے بارے میں یہ بات تو سبھی کو معلوم تھی کہ جب وہ اپنے آقا کے لیے شکار کرتے ہیں تو کیا مجال کہ شکار کو منہ لگائیں اپنے مالک کے ڈر سے یا مالک کے احسانات کے شکریے میں شکار کو جوں کا توں مالک تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ اس سے میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ بدن اور اخلاق میں خاص مناسبت ہوتی ہے اگر بدن لطیف ہے تو اخلاق بھی لطیف ہوں گے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ انسان کو اس پر حسد نہیں کرنا چاہیے جسے وہ اپنے طبقے اور اپنی سطح کا نہ سمجھتا ہو وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ جس کو اللہ ایمان اور تحمل کی دولت سے سرفراز کردے اس کو اپنے حاسد پر حسد نہیں ہوتا لیکن جو ایمان اور عقل سے محروم ہو، وہ اس کو قابل التفات نہیں سمجھتا دنیا کی بنا پر حسد کرتا ہے اور اس کا مطمع نظر آخرت ہے اور ان دونوں میں بعد المشرقین ہوتا ہے۔

ابن جوزی نے تصنیف و تالیف کے گراں قدر کام انجام دیے، بطور خاص ان کی کتاب صید الخاطر بہت شہرت رکھتی ہے اس کتاب میں انہوں نے اسی نوعیت کا کارنامہ انجام دیا ہے جو امام غزالی نے احیائے علوم دین میں، اپنی اس کتاب میں انہوں نے اسلام، مسلمان، ماحول، معاشرے، حکومت، سیاست، امیر، غریب، صوفی، عالم سب ہی کو اپنی فکر و سوچ اور علم کے دائرے میں لے لیا ہے اور بڑی بڑی شخصیات کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کردی ہے۔ وہ فن تاریخ کی اہمیت اور ضرورت کو بہت ضروری سمجھتے تھے ان کے نزدیک تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر علماء اور فقہا سے اپنی کتابوں میں بڑی غلطیاں ہوئی ہیں اور یہ غلطیاں ان کے منصب اور علم و فضل کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

وہ اپنی ادبیت اور خطابت سے مدتوں کام لیتے رہے۔ ان کی فصاحت و بلاغت اور حسن خطابت کے سبھی معترف تھے جب ان کی مجلس وعظ کو مقبولیت کی وجہ سے لوگوں کے اژدھام کی شکل میں دیکھتے تھے تو انہیں اپنی ذہنی کشمکش سے اذیت پہنچتی تھی۔ اس موقع پر ان کا نفس ملامت کرتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ وہ یہ کام چھوڑ دیں۔ لفظوں کی طرف بالکل توجہ نہ دیں کیونکہ یہ سارا کا سارا تکلف اور تصوع ہے لیکن ان کا علم اور فقہی منصب نفس کے خیال کو روکتا تھا، اس نے ان کے نفس کو سمجھایا کہ حسنِ کلام ایک خداداد قابلیت کی شکل میں ایک ہتھیار اور ایک کمال کی بات ہے، اسے نقص اور عیب نہیں سمجھنا چاہیے۔ دعوت اور تبلیغ میں اس سے کام لیتے رہو اس کی ناقدری مت کرو۔

ان کے دل میں کئی بار شدت سے یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ وہ وعظ گوئی اور دعوت و تبلیغ کو چھوڑ کر زہد کی زندگی اختیار کریں دنیا سے قطع تعلق کرلیں اور بالکل یکسو ہو کر گوشہ نشین ہوجائیں۔

لیکن اس خیال کو بھی دلیلوں سے اپنے نفس سے مفصل مباحثہ اور مناظرہ کر کے نجات حاصل کی اور اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ انہیں شیطان ورغلا رہا ہے کیونکہ شیطان یہ نہیں دیکھ سکتا کہ ہزاروں آدمی اس کے جال سے نکل کر ہدایت کا راستہ اختیار کریں۔

دعوت اور تبلیغ تو نبیوں کا راستہ ہے۔ سارے نبی اپنی زندگی اجتماع اور اختلاط میں بسر کرتے تھے جب کہ نفس بے کاری اور تعطل کو پسند کرتا ہے۔ جدوجہد سے بھاگتا ہے۔ اس میں جاہ طلبی بھی ہے، عزلت، گوشہ نشینی، زہد اور دنیا سے قطع تعلق کرلینا عوام کے لیے زہد باعث کشش ہوتا ہے اور لوگ ادھر فوراً متوجہ ہو جاتے ہیں اس لیے انہیں اپنی فصاحت و بلاغت اور حسن خطابت سے ہمیشہ کام لینا چاہیے۔ وہ اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے کہ ان کی ساری دماغی صلاحیتیں ساری خدا کی بخشی ہوئی طاقتیں لوگوں کی اصلاح کے لیے عطا کی گئی ہیں اور وہ پچاس سال سے زیادہ پورے انہماک اور قوت کے ساتھ اصلاح اور افادہ کے کام میں مشغول رہے۔

597ء ہجری (جمعہ کی شب) ابن جوزی نے سفر آخرت اختیار کیا بغداد میں کہرام برپا ہوگیا۔ بازار بند ہو گئے۔ جامع منصور میں نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ یہ وسیع مسجد کثرتِ اژدھام سے تنگ اور ناکافی ثابت ہوئی۔

بغداد کی تاریخ کا یہ ایک یادگار دن تھا۔ لوگ بلند آواز میں گریہ وزاری کرتے رہے اور رمضان بعد لوگوں نے راتیں ان کی قبر کے پاس گزاریں اور قرآن پاک ختم ہوتے رہے۔

راشدی برادران

شکیل صدیقی

رخِ حیات پر وحشت مدام مگر کشکولِ فکر لبالب بھرا اور دل میں کچھ کر دکھانے کی للک اور اسی للک نے اسے ہمہ وقت بے چین رکھا۔ وہ بے سرو سامانی کے عالم میں بھی علم و عرفان کی شمعیں جلا رہا تھا۔

ان دو بھائیوں کا تذکرہ جن پر سندھ کو فخر ہے

پڑھائی میں وہ زیادہ تیز نہیں تھے۔ چونکہ زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کے مشاغل عام لڑکوں سے مختلف تھے۔ کتابوں سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں تھا اور نہ انہوں نے کبھی تعلیم کے بارے میں کچھ سوچا تھا۔ البتہ ان کے بڑے بھائی پیر علی محمد راشدی سارے اخبارات پڑھتے تھے بلکہ انہیں کتابوں سے عشق تھا۔

حسام الدین کو تعلیم اور پڑھائی سے کیسے عشق ہوا اس کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ وہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز جب وہ

کھیل کر واپس آئے تو اپنے بڑے بھائی کے کمرے میں چلے گئے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب حسام الدین کی عمر بارہ برس تھی۔ وہ کتابوں اور اخبارات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ ان کی دل چسپی کی وجہ تصاویر تھیں جو رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔ اچانک علی محمد راشدی کمرے میں داخل ہوئے اور انہوں نے چھوٹے بھائی کو ڈانٹا۔ ''تم میری کتابوں کو ہاتھ کیوں لگا رہے ہو؟ جاہل تمہیں ان سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ جاؤ گلی ڈنڈا کھیلو۔''

اپنے بھائی کا یہ رکیک جملہ سن کر حسام الدین رونے لگے۔ انہوں نے کہا۔ ''تم مجھے جاہل کہہ رہے ہو۔ دیکھنا کہ میں تم سے زیادہ پڑھوں گا اور میرا نام سب سے اوپر ہوگا۔''

''اچھا بک بک نہ کرو اور میرے کمرے سے نکل جاؤ۔'' علی محمد نے اکتا کر کہا۔ ''اس سے پہلے بھی تم کافی دعوے کرتے رہے ہو۔''

اس بار حسام الدین کے دل کو لگ گئی تھی، لہٰذا انہوں نے کتابوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ وہ کھیل کی طرف سے متنفر ہوگئے۔ گلی کے لڑکے انہیں آوازیں دیتے لیکن وہ ان پر توجہ نہ دیتے۔ تعلیم کا سلسلہ ویسے جوش وخروش سے دوبارہ تو شروع نہ ہوسکا، البتہ انہوں نے عالموں کی صحبت میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ صحبت طالح ترا طالح کند، صحبت صالح ترا صالح کند۔

گھر میں جو بھی وقت انہیں ملتا وہ کتابوں پر صرف کرتے۔ حد یہ ہے کہ اب انہوں نے رات کو بھی پڑھنا شروع کر دیا۔ لالٹین ایجاد ہوچکی تھی۔ انہوں نے اس ایجاد سے فائدہ اٹھایا اور رات کو لالٹین جلا کر پڑھنے لگے۔ ان کی والدہ انہیں دعائیں دیا کرتی تھیں اور پنکھا جھلا کرتی تھیں۔ ایک بار وہ رات بھر پڑھتے رہے تو ان کی والدہ ساری رات پنکھا جھلتی رہیں۔

علی محمد راشدی نے انہیں بڑھاوا دینے کے لیے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ البتہ وہ ڈسپلن جوان کی ذات میں شامل تھا، کوشش کر کے حسام الدین میں منتقل کر دیا۔ ایک بار انہوں نے کسی بات پر غصے میں حسام پر ایئر گن تان لی۔ ہر چند کہ اس ایئر گن میں مٹر کے دانے بھرے ہوئے تھے مگر جب انہوں نے فائر کیا تو مٹر کا دانہ حسام کے پیٹ پر لگا، زخم ہوگیا اور خون بہنے لگا۔ پیٹ پر داغ پڑ گیا جو آخری عمر تک قائم رہا۔ اسے دیکھ کر وہ کہتے تھے۔ ''یہ میری غلامی کی نشانی ہے۔ جس طرح شاہ باز قلندر کے فقیر گرم لوہے سے اپنے بازو پر مہر لگواتے ہیں۔''

ان دونوں بھائیوں کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح سے جلد از جلد بڑے ہوجائیں اور بڑے بڑے کارنامے انجام دیں۔ ان کے گھر ''بخشی'' کی جنتری آتی تھی جو کلکتہ سے شائع ہوتی تھی۔ انہوں نے اس میں داڑھی اور مونچھوں کا اشتہار دیکھا تو دو سیٹ منگوا لیے۔ پھر دونوں نے داڑھی مونچھیں لگا لیں اور ''بڑے'' بن گئے۔ عقل وخرد بہر حال وہیں تک تھی جہاں اسے بچپن کی عمر میں ہونا چاہیے تھا۔ علی محمد اس وقت اٹھارہ اور حسام الدین تیرہ برس کے تھے۔

ان کا ماحول تعلیمی کے بجائے وڈیرا شاہی تھا۔ جاگیر دار میلے ملاکھڑے کرتے، مرغے لڑاتے، کتے دوڑاتے اور اپنا سر بلند رکھنے کی جستجو میں ہاریوں پر ظلم اور زیادتیاں بھی کرتے۔ مگر یہ دونوں بھائی ان چیزوں سے متنفر تھے۔

ان کا سلسلۂ نسب پیر محمد راشد روضہ دھنی (بارگاہ) سے ملتا ہے۔ ان کے والد انہیں پیار سے ''ڈتل شاہ'' کہہ کر پکارتے تھے۔ انہیں پیری مریدی ملی ہوئی تھی اور وہ زمین دار بھی تھے۔

گاؤں کی روایتی زندگی اور پیری مریدی کی وجہ سے ان کی نصابی تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ ویسے بھی اس طبقے میں تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن حسام الدین اور ان کے بڑے بھائی علی محمد راشدی نے اپنی عقل وفہم کو استعمال کیا اور اپنے لیے حکمت اور علم کے راستے کا انتخاب کیا۔ جو سب سے اعلا اور ارفع راستہ ہے۔ علم کی طرف ان کی رغبت اور رجحان میں ان کے دادا کا بھی دخل تھا۔

دونوں بھائیوں کی والدہ بہت دانش ور اور سلیقہ مند تھیں۔ وہ انہیں رات کو پری اور جنوں کی روایتی کہانیاں سنانے کی بجائے نصیحت کیا کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا۔ ''میرے بچو! زمانے کی ہوا تبدیل ہورہی ہے۔ سب چیزیں بدل رہی ہیں۔ انسان اب بیل گاڑیوں کی بجائے ریل گاڑیوں میں بیٹھتا ہے اور فضا میں پرواز کرتا ہے۔ پیری اور زمین داری زیادہ عرصے تک نہیں چلے گی۔ اگر تم لوگوں کو اچھی زندگی گزارنا ہے تو علم حاصل کرو۔ ورنہ مزاروں پر بیٹھ کر قوالی کرتے رہو گے۔''

والدہ کی بات علی محمد کے دل کو لگ گئی اور انہوں نے اپنی زندگی میں علم کے چراغ جلانے کا فیصلہ کیا۔ جب کہ حسام لاتعلق رہے۔ انہیں لاڈ پیار نے بگاڑ رکھا تھا۔ ہر ایک کھیل جن میں گلی ڈنڈا اور کنچے کھیلنے سے لے کر کرکٹ تک شامل تھی ان کو بہت مرغوب تھی۔ دیہاتی لڑکوں کے ساتھ کھیلنا ان کا بہترین

مشغلہ تھا۔

☆......☆

حسام الدین راشدی 20 ستمبر 1911ء کو نصرت اسٹیشن ضلع لاڑکانہ (رتو ڈیرو تعلقہ) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم مولوی محمد سومار اور محمد الیاس سے حاصل کی۔

ان کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گئیں اور تب گئیں۔ تین دن تک دردزہ میں مبتلا رہیں۔ لوگوں کا قیاس تھا کہ بچہ پیدا ہوگا تو مردہ ہوگا۔ گاؤں میں کوئی پڑھا لکھا ڈاکٹر ہی نہیں تھا کہ اسے بلالیا جاتا۔ ان کے دادا نے اپنے دوست شیخ غلام علی کو لاڑکانہ سے بلالیا۔ وہ علم نجوم پر دسترس رکھتے تھے۔

انہوں نے خیر و عافیت پوچھی اور حالات سے آگاہ ہونے کے بعد حساب کتاب لگا کر بتایا کہ بچہ شام سے پہلے ہوجائے گا۔ زندہ ہوگا۔ بڑا نام پیدا کرے گا اور خوش نصیب ہوگا۔ خاندان کا نام روشن کرے گا۔

شام سے پہلے بچہ (حسام الدین) ہوگیا۔ زندہ تھا۔ مگر اس کی آنکھیں بند تھیں۔ انہیں نہلا دھلا کر دادا کی گود میں دے دیا گیا۔ اس کی آنکھیں کیچ سے بھری ہوئی تھیں۔ دیکھ کر آزردہ ہوئے کہنے لگے۔ ”غلام علی جھوٹے نجومی تم تو کہتے تھے کہ خاندان کا نام روشن کرے گا اور خوش نصیب ہوگا۔ یہ تو اندھا معلوم ہوتا ہے۔“

غلام علی نے انہیں گود میں لیا اور آنکھیں صاف کرنے کے بعد کہا۔ ”سائیں پیر پریشان نہ ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہی ہوگا۔ یہ خاندان کا نام روشن کرے گا اور آنکھوں کے ساتھ زندہ رہے گا۔ لوگ اسے دیکھتے رہ جائیں گے۔“

دادا نے اپنے بڑے بھائی کے نام پر اس کا نام رکھا۔ پھر اس کی آنکھوں کا علاج کرایا۔ حسام کی آنکھیں جلد ہی ٹھیک ہوگئیں۔

جب حسام الدین نے چوتھی کلاس پاس کرلی تو سکندر نامہ اپنے اساتذہ سے پڑھا۔ دونوں بھائی گھوڑے پر بیٹھ کر نصرت اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر کے پاس جاتے تھے، جو ایک انگریز تھا اور جس کا نام مردک پکتھال تھا، اس سے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ یہ سب اس لیے تھا کہ زمین داروں کے ہاں بچوں کو اسکول یا کالج بھیجنے کا رواج نہیں تھا، اس لیے استاد گھر پر تعلیم دینے آتے تھے۔ بہرحال انگریزی کا معاملہ استثنا تھا۔ بقول علی محمد کے جب انگریزی استاد کے پاس ذخیرۂ الفاظ ختم ہوگیا تو ہماری انگریزی پڑھائی بھی ختم ہوگئی۔

ان دونوں بھائیوں کی پڑھائی تھوڑے عرصے کے لیے ڈگمگاتی رہی، ان معنوں میں کہ ان کے استاد ملا مٹھل (میٹھا ملا) ان کی پڑھائی پر زیادہ توجہ نہیں دے پاتے تھے، اس لیے کہ دو بیویاں تھیں۔ حلیما اور کریما۔ حلیما میں حلم کی اور کریما میں کرم کی کمی تھی۔ دونوں ہر روز برسرپیکار رہتی تھیں۔ ملا کے گھر کو انہوں نے سُپر فائٹنگ ہاؤس بنا رکھا تھا۔ البتہ ان میں اتنی شعور و فہم اور وضع داری تھی کہ وہ براہ راست لڑا کرتی تھیں۔ یہ نہیں کہ آگ لگا کر تماشا دیکھنے کے لیے الگ کھڑی ہوجاتیں۔ ان کی لڑائی کا وقت وہی تھا جو دونوں بھائیوں کی تعلیم کا تھا۔ ادھر ان کا سبق شروع ہوا اُدھر ان کی لڑائی شروع ہوئی۔ برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں آنے لگتیں، بچے دہشت زدہ ہوکر رونے لگتے۔ اس عالم میں ملا کا سکون غارت ہوجاتا۔ وہ مکتب چھوڑ کر گھر چلا جاتا اور جب تک یہ دونوں خواتین کھانا پکانے میں مصروف نہ ہوجاتیں وہ مکتب میں نہ لوٹتا۔ دو چار طالب علم ہوتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہتے اور پھر اٹھ کر چل دیتے۔ دونوں بھائیوں نے اس طرح تعلیم حاصل کی۔

ملا مٹھل اپنی زندگی پوری کرچکا اور گور غریباں کو روانہ ہوا تو ان کی پڑھائی کی ذمے داری کے لیے ایک مولوی کو مقرر کردیا گیا۔ یہ مولوی ہاتھ چھوڑ تھا اور بچوں کی پٹائی کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ طالب علم اس کا سامنا کرنے سے ڈرتے تھے اور اپنا سبق بھول جاتے۔ اس کی بدقسمتی کہ اس کا سابقہ حسام الدین سے پڑگیا۔ اس نے ایک دن حسام الدین کو ہلکا سا تھپڑ رسید کردیا تو مگر حسام الدین نے اس کی داڑھی کے ساتھ گستاخی کرڈالی اور چند بال بھی شہید کرڈالے۔

بھائی کی ہمدردی میں علی محمد اس چٹائی کو لپیٹ کر لیٹ گیا جس پر وہ سب بیٹھا کرتے تھے۔ اس نے کچھ نازیبا کلمات بھی ادا کیے۔ استاد نے دادا سے شکایت کردی۔ دادا نے مقدمہ سنا اور فیصلہ کیا کہ ان کے دونوں پوتے ذرا حساس طبع ہیں لہٰذا مار پیٹ بالکل نہیں چلے گی۔ اگر پڑھنا چاہیں تو بہتر، اگر نہ پڑھنا چاہیں تو اللہ کی مرضی جس نے ان کی قسمت بنائی ہے۔ اس کے بعد سے مولوی صاحب کا انداز تدریس تبدیل ہوگیا اور انہوں نے ڈنڈے کے بجائے لاڈ پیار سے کام لینا شروع کردیا۔

ان کی والدہ نے اپنی طرف سے ان سے معافی مانگی اور کچھ تحفے تحائف بھی مولوی صاحب کی خدمت میں

بھیجے۔ اس طرح سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ مولوی صاحب نے کچھ ایسی حرکتیں کیں کہ پولیس ان کے پیچھے پڑ گئی۔ چنانچہ ان کو رخصت کر دیا گیا۔

جبری تعلیم کا یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا۔ دادا نے حسام الدین کے لیے ایک اور معلم کو مقرر کر دیا۔ جن کا نام مولوی محمد الیاس تھا۔ مولوی خوش الحان اور خوبرو تھا۔ مگر زیادہ دنوں تک نہ ٹک سکا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ دادا کے ہاں ایک پنجابی سکھ بھگت سنگھ رہتا تھا جو فرنیچر بناتا تھا۔ اس کا دعوا تھا کہ اس کے بنائے ہوئے فرنیچر کا مقابلہ یورپ کے فرنیچر میکر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ان کے ہاں طویل عرصے تک رہا۔ پھر اپنی تنہائی سے اکتا کر پنجاب گیا اور ایک لڑکی سے شادی کر کے واپس آ گیا۔ لڑکی عمر میں اس سے بہت چھوٹی تھی۔ وہ مسجد کے قریب ایک کوارٹر میں رہنے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد اسے شبہ ہوا کہ لڑکی مولوی میں دل چسپی لینے لگی ہے۔ وہ مولوی کو شہید کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مجبوراً حسام کے دادا نے مولوی کو اس کے گاؤں واپس بھیج دیا۔

علی محمد راشدی نے تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دی اور انگریزی پر ارتکاز کیا۔ لیکن حسام الدین ڈھنگ سے انگریزی نہ پڑھ سکے۔ جس کا انہیں بعد میں کافی ملال رہا۔ بہر حال بھائی کے جملے نے حسام الدین میں پڑھنے کا شوق پیدا کر دیا۔ علی محمد راشدی کو خاص طور پر اخبارات پڑھنے کا شوق تھا اور وہ ان کا ریکارڈ بھی رکھا کرتے تھے۔ ان کے دادا نے انڈیا کے سارے مشہور اخبارات لگا رکھے تھے جنہیں علی محمد راشدی سنبھال کر رکھا کرتے تھے۔

حسام الدین یقیناً خوش قسمت تھے کہ انہیں محبت کرنے والی والدہ ملیں۔ والدہ کی محبت اور بڑے بھائی کی زندگی کے نظم و نسق نے ان کے مزاج میں ٹھہراؤ پیدا کر دیا۔ وہ سلجھے ہوئے لوگوں سے ملاقاتیں کرنے لگے۔ انہیں اچھا کھانے اور اچھا لباس پہننے کی عادت پڑ گئی۔ چوں کہ وہ ادب سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ان کا حلقۂ احباب مختصر تھا۔

دونوں بھائی نہ صرف یہ کہ دادا کے اخبارات کا ریکارڈ رکھتے تھے بلکہ انہیں پابندی سے خبریں بھی سناتے تھے۔ ان کے دادا کا کہنا تھا۔ ''اخبار ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس سے انسان کا دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے طور پر علم سیکھنے کی سعی کرتا ہے۔ ملکی مسائل سے اسے دل چسپی ہوتی ہے۔ جب کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے اسے آگاہی ہوتی ہے۔''

اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر ایک باشعور انسان

حسام الدین کے بڑے بھائی، پیر علی محمد شاہ راشدی ایک اچھے ادیب، سیاست داں اور ڈپلومیٹ تھے۔ پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے فلپائن (1957ء سے 1961) اور چین (1961ء سے 1962) میں متعین کیے گئے۔ سندھ میں انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ کے وزیر تھے۔

وہ 5 اگست 1905ء کو بہمن ضلع لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کرنے کے بعد علی محمد شاہ راشدی نے اپنے کیرئر کا آغاز 1926ء میں سندھ محمڈن ایسوسی ایشن سے کیا۔ 1927ء میں محمد ایوب کھوڑو کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ وہ 1934ء میں سر شاہ نواز بھٹو کی پیپلز پارٹی میں بھی شامل رہے۔ وہ سندھ اتحاد پارٹی کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں انگریزی اور سندھی میں ہیں۔ یوہی ذہن (تین جلدیں)۔ جاگیر داری جو خاتمو۔ سندھ جوئنٹ وزارت۔ چین جی (ڈائری) سندھ ویز اینڈ ڈیز۔ امام انقلاب۔ اس کے علاوہ انہوں نے روزنامہ ''جنگ'' میں بھی کالم لکھے۔ ان کا کالم آخری صفحے پر جمعہ کے دن شائع ہوتا تھا۔

ان کا انتقال 14 مارچ 1987ء کو کراچی میں ہوا۔

نے جو بات کہی تھی وہ بالکل درست تھی۔

حسام الدین نے تاریخ دانی کے علاوہ صحافت کے میدان میں بھی اپنے جھنڈے گاڑنا شروع کر دیے۔ ان کے بھائی علی محمد نے اپنے گاؤں سے ایک ماہنامہ ''الراشد'' شائع کرنا شروع کر دیا۔ حسام نے جب اس میں دل چسپی ظاہر کی تو انہوں نے ماہنامے کا بیشتر کام ان کے سپرد کر دیا۔

اخبار کے اخراجات، خریداروں کی فہرستیں بنانا، ڈاک سے بھیجنے کے لیے ان کے پیکٹ بنانا اور ان پر ٹکٹیں لگانا، پھر ماہنامے کو سپرد ڈاک کرنا ان کی ذمے داری تھی۔ انہوں نے یہ ذمے داری خوش اسلوبی سے نبھائی۔

اخبار اور رسائل شائع کرنا اس زمانے میں کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ کسی مجسٹریٹ کے سامنے صرف ڈکلریشن دینا پڑتا تھا کہ میں فلاں ابن فلاں ہوں اور اس جگہ سے ایک اخبار شائع کرنا چاہتا ہوں۔ مجسٹریٹ اس کی تصدیق کر دیتا تو ڈاک

میں رعایت حاصل ہو جاتی۔

اجازت لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس لیے کہ انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہے لوگوں کو آزادی اور سہولت حاصل ہو، وہ اپنے دل کا بخار نکالتے رہیں۔ گھٹ کر باغی نہ بن جائیں اور تخریبی راستہ نہ اختیار کرلیں۔

ان کے بڑے بھائی علی محمد نے سیاست میں قدم رکھنا شروع کردیے۔ پہلے انہوں نے اپنے قبیلے کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ ان ہی دنوں ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ جن کی ابتدا ان کے ضلع لاڑکانہ سے ہوئی۔ انہوں نے خان بہادر کھوڑو کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا ساتھ دیا لیکن ہندوؤں کا حوصلہ کم ہونے کو نہیں آرہا تھا۔ دونوں بھائیوں نے سوچا جب تک سندھ ممبئی سے علیحدہ نہیں ہوجاتا، ہندوؤں کا زور کم نہ ہوگا۔

سندھ کی علیحدگی کی تحریک پہلے سے چل رہی تھی، لیکن اب انہوں نے اسے جدید طریقے سے چلانا شروع کردیا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ منظم بھی تھے۔ کھوڑو نے اس تنظیم کی صدارت سنبھال لی تو علی محمد نے ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنا شروع کردیا۔

1926ء میں حسام الدین نے ایک رسالے ”پھاگن“ کے نمائندے کے طور پر بھی کام کرنا شروع کردیا۔ پھاگن میں ملازمت ان کی ادبی حیثیت کا آغاز تھا۔ اس میں انہوں نے سندھ کی تاریخ اور اس کی شخصیات کے متعلق ایسے مضامین لکھے جن کی وجہ سے سندھ کے تمام لوگوں کی نگاہیں یکبارگی ان کی طرف اٹھ گئیں۔ چنانچہ 1929ء میں سکھر کے ادبی جریدے المنار نے انہیں اپنا مدیر مقرر کیا۔ اس دوران انہوں نے تحریک آزادی کے مشہور رہنما عبدالکریم چشتی کی بھی تحریروں اور مضامین کے ذریعے بڑی مدد کی۔ اور تحریک آزادی کے مشن کو بڑھانے میں حصہ لیا۔ اس وقت عبدالکریم چشتی اپنا رسالہ پیغام نکالتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ اس رسالے نے سندھ کے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے اور آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔

اس اثنا میں حسام الدین نے ”زمانہ“ نامی اخبار کے رپورٹر کے طور پر بھی کام کیا۔

ایوب کھوڑو ایک بڑی سیاسی شخصیت تھے۔ جب انہوں نے سکھر سے ”سندھ زمین دار“ اخبار نکالنے کا پروگرام بنایا تو ان دونوں بھائیوں کو سکھر بلالیا۔ انہوں نے اپنا اخبار بند کیا اور سکھر پہنچ گئے۔ 1930ء میں حسام الدین اس کے باقاعدہ نائب مدیر مقرر ہوئے۔ جب کہ ایوب کھوڑو اس کے ڈائرکٹر تھے۔ یہ سندھی صحافت کا ابتدائی دور تھا جب متحدہ ہندوستان کی سیاست میں سندھ صوبے کی ممبئی سے علیحدگی کی تحریک زوروں پر تھی۔ ”سندھ زمین دار“ نے رائے عامہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پہلے اس کا مدیر ایک اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ مگر ان دونوں جوانوں کا جوش وخروش دیکھ کر انہوں نے علی محمد کو اس کا مدیر مقرر کردیا۔ اس وقت علی محمد 24 برس اور حسام الدین صرف 18 برس کے تھے۔ وہ بڑے بھائی کی ماتحتی میں کام سیکھنے اور کام کرنے لگے۔ علی محمد نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ اس وقت سندھ میں صحافت اور سیاست بہت دشوار ہیں، اس لیے ہمت نہ ہار بیٹھنا۔ میرے ساتھ قدم بہ قدم چلتے رہو۔ انہوں نے کہا کہ ”انسان میں توکل، محنت، جفاکشی اور کامل لگن ہونا ضروری ہے۔“ وقت کی قدر معلوم ہونا چاہیے۔ علم کی اہمیت سے آگاہی ہو۔ لیلائے صحافت کا وصال مطلوب ہو تو مجنوں بھی بننا پڑے گا۔

اخبار کے دفتر کے قریب ہی سکھر میونسپلٹی کی جنرل لائبریری تھی۔ دونوں راشدی بھائی وہاں سے کتابیں لاتے اور اخبار کی ادارت کے بعد جو وقت بچ رہتا وہ مطالعے میں صرف کرتے۔ گویا علم ان کا اوڑھنا بچھونا بن چکا تھا۔ وہ سوتے بھی کم ہی تھے۔ کمرے میں جگہ کم ہونے کے سبب حسام الدین فرش پر چٹائی بچھا کر سوجاتے۔

علی محمد پر دُہری ذمے داری تھی۔ وہ ایڈیٹری کرتے اور ایوب کھوڑو کے سیکرٹری کی حیثیت سے بھی کام کرتے۔ انہوں نے حسام الدین کو لکھنا سکھا دیا۔ وہ اخبار کے اداریے اور پُرجوش مضامین لکھنے لگے۔ ان کی تحریر میں تندی زیادہ ہوتی تھی۔

تین سال بعد یہ واضح ہوگیا کہ سندھ، ممبئی سے علیحدہ ہورہا ہے، لیکن آزادی ملنے کے بعد کیا ہوگا؟ اس پر علی محمد اور ایوب کھوڑو کے درمیان اختلاف ہوگیا۔ اختلاف اس بات پر تھا کہ علی محمد ذرا تیز جانا چاہتے تھے جبکہ ایوب کھوڑو مصلحتاً وڈیروں اور مسلمان نوکرشاہی کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے۔ علی محمد نے اشتعال میں آکر استعفا لکھا اور وہاں سے چلے آئے۔ حسام الدین کو معلوم ہوا تو انہوں نے پوچھا۔ ”بھائی صاحب! اب کیا ہوگا؟“

”جو مرضی آقا کی وہی میری بھی ہے۔“

”مگر پھر توکل پر انحصار کرنا پڑے گا۔“ حسام الدین نے سر ہلا کر کہا۔

”ہاں، یہ تو ہے۔ تمہاری ہماری ذمے داری ختم۔ اب

اس کی ذمے داری ہے۔ جس پر ہم توکل کر رہے ہیں۔'' علی محمد نے جواب دیا۔

غالباً وہ توکل پر اس لیے زیادہ زور دے رہے تھے کہ ان کی جیب میں صرف آٹھ آنے تھے۔ اس میں وہ کہاں جاسکتے تھے؟ ارادہ تو گھر ہی جانے کا تھا مگر جاتے کس طرح سے۔ اس لیے کہ ریل کا تھرڈ کلاس کا کرایہ فی کس آٹھ آنے ہی تھا۔ وہ تانگے میں بیٹھے اور اسٹیشن پہنچ گئے۔ دو آنے مزید خرچ ہوگئے۔ اب جیب میں چھ ہی آنے رہ گئے۔

تانگہ ویٹنگ روم کے سامنے جا کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ گاؤں کا ایک دیہاتی دوڑتا ہوا ان کے نزدیک آکر پوچھنے لگا۔ ''بھیا! گاؤں چل رہے ہونا؟''

''ہاں۔'' علی محمد نے جواب دیا۔

وہ واپس پلٹا اور کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر دو ٹکٹ لے آیا اور انہیں علی محمد کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دونوں ٹکٹ سیکنڈ کلاس کے تھے۔ پھر اس دیہاتی نے ان کا تھوڑا سا سامان اٹھایا اور پلیٹ فارم کی طرف چلنے لگا۔ دونوں بھائی بڑی شان کے ساتھ جا کر ریل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ حسام الدین مسکرانے لگے۔ علی محمد نے مسکراہٹ کا سبب پوچھا تو جواب دیا۔ ''جس پر توکل کیا تھا، اس نے لاج رکھ لی بھائی جان! پہلے تھرڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ اب توکل کیا تو سیکنڈ کلاس مل گئی۔''

ان کی خستہ حالی کی وجہ یہ تھی کہ وہ سارا پیسا خرچ کر دیا کرتے تھے۔ علی محمد کو پچاس روپے جب کہ حسام الدین کو تیس روپے ملتے تھے۔ وہ اس میں فراخدلی سے گزر بسر کر رہے تھے۔ گھر والوں سے وہ کچھ نہیں مانگتے تھے۔ اور رشوت خوری کا رواج ابھی تک اخبار نویسوں تک نہیں پہنچا تھا۔ صحافت ایک مقدس مشن تھا۔ اخبار نویسوں کے بارے میں لوگ اس قدر حساس تھے اگر انہیں شبہ بھی ہو جائے کہ اخبار محض پیسا کمانے کے لیے شائع کیا جا رہا ہے تو وہ اس اخبار کو خریدنا بند کر دیتے تھے۔ بلکہ موقع مل جاتا تو اس سے بھی زیادہ کر گزرتے تھے۔ یہ ان کے نزدیک جائز تھا کہ وہ کھل کر اپنے اخبار کو سرکاری ترجمان بنا دیں۔ اور حکومت کی خوشامد کرتے رہیں، مگر یہ بات صاف ہو اور اس میں کسی قسم کا مکروفریب شامل نہ ہو۔ وہ منافقت سے متنفر تھے۔

یہ بات انہیں ناگوار گزرتی تھی کہ اخبار عوام کی ترجمانی کا دعوے دار ہو اور حکومت سے امداد حاصل کرتا رہے۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خان، حسرت موہانی، محمد علی جوہر، شیخ عبدالمجید سندھی، رامانند چیٹر جی نے صحافت کی دنیا میں اپنے جھنڈے گاڑ دیے اور انہوں نے تاریخ کی سب سے بڑی امپائر کی جڑیں برصغیر سے اکھاڑ پھینکیں۔

وہ بڑے خواب دیکھتے، بے مایہ ہوتے لیکن فرومایہ نہیں ہوتے تھے۔

اس صورت حال کے ساتھ وہ دونوں گھر پہنچ گئے، مگر اس کی منصوبہ سازی کسی نے نہیں کی تھی کہ کل کیا کریں گے۔

گرمی کا موسم تھا۔ دونوں بھائی نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھے ٹھنڈی ہوا کھا رہے تھے اور حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے دادا شیخ غلام محمد غلام جنہیں لوگ ان کے آبنوسی رنگ اور گھنگریالے بالوں کی وجہ سے ''غلام محمد شیدی'' کہتے تھے۔ سامنے ہی بیٹھے اور ان لوگوں کے بارے میں تردد کا شکار تھے کہ وہ اچھی ملازمت چھوڑ کر گاؤں کیوں آگئے اور اب کیا کریں گے۔

کچھ دن فارغ بیٹھنے کے بعد نہ جانے علی محمد راشدی کے دماغ میں کیا سمائی کہ انہوں نے حسام الدین سے کہا کہ اب ایک بار پھر وہ اپنا اخبار نکالنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم دونوں کو اس کے سوا کچھ آتا ہی نہیں ہے۔ ''اخبار اپنے گاؤں سے شائع کرنا تو بہت دشوار ہے۔ یہاں اس کی فروخت اتنی نہیں ہوگی جتنی کہ شہروں میں ہوتی ہے۔'' حسام نے کہا۔

''تم درست کہتے ہو۔'' علی محمد نے کہا۔ ''اخبار ہم سکھر سے نکالیں گے۔''

''مگر ہمارے پاس تو اتنا سرمایہ نہیں ہے۔''

''توکل۔'' علی محمد نے گہرا سانس لے کر کہا۔

وہ دونوں سکھر آگئے۔ سکھر پہنچ کر انہوں نے چار روپے ماہانہ پر نرائن داس موٹر والے کی بلڈنگ میں ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ یہ عمارت لیوکس پارک کے سامنے تھی۔ اخبار کیسا ہوگا اور اس کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا یہ انہوں نے قدرت پر چھوڑ رکھا تھا کہ وہ ان کے لیے کیا اسباب پیدا کرتی ہے۔

دکان تو کرائے پر مل گئی، لیکن اس میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور ہونا بھی نہیں چاہیے تھی، اس لیے وہ صرف ایک دکان تھی جس میں وہ پکوڑے بیچتے یا جلیبیاں بناتے یا اخبار شائع کرتے یا چارپائی بچھا کر سوتے رہتے۔

قریب ہی ایک حجام کی دکان تھی جو ان بھائیوں سے واقف تھا۔ اس نے اپنے ہاں سے ایک چارپائی اور دو کرسیاں ان کی دکان پر بھجوا دیں۔ شام تک ان کا ملازم لڑکا بھی پہنچ گیا۔ اس نے لیوکس پارک سے پانی لا کر دکان کے سامنے چھڑکا اور دونوں کرسیاں باہر بچھا دیں تاکہ دونوں مدیر بھائی

اس پر بیٹھ کر منصوبہ سازی کر سکیں۔ وہ عام سی گزرگاہ تھی، اس لیے لوگ گزرتے رہے اور ان دونوں کو دیکھتے رہے۔ چند گھنٹوں میں سکھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ راشدی برادر دوبارہ آگئے ہیں۔ وہاں ان کے مسلمان دوست بہت تھے جو سیاسی پارٹیوں کے کارکن تھے۔ کافی افراد وہاں آگئے۔ تھوڑی دیر بعد بیٹھنے کی جگہ کم پڑ گئی تو سب افراد پارک میں چلے گئے۔

سب کو تجسس تھا کہ وہ دوبارہ کیا کرنے آئے ہیں۔ پے درپے سوالات کا سلسلہ جاری تھا۔ علی محمد کا ایک ہی جواب تھا کہ اپنا اخبار شائع کریں گے۔ مگر کیسے؟ ان کا جواب تھا کہ ہمیں خود نہیں معلوم تمہیں کیا بتائیں؟

یہ سب مسئلے مسائل آنے والے کل کے تھے۔ اس وقت کا مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس کھانے کے لیے بھی رقم نہیں تھی اور وہ کسی سے مانگنا نہیں چاہتے تھے۔ علی محمد نے حسام الدین کو ''سادھو بیلہ'' بھیجا کہ وہاں سے مفت کی پوریاں اور پرشاد وغیرہ لے آئے۔ وہ ایک مندر تھا اور وہاں باقاعدہ لنگر تقسیم ہوتا تھا۔ پوریاں لذیذ ہوتی تھیں، اس لیے کہ اصلی گھی میں پکائی جاتی تھیں۔ حسام اور ملازم لڑکے نے ڈٹ کر کھایا پھر علی محمد کے لیے بھی لے آئے یوں پیٹ پوجا کا انتظام ہو گیا۔

شہر کے مالدار مسلمان اپنی شہرت اور ناموری کے لیے کوشاں رہتے تھے، لیکن پیسا خرچ کرنے کا معاملہ آتا تو پیچھے ہٹ جاتے اور تماشا دیکھتے۔ البتہ غریب لوگ جوش و خروش سے قومی کاموں میں حصہ لیتے۔ علی محمد نے اعلان کر دیا کہ لوگ اگر پیشگی چندہ بھیج دیں گے تو اخبار شائع کرنے میں آسانی رہے گی۔

دونوں بھائی اپنی دکان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دوست نے انہیں دیکھ لیا۔ وہ جیکب آباد میں رہتا تھا اور ہندوؤں کا ستایا ہوا تھا۔ تانگے سے اتر کر اس نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور حال احوال پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اخبار شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس نے کوئی تبصرہ کیا اور نہ کوئی سوال۔ بس مسکراتا رہا۔ پھر ہاتھ ملا کر دوبارہ تانگے میں بیٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے دن علی الصباح اس دوست کا منشی ان کی دکان پر آگیا اور کہنے لگا کہ وہ اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ پریس کا سامان خرید کر ہمارے حوالے کرے۔ پھر ایک اور دوست نے اپنے پریس سے سلنڈر مشین اپنے ہاں سے اکھڑوا کر ان کی دکان پر بھیج دی۔ اور ایک مستری بھی جس نے مشین سیٹ کر

دی۔ یوں پریس لگ گیا۔ پھر حسام الدین ڈکلریشن لے آئے۔ اس طرح سے مالک حقیقی نے اخبار شائع کرنے کے سارے اسباب مہیا کر دیے۔

انہوں نے اپنا اخبار ''ستارۂ سندھ'' شائع کرنا شروع کر دیا۔ حسام الدین نے اس کا بیشتر کام سنبھال لیا۔ یہ ایک دل چسپ اور معلوماتی اخبار تھا جس میں خبروں کے علاوہ دنیا بھر کی تاریخ کے علاوہ سیاسی سرگرمیوں پر مضامین شائع کیے جاتے تھے۔

اس کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعات پر چنیدہ مضامین بھی شائع کیے، مثلاً افسر شاہی (سرکاری ملازمین) جو عوام کے لیے زحمت پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ وڈیرا شاہی (زمین دار طبقہ) جس نے اپنے ظلم اور زیادتیوں سے عوام کی کمر توڑ ڈالی ہے۔ ہندو سیٹھ جو سود پر رقم دیتے ہیں اور عوام کا خون چوستے ہیں۔ ملا اور پیر جو عوام کی ذہنی پسماندگی کے ذمے دار تھے۔

دونوں بھائی حالانکہ زمین دار طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور سلسلے کے اعتبار سے پیروں میں شامل تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان فروعاتی چیزوں کے بارے میں دل کھول کر لکھا اور اپنے پڑھنے والوں کو جگا دیا۔ انہی کی وجہ سے سندھ میں بیداری کی ایک لہر اٹھی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ جب سندھ ممبئی پریزیڈنسی سے علیحدہ ہو کر اپنی اصلی شکل میں کام کرنے لگے تو عام لوگوں کو کوئی دقت نہ ہو۔

راشدی بھائیوں کی تیز و تلخ اداریوں اور مضامین کے لگاتار شائع ہونے کی وجہ سے انگریز، افسر شاہی اور وڈیرے ہندو سیٹھ اور پیروں جیسی طاقتیں ان کے خلاف ہو گئیں۔ چنانچہ انہیں خاصی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ مثلاً ان پر جھوٹے مقدمات قائم کیے گئے۔ ایک مقدمہ تو پورے تین برس تک چلتا رہا۔ ان پریشان کن حالات کے باوجود ان دونوں بھائیوں نے سچ بولنے سے گریز نہ کیا۔ اپنا اخبار جاری رکھا اور ایسی ہی تحریروں سے اعلا طبقے کی بے چینیوں میں اضافہ کرتے رہے۔

☆......☆

سکھر میں رہائش کے دوران انہیں اردو ادب سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ وہ لکھتے ہیں ''سکھر ان دنوں اگرچہ بے انتہا صاف ستھرا شہر تھا، لیکن اتنا بڑا نہیں کہ آدمی ادھر اُدھر گھوم پھر کر اپنا وقت کاٹ لے۔ کھاتے پیتے لوگ شام کو ریلوے اسٹیشن پر آجاتے تھے۔ ریل کا تماشا دیکھتے اور ریلوے ویٹنگ روم میں

سفید پٹھو والے بوڑھے بیرے جان صاحب کی بنائی ہوئی لپٹن چائے جس سے خوشبو کی مہکیں پھیل جاتی تھیں، پی کر بکسٹال سے کھڑے کھڑے اپنی پسند کے دو ایک اخبارات کا جائزہ لے کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔

میں بھی دوسروں کی طرح شام کو اسٹیشن پر پہنچ جاتا۔ جان صاحب کی چائے پیتا تو اپنی مقدر سے دور تھا۔ کون روزانہ چار آنے چائے پر صرف کرے۔ لیکن یارانے کی وجہ سے بکسٹال والا اسٹول رکھ دیتا اور میں اس پر بیٹھ کر رسائل اور اخبارات پڑھ لیا کرتا۔ اگر کبھی جیب میں پیسے ہوئے اور کسی رسالے کا خاص نمبر آ گیا تو وہ بھی خرید لیا کرتا۔

یہ دور اور اپنی یہ صورتِ حال تھی، جب دلی سے ایک رسالہ ''ساقی'' بکسٹال پر آیا۔ سرورق دیدہ زیب، چھپائی صاف ستھری کہ لاہور کے رسائل کا مقابلہ کر سکے۔ مضامین اتنے دل چسپ کہ آدمی کا دل موہ لیں۔ شاہد احمد دہلوی صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ حضرت کون تھے؟ ادبی دنیا میں ان کا پس منظر کیا تھا؟ کس ادبی اثاثے اور برتے پر اس میدان میں آئے تھے؟ یہ کچھ بھی معلوم نہیں تھا کیونکہ اچانک وارد ہوئے تھے۔ بغیر کسی اطلاع کے اور بغیر کسی اعلان کے رسالہ شائع کیا تھا۔ کافی عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ حضرت مولوی بشیر احمد دہلوی کے صاحبزادے ہیں جن کی لکھی ہوئی تین جلدوں میں ضخیم کتابیں واقعات دار الحکومت دہلی اور واقعات بیجا پور میری کرسی کی پشت والی الماری میں آج بھی خاص الخاص حیثیت سے رکھی ہوئی ہیں۔ توبۃ النصوح والے ڈپٹی نظیر احمد ان کے دادا تھے۔ شاہد احمد دہلوی اس میدان میں یوں ہی نہیں ٹپک پڑے بلکہ خاندانی لحاظ سے ایک طویل اور مؤقر علمی روایات کا پورا انبار اپنی جھولی میں بھر کر لائے تھے۔ اور خود بھی بھرپور ہو کر آئے تھے۔ اگر میں نے کوئی رسالہ دور افلاس میں مستقل طور خریدنا شروع کیا تھا تو وہ یہی رسالہ تھا۔

مہینے کے آخر میں سگرٹ کے بجائے 15 نمبر کی بیڑی پی کر آٹھ آنے بچا لیتا اور پہلی تاریخ کو جا کر یہ رسالہ خرید لیتا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب ساقی خرید لیتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے ڈھیروں دولت میرے قبضے میں آ گئی ہو۔

یہ روداد ہے میرے اور ساقی کے تعلقات کی۔ اور یہ داستان ہے ساقی کے ذریعے شاہد احمد دہلوی سے میری واقفیت کی۔ زمانہ بہت ہی اچھا تھا۔ سوائے اخبار شائع کرنے کے کوئی خاص ذمے داری نہیں تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ عشق کی

کیا آپ ایسی ملازمت کرتے ہیں جس میں آپ کا زیادہ تر وقت کرسی پر بیٹھ کر گزرتا ہے؟ اگر ہاں تو آپ کینسر جیسے جان لیوا مرض کے لیے آسان شکار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایڈنبرگ یونیورسٹی کی تحقیق میں بتایا گیا کہ درمیانی عمر کے افراد جو اپنا زیادہ وقت دفتر میں بیٹھ کر گزارتے ہیں، ان میں کینسر، ذیابیطس ٹائپ ٹو، خون کی شریانوں کے مسائل (امراض قلب یا فالج) اور جلد موت کا خطرہ جسمانی طور پر متحرک افراد کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ تحقیق کے دوران لگ بھگ پندرہ ہزار کے قریب افراد کے دن بھر کے معمولات کا جائزہ لیا گیا۔ نتائج سے معلوم ہوا کہ دن بھر میں سات گھنٹے سے زائد وقت بیٹھ کر گزارنا کینسر سمیت دیگر جان لیوا امراض کا خطرہ بڑھاتا ہے، چاہے وہ لوگ دیگر اوقات میں جسمانی طور پر زیادہ متحرک ہی کیوں نہ ہوں۔ تحقیق میں بتایا گیا کہ اوسطاً درمیانی عمر کے افراد دن بھر میں آٹھ گھنٹے تک اپنا وقت بیٹھ کر گزارتے ہیں جس کی بڑی وجہ دفتر میں سست طرز زندگی کو اختیار کرنا ہے۔ محققین کا کہنا تھا کہ دنیا بھر میں آبادی کا بڑا حصہ خطرناک حد تک سست طرز زندگی کا عادی ہو چکا ہے، دفاتر سے ہٹ کر بھی گھر میں ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھے رہنا لوگوں کا دلپسند مشغلہ بن چکا ہے جو کہ مختلف امراض کی وجہ بنتا ہے۔

مرسلہ: ابو عمر۔ ملتان

کسک اور اس کی حرارت سے دل خالی تھا تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔ یہ چیز یقین کرنے کے قابل ہے بھی نہیں۔ اس لیے انکار نہیں کرتا۔ دل میں ایک کسک لیے ہوئے تھا۔ لیکن بڑے اعتدال اور احتیاط کے ساتھ بلکہ یہ حرارت، یہ گرمی اور یہ سوز و ساز ساقی پڑھنے میں اور اس کے مضامین سے لذت حاصل کرنے میں، سچ عرض کرتا ہوں کہ میرے مدد و معاون ثابت ہوئے۔ اگر کبھی میں نے افسانے انہماک اور لذت سے پڑھے ہیں تو فقط ساقی میں اور وہ بھی محض اس دور میں۔

ساقی نے بہت سے نئے لکھنے والوں کو جنم دیا تھا۔ عظیم بیگ چغتائی اسی زمانے کی عظیم پیداوار تھے۔ ان کی بہن عصمت چغتائی آج تک اسی دور کی یاد دلاتی ہیں۔ پریم پجاری کی سچی کہانیوں نے نہ فقط عشاق کے گروہوں میں تہلکہ مچا دیا تھا بلکہ آہ و فغاں کی گونج اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہتی ہوئی، میں نے خود دیکھیں، یہ کئی برس کے بعد

معلوم ہوا کہ یہ حضرت عندلیب شادانی کی ذات صفات والا تھی جنہوں نے پریم پجاری کا روپ دھار رکھا تھا۔اور یہ سچی کہانیاں حقیقت میں ان کی اپنی سچی کہانیاں تھیں بہرحال اس وقت تو پریم پجاری ایک پُراسرار شخصیت تھی اور عشاق کے امام سمجھے جاتے تھے۔

وہیں سکھر میں آرت مل پنجابی ہمارے ہم پیشہ دوست تھے خوب صورت، جوان، صحت مند جسم اور کھلا گندمی رنگ اگرچہ کٹر آریہ سماجی تھے لیکن ان کا یارانہ ہم جیسے مسلمانوں سے رہا کرتا تھا۔ ہندو گزٹ نکالتے تھے اور اس میں مسلمانوں کو برا بھلا کہتے رہتے تھے۔ اردو کے بڑے رسیا تھے۔ سرشار اور شرر کے ناول، حجاب علی امتیاز اور ایم اسلم کے افسانے انہیں خاص طور پر پسند تھے۔ پریم پجاری سے جب آشنا ہوئے تو یکلخت ان کے دل میں عملی طور پر عشق کی آگ بھڑک اٹھی۔ یا اگر دبی ہوئی کوئی چنگاری پہلے سے تھی تو وہ اب الاؤ بن چکی تھی۔ انہی دنوں ایک ہندو خاتون ڈاکٹری کا امتحان دے کر سکھر آئی تھیں، پریم پجاری کی کہانیوں نے ہمارے اس دوست کو عاشقی پر اس حد تک اکسایا کہ اس خاتون پر والہ وشیدا ہوگئے۔ عشق چونکہ یک طرفہ تھا اس لیے ہمارے دوست آرت مل ہمیشہ سوزش اور سرگردانی میں مبتلا رہنے لگے۔ ایک تو بال بچے دار تھے اور پھر عشق، عشق بھی ہندو خاتون سے۔ اس لیے کسی ہندو کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان سے اپنا راز کہہ سکتے۔ چونکہ ہمارے لنگوٹیا یار تھے اس لیے ہمیں ہی اپنا رازدار بنایا۔ ان کے عشق میں روزانہ جو مد و جزر ہو رہا تھا وہ راتوں میں آکر ہم دونوں بھائیوں کو بتایا کرتے تھے۔ شرر کے ناول پڑھ پڑھ کر اپنے تئیں مسلمانوں کو عشق کے پیشے میں استاد اور فرہاد سمجھے ہوئے تھے۔ اس لیے فریق ثانی کو راہ راست پر لانے کے لیے مجھ سے کم، البتہ بھائی صاحب سے زیادہ مشورے لیا کرتے تھے۔ مہینے بھر اسی ریاضت میں کٹ جاتا اور جب پہلی تاریخ کو ساقی آجاتا اور اس میں پریم پجاری کی کہانی پڑھتے تو ان کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کے بے پناہ دھارے بہہ نکلتے تھے۔

آرت مل ہم دونوں بھائیوں کے جانی دوست اور لنگوٹیا یار تھے۔ مدتیں اکٹھی گزری تھیں۔ کوئی راز ایک دوسرے سے مخفی نہ تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ عشق کا الاؤ آخر تک ان کے دل میں شعلہ زن رہا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ جب پاکستان بن گیا اور وہ ہم سے رخصت ہوئے تو دونوں بھائیوں سے گلے مل کر بچوں کی طرح دھاڑیں مار کر روئے۔ ان کی یاد کے ساتھ ساقی، پریم پجاری اور وہ خاتون سب مل جل کر مجسم صورت میں سامنے آجاتے ہیں۔ مدتیں بیت گئیں۔ لیکن سچ عرض کرتا ہوں کہ جب بھی وہ یاد آجاتے ہیں تو آنکھیں نمناک ہوجاتی ہیں۔ اور بڑی دیر تک پرانے واقعات میں گم صم ہوجاتا ہوں۔

☆......☆

حسام الدین صرف صحافی اور مورخ ہی نہیں شاعر بھی تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری صرف بیاضوں میں نہیں لکھی بلکہ مشاعروں میں اپنی نظمیں بھی سنائیں۔ وہ سندھی شاعروں کے اصناف اور اسلوب کو بہت پسند کرتے تھے۔ انہیں اچھے شعرا کا کلام زبانی یاد تھا۔ غزل کے مقابلے میں وہ نظم کو پسند کرتے تھے۔ انہوں نے سندھ کے غزل گو شعرا پر اپنی مشہور کتاب ''ہوڈو تھی ہونینس'' میں کھل کر تنقید کی ہے۔

سندھ زمین دار کی اشاعت کے زمانے میں انہوں نے افسانے بھی لکھے۔ یہ بعد میں دوسرے اخبارات میں بھی شائع ہوئے اور انہوں نے قارئین سے داد پائی۔ ان کے افسانے ''انارکلی'' نے شہرت پائی۔ اپنی بیماری کے زمانے میں انہوں نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب فلپائن میں لکھی۔ وہ ان کی یادگار تصنیف ہے۔ اس کتاب میں حسام الدین نے سندھ کے سماجی، سیاسی اور علمی ادبی تاریخ کا احاطہ دل نشیں پیرائے میں کیا ہے۔ پیر پرستی اور اوہام کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں۔ یہ دور سندھ میں توہم پرستی اور قبر پرستی کا دور ہے۔ مردہ لوگوں کا زندہ لوگوں پر رعب داب قائم ہے جو سالوں سے مٹی کے نیچے دفن ہیں۔ حالانکہ ان کی قبریں ابتدا ہی سے مشکوک ہیں۔

یہ حروف کوئی اور لکھتا تو قابل گردن زدنی قرار پاتا اور اس کی تحریر مشکوک قرار پاتی لیکن یہ تحریر حسام الدین کی تھی جو خود بھی پیری سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اور یہ ان کے مشاہدے سے متعلق تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان کا تقدس پامال نہ ہو۔ عام آدمی کس طرح سے خوار ہوتا ہے اور اپنی عزت کو داؤ پر لگاتا ہے، یہ حسام الدین نہیں دیکھ سکتے تھے۔

حسام الدین الحاد کے بھی خلاف تھے، لہٰذا جب دین محمد وفائی نے اپنا رسالہ ''توحید'' شائع کرنا شروع کیا تو وہ اس میں بھی شریک رہے۔ وہ سماجی نقاد تھے اور بہتر سماجی معاشرہ قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ چنانچہ ان کا قلم سماج دشمن عناصر کے خلاف حرکت کرتا رہتا تھا۔

فارسی زبان ان کی فطرت ثانی کی طرح ان کی ذات کا

حصہ تھی۔ان کی یہ صلاحیت تاریخ و تحقیق سے گہری وابستگی کی وجہ سے دو آتشہ ہوگئی۔سندھ میں فارسی زبان دو سو برس تک دفتری زبان کی حیثیت سے رائج رہی۔سندھ کا ایران سے قبل از اسلام سے تعلق رہا ہے۔یہاں تک کہ سندھ کی سیاست اور تاریخ کے اہم واقعات ایران کی جانب سے آمدہ شخصیات کی وجہ سے نمودار ہوئے۔سندھ کی اکثر تاریخی کتب فارسی میں لکھی گئی ہیں۔پیر حسام الدین راشدی تاریخ کے محقق کی حیثیت سے جب اس طرف متوجہ ہوئے تو انہیں کئی مقامات پر تاریخ کا تسلسل ٹوٹتا محسوس ہوا۔خصوصاً سندھ کی سیاسی اور تمدنی زندگی کے حقائق درج نہیں تھے۔ان کو قلمبند کرنے میں جانبداری برتی گئی تھی۔حسام الدین نے ان ٹوٹے ہوئے سلسلوں کو ملانے سندھ اور بیرونِ سندھ کے سارے کتب خانوں کو کھنگالا۔انہوں نے پنجاب، دکن، ایران، شام، مصر، فرانس اور برطانیہ کے کتب خانوں میں جا کر برصغیر کے حالات پر تحقیق کی، نایاب نسخوں کا مطالعہ کیا، پھر ہزاروں اوراق کا مطالعہ کرنے کے بعد تاریخ کے اوراق گم گشتہ کو ایک ترتیب سے تحریر کیا۔اس ضمن میں ان کی کئی کتابیں مشہور ہیں۔

اس کارنامے کی وجہ سے پاکستان کے علاوہ بین... الاقوامی کانفرنسوں میں بھی انہیں بلایا جانے لگا۔انہوں نے افغانستان اور ایران کی متعدد کانفرنسوں میں بھی شرکت کی۔انہیں ایران کے ادب اور تاریخ سے زیادہ دل چسپی تھی۔جس کی بنا پر ایران میں شہرت اور عزت ملی۔وہ فارسی زبان میں مہارت رکھتے تھے۔شہنشاہ ایران نے ان کی علمی خدمات کے عوض ایران کا سب سے بڑا اعزاز دو بار پیش کیا جو ''نشان سپاس درجہ اوّل'' کہلاتا تھا۔پہلی بار یہ اعزاز 1962ء میں اور دوسری بار 1966ء میں دیا گیا۔

یہ اعزاز اس سے پہلے برصغیر میں پروفیسر ہادی حسن کو ملا تھا۔

تہران یونی ورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔مگر حسام الدین نے اپنے نام کے ساتھ کبھی لفظ ڈاکٹر نہیں لکھا۔انہیں ایران کی سب سے بڑی ڈگری دی گئی تھی، مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے نصابی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔

☆......☆

کراچی میں آ کر انہوں نے جمشید روڈ پر ایک حویلی میں رہنا شروع کر دیا۔جس کا نام انہوں نے بیت الضیاء رکھا۔ان کی کتابوں کا کمرا چھوٹا تھا لیکن اوپر تک کتابوں سے بھرا رہتا۔علمی ادبی کام کرنے والوں کے لیے کوئی پابندی نہیں تھی اس لیے وہ ان سے بھرا رہتا تھا۔وہ سحر خیز تھے علی الصباح اٹھ کر کام میں مصروف ہو جاتے۔چائے بسکٹ پر گزارا کرتے۔پھر 9 بجے اٹھ کر غسل کرتے اور اس کے بعد بڑی میز پر کام کرتے اس دوران بھی چائے بسکٹ چلتے رہتے۔قرض خواہوں (حسام کی اصطلاح کے مطابق ملاقاتی) کی آمد سے پیشتر وہ کافی کام نمٹا لیتے۔ایک بجے تک اپنی میز پر بیٹھتے اور لوگوں سے اپنی لائبریری میں ہی ملاقات کرتے رہتے۔ہر ایک کو خندہ پیشانی اور بے تکلفی سے خوش آمدید کہتے۔گفتگو میں علم و ادب کے علاوہ لطیفے بھی ہوتے۔انہیں انسانوں سے محبت تھی۔وہ ظاہری شان و شوکت کے لیے کام نہیں کرتے تھے۔شادی شدہ تھے مگر اولاد اب تک نہیں ہوئی تھی۔دوسری شادی نہیں کی۔البتہ انہوں نے بڑے بھائی کے دو بچوں کو گود لے لیا۔جن کے نام حسین شاہ اور حسنہ تھے۔

حسام الدین نے 1974ء میں الحمرا سوسائٹی میں ایک مکان خرید لیا۔اور اپنے پوتے (حسین شاہ راشدی) کے نام پر اس کا نام علی رضا منزل رکھ دیا۔پھر لائبریری بھی رفتہ رفتہ وہاں منتقل ہوگئی۔لیکن صبح کے وقت وہ ایک دو گھنٹے کے لیے بیت الضیا میں آ کر بیٹھ جاتے۔اس لیے کہ الحمرا سوسائٹی وہاں سے دور تھی اور بس کا کوئی روٹ بھی نہیں تھا۔ملاقاتی پہلے تو بیت الضیا میں آتے رہتے مگر بعد میں انہوں نے علی رضا منزل میں آنا جانا شروع کر دیا۔بہر حال وہاں ملاقاتیوں کا اتنا جمگھٹا نہیں تھا۔وہ بڑی بڑی دعوتیں کرتے اور اس کے لیے علی رضا منزل بہترین تھی۔پھر شور و غل سے بھی نجات مل گئی۔وہ خود آم کھانے کے شوقین تھے اس لیے ملاقاتیوں کو دعوتوں میں آم ضرور پیش کرتے تھے۔

وہ سچے، کھرے، با اصول اور جری انسان تھے۔چاہے نجی محفل ہو یا دوستوں میں بیٹھے ہوں، وہی کہتے تھے جو ان کے دل میں ہوتا تھا۔مثال کے طور پر یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ میر حسن کو امیر خسرو سے بڑا شاعر تسلیم کرتے تھے۔اس لیے صرف طرفداران خسرو کو خوش کرنے یا تالیف قلوب کرنے کے لیے وہ خسرو کی تعریف کرنے پر آمادہ نہ تھے۔وہ وقت کی لہروں کے ساتھ بہنا پسند نہیں کرتے تھے اور نہ حکام اور ارباب حل و عقد کی قربت انہیں پسند تھی۔

وہ منظم انسان تھے۔بڑے پروفیسروں کی طرح بھولتے نہیں تھے۔دنیا بھر کے اسکالروں سے خط و کتابت رہتی تھی، مگر وہ فائلوں کو اس طرح سے مین ٹین کرتے کہ منٹوں

میں مطلوبہ خط فائل سے نکال لیتے۔ دوسروں سے کتابیں لیتے تو انہیں علیحدہ رکھتے، تاکہ جب بھی وہ شخص اپنی کتاب مانگے تو فوراً ہی دے سکیں۔ اگر پوچھا جاتا کہ لندن میں فلاں پروفیسر کا پتا چاہیے، یالاہور میں مقیم فلاں ادیب کا فون نمبر درکار ہے تو حسام الدین گھر پر ہوں یا باہر اپنی ڈائری نکال کر منٹوں میں بتا دیتے۔ اسی تنظیم کی بنا پر وہ بہت سی علمی انجمنوں اور سوسائٹیوں کے نگراں اور رہنما بن گئے۔

شعبہ آثار قدیمہ و کتب خانہ جات اور دانش گاہوں اور دیگر متعلقہ اداروں کو کام کی مفید سمتیں فراہم کیں۔ آثار قدیمہ کی نہ صرف یہ کہ نشان دہی کی بلکہ خود دشوار گزار کھدائیوں میں شریک رہے۔

حسام الدین بہت متواضع اور خلیق تھا۔ ان کے گھر میں داخل ہونے کے بعد گرمجوشی اور خلوص کا احساس ہوتا تھا۔ ان کا گھر سندھی تہذیب کا اعلا نمونہ تھا۔ علی محمد اور حسام الدین کی بیگمات اور ان کے بچے آپس میں اتنے گھل مل گئے تھے کہ یہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کون کس کا بچہ ہے۔

ایک وقت آیا کہ حسین شاہ اور حسنہ کی شادیاں ہوگئیں۔ گھر میں گنجائش کم تھی اور مالک مکان نے پریشان کرنا شروع کردیا تو انہوں نے اپنی عظیم الشان لائبریری اسلام آباد روانہ کردی اور خود الحمرا سوسائٹی میں رہنے لگے۔ اسی اثنا میں ان کی بیگم بیمار ہوگئیں اور انہوں نے نئی جگہ پر منتقل ہونے سے انکار کردیا۔ حسام الدین کو گلے کا سرطان ہوگیا اور وہ روس روانہ ہوگئے۔ ابن انشا بھی اسی مرض میں مبتلا ہوئے تھے۔ انہوں نے تو ہمت ہار دی تھی، لیکن حسام الدین نے تو کمال کردیا اور پہلے سے زیادہ انہماک سے تصنیف و تالیف شروع کردی۔ 1979ء میں ان کی بیگم کا انتقال ہوگیا تب حسام الدین کا آپریشن ہوا۔

☆......☆

ان کی مشہور کتاب ''گالہیوں گوٹھ وطن جوں'' (باتیں میرے وطن کی) 1980 میں شائع ہوئی۔ جس میں 43 مقالے شامل ہیں جو سندھ کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اور سندھی ادب اور تاریخ پر مستند مواد ہیں۔ یہ مقالے پیر حسام الدین شاہ راشدی کی پچاس سالہ تحقیق اور جستجو کا ایک شاندار ریکارڈ ہے۔ حسام الدین نے چین جاکر بھی تحقیق۔

وہ صرف فارسی اور سندھی کے ادیب نہیں تھے بلکہ انہوں نے اردو میں تحقیقی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ 1961ء میں انہیں ایوب خان نے ستارہ امتیاز دیا، لیکن انہوں نے قبول نہ کیا۔ حسام الدین بہت سی علمی اور ثقافتی انجمنوں کے بانی اور ممبر بھی رہے۔ وہ سندھی ادبی بورڈ کے کافی عرصے تک ممبر رہے۔ انجمن ترقی اردو کے تا حیات ممبر تھے۔ لیاقت میموریل لائبریری اور نیشنل میوزیم کی ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر رہے۔ کراچی یونی ورسٹی کی اکیڈمک کاؤنسل کے 1958 سے ممبر رہے اور وہاں کی انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشن اسٹڈیز کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھے۔

وہ 1962ء میں سندھ یونی ورسٹی کے سینیٹ اور سینڈیکیٹ کے ممبر رہے۔ اس کے علاوہ 1964ء میں سندھی اکیڈمی کو انسٹی ٹیوٹ آف سندھ لاجی میں تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان کے نام کا ایک گوشہ وہاں قائم کیا گیا۔ ان کے نام سے ایک آڈیٹوریم بھی منسوب کیا گیا۔

انہوں نے 40 کے قریب سندھی، فارسی اور اردو میں سوانحی، تاریخی اور ادبی کتابیں لکھیں۔

یہ 1959ء کی بات ہے کہ انہیں دل کا دورہ پڑا۔ پھر اس کے بعد ان کی طبیعت میں اضمحلال پیدا ہوگیا۔ اس کے باوجود وہ علمی اور ادبی کام کرتے رہے۔ ان کی تحقیق جاری رہی۔ پھر انہیں سرطان ہوگیا۔ وہ 74 برس کی عمر میں یکم اپریل 1982ء میں انتقال کرگئے اور انہیں مکلی ٹھٹہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

وہ آج ہم میں نہیں ہیں لیکن وہ اپنی تصنیفات میں زندہ ہیں اور رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔ ان کی علم و دانش ہمیں نت نئی راہیں دکھانے کے لیے موجود ہے۔

ان کی تصنیفات و تالیفات ''مثنوی چنیر نامہ۔ مقالات شعرا۔ مثنوی مظہر الاسرار۔ قصائد و مثنویات۔ مثنویات ہشت بہشت۔ تاریخ مظہر شاہجہانی۔ تاریخ ترخان نامہ۔ تذکرہ حدیقہ الاولیا۔ تذکرہ شعرا کشمیر (تین جلدوں میں) حالات فیضی۔ محمد صادق مینا۔ تذکرہ روضتہ اسلاطین۔ دیوان بیرم خان۔ تحفتہ الکرام۔ مثنوی مہر و ماہ۔ تذکرہ سردستان۔ مولانا محب علی سندھی۔ ہفت مقالہ۔ دود چراغ۔ مرزا غازی عمر خان اور اس کی بزم۔ اسلامی کتب خانہ۔ سندھی ادب۔ رسالہ مہران۔ تذکرہ امیر خان۔ مکلی نامہ۔ مک بھینا رابل۔ مرزا عیسٰی خان ترخان۔ سعدی علی رئیس۔ تذکرہ مشاہیر سندھ مولوی وفائی۔ گوٹھ وفن جون گالے پھرن۔

شکیل ادریس

اردو ادب کو تنقید کے ذریعے باثروت بنانے، سنوارنے میں اہم کردار ادا کرنے والے کی زندگی غموں کے کوہِ گراں تلے دبی سسکتی سی تھی لیکن یہ کوہِ گراں معاشی نہیں فکری تھی۔ وہ گردشِ حالاتِ سے ہمہ وقت برسرِ پیکار رہا۔ ذات کی پنہائیوں میں اسیر ہو کر بھی اس نے اپنا مقام پیدا کیا۔

ایک بڑے تنقید نگار کی حالات زیست

ان کا نام جمیل تھا اور انہیں بچپن ہی سے اسکول میں پڑھنے کا شوق تھا۔ جب ان کے والد انہیں چھٹی جماعت میں داخل کرانے کے لیے اسکول لے گئے تو ہیڈ ماسٹر نے ''چھوٹا'' دیکھ کر داخل نہیں کیا۔ مگر جب داخلے کا امتحان ہونے والا تھا تو والد صاحب انہیں اچکن اور علی گڑھ پاجامہ اور ترکی ٹوپی پہنا کر اسکول لے گئے۔ وہ اپنی عمر سے ذرا ''بڑے'' دکھائی دینے لگے۔ امتحان دیا اور چھبیس بچوں میں اوّل آئے، لہٰذا گورنمنٹ اسکول میں داخلہ مل گیا۔

اچھے بچوں کی طرح وہ پابندی سے اسکول جاتے تھے۔اسکول کے شرارتی بچے انہیں دیکھ کر کترا کر نکل جاتے تھے۔وہ سلیقہ منداور بااصول تھے۔اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ کپڑوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔اس لیے جو کپڑے اسکول پہن کر جاتے تھے وہ واپسی پر بالکل صاف ہوتے، کہیں سے بھی میلے نظر نہ آتے۔وہ پہلے یونی فارم اتارتے اوراس کے بعد کھانا کھائے بغیر اسکول کا کام کرنے بیٹھ جاتے۔اسکول کا کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔ایک باران کی ٹانگ میں چوٹ لگ گئی تو والد صاحب نے کہا کہ کچھ دن کے لیے چھٹی کر لو لیکن جمیل نہ مانے۔چنانچہ ان کے والد نے ایک ملازم سے کہا کہ جمیل کو کاندھے پر اٹھا کر اسکول پہنچائے۔وہ ایک ہفتے تک یہ ورزش کرتا رہا۔

جب انہوں نے آٹھویں جماعت پاس کرلی اور نویں میں جانے لگے تو والد صاحب نے سائنس دلوادی جب کہ جمیل کو سائنس سے کوئی شغف نہیں تھا لیکن والد کا حکم کیسے ٹالتے؟ چنانچہ جوں توں کر کے میٹرک پاس کرلیا اور کالج کا مرحلہ آگیا۔والد صاحب نے کہا کہ وہ سائنس لیں اور سائنس داں بنیں۔ناچار انہوں نے سائنس لے لی لیکن جلد ہی اس سے طبیعت اچاٹ ہوگئی۔چنانچہ انہوں نے بغیر کسی کو اطلاع دیے آرٹس میں داخلہ لے لیا۔دو برس تک انہوں نے اسے راز رکھا،لیکن جب کالج کا رزلٹ آیا تو والد صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جس بیٹے کو وہ سائنس داں بنانا چاہتے تھے اس احمق نے آرٹس میں ڈبکیاں کھانے کا انتظام کرلیا ہے۔وہ ناراض ہوئے لیکن کر بھی کیا سکتے تھے۔جمیل اردو اور انگریزی کے رسائل کا بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کرتا۔سماجی علوم انہوں نے اس وقت پڑھنا شروع کیا جب انہیں ادب اور زندگی کے گہرے رشتے کا احساس ہوا۔

وہ بچپن ہی سے ادیب بننا چاہتے تھے۔لہٰذا جب گھر والے سوجاتے تو وہ غسل خانے میں جاتے اور کاپی کے اوراق پھاڑ کر اسے کتاب کی شکل دیتے پھر اس پر نصابی کتب سے ایک دو مضامین نقل کرتے اور اس کے ٹائٹل پر جلی حروف میں اپنا نام لکھ دیتے۔ان کے والد کو جب یہ پتا چلا تو وہ بہت خوش ہوئے کہ بیٹا کھیل کھیل میں کئی کتابوں کا مرتب بن گیا ہے۔

بچپن میں انہوں نے اسکول لائبریری سے بہت استفادہ کیا۔لائبریرین ولی محمد شعلہ تھے۔وہ بچوں کے رجحان کو مدنظر رکھتے تھے اور بچے جس کہانی یا رسالے کی فرمائش کرتے وہ منگوا کر انہیں دیتے۔جمیل نے اپنے بچپن میں پھول، تعلیم وتربیت اور غنچہ کا مطالعہ کیا۔انہیں روزانہ جو جیب خرچ ملتا تھا۔اس کو بچا کر نزدیکی ایک پیسہ لائبریری سے کہانیوں کی کتابیں منگوالیتے۔

ان کی ادبی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں ان کی والدہ کا بڑا ہاتھ تھا۔وہ خود بھی شاعرہ تھیں اور انہیں مطالعے کا شوق تھا۔ان کے گھر میں محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' علامہ شبلی نعمانی کی ''سیرت النبی'' ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ابن الوقت، توبۃ النصوح اور مراۃ العروس موجود ہوا کرتے تھے۔جمیل کا کہنا ہے کہ ہر چند کہ یہ کتابیں ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر انہوں نے سب کو پڑھ ڈالا۔دلچسپ تو تھیں لیکن سر پر سے گزر جاتی تھیں۔

وہ جب باشعور ہوئے تو انہوں نے ساقی، نگار اور ادبی دنیا جیسے رسائل لگوا لیے۔یہ اس وقت کا تذکرہ ہے جب وہ گریجویشن کر رہے تھے۔انہوں نے بتایا کہ انہیں محمد حسن عسکری نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

جمیل کو کالج کے زمانے میں بھی لائق اور جید اساتذہ کی سرپرستی حاصل رہی۔چنانچہ انہوں نے انگریزی میں بھی شاعری کی۔ان کا شمار ذہین طلبہ میں ہونے لگا۔اچھے اساتذہ کے شوق دلانے پر ان کا مطالعہ وسیع ہوگیا۔نصابی کتب کے علاوہ بھی انہوں نے بے شمار ادبی کتاب کا مطالعہ کیا۔اسی زمانے میں انہیں انگریزی میں شاعری کا سوق ہوا۔ دوچار نظمیں لکھی تھیں کہ اساتذہ نے انہیں منع کردیا کہ وہ انگریزی میں شاعری نہ کریں۔

انہوں نے بچپن ہی سے کہانیاں لکھنا شروع کردی تھیں۔ان کی پہلی تصنیف ''سکندر اور ڈاکو'' تھی جسے ان کے استاد نے پسند کیا اور وہ اسکول کے سالانہ جشن میں ڈرامے کے طور پر پیش کی گئی۔ان کی پہلی کہانی ''حیات'' دہلی میں شائع ہوئی۔اس زمانے میں وہ اسکول کے طالب علم تھے اور ان کا نام محمد جمیل خان ہوا کرتا تھا۔ان کی کچھ تحریریں ''عصمت'' میں بھی شائع ہوئیں۔ان کا پہلا مضمون ''بابائے صحافت میر جالب دہلوی'' تھا۔پہلی کتاب ''جانورستان'' تھی جو جارج آرویل کے ناول کا ترجمہ تھا۔

1944ء کا واقعہ ہے کہ ایک دن شام کے وقت جمیل کو ان کے والد کے ایک دوست گھر لے گئے اور ان کے بھائی انوار عالم صدیقی سے ملوایا۔انوار عالم کو یہ دبلا پتلا اور گورا چٹا سا لڑکا پسند آیا۔جس کا رنگ گورا تھا اور آنکھیں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور طبیعت میں

چلبلا پن تھا۔ باتوں میں اعتماد۔ بڑے پائنچوں کا پاجامہ اور اوپر سے شیروانی، جس کے سارے بٹن لگے ہوئے تھے۔ جمیل صاحب کے والد کے دوست نے جمیل کا تعارف کرایا۔ ''یہ جمیل احمد خان ہیں۔ میرٹھ کالج میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتے ہیں۔'' انوار نے بھی ان سے ہاتھ ملالیا۔ وہ دونوں تقریباً ہم عمر تھے، لہٰذا انہوں نے ایک دوسرے سے انسیت محسوس کی۔

انوار، فیض عام انٹر کالج میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتے تھے۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد انہوں نے بھی میرٹھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ ان کے درمیان دوستی استوار ہوچکی تھی۔ اس لیے وہ ان کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ دونوں اتفاق سے ایک ہی سیکشن میں تھے۔ کلاس میں ساتھ بیٹھتے، کالج میں ایک ساتھ رہتے، لائبریری ایک ساتھ جاتے۔ کتابیں پڑھتے پھر ان پر بحث کرتے۔ اردو ادب کی انہیں ایسی چاٹ لگی کہ سارے بڑے مصنفوں کو انہوں نے تقریباً پڑھ ڈالا۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ جو اردو افسانے کی آبرو ہیں۔

سلیم احمد ان دنوں مسلم ہوسٹل میں رہتے تھے، جہاں طالب علموں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ لوگ اپنی تخلیقات لکھ کر لاتے اور سناتے۔ جمیل ان دنوں ہر روز ایک افسانہ لکھ لیتے تھے۔ پھر انہوں نے تنقید کی طرف توجہ دینا شروع کردی۔ کالج میگزین میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا۔ اس سے ان کے رجحان کا پتا چلا ہے کہ وہ تنقید کی طرف مائل تھے۔

زندگی کے اس حصے پر غور کیا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے پڑھنے کے ذوق و شوق کا ایک ایسا سیلاب تھا جو زندگی کی ہر سرگرمی کو اپنے ساتھ بہائے لیے جارہا تھا۔ وہ شرارتیں کرتے اور سیر و تفریح بھی کرتے، لیکن زندگی کا محور صرف اور صرف ادب تھا۔ جمیل خان تو جیسے کتابوں کے کیڑا تھے۔ لائبریری سے جو کتاب لیتے وہ دوسرے دن واپس کر دیتے۔ وہ کلاس میں نہایت شریر اور منہ پھٹ تھے۔ بعض نوجوان پروفیسروں سے ان کی نہیں بنتی تھی۔ پروفیسروں کو شکایت تھی کہ وہ لیکچر کے دوران بے تکے سوالات کرکے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ جمیل کا رویہ چند پروفیسروں کے ساتھ اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا۔ البتہ حسن عسکری کو بہت پسند کرتے تھے اور جب ان کا لیکچر شروع ہوتا تو جمیل لڑکوں کو خاموش رہنے کی تلقین کرتے تاکہ لیکچر سب کی سمجھ میں آجائے۔

جمیل ان دنوں میرٹھ چھاؤنی میں اپنی ددھیال میں رہتے تھے۔ جمیل کے دادا کے مراسم ایک سنیما کے مالک سے بھی تھے جو پڑوس میں رہتا تھا۔ وہ جاکر اس سے کہتے کہ دادا نے فلم کے دو پاس منگوائے ہیں۔ وہ پاس دے دیتا تو دونوں فلم دیکھ لیتے۔ ایک روز دادا نے انہیں بلایا اور پوچھا کہ کیا وہ ان کا نام لے کر مالک سے پاس مانگتے ہیں؟ وہ سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔ دادا نے کہا۔ ''یہ طریقہ غلط ہے۔ جب فلم دیکھنا ہو تو مجھ سے ایک رقعہ لکھوا کر لے جاؤ۔ پھر فلم دیکھ لو۔ فلم دیکھنے کو میں منع نہیں کرتا۔''

جمیل بہت شرارتی تھے، بات سے بات نکالنا دوسروں کو لاجواب کرنا انہیں خوب آتا تھا۔ ایک دن وہ کالج نہیں آئے۔ انوار نے دوسرے دن اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے پچھل پائی اور سر کٹے کی داستان سنائی۔ نہایت ہولناک داستان تھی۔ کسی چھوٹے بچے کو سنادی جاتی تو وہ چیخیں مارنے لگتا مگر انوار کو یقین ہی نہ آیا۔ جمیل قسمیں کھانے لگے اور سر پر لگا ہوا زخم دکھایا۔ انوار نے کہا۔ ''یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کسی لڑکی سے اظہار عشق کیا تھا تو اس نے تمہارا سر نوچ لیا۔ سچ بتاؤ، کیسی لڑکی تھی؟''

جمیل نے قسمیں کھا کر کہا۔ ''واقعہ بالکل سچ ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں تو ہم پرست نہیں ہوں اور نہ تم نے میری زبان سے ایسی کہانیاں پہلے کبھی سنی ہوں گی لیکن یہ واقعہ سچ ہے۔ وہ حسین و جمیل تھی مگر اس کے پاؤں پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ اس نے مجھ سے کافی باتیں کیں لیکن میں نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ ٹھیک کیا نا؟''

انوار کی اور ان کی دوستی کافی دنوں تک قائم رہی وہ جب بھی اس واقعے کے بارے میں پوچھتے جمیل یہی کہتے کہ وہ واقعہ سچ تھا۔

1947ء میں جب انہوں نے میرٹھ کالج سے بی اے کرلیا اور ایم اے کے لیے داخلہ لیا۔ تقسیم کے فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ جس طرف نظر جاتی، لاشیں اور دھواں دکھائی دیتا۔ ایک دن جمیل بغیر بتائے غائب ہوگئے۔ انوار نے گھر جاکر ان کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ اپنے والد کے پاس سہارن پور چلے گئے ہیں اور پھر پاکستان۔ جب ان کا خط پاکستان سے آیا تو اس کی تصدیق ہوگئی۔

دراصل قائداعظم کی تقریریں سن کر جمیل پر پاکستان جانے کا جنون سوار ہوگیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر والوں کو بتائے بغیر ریل گاڑی میں سوار ہوکر پاکستان آگئے۔ (یہ پاکستان بننے کے تیسرے دن کی بات ہے) تین چار مہینے

جیکب لائن کے ایک برآمدے میں پڑے رہے۔ اُدھر گھر والے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہے۔ پھر ایک دن ریڈیو سے اعلان ہوا تو گھر والوں تک خبر پہنچی اور انہیں سکون آیا۔

ان کے بعد ان کے بھائی بھی پاکستان آگئے۔ وہ اپنے ساتھ ڈیڑھ لاکھ روپے لے کر آئے تھے۔ جمیل نے اس رقم سے پیر الٰہی بخش کالونی میں مکان خرید لیا۔ پھر ایم اے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ 1949ء میں امروز شائع ہونے لگا تو انہوں نے اس میں ملازمت کرلی۔ لیکن یہ ملازمت طویل ثابت نہ ہوئی۔ صرف ایک ماہ بعد انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور تنخواہ بھی نہیں لی۔ تفصیل کچھ یوں تھی کہ ان دنوں مولانا چراغ حسن حسرت اس کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ ان سے پالیسی میٹر پر بحث ہونے لگی۔ سارا اسٹاف جمع ہوگیا لیکن باہر کھڑا ہوکر تماشا دیکھتا رہا، کوئی اندر نہ آیا اور نہ کسی نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ مگر ایک ہفتہ بعد پھر دونوں میں بحث ہوگئی۔ جمیل کا کہنا تھا کہ آزادیٔ اظہار پر پابندی عائد کرنے سے ان کے لیے کام کرنا دشوار ہے۔ میں یہ لکھوں اور وہ نہ لکھوں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ ان کی ناسمجھی تھی مگر نوجوانی میں خون گرم ہوتا ہے اور برداشت کم ہوتی ہے۔

خاندان والے ابھی انڈیا میں تھے اور وہ چھڑے چھانٹ یہاں رہ رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ کھانا باہر کھانے کی بجائے گھر پر ہی پکایا جائے۔ سب نے ذمے داریاں تقسیم کرلیں۔ سب اپنا کام ختم کر کے بیٹھ گئے۔ اب جمیل کا انتظار ہو رہا ہے۔ آوازیں دی جا رہی ہیں۔ ”آؤ بھئی۔“ وہ کمرے میں پڑے کتاب پڑھنے میں مصروف تھے۔ جب سب اکتا جاتے تو خود ہی کر لیا کرتے۔ اس طرح سے کام میں اکتاہٹ پیدا ہوگئی کہ جمیل تو اپنے حصے کا کام نہیں کرتے سب کچھ ہمیں ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس سے یہ مطلب نکالا گیا کہ انہیں امور خانہ داری سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔

وہ 1950ء سے لے کر 1952ء تک بہادر یار جنگ اسکول میں ماسٹر اور پھر ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔ مشہور ڈراما نگار خواجہ معین الدین چشتی بھی اسی اسکول میں ماسٹر تھے۔ انہوں نے لال قلعہ سے لالو کھیت تک، مرزا غالب بندر روڈ پر اور تعلیم بالغان جیسے دل چسپ اور ناقابل فراموش ڈرامے لکھے تھے۔

مختصر سے عرصے میں جمیل نے اسکول کو بہت ترقی دی۔ اس کا شمار بڑے اسکولوں میں ہونے لگا۔ اسی زمانے میں جمیل نے ولی کا یادگار مشاعرہ خود لکھا اور اسٹیج کیا۔ اس کو اسٹیج کرنے کے لیے خود ہی ایڈیٹ کیا۔ اس کے لیے ابتدائی ڈاکومنٹری بھی لکھی۔ جس میں ڈرامے کا تعارف تھا۔ یہ ڈراما اتنا مقبول ہوا کہ اس کے دس شو ہوئے۔

اعجاز الحق قدسی بہت سی دینی کتابوں کے مصنف تھے اور لوگ ان کی تحریروں کو پسند کرتے تھے۔ انہیں اپنے بیٹے کا داخلہ بہادر یار جنگ میں کرانا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں گئے۔ کچھ اور لوگ بھی اپنے بیٹوں کو داخلہ دلانے کے لیے بیٹھے تھے۔ چنانچہ انہیں اندر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ ایسا نہ ہو کہ بھگا دیے جائیں۔ ایک چپراسی کو ان پر رحم آگیا اور اس نے کہا۔ ”میاں اسی طرح سے بیٹھے رہو گے تو شام ہوجائے گی۔ لائیے مجھے اپنے نام کی پرچی لکھ دیجیے میں اسے صاحب تک پہنچا دیتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کا نمبر جلد آجائے۔“ قدسی صاحب نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ تھوڑی دیر بعد بلا لیا گیا۔

انہوں نے دیکھا کہ ہیڈ ماسٹر کی کرسی پر ایک شگفتہ سی شخصیت براجمان ہے۔ جس کے منہ میں پان دبا ہوا ہے۔ اور چہرے پر مسکراہٹ ہے۔ دو تین لڑکے سامنے کھڑے تھے۔ وہ انہیں چھوڑ کر ان سے مخاطب ہوگئے اور بولے۔ ”فرمایئے؟“

قدسی نے نہایت مختصر لفظوں میں اپنا دکھڑا بیان کیا۔ ان کی روداد سن کر اپنی میز کی دراز سے داخلے کا فارم نکالا اور ان کی طرف بڑھا کر بولے۔ ”داخلے کی طرف سے آپ مطمئن ہوجایئے۔ اس فارم کو بھر کر مجھے بھیج دیجیے۔ کل اس بچے کا داخلہ ہوجائے گا۔“

انہوں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے نکل آئے۔

اتفاق سے اسی چپراسی سے ملاقات پھر ہوگئی۔ کہنے لگا۔ ”حضرت! آپ کا کام بن گیا؟“

قدسی صاحب نے کہا۔ ”میاں تمہاری مہربانی سے کام بن گیا۔ تمہارے ہیڈ ماسٹر بہت اچھے انسان ہیں۔“

”ان کا کیا کہنا حضرت! جب سے آئے ہیں اسکول کا نقشہ ہی بدل ڈالا ہے۔ ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ یہاں کی تعلیم اچھی ہوجائے۔ ہر ایک سے اس موضوع پر بات کرتے ہیں، غصہ کرنا تو انہیں آتا ہی نہیں۔“ وہ بہت دیر تک اپنے ہیڈ ماسٹر کے گن گاتا رہا۔

اس کی باتیں سن کر قدسی نے کہا۔ ”جمیل خان عظیم انسان ہیں اور ان کے اخلاق نے میرا دل موہ لیا ہے۔“

ان کے لڑکے کا داخلہ اسکول میں ہوگیا اور وہ بتدریج

جمیل خان سے قریب ہوتے چلے گئے۔ پھر انہوں نے اپنی متعدد دینی کتابوں پر ان سے دیباچے بھی لکھوائے۔

☆......☆

کچھ عرصے بعد "پیام مشرق" نامی ہفت روزہ شائع ہونے لگا۔ جمیل نے ہیڈ ماسٹری چھوڑ دی اور پیام مشرق میں کام کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ صحافی بن جائیں تو زیادہ اچھا رہے گا۔ پڑھنے پڑھانے کی طرف تو رجحان تھا، لیکن ابھی ان کی سوچوں کو کوئی صحیح سمت نہیں ملی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے مالک نے سارا پرچا ان کے سر پر لاد دیا اور سارا کام کرانے لگا۔ اس میں انہوں نے خود بھی لکھا اور شاہد احمد دہلوی سے بھی مضامین لکھوائے۔ ایک روز شاہد صاحب نے پوچھا کہ انہیں کیا ملتا ہے؟

جمیل کہنے لگے "کچھ کہا نہیں۔ وہ اللہ کا بندہ بھی سانپ سونگھ کر بیٹھا ہوا ہے۔ اسے خود کچھ سوچنا چاہیے۔ میں کیا کہوں؟ یہاں ان کی رواداری اور مروت آڑے آ رہی ہے۔"

یہ معاملہ یوں ہی چلتا رہا پھر ایک روز وہ کاتب سے کہہ کر چلے آئے کہ کل سے نہیں آؤں گا۔ دوسرے دن اس کا مالک آ گیا اور اس نے جمیل کے پاؤں پکڑ لیے۔ جمیل پھر جانے لگے۔ مگر پھر بددل سے ہو گئے۔ کہنے لگے خود کماتا ہے لیکن طباعت اور کتابت پر کچھ خرچ نہیں کرتا۔ نتیجے کے طور پر اس بار جو ملازمت چھوڑی تو اس کے لاکھ کہنے پر بھی جوائنگ نہ دی۔ گویا کہ صحافت سے انہوں نے منہ موڑ لیا اور پوری توجہ ادب کی طرف مبذول کر لی۔

وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ادبی محفلوں میں جاتے تھے۔ مگر وہاں اختلافات ہونے لگتے۔ اس لیے کہ جمیل میں الجھنے کی عادت بہت تھی۔ وہ غلط بات نہیں سن پاتے تھے۔ ہر چند کہ ان کا دل صاف تھا لیکن رویے کے بارے میں بے وجہ بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی تھیں۔

☆......☆

شاہد احمد دہلوی مدیر "ساقی" نے ان کا خاکہ اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے۔ اس زمانے میں جمیل اکیس برس کے تھے۔ "کراچی میں ایک دن شام کے وقت ایک بڑے دل نشیں سے نوجوان آ کھڑے ہوئے اور نہایت ادب سے انہوں نے سلام کیا۔ میں نے انہیں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر پہ سفید کشتی نما ٹوپی، گول چہرہ، یاسمینی رنگ کی کشادہ پیشانی، غلافی آنکھیں، کتابی سی ناک، پتلے پتلے سے گلابی ہونٹ، ٹھوڑی میں ہلکا سا چاہ زنخداں، داڑھی مونچھ صاف، سفید سلک کی شیروانی، اکہرا پاجامہ اور پاؤں میں سفید سانبھر کی جوتی۔

کچھ دیر اس نوجوان سے گفتگو کرنے کے بعد اندازہ ہو گیا کہ یہ طرح دار نوجوان آج کل کے نوجوانوں کی طرح کھوکھلا نہیں ہے اور اس کے ظاہر کی طرح اس کا باطن بھی اجلا ہے۔ شرافت نسب، شرافت نفس کی ذمے دار تھی۔ ان کی شخصیت میں کھرائیت اور ان کی باتوں میں موہنی ہے۔ چھل فریب، مکاری اور چالاکی ان میں نہیں ہے۔ باتیں بہت بھولی بھولی سی کرتے ہیں۔"

جوش صاحب نے ان کے بارے میں ایک خط میں لکھا ہے۔ "جمیل صاحب جالبی، چشم بدور، رنگیلے جوان اور طباع انسان ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور ان کے لہجے میں شرافت کی گمک پائی جاتی ہے۔ قدرت نے انہیں سخن فہمی اور بذلہ سنجی کا جوہر بھی عطا کیا ہے اور برمحل صحیح بات کہنے کی صلاحیت بھی عطا کی ہے۔ ان کی شخصیت میں جاذبیت اور ان کی عقل میں تابانی کا امتزاج یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ

خدا کے فضل سے یوسف جمال کہلائے
اب اور کیا چاہتے ہو، پیمبری مل جائے؟

جمیل صاحب خاصے بھولے آدمی ہیں۔ فوراً لوگوں پر اعتبار کر لیتے ہیں اور بعد میں آدمی غلط ثابت ہونے پر پچھتاتے بھی نہیں۔ قصہ سنیے۔ انگریزی کا ایک اخبار نویس میرے پاس آیا۔ میٹھی میٹھی باتیں کر کے چلا گیا۔ گفتگو میں جمیل کا تذکرہ اس طرح کرتا جیسے ان سے گہرے مراسم ہوں۔ میں اس کے رویے سے کھٹک گیا۔ یہ شخص جو کبھی میرے پاس نہیں آیا۔ اب میری تعریفوں کے پل کیوں باندھ رہا ہے۔ مجھ پر مضمون کیوں لکھوا رہا ہے اور مجھے سبز باغ کیوں دکھلا رہا ہے؟"

اگلے دن وہ اخبارات کا پلندہ اٹھا کر پھر آ گیا۔ اپنے چھپے ہوئے مضامین دکھانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اجازت چاہی اور فون نمبر دے کر کہنے لگا۔ "میرے اخبار کا نمبر ہے جب کوئی مسئلہ ہو تو فون پر بات کر لیں۔"

میں اسے چھوڑنے دروازے تک گیا۔ وہ اچانک مڑا اور کہنے لگا۔ "آپ کے پاس دس روپے ہوں گے؟ میں اپنا پرس گھر بھول آیا ہوں۔ جمیل کے پاس گیا تھا وہ گھر پر نہیں ہے۔ میں کل اسی وقت دے جاؤں گا۔"

میں نے سوچا اگر اسے دس روپے دے کر پیچھا چھوٹ

سکتا ہے تو دیر نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اندر جا کر دس روپے کا نوٹ لا کر اسے دیا تو اس نے کہا۔ ”بس کل اسی وقت۔“ اور چلا گیا۔

دوسرے دن بھلا کون آتا ہے۔ میں نے تیسرے دن فون ملایا کہ دیکھوں تو سہی کیا کہتا ہے۔ نمبر مل گیا تو معلوم ہوا کہ ایک بڑے انگریزی اخبار کا آفس ہے۔ اس شخص کے بارے میں پوچھا۔ اتفاق سے اس اخبار کا ایڈیٹر میرا واقف کار تھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔ ”وہ شخص آپ سے کچھ لے تو نہیں گیا؟“

میں نے بتایا۔ ”دس روپے لے گیا ہے۔“

وہ افسردہ ہو کر بولے۔ ”اس شخص کو ہم نے اخبار سے نکال دیا ہے۔ ذہین ہے لیکن ناکارہ۔ کم بخت سب کو ہمارا نمبر بتا دیتا ہے۔ آئندہ کبھی اس کا اعتبار نہ کیجیے گا کہ پرس گھر بھول آیا ہوں۔“

اگلے دن میں جمیل صاحب کو آگاہ کرنے کے لیے ان کے گھر گیا۔ ان کا نام سنتے ہی پوچھا۔ ”آپ سے کچھ لے تو نہیں گیا ہے؟“

”جی دس روپے۔ مگر اس سے ہوشیار رہیے گا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے پاس بھی دس روپے مانگنے آجائے۔“

”وہ تو پہلے ہی مجھ سے لے جا چکا ہے۔“ وہ بولے۔

”چلو دس روپے پر ہی جان چھوٹ گئی۔“

”نہیں وہ پھر آئے گا۔“ انہوں نے بے چارگی سے کہا۔ مجھ سے تو کئی بار پانچ پانچ اور دس دس روپے لے جا چکا ہے۔“

”اور آپ دیے جا رہے ہیں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”کیا کروں اس کی مفلسی پر ترس آجاتا ہے۔“ انہوں نے جواب دیا۔

کبھی انہیں ترس آجاتا ہے، کبھی انہیں خوف خدا ہوتا ہے اور کبھی ان کا جی چاہتا ہے۔ طالب علموں کی فیسیں اپنے پاس سے دے دیتے ہیں، کتابیں دلوا دیتے ہیں، امتحان کی فیس ادا کر دیتے ہیں۔ دوستوں میں سے کوئی کہتا ہے کہ جمیل صاحب آپ کا فلاں کام ہو گیا۔ مٹھائی کھلائیے۔

جمیل کہتے ہیں۔ ”آئیے۔“ پھر سب کو حلوائی کی دکان پر لے جاتے ہیں اور ہر ایک کی من پسند مٹھائی کھلاتے ہیں۔

ایک دن خود کہنے لگے۔ ”اپیل جیت گئے۔ دعوت ہوگی۔ مرغ اور آئس کریم۔“

سب ہا ہو کر کے ریستوران کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی سی دیر میں مرغ کی ہڈیوں کا پہاڑ سا بن گیا۔ اس کے بعد سب نے آئس کریم پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ جمیل ہیں کہ خوشی سے کھِلے جا رہے ہیں کہ دوستوں کی دعوت کر دی۔

پی آئی این کی نمائندگی کرنے جب وہ پیرس گئے تو وہاں بھی ایک جگہ ان کا دل چاہ گیا۔ پروفیسر سید علی احسن نے بتایا کہ تمہارے یہ جمیل خان بھی عجیب آدمی ہیں۔ پیرس میں ہماری حیثیت مہمانوں کی تھی مگر جتنے مندوبین وہاں تھے انہوں نے ان کو نہایت قیمتی شراب پلوا دی۔ میں نے سوال کیا یہ کیا حرکت تھی؟

”میرا جی چاہ گیا تھا اس وقت۔“ انہوں نے جواب دیا۔

جب انہوں نے رسالہ ”نیا دور“ شائع کرنا شروع کیا تو مجھ سے فرمائش کی کہ آپ بھی کچھ لکھیں۔ میں نے خواجہ حسن نظامی کا خاکہ لکھ دیا۔ وہ انہیں پسند آیا۔ نیا دور میں چھپ گیا۔ قارئین کے خطوط آنے لگے کہ شاہد صاحب سے مزید کچھ لکھوائیے۔

میں مخمصے میں تھا کہ اب کس موضوع پر لکھوں کہ ان کا منیجر آیا اور اس نے ایک لفافہ مجھے پیش کیا۔ میں نے کھول کر دیکھا تو اس میں دس دس کے کئی نوٹ تھے۔ میں نے منیجر کو لفافہ واپس کر دیا اور کہا۔ ”میں نے خلوص اور محبت سے مضمون لکھا تھا۔ میں اس کا معاوضہ نہیں لوں گا۔“

تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ جمیل خان ہانپتے کانپتے خود چلے آرہے ہیں۔ کہنے لگے۔ ”یہ معاوضہ نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی رہنمائی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں آئندہ بھی پرچے کے لیے لکھوں گا لیکن معاوضہ نہیں لوں گا۔“

وہ خاموشی سے چلے گئے۔

وہ بہرحال ایک خوددار آدمی ہیں۔ اس لیے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن صبح کسی کام سے آئے۔ کہنے لگے۔ ”آپ کے ہاں پنکھا نہیں ہے، بڑی گرمی ہے۔“

”ہاں لگوا لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”فرصت نہیں ملی۔“

ان کا مکان میرے مکان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پی آئی بی میں رہتے تھے اور میں مارٹن کوارٹرز میں۔ ہم لوگ ٹہلتے ہوئے ایک دوسرے کے گھر آجاتے تھے۔ کسی کام سے بندر روڈ چلا گیا۔ شام کو لوٹا تو میں نے دیکھا کہ ایک بالکل نیا پنکھا لگا

ہوا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو پتا لگا کہ جمیل خان آئے تھے اور اپنے ساتھ ایک الیکٹریشن کو بھی لائے تھے۔ وہ پنکھا لگا گیا۔ اب خفیف ہونے کی میری باری تھی۔ جب ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔ ''حضرت! یہ آپ نے کیا کیا؟''

کہنے لگے۔ ''اب کچھ نہ کہیے گا۔ دوستوں کا حساب دل میں رکھا جاتا ہے۔''

میری اہلیہ نے ایک اسکول میں پڑھاتے ہوئے بیماری کی حالت میں ایم اے کیا تو سب کو بہت خوشی ہوئی۔ گھر میں زنانہ میلاد شریف ہوا۔ جمیل کی بیگم جب آئیں تو مٹھائی اور ایک پھول دار ساڑی بھی لے آئیں۔ میری بیگم نے کہا۔ ''یہ کیا؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''تمہارے بھائی صاحب مارکیٹ لے گئے تھے۔ وہاں مجھ سے کہنے لگے کہ بھابی کے لیے ایک ساڑی پسند کرلو۔ تمہیں یہ رنگ پسند ہے نا؟''

اب ایک دل چسپ واقعہ سنیے۔ جوش صاحب نے لاڈ میں ایک روز کہا۔ ''آپ ہماری دعوت کیجیے۔''

''جب آپ فرمائیں۔'' جمیل نے ملائمت سے کہا۔

''ہماری دعوت میں بریانی اور بگھارے بیگن کا سالن ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کی بیگم حیدر آباد میں رہ چکی ہیں۔ کھانا اچھا پکانا جانتی ہیں۔''

جمیل بھولا سا آدمی ہے۔ تعریف سن کر خوش ہوگیا۔ بہرحال تاریخ اور وقت طے ہوگیا۔ دعوت نامہ مجھے بھی بھیجا گیا۔ میں نے معذرت کرلی۔ اس لیے کہ مجھے لاہور جانا تھا۔ واپس آیا تو قدسی صاحب نے مزے دار قصہ سنایا۔

جمیل صاحب نے کھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ سب کچھ جوش صاحب کی فرمائش کے مطابق تیار کروالیا۔ نو بج چکے تھے اور مہمان آرہے تھے۔ جوش صاحب کو دس بجے جاکر گھر سے لانا تھا۔ جمیل خان میں یہ بری عادت ہے کہ وہ کوئی کام وقت پر نہیں کرتے۔ ساڑھے دس بجے ان کی بیگم نے کہا کہ کھانا بالکل تیار ہے۔ قدسی جمیل خان کی کار لے کر جوش صاحب کے گھر پہنچے۔ اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔

ملازم نے بتایا کہ جوش صاحب کھانا کھا کر لیٹ گئے ہیں۔ قدسی نے کہا کہ ان سے کہو کہ قدسی آپ کو لینے آئے ہیں۔ جمیل خان کے ہاں آپ کی دعوت ہے۔

جوش صاحب وقت کے بہت پابند تھے۔ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ قدسی نے خواب گاہ میں جا کر کہا۔ ''اس نے سارا انتظام کرلیا ہے۔ دس بارہ آدمی بھی بلا لیے ہیں۔ آپ سب پر پانی پھیرے دے رہے ہیں۔''

جوش صاحب اپنی رٹ لگائے رہے۔ ''اب تو ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ اب نہیں جائیں گے۔''

قدسی واپس آگئے۔ پھر جمیل کو قصہ سنایا۔ ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

''ہاں، مگر انہیں آجانا چاہیے تھا۔'' جمیل نے خفیف ہوکر کہا۔

جمیل صاحب کوئی کام وقت پر نہ کرنے کے عادی تھے جب کہ جوش صاحب ہر کام کو وقت پر کرتے تھے۔ ایسے میں دعوت کا ستیاناس کیوں نہ ہوتا۔

جمیل خان کبیدہ خاطر ہوئے۔ سب نے کھانا زہر مار کیا اور اپنے گھروں کو رخصت ہوگئے۔ جمیل افسردہ تھے۔ مگر ایک روز جوش صاحب ان کے آفس پہنچ گئے۔ جمیل خان نے انہیں گلے لگالیا اور ساری باتیں بھول گئے۔ دل سے ساری کثافت دور ہوگئی۔

جمیل صاحب کی نفاست پسندی بعض اوقات ان کے دوستوں کے لیے صبر آزما ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً انہیں چاندنی راتیں بہت پسند ہیں۔ ایک بار مجھے چودھویں کی رات کو اپنے ساتھ سینڈز پٹ لے گئے۔ چاند نے کھیت کیا تو سمندر میں دور تک چاندنی کے ٹکڑے تیرتے ہوئے لگے۔ ایسا سحر آفرین منظر تھا کہ آدمی نظاروں میں کھو جائے۔ وہ بت بنے بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ ''بس دیکھ لیا۔ اب گھر چلو مگر نہیں، وہ تو خاموش بیٹھے انہیں تکے جارہے ہیں۔ ایک گھنٹے دو گھنٹے، کوئی حد ہے اس خوش منظری سے لطف اندوز ہونے کی؟ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے قلفی جمی جارہی تھی۔ اور آپ ہیں کہ کبھی چاند کو اور کبھی چاندنی کو تکے جارہے ہیں۔''

تنگ آکر میں نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ آپ ماہ زدہ ہوجائیں اور Lunatic کہلائیں، آپ کھڑے ہوجائیں۔''

وہ بڑی لجاجت سے بولے۔ ''ابھی چلتے ہیں، بس ذرا.....''

''ذرا ورا کچھ نہیں آپ کھڑے ہوجایئے ورنہ میں چلا۔''

انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ رات گھر پہنچے تو بارہ بج رہے تھے۔

ایک راز کی بات بھی بتادوں کہ گلاب کا پھول ان کی کم زوری ہے۔ کہیں دیکھیں گے تو اکھاڑ لیں گے، دکان پر دیکھیں گے تو خریدنے سے باز نہیں رہیں گے۔ جب کوٹ پہنیں گے تو گلاب جیب کے اوپر ضرور لگائیں گے۔

ان کی خوش اخلاقی بعض اوقات اپنی حد کو پہنچ جاتی ہے اور لوگ انہیں شک کی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں، خاص طور پر عورتوں کے معاملے میں۔ میں نے چند بار ان کے التفات فراواں کو دیکھا ہے اور اس پر انہیں ٹوکا بھی ہے۔ تو جمیل صاحب نے نہایت سادگی سے کہا۔ "نہیں، یہ بات تو نہیں ہے۔" "مگر بدطینتوں کا کیا کیجیے؟ مارتے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے، لیکن کہنے والے کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔ جو لوگ جمیل کی طبیعت سے واقف نہیں ہیں سمجھتے ہیں کہ عورت جمیل کی کم زوری ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جب کسی خاتون سے ملاقات ہو جائے تو اتنا گھل مل جاتے ہیں کہ دیکھنے والے یہ تاثر لیتے ہیں کہ ریشہ خطمی ہو گئے۔

ایک اور واقعہ سنیے۔ گلڈ کے انتخابات ہو گئے تو مہمانوں کی ٹولیاں بنا کر مشرقی پاکستان کی سیر کرائی گئی۔ جمیل صاحب کو خواتین کی ٹولی میں شریک کر دیا گیا۔ ریل کسی خوش منظر علاقے سے گزر رہی تھی۔ جمیل نے سامنے بیٹھی ہوئی خاتون سے کہا۔ "دیکھیے کتنا خوب صورت منظر ہے۔"

خاتون نے پلٹ کر کھڑکی سے منظر دیکھا پھر اٹھلا کر کہا۔ "ہوں تو آپ میری کمر دیکھنا چاہتے تھے؟"

جمیل صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ سامنے کوئی مرد ہوتا تو یقیناً اسے مار بیٹھتے۔ بہرحال بردباری سے بولے۔ "آپ کی کمر میں کیا رکھا ہے جو اسے دیکھوں؟"

اس خاتون نے پھر وار کیا۔ "آپ لوگ اپنی بیویوں کو ساتھ کیوں نہیں لاتے؟"

جمیل بولے۔ "جب آپ اپنے شوہروں کو ساتھ نہیں لاتیں تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم اپنی بیویوں کو ساتھ لائیں۔" اس بات پر زبردست قہقہہ پڑا اور وہ خاتون محجوب سی ہو گئیں۔

میں نے بچپن میں ایک انگریزی فلم میں دیکھا تھا کہ استانی بچے کو نصیحت کرتی ہے کہ اگر زندگی میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو "نہیں" کہنا سیکھو۔ جمیل نے کامیابی تو حاصل کی لیکن "نہیں" کہنا ابھی تک نہیں سیکھا۔ ان کے پاس کوئی بھی ضرورت مند آ جائے وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ [illegible] جب تک

اس کا کام نہیں کر دیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

☆......☆

جمیل 1953ء میں مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو کر محکمۂ انکم ٹیکس سے وابستہ ہو گئے۔ پھر انکم ٹیکس کمشنر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ نومبر 1980ء میں وزارت تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔

انہی دنوں ڈاکٹر خلیق انجم ہندوستان سے پاکستان آئے۔ وہ "پاکستانی کلچر" پڑھ چکے تھے۔ جمیل کی تحریر سے متاثر ہوئے اور جمیل کو ملاقات کے لیے فون بھی کر چکے تھے۔ مگر ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ وہ محمد علی صدیقی کے ساتھ کہیں جا رہے تھے تو انہوں نے اشارے سے بتایا کہ جمیل صاحب کا آفس اس عمارت میں ہے۔ خلیق نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو محمد علی اندر لے گئے۔ آفس کے باہر ایک چپراسی بیوروکریٹک انداز میں سینہ پھلائے بیٹھا تھا۔ ایک بینچ پر انکم ٹیکس کے مارے ہوئے چند افراد بیٹھے تھے۔ یہ حالات دیکھ کر خلیق نے محمد علی کو واپس چلنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے خلیق کا مشورہ قبول نہیں کیا اور ایک چٹ پر خلیق کا نام لکھ کر چپراسی کو تھما دیا۔ وہ چٹ لے کر آرام سے بیٹھا رہا۔ اس کے سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔ محمد علی نے خلیق کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ تمہارے صاحب کے بھائی ہیں اور ہندوستان سے آئے ہیں۔" چپراسی کو جب اہمیت کا احساس ہوا تو وہ چٹ لے کر اندر چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد آیا اور اس نے اشارہ کیا کہ وہ اندر جا سکتے ہیں۔

جمیل صاحب فائلوں کے انبار کے پیچھے چھپے ہوئے تھے اور چند افراد اپنا کیس لے کر بیٹھے تھے۔ جمیل صاحب ہمیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ بڑی محبت سے ملے۔ پانچ چھ منٹ باتیں ہوئیں، پھر انہوں نے معذرت کی کہ شام کو آپ میرے گھر آ جائیں وہاں ملاقات ہو گی۔ ایک سرکاری افسر کی اس ذمے داری سے خلیق بہت متاثر ہوئے۔ عام طور پر سرکاری افسران ایسے موقعوں پر اس طرح سے محو گفتگو ہو جاتے ہیں کہ انہیں گرد و پیش کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ اور سرکاری کام سے آنے والے افسر اور ملاقاتی دونوں کو کوسنے دیتے رہتے ہیں۔

☆......☆

اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ اور ہے۔ ایک صاحب آفس میں آ کر ادب پر گفتگو کرنے لگے۔ جمیل نے معصومیت سے کہا کہ ان کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ادبی محمد جمیل خان میرے [illegible]

جڑواں ہیں۔وہ ادب سے لگاؤ رکھتے ہیں، جبکہ میں یہاں انکم ٹیکس کے کیس نمٹاتا ہوں۔وہ بے چارہ خاموش ہوگیا اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

جمیل آفس سے گھر آکر سوجاتے اور پھر جب اٹھتے تو رات ڈیڑھ بجے تک لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے۔صبح اٹھ کر روزانہ کئی میل کی دوڑ لگاتے۔کہتے تھے کہ آدمی کو صحت کی طرف بھی توجہ دینا چاہیے۔آدمی صحت مند ہوگا تب ہی کام ہوسکے گا۔خود کام کرتے اور دوسروں کو بھی کام کرنے کی تلقین کرتے۔حضرت سلیمان کے دور میں ہوتے تو یقیناً ہیکل سلیمانی کی تعمیر انہی کے ذمے ہوتی۔

کراچی میں ان دنوں شور سا مچا رہتا تھا،نفسانفسی کا عالم تھا۔جمیل خان نے یہ شور اپنے اندر داخل نہ ہونے دیا۔وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ زندگی کے لیے کاہلی بہت ضروری ہے۔جب جسم کاہل ہوجاتا ہے تو دماغ چل پڑتا ہے۔سوچنے لگتا ہے۔سوچنا ایک عظیم عمل ہے۔وہ خوب محنت کرتے ہیں اور یہ دعوا نہیں کرتے کہ قلم لے کر بیٹھا اور سارا مقالہ لکھ ڈالا۔وہ ایک چیز کئی مرتبہ لکھنے کے عادی ہیں۔اسے بار بار پڑھتے ہیں۔غور کرتے ہیں چول پر چول بٹھاتے ہیں۔اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک کہ ان کا مافی الضمیر یہ اعلان نہ کردے کہ اب اس میں مزید ردوبدل نہیں ہوسکتا۔

وہ تحریر کے معاملے میں ایک محتاط شخص ہیں، سردیوں کی دھوپ میں چین سے بیٹھ کر سوچتے ہیں، موسم بہار میں پھولوں کی خوشبو اکھٹی کر کے لفظوں میں ملاتے ہیں پھر وہ سوغات ایک عالم کو بانٹ دیتے ہیں تاکہ انسان زندہ رہے اور کائنات کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا رہے۔

پان بہت کھاتے ہیں۔لیکن اس معاملے میں بھی صفائی ستھرائی کی طرف سے غافل نہیں رہتے۔جب لالی ہونٹوں تک آجاتی ہے تو تولیے سے ہونٹ صاف کرلیتے ہیں۔جب ذہنی کرب اور بے چینی میں مبتلا ہوتے ہیں تو اسی شدت سے پان کھانے لگتے ہیں۔جب ذہنی طور پر پُرسکون ہوجاتے ہیں تو پھر پان وقفے وقفے سے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔

ان کے ایک دوست کی بیوی نے ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ ایک بار میرے گھر آئے تو میرے شوہر سے کسی بات پر الجھ گئے۔ذہن میں کوئی پھانس تھی جو شاید چبھ رہی تھی، لہٰذا پان پر پان کھانا شروع کردیے۔جب گئے تو سارا تولیا لال ہورہا تھا۔حالانکہ پاندان بھی رکھا تھا،مگر اسے استعمال کرنے کا ہوش نہیں آیا۔معلوم نہیں وہ ذہنی پھانس نکلی یا نہیں نکلی۔

☆......☆

جمیل صاحب کا خاندان ماشاءاللہ بھرا پُرا ہے۔قدرت نے انہیں پانچ بہنیں اور پانچ بھائی عطا کیے۔ایک بہن کا بچپن میں انتقال ہوگیا۔باقی خدا کا شکر ہے کہ بقید حیات ہیں اور خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں۔جمیل کے والد محمد ابراہیم خان نے اپنی تمام اولاد کو اعلا تعلیم دلائی۔جمیل کے ایک بھائی ڈاکٹر ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں۔باقی تین چھوٹے بھائیوں نے امریکا میں سکونت اختیار کرلی ہے۔ان میں سے ایک بھائی کیمیکل انجینئر، دوسرا کمپیوٹر انجینئر جب کہ تیسرا معاشیات میں ماسٹر ہے اور تجارت کرتے ہیں۔جمیل سب سے بڑے ہیں۔چاروں بہنیں شادی شدہ ہیں اور اپنے شوہروں کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔

☆......☆

جمیل کی شخصیت کی تعمیر ذہنی ترویج میں بہت سے اساتذہ نے حصہ لیا، لیکن چند اساتذہ کا کردار بے حد اہم ہے۔جن میں ایک ہندوستانی عیسائی مسٹر فرانس سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔مولوی اسماعیل میرٹھی کے ایک شاگرد تھے جن کا نام مولوی محمد اسماعیل تھا۔جمیل نے ان سے اردو، جغرافیہ اور حساب پڑھا۔اردو بہت سے اساتذہ سے پڑھی، لیکن مولوی فیض الحسن نے انہیں سب سے زیادہ متاثر کیا۔انہوں نے جمیل میں ایسا ذوق پیدا کیا کہ ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران ہی جمیل کی تخلیقی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔شعروشاعری سے نہ صرف دل چسپی پیدا ہوئی بلکہ مولوی فیض الحسن کے کہنے پر باقاعدہ شعر کہنا شروع کردیے۔جغرافیہ، سائنس اور حساب سے انہیں کوئی دل چسپی نہیں تھی البتہ اردو، انگریزی اور تاریخ کے مطالعے سے انہیں لگاؤ تھا۔

☆......☆

اردو کے بہت سے ادیب بچوں کے لیے لکھنا پسند نہیں کرتے۔ان کا خیال ہے کہ اس سے حیثیت گر جاتی ہے۔حالانکہ غالب اور اقبال عظیم شاعر تھے،لیکن انہوں نے بھی بچوں کے لیے نظمیں لکھیں۔مولانا محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی اور مولانا الطاف حسین حالی جیسے بلند پایہ ادیبوں نے بھی بچوں کے لیے کافی لکھا۔جمیل صاحب بھی اس اہمیت سے واقف تھے، اس لیے انہوں نے فرائض منصبی اور ادبی مشاغل سے وقت نکال کر بچوں کے لیے لکھا۔حضرت

امیر خسرو، بید کی کہانی، بلیاں، عجیب واقعہ اور نئی گلستان اسی زمانے میں لکھیں جو عصمت اور ہونہار وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ بڑی عمر کے بچوں کے لیے انہوں نے فسانہ آزاد کے کردار خوجی کی داستان ہونہار میں شائع کرائی۔ یہ کہانی وہ اور کامل القادری مل کر لکھا کرتے تھے۔ یہ قسط وار لگتی تھی، اس کی 78 اقساط شائع ہوئیں۔ روزنامہ حریت کراچی میں انہوں نے ایک مقالہ مئی 84ء میں لکھا۔ ''اچھا لکھنے والوں کو بھی بچوں کے لیے لکھنا چاہیے۔''

ان کی سب سے اہم کتاب ''پاکستانی کلچر'' ہے جس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ سندھی اور انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔ ان کا اہم کارنامہ ''تاریخ اردو ادب'' ہے جس کی پانچ جلدیں شائع ہوں گی۔ (اب تک صرف تین جلدیں شائع ہوئی ہیں)

جمیل کہتے تھے کہ پاکستان کو وجود میں آئے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے، لیکن ہم اب تک ایک قوم نہیں بن سکے ہیں۔ ہمارا کوئی الگ قومی کلچر نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی کلچر کی تشکیل کے مسئلے پر انفرادی و اجتماعی طور پر غور کیا جائے۔ وہ خود بھی اس مسئلے پر غور کرتے رہے بالآخر پاکستانی کلچر شائع ہوگئی۔ جس کا ذیلی عنوان ''قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ'' ہے۔ اس موضوع پر یہ پہلی مبسوط کتاب ہے جس میں خلوص کے ساتھ اہم بنیادی قومی مسئلے پر غور کیا گیا ہے۔ یہ موضوع نہایت پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے اس کے باوجود اس کتاب کا اسلوب شگفتہ اور صاف ہے کہ بہت آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

سلیم احمد، جمیل صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''انہوں نے کلچر پر پاکستانی کلچر کے نام سے ایک باقاعدہ کتاب لکھنے کے علاوہ کلچر کے مختلف مظاہر کے حوالے سے علیحدہ علیحدہ مضامین بھی لکھے ہیں جو ان کی کتاب ''کلچر اور مسائل'' میں شامل ہیں۔ اس کتاب میں وہ پاکستانی کلچر کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے کلچر اور مذہب کے تعلق پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ ہمیں دعوت دیتے ہیں کہ ہمیں بے فکری اور بے راہ روی ترک کر کے اپنے بنیادی مسائل پر غور کرنا چاہیے۔ جمیل صاحب کی عملی تنقید کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کم درجے کے ادیب پر نہیں لکھا ورنہ ہمارے ہاں عام طور پر تنقید میں یہ رواج چل نکلا ہے کہ نقاد حضرات فرمائشی مضامین لکھتے ہیں اور ان میں فرمائشی آرا کا بھی اہتمام کرتے ہیں لیکن جمیل اس علت سے پاک ہیں۔''

کافی پہلے کی بات ہے کہ میری ایک طویل غزل پڑھنے کے بعد جمیل نے مشورہ دیا کہ تم غزل لکھنے کے چکر میں نہ پڑو اور ڈراما لکھا کرو۔ میں نے کہا۔ ''یار جمیل میرا ڈرامے سے کیا تعلق؟ میں نے تو کوئی ڈراما آج تک پڑھا ہی نہیں۔

''میری بات مان لو اور ڈراما لکھو۔'' انہوں نے کہا۔ ''تمہارے مزاج میں ڈرامائیت بہت ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ۔''

ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس بات کو کئی برس گزر گئے۔ جمیل جب بھی ملتے تو کہتے کہ دیکھنا ایک دن تم ڈرامے میں نام پیدا کرو گے۔ ان کی بات اس طرح سے پوری ہوئی کہ میں نے پچیس برس تک ڈرامے کی روٹی کھائی۔ بس یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جمیل نے یہ صلاحیت مجھ میں کیسے دریافت کر لی؟

☆......☆

وہ محمد جمیل تھے مگر انہوں نے اپنا نام تبدیل کر کے جمیل جالبی کر دیا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اردو کے نامور صحافی سید جالب دہلوی اور جمیل کے دادا دونوں ہم زلف اور رشتے کے بھائی تھے۔ جمیل نے جب ادبی زندگی میں قدم رکھا تو جالب دہلوی ان کا آئیڈیل تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ پیوندکاری کر لی۔ تاہم حسن عسکری انہیں جمیل جلیبی کہتے تھے۔

جمیل انگریزی میں ماسٹرز کر چکے تھے۔ ملازمت حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اردو میں ماسٹرز کیا اور پھر ایل ایل بی بھی کر لیا۔ اس کے بعد سندھ یونی ورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔

☆......☆

ایک بار انہیں خیال آیا کہ زندگی کم ہے اور انہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے وقت سے پہلے ملازمت چھوڑ دی اور ادب کی خدمت کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔

جب ان کے قدم پاکستان میں جم گئے تو انہوں نے اپنے والد کو بھی پاکستان بلالیا۔ ان کے والد کی وہاں بسیں چلتی تھیں، چنانچہ انہوں نے یہاں بھی بسیں چلوانے کا کام شروع کر دیا جس میں انہیں فائدہ ہوا، لہٰذا خاندان پہلے کی طرح سے خوش حال ہوگیا۔

☆......☆

یکم نومبر 1953ء کو ان کی شادی انہی کے خاندان کی ایک صاحبزادی نسیم شاہین سے شادی ہوگئی۔ ان کی ازدواجی

زندگی خوشگوار گزرنے لگی۔ اولاد کے معاملے میں بھی وہ خوش قسمت ہیں۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ سب کو اعلا تعلیم دلائی گئی ہے۔ چاروں بچوں کی شادی ہو چکی ہے۔ اور وہ سب اولاد والے ہیں۔ گویا جمیل نانا اور دادا بن چکے ہیں۔ ہر چند کہ وہ بے پناہ مصروف انسان تھے اس کے باوجود انہوں نے اپنے بچوں کے تعلیمی کیریئر کی طرف سے بے پروائی نہیں برتی اور انہیں اعلا تعلیم دلوائی۔

جمیل کی زبانی ان کے رسالہ شائع کرنے کی داستان سنیے۔ ''1955 میں میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ ایک مضبوط اور معیاری رسالہ شائع کیا جائے۔ میں نے ''پاکستانی ادب'' اور ''جدید ادب'' کے نام سے ڈکلریشن کی درخواست دے دی۔ ان دنوں ڈکلریشن آسانی سے مل جایا کرتا تھا۔ جب میں ڈکلریشن لینے کے لیے پہنچا تو وہاں ایک صاحب کو ڈکلریشن کی درخواست داخل کرتے دیکھا۔ وہ ''نیا دور'' کے نام سے درخواست دے رہے تھے۔ ان سے گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ فلمی ٹائپ کا پرچا نکالنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں منع کیا کہ ممتاز شیریں اور صمد شاہین اس نام سے ایک موقر ادبی پرچا نکال چکے ہیں، چنانچہ وہ اس نام سے درخواست نہ دیں۔ لیکن وہ نہ مانے اور انہوں نے درخواست جمع کرا دی۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو میں نے اندر جا کر بات کی۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہ آئی تھی کہ نیا دور کا نام فلمی پرچے پر استعمال ہو۔ میں نے پاکستانی ادب کے اوپر نیا دور لکھ دیا۔ اس طرح تیسرے دن مجھے ''نیا دور'' کا ڈکلریشن مل گیا۔ (جب ایک نام سے کوئی پرچا شائع کر رہا ہو تو کسی دوسرے کو وہ نام نہیں دیا جاتا۔)

جمیل جالبی کو اس پرچے کے ایڈیٹر سے لے کر چپراسی تک کے سارے کام کرنا پڑتے تھے۔ چونکہ وہ سرکاری افسر تھے، لہٰذا پرچے پر اپنا نام نہیں دے سکتے تھے۔ جمیل نے مجلس ادارت میں شمیم احمد اور ثنا اللہ کو شامل کیا۔ بعد میں احسن فاروقی بھی اس میں شامل کر لیے گئے۔ نیا دور کسی سیاسی یا ادبی نظریے کا پابند نہیں تھا۔ یہ صرف معیاری ادب کا پابند تھا۔ اس لیے اس نے اردو ادب کی واقعی خدمت کی۔

وہ اردو کا ایک خوب صورت اور جامع ادبی رسالہ تھا۔ جس کے سرورق سے لے کر مضامین کے انتخاب تک میں بہت احتیاط کی جاتی تھی۔ مزے کی بات یہ کہ سارے لکھنے والے نئے تھے مگر ان کی تحریریں بے حد جاندار تھیں۔ وہ رسالہ کافی عرصے تک شائع ہوتا رہا لیکن اب بھی اس کی ورق گردانی کی جائے تو لگتا ہے کہ اس کی تحریریں آج بھی تازہ ہیں۔ انتظار حسین نے لکھا تھا۔ ''نیا دور کا ہر شمارہ ادب کا ایسا تھرمامیٹر ہوتا ہے، جسے پڑھ کر بتایا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کا درجۂ حرارت کیا ہے۔''

نیا دور کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے نہ صرف نئے دور کی ترجمانی کی ہے بلکہ نئے اور آنے والے مثبت رجحانات کو بھی آگے بڑھایا ہے۔ 1955ء سے لے کر پرچے کے بند ہونے تک جو کچھ اردو میں بہترین لکھا گیا ہے اس کی اکثر نمائندہ تحریریں نیا دور میں شائع ہوئی ہیں۔

☆......☆

1983ء میں انہیں یونی ورسٹی کی وائس چانسلر شپ پیش کی گئی جو انہوں نے قبول کر لی۔ پھر انہوں نے 1987ء تک اس عہدے پر کام کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کہتے ہیں ''سنا ہے کہ کسی ادیب کے خلاف کوئی سازش نہیں کرتے۔ کسی سے اختلاف کا ذکر ہو جائے تو بس مسکرا دیتے ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری کمیٹیوں کے رکن بننے کے بعد بھی جوڑ توڑ نہیں کرتے۔ پتا نہیں کیسے ادیب ہیں اور کیسے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایسے کاموں کے لیے تو یونی ورسٹی کی فضا بہت سازگار ہوتی ہے۔ حیرت ہے کہ یونی ورسٹی کا وائس چانسلر بننے کے بعد بھی یونی ورسٹی کے پروفیسروں سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ جوڑ توڑ نہیں کیا اور گروہ بندی نہیں کی۔ حد یہ ہے کہ مطالعہ جاری رکھا اور لکھتے پڑھتے رہے۔''

جمیل صاحب نے جب وائس چانسلر کی حیثیت سے چارج سنبھالا تو زمین سخت اور آسمان نامہربان تھا۔ یونی ورسٹی میں داخلوں کے ہنگامے اپنے عروج پر تھے۔ طلبہ کا ایک گروپ شعبہ فنون میں بھوک ہڑتال کر کے لیٹا ہوا تھا۔ زنانہ اور مردانہ ہوسٹلوں کے نگراں نے استعفا دے دیا تھا۔ حالانکہ دستور یہ ہے کہ استعفا نئے آنے والے چانسلر کے سامنے پیش ہوتا ہے تاکہ وہ اسے منظور یا نامنظور کر کے اپنی نئی ٹیم تشکیل دے۔ مگر اس وقت صورتِ حال مختلف تھی۔ جمیل صاحب نے جب چارج لیا تو نہ ہوسٹلوں کے نگراں تھے اور نہ مشیر اور طلبہ۔ نہلے پہ دہلا یہ رجسٹرار صاحب نے بھی تین چار دن کے بعد استعفا دے دیا۔ شاید ہی کسی چانسلر نے ان نامساعد حالات میں اپنے عہدے کا چارج لیا ہو۔

مگر ایک انگریزی محاورے کے مطابق، وہ آیا، اس نے دیکھا اور اس نے مسخر کر لیا۔ یونی ورسٹی میں کون سی ایسی چیز رہی ہوگی جو نہ ہوئی ہو۔ انہیں چارج لیے ہوئے دس بارہ دن گزرے

.... تھے کہ طلبہ نے گیٹ پر تالے ڈال دیے اور بندوقیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ یہ صورتِ حال بارہ گھنٹے جاری رہی۔ مگر جمیل خان کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئی۔ وہ مذاکرات اور نصیحتیں کرتے رہے، بالآخر جو طلبہ بدتمیزی کی ساری حدیں پھلانگ چکے تھے۔ انہیں روتے اور معافی مانگتے دیکھا گیا۔ اسی اثنا میں کراچی کی انتظامیہ نے کمانڈوز بھیجنے کی پیش کش کی، لیکن جمیل صاحب نے سختی سے منع کر دیا۔

ساڑھے تین بجے تو طلبہ نے انتظامی عملے سے کہا کہ آپ لوگ چلے جائیں۔ عملے نے انکار کر دیا۔ عجیب سی سچویشن تھی۔ ایک طرف طلبہ، دوسری طرف آفس اسٹاف اور درمیان میں جمیل صاحب۔ ایک عبرت انگیز واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ ڈاکٹر منظور احمد کھانا لے کر گیٹ پر پہنچے تو لڑکوں نے بندوقیں تان لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سینہ تان کر کہا۔ ”لو بیٹا، اپنے استاد کے سینے کو گولیوں سے چھلنی کر دو۔ یقیناً ہم نے جو تربیت تمہیں دی ہے، اس میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔“

لڑکوں نے شرمندہ ہو کر بندوقیں نیچے کر لیں اور گیٹ کھول دیا۔ ڈاکٹر صاحب کھانا لے کر اسٹاف روم میں پہنچ گئے تو سب نے کھانا کھایا۔ اس سارے منظر میں جمیل جالبی کا استقلال، بردباری اور شگفتگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بیشتر لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ انہیں ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کا بخوبی تجربہ ہے۔ وہ کچھ اور ہی ٹائپ کے انسان ہیں۔

جمیل صاحب سے پہلے اور بھی چانسلر گزرے، صورتِ حال کچھ یوں ہوتی تھی کہ یونی ورسٹی مالیاتی بحران کا شکار ہو جاتی تھی۔ نئے مکانات تو بن نہیں پاتے تھے، پرانوں پر سفیدی کرانے کے لیے فنڈ نہیں ہوتا تھا۔ نئے اپائنٹمنٹ بند ہو جاتے، عملے کی ترقیاں بند ہو جاتیں۔ جب انہوں نے چارج سنبھالا تو نیشنل بینک کا لاکھوں کا اوور ڈرافٹ اور سندھ حکومت کا قرضہ چڑھا ہوا تھا۔ قرضے اتنے تھے جب کہ اخراجات ہیں کہ سر پہ چڑھے آ رہے ہیں۔

جمیل صاحب معلوم نہیں کہاں سے الہ دین کا چراغ لے کر آ گئے تھے کہ بینک اور حکومت سندھ کا قرضہ ادا ہو گیا۔ نئے مکانات بننا شروع ہو گئے، لاکھوں روپے کی کتابیں آ گئیں اور لیبارٹری کا قیمتی سامان بھی آ گیا۔ اس کے علاوہ یونی ورسٹی نے ایک کروڑ روپے کے محفوظ ذخائر بھی قائم کر لیے۔ کیمپس کی حالت تبدیل ہونا شروع ہو گئی۔ نئی سڑکیں بننے لگیں، بجلی کے سب اسٹیشن قائم ہو گئے، نیا ٹیلی فون ایکسچینج لگ گیا۔ شجر کاری ہونے لگی اور چند ماہ میں یونی ورسٹی باغ و بہار ہو گئی۔ جس طرف دیکھو سبزہ و گل کھلے ہوئے۔ اساتذہ خوش اور لڑکے بھی خوش۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں۔

جمیل صاحب نے کبھی فنڈز کی کمی کا رونا نہیں رویا۔ عجب دریا دل قسم کے انسان تھے۔ انہی دنوں برٹش کونسل نے اپنی پرانی کتابوں کی فروخت کا اعلان کیا اور کلفٹن کے نزدیک نمائش رکھی۔ جمیل خان کی ہدایت پر سارے شعبوں کے صدور وہاں پہنچ گئے۔ جمیل صاحب کی ہدایت پر سب نے اپنی اپنی پسند کی وہ کتابیں خرید لیں جو یونی ورسٹی کی لائبریری میں موجود نہیں تھیں۔ ایک ہی دن میں پانچ لاکھ روپے کی کتابیں خرید لی گئیں۔

وہ قومی معاملات اور یونی ورسٹی کی توسیع کے لیے ہر وقت سرگرم رہتے تھے۔ مگر ہر ایک چیز میں باریک بینی بھی کرتے تھے۔ ایک بار کسی پروفیسر نے لکھا کہ رجسٹرار کے کمرے کی گھڑی پرانی ہو گئی ہے، چلتے چلتے رک جاتی ہے۔ نئی گھڑی کی منظوری دے دی جائے۔ کچھ نہ ہوا۔ پروفیسر صاحب نے سوچا ممکن ہے بھول گئے ہوں یا درخواست پڑھی ہی نہ ہو چنانچہ یاد دہانی کرانے کے لیے ان کے آفس میں چلے گئے۔ نئی گھڑی کے لیے مطالبہ سن کر جالبی صاحب نے اپنا چشمہ اتارا اور بولے۔ ”اگر اسی گھڑی کی مرمت کرا لی جائے تو میرا خیال ہے کہ کام بن سکتا ہے۔ آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ ایک روز اللہ کے ہاں بھی حساب دینا ہے۔ ہم یہاں اس لیے نہیں بیٹھے ہیں کہ قومی دولت کو اس طرح سے ضائع کریں۔ وہ پروفیسر چلے گئے، لیکن یہ سوچتے رہے کہ اگر قومی سوچ بھی اسی طرح ہو جائے تو قومی دھارا تبدیل ہو سکتا ہے۔

انہوں نے کبھی یونی ورسٹی کے پیڈ پر ذاتی خط نہیں لکھا۔ یونی ورسٹی کی اسٹیشنری استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کے ذاتی خطوط گھر کے پتے سے پوسٹ کیے جاتے تھے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب اپنے آفس سے اٹھتے تھے تو میز کا بلب بجھا دیتے اور آفس کی بتیاں بھی آف کر دیتے کہ بلاوجہ جلتی نہ رہیں اور بجلی نہ خرچ ہو۔ یہ باتیں بہت چھوٹی ہیں اور عام طور پر انہیں نظر انداز ہی کر دیا جاتا ہے، لیکن آدمی انہی سے پہچانا بھی جاتا ہے۔ یہی چیزیں شخصیت کو بڑا بناتی ہیں۔

وہ مالی معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کے دور میں مالی بحران کبھی نہیں آیا۔ حالات سکون، رسانیت اور ہمواری سے چلتے رہے۔ مالیات کے ہر کاغذ کو نہایت باریک بینی سے دیکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ بغیر دیکھے دستخط کر دیے اور بعد میں کمیشن جیب میں رکھ لیا۔

فائلوں کو غور سے دیکھتے اور ان پر نوٹ لکھتے۔ درشتی نہیں

نرمی سے۔ایک بار یونی ورسٹی کے میڈیکل افسر ریٹائر ہوگئے،اب انہیں مکان خالی کرنا تھا۔انہوں نے درخواست لکھی اور آنکھوں میں آنسو بھرے ان کے آفس میں چلے گئے۔اپنی مجبوری کے بارے میں بتایا۔جمیل صاحب نے زیادہ استفسار نہیں کیا اور درخواست پر تین ماہ کی توسیع لکھ کر دستخط کر دیے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی ہے۔ایک پروفیسر صاحب ریٹائر ہوکر غیر ملک چلے گئے اور وہاں ملازمت کرنے لگے۔ان کے اہل خانہ کو مکان خالی کر دینا چاہیے تھا۔مگر ان کی اہلیہ نے الٹا جمیل صاحب کے خلاف چانسلر کو اور وزیر تعلیم کو خط لکھا کہ وائس چانسلر ہمیں پریشان کر رہے ہیں اور مکان خالی کرانا چاہتے ہیں،ہمیں بے گھر کر رہے ہیں۔اب آپ ہی اس معاملے میں کچھ کیجیے۔

سرکاری ضابطے کے مطابق دونوں خط یونی ورسٹی بھیج دیے گئے۔مگر جمیل جالبی نے کچھ کہا نہیں۔پھر ایک روز یوں ہوا کہ وہی صاحبہ درخواست لے کر ان کے پاس آئیں کہ توسیع کر دی جائے۔جمیل صاحب نے اس درخواست پر تین ماہ کی توسیع کی مدت بڑھا دی۔

ان کے جانے کے بعد ایک پروفیسر جنہوں نے وہ خط پڑھ رکھے تھے کہنے لگے کہ آپ نے ان صاحبہ کو اتنی رعایت کیوں دے دی؟انہوں نے تو آپ کے خلاف محاذ بنالیا تھا؟

جمیل صاحب بولے"ان کا فعل اپنی جگہ ہماری نیکی اپنی جگہ۔آپ کو معلوم نہیں ان کی بیٹی کا امتحان ہونے والا ہے۔اگر اس موقع پر میں مکان واپس لے لیتا تو اس کی پڑھائی پر برا اثر پڑتا۔"

یہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی آواز نہیں ایک ماہر تعلیم کی آواز تھی۔ایسے لوگ شاذ ہی دنیا میں ملیں گے جو اپنے دشمنوں سے اتنا بہتر سلوک کرتے ہوں۔

جمیل صاحب نے یونی ورسٹی سے بارہ علمی جریدے شائع کیے۔بہت سی کتابیں مرتب کرا کے شائع کیں اور تدریس و تحقیق کے لیے انہوں نے جو کچھ کیا اس کو بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔اساتذہ سے ان کی تحقیق پر گفتگو ہوتی تھی اور رائے مشورے ہوتے تھے۔اس سلسلے میں مالی اعانت کی کوئی فکر نہیں کرتے تھے۔سب کام سہولت سے ہو جاتے تھے۔طلبہ کے لیے کھیلوں کے ہفتے کا اہتمام کرتے تھے اور خود ان کے ساتھ ہاکی بھی کھیلتے تھے۔ان کے مسائل پر ان سے گفتگو بھی کرتے تھے۔

طلبہ کا الیکشن ہمیشہ سے ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ان کی وائس چانسلری سے پہلے جو الیکشن ہوا تھا اس میں ایک طالب علم مر گیا تھا۔انہیں یہ بات معلوم تھی۔اس لیے انہوں نے اس کے لیے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا۔ہر کام بڑے سلیقے اور سکون سے ہوا۔نہ کوئی بدمزگی،نہ کوئی جھگڑا نہ سر پھٹول۔اساتذہ بھی خوش کہ انہوں نے بغیر کسی دباؤ کے کام کیا۔شہر والے بھی حیرت زدہ تھے اور والدین کو بھی اعتبار نہیں آتا تھا کہ یونی ورسٹی میں اتنے امن سے الیکشن کیسے ہوگیا؟

جب وہ چار سال کے بعد یونی ورسٹی سے رخصت ہو رہے تھے تو ہر ایک شخص ملول و مضطرب تھا۔بہت سی آنکھیں نمناک تھیں۔ان کا کمرا اساتذہ سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔جب آئے تھے تو سب حیرت زدہ اور پریشان تھے کہ کیسے کیا ہوگا؟اب جا رہے تھے تو لوگوں کے دلوں میں وسوسے چھوڑے جا رہے تھے کہ معلوم نہیں آیندہ وائس چانسلر کیسے ہوں گے؟یہ ان کی بے غرض اور بے لوث خدمت اور علم سے لگاؤ کا نتیجہ ہے۔وہ اردو کے ممتاز مؤرخ ہیں مگر اب خود تاریخ بن چکے ہیں۔

☆......☆

1987ء ہی میں انہیں ایک اہم سرکاری ادارے مقتدرہ قومی زبان کا چیئر مین مقرر کر دیا گیا۔ممتاز مفتی کہتے ہیں۔"وہ اسلام آباد میں ہر محفل میں شریک ہوتے،کبھی کرسی صدارت پر،کبھی مہمان خصوصی اور کبھی سامع کی حیثیت سے۔ان کی شمولیت کچھ اس انداز سے ہوتی ہے کہ پتا نہیں چلتا کہ ہیں یا نہیں۔کرسی صدارت پر کبھی صدر بن کر نہیں بیٹھتے۔لگتا ہے جیسے سامع ہوں۔

ادبی میدان میں مور بن کر نہیں آتے،لگتا ہے جیسے کبوتر ہوں۔ایسا کبوتر جو غوں غوں نہیں کرتا۔چھاتی پھلا کر نہیں چلتا۔وہ محفلوں میں مقالہ بھی پڑھتے تو مدھم آواز میں اور محتاط و متوازن الفاظ میں بات کر کے جھکی جھکی گردن سے اپنی نشست پر واپس آجاتے۔ایسے کہ پتا ہی نہیں چلتا ہے کچھ کہہ گئے ہیں۔

☆......☆

انہوں نے"مثنوی کدم راؤ پدم راؤ"پر کام کیا۔اس مثنوی کو پڑھنے کی چالیس سال سے کوشش ہو رہی تھی۔اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح سے یہ مثنوی شائع ہو۔اس مثنوی کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اردو زبان کی پہلی معلوم تصنیف ہے اور یہ بابر بادشاہ کے ہندوستان پر حملے سے تقریباً ایک سو پچیس برس پہلے لکھی گئی تھی۔جمیل نے جس طرح اس کام کو کیا ہے،یہ انہی کا حوصلہ ہے۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے مصنف کا نام فخر الدین تھا اور تخلص نظامی تھا۔ وہ دکن کے بہمنی فرماں روا احمد شاہ ولی (جس کا دور حکومت 1421ء سے لے کر 1435ء تک تھا) کے دور میں پیدا ہوا تھا۔ گویا یہ مثنوی چھ سو برس پہلے کی ہے۔ اس مثنوی کی کہانی بیرانگر کے راجا کدم راؤ اور اس کے وزیر پدم راؤ کے گرد گھومتی ہے۔ کدم راؤ انسان ہے اور پدم راؤ ناگ۔ اس مثنوی میں وہ سب کچھ ہے جو دیومالائی قصوں میں ہوتا ہے۔ کہانی کے اعتبار سے یہ مثنوی کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی لیکن لسانی نقطۂ نظر سے یہ ایک اہم تصنیف ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھ سو برس پیشتر ہماری زبان کی حالت کیا تھی اور اس پر کون کون سے لسانی اثرات غالب تھے۔ اس کا ذخیرہ الفاظ کن کن زبانوں سے خوشہ چینی کا نتیجہ ہے۔ جمیل جالبی کہتے ہیں۔ ''اس مثنوی میں بیک وقت پنجابی، راجستھانی، برجی، گجری، سرائیکی اور مرہٹی زبان کے اثرات ہیں۔''

مثنوی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق شائع ہوئی ہے۔ ایک صفحے پر مخطوطے کا عکس چھاپا گیا ہے اور سامنے کے صفحے پر اسی متن کو جدید رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ اس طرح سے قاری یہ اندازہ لگا لیتا ہے کہ اسے شائع کرنے میں کتنی محنت سرف ہوئی ہے۔

☆......☆

مؤرخ، معلم، نقاد، محقق، لغت نگار اور کلچر شناس کے علاوہ وہ ایک اچھے مترجم بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جمیل جالبی نے ترجمے کی اہمیت کے دونوں پہلوؤں کے حوالے سے مغربی تنقید کے اردو ترجم کا بہت وقیع اور اہم ترین کام کیا ہے۔ انہوں نے مغرب کے شاہکار تنقیدی کارنامے ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' کے نام سے اردو میں پیش کیے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ کے چودہ عہد آفریں مضامین کا ترجمہ کیا ہے اور انہیں ایلیٹ کے بارے میں اپنے چار مضامین اور مقالے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مقدمے میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ انہوں نے ترجمے کے لیے ایلیٹ کے تنقیدی مضامین کیوں منتخب کیے۔ وہ کہتے ہیں۔ ''حسن عسکری میرے ذہن سے کنکھورے کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا ان سے پیچھا چھڑانا چاہیے۔ میں نے مغربی ادب کو ہاتھ میں لیا تو ٹی ایس ایلیٹ بھا گیا۔ گویا حسن عسکری کا کنکھجوراہٹ گیا اور ایلیٹ کا سوار ہوگیا۔ ایلیٹ کی تحریریں مجھے پسند ہیں۔ اس کا اندازبیاں اور زاویہ نظر مجھے بھاتا ہے۔ اس کی سنجیدگی اور گہرائی اور بات سے بات نکالنے کا ڈھنگ مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں نے اس کے تنقیدی مضامین سے انتخاب کر لیا۔ جو نہ صرف اپنے طور پر عہد آفریں ہیں بلکہ ان میں ادب و تہذیب کے مسائل کو عالمگیر ذہنی تناظر میں رکھ کر دیکھا گیا ہے۔ ان ترجموں سے میں نے اپنے ذہن کی تعمیر کا کام لیا ہے۔ یہ ترجمے دراصل میرے لیے ریاض کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے ذریعے میں نے ایلیٹ کی فکر اور اس کے طرز ادا کو اپنے مزاج میں سمونے کی کوشش کی ہے۔''

☆......☆

انہوں نے اپنی بے پناہ ادبی اور تنقیدی خدمات کے عوض چار بار داؤد ادبی انعام حاصل کیا۔ ان کی اہم تصانیف یہ ہیں۔ ''پاکستانی کلچر۔ ایلیٹ کے مضامین۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ تنقید اور تجربہ۔ ارسطو سے ایلیٹ تک۔ دیوان حسن شوقی۔ دیوان نصرتی۔ میر تقی میر۔ جانورستان (ترجمہ)۔ حیرت ناک کہانیاں۔ ادب کلچر اور مسائل۔ کلیات میراجی۔ اسلامی جدیدیت۔ تاریخ اردو ادب (تین جلدوں شائع ہوئی ہیں) قومی انگریزی لغت۔ قدیم اردو کی لغات۔

وہ کئی تنظیموں کے صدر اور رکن بھی بنے، جن میں انجمن ترقی اردو، ڈاکٹر اشتیاق حسین اکیڈمی، اردو ڈکشنری بورڈ، نیشنل لائبریری آف پاکستان، اکادمی ادبیات پاکستان وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے کئی بیرونی ممالک کی ادبی کانفرنسوں اور مذاکرات میں خصوصی لیکچر دیے۔

اس کے علاوہ ان کے دو سو سے زائد مقالات معیاری ادبی جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے ''ستارۂ امتیاز'' اور ''ستارۂ ہلال'' کے اعزازت سے نوازا۔ انہوں نے تنقید پر انتہائی سنجیدگی سے گروہ بندی سے لاتعلق ہو کر کام کیا ہے۔ اسی لیے ان کا نام ادب سے لیا جاتا ہے۔

اس وقت سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں، چنانچہ ان کے لیے ہر خاص و عام کو دعا کا طالب ہونا چاہیے۔

جن کتابوں سے مدد لی گئی

پاکستان کی 100 نامور شخصیات۔
سیارہ ڈائجسٹ 1998ء......ڈاکٹر جمیل جالبی۔
ایک مطالعہ۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی......یہ صورت گر کچھ خوابوں کے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود......
پاکستانیکا۔ سید قاسم محمود

شاعرِ انقلاب

سلمیٰ اعوان

نخلِ امید کے سب پات جھڑ رہے تھے لیکن وہ نااُمید نہ تھا۔ اپنے ہم وطنوں کے دل میں جوت جگانے کے لیے حروف کو چنگاری بنا رہا تھا۔ اسے اُمید تھی کہ ایک دن اس کے خواب تعبیر پا لیں گے۔ ہم وطنوں میں دم بہ دم پھیلتی مایوسی ختم ہو کر رہے گی۔

اِس شاعر کا تذکرہ جس کے اشعار سے کئی ممالک کے سربراہ نالاں تھے

نزار قبانی سے میری پہلی شناسائی قاہرہ کی رعمیس اسٹریٹ کی ایک بک شاپ پر ہوئی۔ باہر ہواؤں میں بہت تیزی اور خنکی تھی۔ قاہرہ کا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور اندر میں کتابوں کو دیکھنے اور اُن کی پھولا پھرولی میں مگن تھی۔ جب میں نے باہر سے کتابوں کے بنڈل اندر آتے دیکھے۔

یہ نجیب محفوظ کی ''ثرثرہ فوق انیل'' اور'' قالت لی السمر اء'' نزار قبانی کی تھیں۔ اول الذکر نوبل انعام یافتہ نثر

کی کتاب اور موخر الذکر شاعری کا مجموعہ تھی۔

کتاب ہاتھوں میں لی تو مالک جس نے مجھے پاکستانی جان کر خصوصی شفقت کا برتاؤ کیا تھا، نے اِس پر نظر پڑتے ہی لطف و محبت و سرشاری سے کہا۔ ”نزار قبانی کا مجموعہ کلام۔ کیا شاعر تھا۔ عرب دنیا کا عظیم انقلابی شاعر۔“

میں نے انگریزی ترجمے کا پوچھا۔ مالک نے ملازموں سے کہا۔ مگر اُن کی جانچ پڑتال کے بعد پتا چلا کہ ختم ہو گیا ہے۔

بہر حال میری لگن اور کوشش کچھ کام نہ آئی۔ کتاب مجھے اسکندریہ سے بھی نہ ملی۔ تاہم نیٹ سے "The Brunette told me" مل گئی۔ شام کے اِس شاعر سے میرا پہلا تعارف روایات سے باغی اور رومانوی شاعر کے طور پر ہوا۔

اب کوئی تین سال بعد جب میں شام کی سیاحت کے لیے آئی ہوں۔ پہلے ہی دن ٹیکسی ڈرائیور نے اس کا گیت لگا کر اور مجھے بتا کر میری بھولی بسری یادوں کو تازہ کرنے کا سامان کر دیا۔ واہ کیا حسین اتفاق ہے۔ گیت سے میں نے لطف اٹھایا تھا۔

میری خاتون
میں دوسرے چاہنے والوں کے ساتھ
اپنا مقابلہ نہیں کرتا مگر
اگر دوسرا تمہیں بادل دیتا ہے
تو میں تمہیں بارش دوں گا
اگر وہ تمہیں لالٹین دیتا ہے
میں تمہیں چاند دوں گا
اگر وہ تمہیں شاخیں دیتا ہے
تو میں تمہیں درخت دوں گا
اگر وہ تمہیں بحری جہاز دیتا ہے
تو میں تمہیں سفروں پر لے جاؤں گا

شام کو زینبیہ واپس جاتے اور آج صبح پرانے دمشق آتے ہوئے شاعر سے مزید متعارف ہوئی۔

اس عظیم شاعر سے تفصیلی تعارف دمشق میں اس لڑکے کے توسط سے ہوا جو احمد فاضل تھا اور مجھے میرے شہر لاہور کے دلی دروازے جیسی مشابہت رکھنے والے Damascus Citadial کے گلیارے میں ملا تھا۔ محبت اور خلوص سے بھرا ہوا لڑکا۔ میں اِس دیوہیکل سے گلیارے کے ساتھ فٹ پاتھ پر کتابیں بکھیرے کھڑے بوڑھے شامی کے پاس رک کر کتابوں کو دیکھنے لگی کہ ناگہاں بھاگ دوڑ، سیٹیوں کی آوازیں، شور و غل نے حیرت زدہ کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے پر مجبور کیا۔

سامنے قدیم مگر شکستہ عمارتوں کی چھتوں پر لکن مٹی یا چور سپاہی کا کھیل جاری تھا۔ فائرنگ کا بڑا کھلا ڈلا تبادلہ ہو رہا تھا۔ لوگ دائیں بائیں پناہ گاہوں کی تلاش میں تھے۔ پہلے میں نے وہیں بیٹھے رہنے سے چمٹنا چاہا۔ مگر وہاں پولیس کے کچھ لوگ آ گئے تھے۔ ماحول میں عجیب سی دہشت اور سنسنی پھیل گئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ جہاں بیٹھی ہوں وہ جگہ تو سیدھی نشانے پر ہے۔

میں اُٹھ کر بھاگی۔ مگر فوراً ہی پلٹ آئی کہ لوگ گلیارے کے اندر پناہ گزین ہو رہے تھے۔ میں بھی ڈری سہمی سی ان کے ساتھ وہیں گھس گئی۔ اور یہیں اُس بے حد پیارے سے لڑکے سے ملاقات ہوئی جس کا نام احمد فاضل تھا۔ جو انگریزی بہت اچھی بول سکتا تھا۔ بینک میں ملازمت کا ابھی آغاز ہی کیا تھا۔ اِس واقعے کے بارے میں بتایا کہ چوری ڈکیتی کا کوئی کیس ہوگا۔ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔

آج لکھتے ہوئے سوچ رہی ہوں۔ تب یہ کہاں معلوم تھا کہ یہاں چند ہی سالوں بعد قیامتیں ٹوٹنے والی ہیں۔ یہ خوبصورت تہذیب و تمدن کا گہوارہ پُرامن سا ملک بیرونی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں، اُن کے پروردہ غنڈوں پہلے القاعدہ بعد ازاں داعش کے ہاتھوں پور پور زخمی ہونے والا ہے۔

اس وقت اِس چھوٹے سے واقعے نے ماحول کو ہراساں اور خوف زدہ کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی جیسے فلم کے کسی سین کی طرح سب کچھ غائب ہو گیا۔ لوگ باگ اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے۔ تاہم میرا احمد فاضل سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ جس سے باتوں کا سلسلہ چلتے چلتے نزار قبانی تک چلا گیا۔ میری اُس سے محبت اور لگن دیکھ کر اس نے پیش کش کی وہ مجھے اپنے دوست جس نے نزار قبانی پر پی ایچ ڈی کی ہے ملانے لے جا سکتا ہے اس کا گھر یہیں پرانے دمشق میں ہی ہے۔

جی چاہتا تھا لڑکے کی بلائیں لوں۔ لو بھئی یہ تو موجیں ہو گئیں۔

”میرے بچے میں تو تمہاری حد درجہ شکر گزار ہوں گی۔“

اُس نے اسی وقت فون ملایا۔ میری خوش قسمتی کہ فوراً رابطہ ہوگیا۔ تھوڑی دیر دونوں میں بات ہوتی رہی۔ پھر موبائل بند کرتے ہوئے وہ میری طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ”زکریا محمد کبرت اس وقت دمشق یونیورسٹی میں ہے۔ وہاں وہ پڑھاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد گھر پہنچے گا۔ اگر آپ پسند کریں تو یہ وقت ان کے اہل خانہ کے ساتھ گزار سکتی ہیں۔

”ہائے کیسا بھاگوان دن ہے۔ کیسی خوبصورت پیشکش سے ابتدا ہوئی ہے۔ خدا بہت مہربان ہے اور یہ عنایت اس کا خاص الخاص تحفہ ہے کہ کسی مقامی کے گھر جانا اور وہاں کی تہذیبی زندگی کی جھلکیاں دیکھنا بھی تو لکھنے لکھانے کے لیے اہم ہے۔“

قدموں میں تیزی، دل میں خوشی کا جل ترنگ اور نگاہوں میں دائیں بائیں کے ماحول کو دیکھنے اور جذب کرنے کی آتش شوق کا آلاؤ۔ چمکتی دھوپ بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے میں نے اوپر والے کا شکریہ ادا کیا۔

تاہم جب میں راستے کے پُرسحر منظروں پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل کا حال بند پنجرے میں قید کسی نئے نویلے پرندے کے پھڑپھڑانے جیسا ہی تھا۔ رومن کالموں اور امیہ مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے بس ایک طائرانہ سی نظر ان پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جانا کیسا روح فرسا سا تھا۔ دل پاگل تو وہیں بیٹھنے اور ڈیرے ڈالنے کا خواہش مند تھا۔ پیاسی آنکھیں بھی اِن کمال کے منظروں سے سیر ہونے کے لیے بیتاب تھیں۔ میں نے دونوں کی دلداری کی۔

احمد فاضل دو بار غلط گلیوں میں گھس گیا۔ اس کے سرعت سے پلٹنے اور میرے سستی سے قدم اٹھانے میں میری نظر بندی ہی کے چکر تھے۔ طارق بن زیادا سٹریٹ پر کہیں آگے جا کر گھر تھا۔

گھر کچھ اُس محاورے کا عکاس تھا کہ صورت کے نہیں سیرت کے ہم غلام ہیں۔ مرکزی دروازے کا گیٹ چوبی تھا۔ ڈیزائن سے گھٹا ہوا۔ دومنزلہ گھر کی بالکونیاں چوبی تھیں۔ عام سی جسامت والے ستون بھی غالباً چوبی ہی تھے۔ ہمارے ہاں کی طرح بالکونیوں کے چھجے بڑے خوبصورت اور ڈیزائن دار تھے۔ بیل کی آواز پر دروازے کی چھوٹی کھڑکی کھلی جس میں سے جھک کر اندر داخل ہونا پڑا۔ یقیناً گھر میں اطلاع تھی تبھی تو ایک نوعمر لڑکے نے دروازہ کھولتے ہی احمد فاضل کو نشست گاہ کا راستہ دکھایا تھا۔

نشست گاہ یا گھر کا ڈرائنگ روم عربی کلچر میں دیوان مستطیل سی صورت کا تھا۔ گھر کے اندر ڈیوڑھی اور باہر کھلنے والے دروازوں اور کھڑکیوں کی پیشانیوں پر محرابی صورت بنی پٹی آرٹ کی مینا کاری سے بجی کمرے کو انفرادیت دیتی تھی۔ چھت اونچی اور دو دیواروں میں بلندی کی سطح پر لمبوتری سی چار کھڑکیاں روشن دانوں کی طرز پر شیشوں سے روشنی آنے کا باعث تھیں۔ صوفے کا ایک سیٹ جدید وضع اور دوسرا قدیمی صورت لیے ہوئے تھا۔ کمرے میں دو الماریاں تھیں اور دونوں کے پٹ چوبی کندہ کاری سے مزین تھے۔

ابھی میں کمرے کے جائزے میں مصروف ہی تھی کہ جب کبرت اندر داخل ہوا۔ زکریا محمد کبرت اونچا لمبا خوبصورت نوجوان تھا۔ محبت سے ملا۔ میں نے اُس کی چھاتی پر بوسہ دیا۔

میرے عین سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اُس نے میرا حال احوال پوچھا۔ پاکستان کے بارے میں مختصراً بات ہوئی۔ پھر گفتگو کا رخ اپنے موضوع پر آگیا۔ اُس کے ایک سوال پر میں نے بے اختیار ہی کہا۔ ”کبرت، سچی بات ہے میں بڑی جذباتی سی کیفیت میں خود کو ڈوبا ہوا محسوس کرتی ہوں۔ ڈیڑھ دن نے ہی مجھے بتا دیا ہے کہ شاعر دمشق کی ہر ٹیکسی، گاڑی میں گھسا بیٹھا ہے۔ ہر دل میں دھڑک رہا ہے۔ ہر لب پر مچل رہا ہے۔ ہم جیسے سیاح جنہیں عربی کی پوری سمجھ نہیں پوچھنے پر جانتے ہیں اور جب جذبات میں مانوسیت کے رنگ گھلتے ہیں تو مزہ آتا ہے۔“

زکریا محمد کبرت کھلکھلا کر ہنسا اور بولا۔ ”آپ تو داستان گوئی میں بڑی ماہر لگتی ہیں۔“

میں ہنسی اور بولی۔ ”لکھنے والی ہوں نا کبرت۔“

بیسویں صدی کی عرب دنیا میں ایک بھی ایسا نایاب ہیرا نہیں جس نے عربی شاعری کو اتنی جدت اور توانائی دی۔ عورت کی محبت، اُس کے حسن، اس کے جسم کو موضوع سخن بنانے کی شاعرانہ روایت تو خیر صدیوں پرانی ہے۔ مگر اسے اس کی ذات کے ادراک سے آگاہی دینا شاعر کا عزم تھا۔ جوشیلی آگ کی مانند بھڑکتی اُس کی شاعری نے مسلسل ملکی، عرب دنیا اور اقوام عالم کے طاقتور لیڈروں کو تختہ مشق بنایا۔

اس مقبول شاعر کی پیدائش پرانے دمشق میں ہوتی۔ سال 1923ء تھا اور اس کا پورا نام نزار توفیق قبانی تھا۔

خاندان کا تعلق ترکی کے مشہور شہر قونیہ سے اور خاندانی نام اک بیک (Ak Biyik) تھا۔ ترکی زبان میں اِس کا مطلب ''کِس کی مونچھ'' ہے۔

دو بہنوں اور تین بھائیوں پر مشتمل یہ گھرانا روایات کا اسیر ہونے کے ساتھ ساتھ انقلابی بھی تھا۔ قبانی شامی تھا جبکہ ماں ترکی نژاد۔ چاکلیٹ فیکٹری کا مالک باپ توفیق قبانی شام پر فرانسیسی تسلط کے خلاف لڑنے والوں کو نہ صرف اخلاقی بلکہ مالی مدد بھی کرتا تھا۔ یوں حکام کی نظروں میں رہتا تھا۔ کئی بار جیل بھی بھیجا گیا۔

آبائی گھر Milthnah Alshahm میں تھا۔ پرانے دمشق کے ہمسائے میں۔ تعلیم بھی دمشق میں ہی ہوئی۔ قانون کی تعلیم بھی دمشق یونیورسٹی سے حاصل کی جو کہ پہلے سیریا یونیورسٹی کے نام سے مشہور تھی۔

روایت سے بغاوت کا عنصر اِس کے خمیر میں بچپن سے ہی تھا۔ اس کا واضح عملی اظہار پندرہ سال کی عمر میں ہوگیا تھا۔ کیونکہ اس سے دس سال بڑی بہن وصال نے خود کشی کرلی تھی۔ وہ جس سے محبت کرتی تھی اُس سے شادی کی اجازت نہیں ملی تھی اس دن اس نے چھوٹی بہن حیفہ کے گالوں پر زار زار بہتے آنسوؤں کو اُس نے اپنی پوروں سے صاف کیا اور بولا تھا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں حیفہ تمہارے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔''

اولڈ دمشق کی گلیوں میں جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُس نے اپنے دوستوں سے کہا تھا۔ ''میں اِن رسوم کے خلاف آواز اٹھاؤں گا۔ میں شاعر بنوں گا۔ عرب دنیا میں محبت کرنا جرم ہے۔ عرب روح ایک بڑے سے قید خانے میں بند ہے، میں اسے آزاد کروں گا۔''

اور اُس نے واقعی جو کہا تھا سچ کر دکھایا تھا۔

جب وہ ابھی کالج اسٹوڈنٹ تھا اُس نے شعر کہنے شروع کردیئے تھے اور پہلا مجموعہ بھی مرتب کرلیا۔ قالت لی السمر اء (براؤن بالوں والی گوری عورت نے مجھ سے کہا) یہ رومان اور جنس سے بھری شاعری تھی۔ ایسی شاعری جس نے عورت کو اس تنگ نظر معاشرے کی گھٹن زدہ حالت کا احساس دلانے اور اسے اپنے لیے آواز اٹھانے کے حق سے متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ شام جیسے پرانے قدامت پسند ملک میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا کردی تھی۔

یہ شاعری سوچ میں بنیادی تبدیلیوں کی عکاس تھی۔ یہاں عورت مرکزی تھیم کے طور پر نمایاں ہوئی تھی۔ اس مجموعے نے بہت سارے مسائل پر قلم اٹھایا تھا۔ مرد عورت کے تعلقات پر ہر زاویہ اور ہر رخ سے روشنی پڑی۔ انسانی اور سماجی رویے، مذہب کی اندھی تقلید اور انسانی سوچ کی آزادی، بے باکی، معاشرے میں مرد اور عورت کا صحت مند تعلق اس کے بڑے موضوع تھے۔ اس مجموعے کی ملک میں شدید مخالفت ہوئی۔ یہ نظم پڑھیئے اور تب کے مرد غالب معاشرے کے غصے اور اشتعال کا اندازہ لگائیے۔

تمہیں بدلنے کی میرے پاس طاقت اور اختیار نہیں
نہ ہی تمہارے طور طریقوں کے لیے وضاحت کی
کبھی مت سوچو کہ مرد عورت کو بدل سکتا ہے
جو ایسا کہتے ہیں وہ دغا باز ہیں
جو سوچتے ہیں
کہ انہوں نے عورت تخلیق کی
اپنی پسلیوں میں ایک سے
عورت مرد کی پسلی سے نہیں نکلی
کبھی نہیں

یہ وہ ہے جو اس کے رحم سے نکلا ہے
اُس مچھلی کی طرح جو پانیوں کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے

یہ وہ ہے جو اس کی آنکھوں کی روشنی کے دائروں میں
خود کو وہاں رکھنے کے خواب دیکھتا ہے

ایک اور جگہ دیکھئے۔ اس کی سوچ کی گہرائی اور تجربے کا کیسا دلآویز اظہار، عورت کو بیدار کرنے کی خوبصورت کاوش اور عام فہم زبان اور قاری کو اپنے ساتھ لپٹا لینے کا فن۔

بہت گہری محبت مت کر
جب تک کہ تمہیں یقین نہ ہو جائے
کہ دوسرا بھی تمہیں اسی گہرائی سے
پیار کرتا ہے
آج تمہاری محبت کی گہرائی
کل تمہارے زخم کا باعث بنے گی

اُس کی محبت کے جذبات سے لبریز نظموں نے اب سماں باندھ دیا تھا۔

میرا محبوب مجھ سے پوچھتا ہے
کہ میرے اور آسمان کے درمیان کیا فرق ہے
میرے محبوب فرق تو صرف یہی ہے

جب تم ہنستے ہو میں آسمان کو بھول جاتا ہوں
ذرا اِسے سنیے۔
چاند کو دیکھنا مجھے بہت پسند ہے
خاص طور پر تب
جب یہ ہلال کی صورت ہو
کیونکہ میں ہر اُس چیز سے پیار کرتا ہوں
جس کا کوئی مستقبل ہو

قبانی نے عورت کے متعلق جس انداز میں سوچا اور لکھا۔ ایسا پہلے بہت کم لکھا گیا۔ اس کی باغی سوچ نے عورت کو نئے راستوں اور نئی سوچوں سے آگاہ کیا۔ ریت اور رواج میں لپٹی عورت کو اس نے اہمیت دی اور اُسے اس کے ہونے کا بھرپور احساس دلایا۔

اے میری محبت، اے میرے پیار
اگر تم میرے پاگل پن کے لیول پر آجاتیں
تم اپنے زیورات پھینک دیتیں
اپنے بریسلٹ بیچ دیتیں
اور میری آنکھوں میں سو جاتیں

ایک اور جگہ دیکھیے۔

کبھی ایک ایسی عورت سے ناطہ نہ توڑو
جو تمہاری بہت سی خامیوں کو جانتی ہے
اور پھر بھی تم سے پیار کرتی ہے

یہاں دیکھیے اس کا ایک اور منفرد انداز

وہ سب کتابیں لے لو
جو میں نے اپنے بچپن میں پڑھیں
میری نوٹ بکس بھی لے لو
لے لو میرے سارے چاک
اور سارے قلم بھی لے لو
اور تختہ سیاہ بھی
بس مجھے ایک نیا لفظ سکھا دو
جو کان کی بالی کی مانند جھولے
میری محبوبہ کے کانوں میں

اُس وقت ملک چونکہ فرانس کے زیر تسلط تھا۔ تاہم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں نے اسے بہت سراہا۔ ان سراہنے والوں میں ایک بڑا نام اُس وقت کے وزیر تعلیم کا تھا جو ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ملک کا ایک بڑا قومی لیڈر بھی تھا۔

چونکہ تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا۔ دمشق کا سوداگر

گھرا۔اس لیے اسے نہ مخالفت کی پرواہ تھی اور نہ موافقت نے کوئی اثر ڈالا۔ قانون کی تعلیم مکمل ہونے پر وہ وزارتِ خارجہ سے منسلک ہوگیا۔

1946ء میں شام فرانس کی غلامی سے بھی آزاد ہوگیا۔ کلچرل اتاشی کے طور پر وہ بیروت، قاہرہ، لندن، استنبول اور میڈرڈ وغیرہ میں سفارت کاری کے فرائض سرانجام دینے لگا۔ ڈپلومیٹک کیریئر نے اُس کے ذہنی افق کو بہت وسعت دی۔

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ نے شاعر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ شاعر جس نے 1956ء میں اپنی نظموں میں عام فوجیوں کو سراہا تھا۔ باوجود یہ کہ مصر جنگ ہارا تھا مگر اس نے جنگ ہارنے کے باوجود جیت لی تھی۔ لوگ خوش تھے۔ ناصر کے لیے محبت کا طوفان تھا۔ مگر 1967ء کی چھ روزہ جنگ شاعر کے اعصاب پر بجلی بن کر گری تھی۔

''ھوامش علی دفتر النکبۃ'' کے عنوان سے اُس نے اپنا کلیجہ نکال کر گلیوں بازاروں میں پھینک دیا تھا۔

اے میرے غم زدہ وطن
بس ایک لمحے میں
تو نے محبت کی نظمیں لکھنے والے شاعر کے ہاتھ میں
خنجر تھما دیا ہے
ذرا اِن اشعار کے اندر جھانکیے۔
ہم اپنے آباء کے دامن پر داغ ہیں
ہمارے صحراؤں کا تیل
آگ اور شعلوں کا خنجر بن سکتا تھا
مگر
ہمارا تیل فاحشاؤں کے قدموں میں پڑا ہے

بیس بندوں پر مشتمل اس طویل نظم جس نے عرب قیادت کے لتے لیے۔ جمال عبدالناصر کو رگیدا۔ سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے اُسے لعن طعن کیا۔ خفیہ پولیس، حکومتوں کے بکار پردازوں کو صیغہ جمع متکلم ہم یعنی ذات کے دائرے میں گھسیٹتے ہوئے تنقید کی سان پر چڑھایا۔ ذرا دیکھیے تو

''اب اگر آسمانوں نے تمہاری ضمانت نہیں دی
تو اُسے کوسو مت
حالات کو بھی لعن طعن مت کرو
خدا انہیں فتح دیتا ہے، جنہیں وہ چاہتا ہے
خدا کوئی ہتھیار گھڑنے والا لوہار تو نہیں
یاد رکھو

جنگیں کبھی جیتی نہیں جاتیں
طاؤس و رباب کے ساتھ
ہمارے دشمن ہماری سرحدوں میں رینگ کر نہیں آئے
وہ تو چیونٹیوں کی طرح
ہماری کمزوریوں کے ذریعے آئے ہیں

ذرا اور دیکھیے شاعر نے کیسے کلیجہ چیر دیا ہے۔

اگر اتفاق و اتحاد کو ہم دفن نہ کر چکے ہوتے
اس کے نوخیز بدن میں سنگین نہ اُتار چکے ہوتے
اور اگر اتحاد باقی ہوتا
تو دشمن یوں ہمارے خون سے ہولی نہ کھیلتا

ایک طوفانی نظم عرب دنیا میں ہواؤں کے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہر جگہ پہنچی اور ہر زبان پر تھرکی۔ حتیٰ کہ لوگ حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے کرتے اچانک ایک دوسرے سے کہتے۔

''ارے تم نے نزار قبانی کی نظم پڑھی۔''

طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مصری حکومت نے ان کی تمام کتابوں کو بین کر دیا تھا۔ وہ تمام نظمیں جنہیں ام کلثوم نے گائی تھی جلا دی گئیں۔ جمال عبدالناصر سخت مشتعل تھا۔ شاعر کے مصر میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ اردن کا اصرار تھا کہ قبانی پر مقدمہ چلایا جائے۔

کہیں دایاں باز و نکتہ چینی کر رہا تھا کہیں بایاں بازو۔ مگر شاعر کو کچھ پرواہ نہیں تھی۔ وہ اگر نشتر چلا رہا تھا تو ساتھ ہی مایوس لوگوں کے زخموں پر پھاہے رکھ رہا تھا۔ وہ ان کی دلی کیفیات کی عکاسی کرتے ہوئے انہیں آس اور اُمید کی روشنی کا پیغام دے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا مایوسی بے عملی پیدا کرتی ہے یا بے ادراک تشدد۔ اُس کی نظمیں نئی نسل سے مخاطب تھیں۔

ہمیں ایک ایسی ناراض نسل چاہیے
جو جوش و جذبے سے معمور ہو
جو آسمان میں تہلکہ مچانے پر قادر ہو
جو تاریخ کی بنیادوں کو ہلا دے
ہمیں ایک نئی نسل کی ضرورت ہے
جو غلطیوں کو برداشت نہ کرے
جو گھٹنوں کے بل نہ جھکے
ہمیں جنوں جیسی نسل چاہیے
جو ہماری شکست پر غالب آسکے

......

عرب بچو
ساون کے قطرو
ہمارے بارے میں مت پڑھو
ہمارے نقش قدم پر مت چلو
ہم دغاباز اور تماشا گروں کی قوم ہیں
عرب بچو
آنے والے کل کو بتا دو
تم ہماری زنجیریں توڑ ڈالو گے

لکھنے پڑھنے کی نصف صدی پر پھیلا اس کا کام شاعری کی چونتیس کتابوں کے علاوہ نثر میں بڑے اہم اور ٹھوس موضاعات پر ہوا ، اخباروں میں مضامین کے ساتھ ... "الحیات" اخبار میں کالم نگاری بھی کی۔ پہلے بیروت میں ذاتی پبلیشنگ ہاؤس قائم کیا۔ پھر اُس کی شاخ لندن میں بھی قائم ہوئی۔ اُس کی زیادہ تر کتابیں یہیں سے چھپیں۔

اس نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی اس کی کزن تھی زہرہ اک بیک۔ ایک بیٹی حدبہ اور ایک بیٹا توفیق جو صرف بائیس سال کی عمر میں لندن میں ہارٹ اٹیک میں چل بسا بیٹے کی موت پر اُس کی نظم "دمشق کا چاند" بھی ایک شاہکار تھی۔

دوسری شادی اس نے ایک عراقی ٹیچر بلقیس الروی سے کی جو اُسے بغداد کے ایک مشاعرے میں ملی تھی۔ بلقیس سے اُسے بہت محبت تھی۔ نظار قبانی بیروت میں تھا۔ یہ 1981 کا زمانہ تھا جب لبنان سول وار کی لپیٹ میں تھا۔ وہ تو اخبار لینے کے لیے گھر سے نکلا تھا جب عراقی سفارت خانے پر بم بلاسٹ ہوا۔ سفارت خانے سے قریب تر ہونے کی وجہ سے اس کا گھر متاثر ہوا اور بلقیس تو عین موقع پر ہی دم توڑ گئی۔ یہ اس کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ وہ بکھر گیا تھا۔ بلقیس سے اسے بہت پیار تھا۔ اُس کی موت پر اس نے جو شاعری کی وہ مرثیہ گوئی کی تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

کہیں اس نے بلقیس کو بابل کی ملکہ کے عنوان سے مخاطب کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ کہیں نینوا کی لچکیلی شاخ کہا۔ کہیں عراقی بلند ترین پام کے بوٹے سے تشبیہہ دی۔ کہیں وہ کوئین اف شیبا تھی، کہیں میری بلونڈ جیسی۔ کہیں دجلہ کی کوئی نشیلی لہر، بہار کا پھول، حسین نیکلس، کہیں باوقار چال کی مورنی اور افریقا کی مادہ بارہ سنگا۔

عرب کی ساری جغرافیائی اور ثقافتی تاریخ سے تشبیہوں اور استعاروں کے ڈھیر لگاتے ہوئے اُس نے لکھا۔

شکریہ۔
شکریہ میری بلقیس کو مارنے کا شکریہ
اب جاؤ اور جام نوش کرو
شہید کی قبر کنارے
میری نظم بھی قتل ہوگئی

اپنی محبت اور غم و درد کے سمندر میں اُتر کر اس نے اپنے قاری کو کس، کس انداز میں اپنے احساسات میں شریک کیا۔ صرف چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

بلقیس
تم کیسے میرے شب و روز
اور میرے خوابوں کو اپنے ساتھ لے گئیں
تم نے سب خوبصورتیوں
اور سب موسموں سے کنارہ کشی کر لی
او میری زندگی میری جان، میرا پیار
میری نظمیں اور میری آنکھوں کی بصارت
تم نے کیسے مجھے چھوڑ دیا
ایک لفظ کہے بغیر

اس کے جذبات کے بہاؤ کو مثالوں کے احاطے میں لانا دشوار ہے۔ ایک اور جگہ اِس اظہار کا رنگ دیکھیے۔

بلقیس تم میرا درد ہو
وہ درد جو نظم لکھتے ہوئے
مجھے اپنے دل اور انگوٹھے
میں محسوس ہوتا ہے

1990 کی خلیجی جنگ پر اُس نے اپنی مشہور نظم میں کہا

شکست ہوئی
اس کے بعد ایک اور شکست
ہم کوئی جنگ کیسے جیت سکتے ہیں
اگر وہ سب
جنہوں نے فوٹو گرافر کے طور پر کام کیا
اور
پروپیگنڈا منسٹری میں جنگ لڑنی سیکھی

بلقیس کی موت کے بعد اُس نے بیروت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ وہ جنیوا اور پیرس کے درمیان متحرک رہا۔ پھر لندن میں سیٹ ہوگیا۔

گو اُس نے خاصا وقت لندن میں گزارا۔ مگر اس کے باوجود اس کی طاقتور شاعری اپنی بھرپور توانائیوں کے ساتھ عرب دنیا میں سفر کرتی رہی۔ دمشق ہمیشہ اس کی کمزوری

رہا۔ ایک طاقتور عنصر کے طور پر اُس کی شاعری میں جھانکتا
رہا۔ اپنی محبت اور پیار کا اظہار اُس نے بہت بار کیا۔
اپنی وفات سے صرف ایک سال قبل اس نے ''میں
دہشت گردی کے ساتھ ہوں'' جیسی شہرہ آفاق طویل سیاسی
نظم لکھ کر خود کو امر کر لیا۔ نظم میں وہ دہشت گرد انہیں کہتا ہے جو
دہشت گردی کی آڑ میں ملکوں پر تسلط جماتے اور معصوم لوگوں
کو خون میں نہلاتے ہیں۔ قبانی جسے دہشت گردی مانتا ہے وہ
گیارہ ستمبر والی نہیں نہ اس سے مراد فضول قسم کے دھماکے اور
قتل ہیں۔ اس لازوال نظم کا ہر مصرع موتی ہے، ہیرا ہے۔

''میں دہشت گردی کا حامی ہوں''
امریکا کے لوگوں کی ثقافت کا دشمن
مگر خود ثقافت سے عاری
مہذب لوگوں کی تہذیب کا بیری
مگر خود تہذیب سے محروم
امریکا
ایک فلک بوس عمارت کا نام
مگر دیواروں سے خالی
میں دہشت گردی کا حامی ہوں
ہمیں دہشت گرد کہا جاتا ہے
اگر ہم اسرائیلی بلڈوزروں تلے آکر
مرنے سے انکار کر دیں
اپنے لوگوں پر ہونے والے ظلم وزیادتی کے
خلاف آواز اٹھائیں
وہ ہماری دھرتی ملیا میٹ کر رہے ہیں
ہماری تاریخ مٹا رہے ہیں
ہمارے قرآن، ہماری انجیل کی تذلیل کر رہے ہیں
اگر ہمارا گناہ یہ ہے تو
واللہ کتنی خوبصورت ہے دہشت گردی
میں دہشت گردی کا حامی ہوں
اگر یہ مجھے
روس، رومانیہ، ہنگری اور پولینڈ سے آئے
مہاجروں سے بچا سکے
یہ مہاجر فلسطین میں آبسے ہیں
وہ ہمارے کندھوں پر سوار ہیں
انہوں نے القدس کے مینار
اقصیٰ کے دروازے
اور محرابیں چرالی ہیں
میں دہشت گردی کی حمایت جاری رکھوں گا
جب تک نیو ورلڈ آرڈر
امریکا اور اسرائیل کے درمیان
منقسم رہتا ہے
یہ میرے بچوں کا خون کرتا رہے گا
ان کے ٹکڑے کتوں کے آگے ڈالتا رہے گا
میں اپنی شاعری سمیت
اپنے لفظوں سمیت
اپنی ساری طاقت کے ساتھ آواز بلند کرتا رہوں گا
جب تک یہ نئی دنیا قصاب کی گرفت میں ہے
میں دہشت گردی کا حامی ہوں اور رہوں گا

اس نظم نے پوری عرب دنیا کے طول وعرض میں
طوفان برپا کر دیا۔ بڑی طاقتوں نے بھی شدید غصے کا اظہار
کیا۔ مگر شاعر نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔
اس کی موت پر جہاں دنیا بھر کے اخبارات نے
اُسے خراج تحسین پیش کیا۔ وہیں دمشق کے گلی کوچوں میں
اشک بہاتی آنکھوں نے ایک دوسرے سے ملنے پر کہا تھا۔
''جانتے ہو آج دنیا سے کون رخصت ہوا ہے؟''
وہ شخص جس سے بڑے بڑے ایوانوں میں بیٹھنے
والے چھوٹے اور بزدل لوگ ڈرتے اور نفرت کرتے
تھے۔ اُس کی آخری خواہش جس کا اظہار اس نے اسپتال
میں کیا۔ دمشق میں دفن ہونے کی تھی۔

''دمشق میرے لیے رحم مادر کی طرح ہے جس نے
مجھے شاعری سکھائی جس نے
مجھے تخلیق کار بنایا۔''

میں ملول تھی۔ شکر گزار تھی۔ عرب مہمان نوازی سے
لطف اندوز ہوئی تھی۔ شام کی ایک صاحب علم ہستی سے ملی
تھی اور اب باب صغیر جانے کی متمنی تھی جہاں وہ عظیم شاعر
دفن تھا۔ جب میں گھر سے نکلی تھی۔ اس کی ایک خوبصورت
نظم میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔

گرمیوں میں ساحل پر نیم دراز
تمہارے بارے سوچتا ہوں
اے سمندر اگر تمہیں یہ پتا چل جائے
کہ تمہارے بارے میں میں نے کیا سوچا
تو تم اپنے ساحلوں، اپنی سیپیوں، اپنی مچھلیوں کو
چھوڑ کر میرے پیچھے چلے آتے

❀❀

یہ 2000ء کے شروع کا ذکر ہے، ان دنوں میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ریاست ویسٹ ورجینیا کے ایک چھوٹے سے قصبے 'اوک ہل' میں رہتا تھا۔ ابھی یہاں صحیح طور پر ایڈجسٹ بھی نہ کر پایا تھا کہ میرا دانہ پانی اٹھ گیا.... اور مجھے یہاں سے 52 میل کے فاصلہ پر ساؤتھ چارلسٹن منتقل ہونے کا حکم نامہ آ گیا ابھی میں منتقل ہونے کے انتظامات کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اہم واقعہ رونما ہو گیا۔

میری عادت تھی کہ چھٹی والے روز، کسی ویران اور

شاھد لطیف

پُراسراریت کی دھند میں ڈوبی شخصیات ہر ملک و ملت میں دل جاتی ہیں لیکن ان کو سمجھنا آسان نہیں کیونکہ عقل کی کسوٹی پر انہیں پرکھا نہیں جاسکتا۔ مصنف سے بھی ایک ایسی ہی ہستی ٹکرائی تھی جو خود میں منفرد ثابت ہوئی۔

امریکا میں بسنے والے ایک پراسرار قبیلے کے وجدان کا تذکرہ

متروک قبرستان میں جا کر وقت گزاری کرتا۔ یہ دراصل مجھے شہر خموشاں میں قبروں کے کتبوں سے دلچسپی تھی۔ یہ کتبے گزرے وقت کی کہانی سناتے ہیں۔ ان پر رقم معلومات سے ان کے دور کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ اسی لیے میں اپنی 1989ء ماڈل کی ٹویوٹا ٹرک لے کر نکل گیا تھا۔ اِن ہی ایام میں ایک چرکی (جسے ہم لوگ چیروکی کہتے ہیں) خاتون، نورا (Nora) سے مُلاقات ہوئی جو اپنے آپ کو خالص چرکی کہلواتی تھی۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ مہرہ سب ہی ریڈ انڈین لگتا تھا۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے خاندانی لیکن متروک قبرستان میں لے آئی۔ اس قبرستان کے ٹوٹے اور جھولتے ہوئے صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہاں تو زمانے سے کوئی زندہ یا مردہ نہیں آیا میرے کہنے پر وہ مجھے قبرستان کے ایک قدیم مقبرے میں لے گئی جس کا آدھا دروازہ کب کا گر چکا تھا۔ بظاہر تو سورج کی روشنی کافی تھی لیکن اس مقبرہ میں کچھ کم محسوس ہوئی۔ اندر اوپر تلے کئی ایک تابوت رکھے نظر آئے۔ میں نے خواہش کا اظہار کیا کہ انہیں دیکھنا ہے۔

اُس نے پوچھا کہ میں تابوت اور صاحبِ تابوت کیوں دیکھتا ہوں؟

میں نے جواب میں کہا کہ ”معلوم نہیں“۔ اس پر نورا نے حیرانی سے مجھے دیکھا پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہم نے اُس کمرے میں اوپر تلے رکھے 9 تابوت کھول کر دیکھے۔ کافی دیر بعد جب شام ڈھلے ہم اُس مقبرے سے واپس ہونے والے تھے۔ نورا نے کہا اگر تمہیں یہاں سے کوئی چیز بطور یادگار لے جانی ہے تو وہ تم لے جا سکتے ہو۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔

میرے انکار پر وہ کچھ نہ بولی لیکن جب وہ شام کو میری فارمیسی میں آئی تو میں نے تھوڑی دیر کے لیے اپنے فارماسسٹ سے اجازت لی اور نورا کے ساتھ باہر آ گیا

نورا نے پوچھا کہ قبرستان میں کیا پریشانی تھی تمہارا چہرہ بتا رہا تھا کہ کوئی اہم بات نے تمہیں بے چین کر رکھا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے دفتر جوائن کرنے کے ساتھ ایک حکومتی ملکیت کا تخفیف شدہ کرایہ پر اپارٹمنٹ درکار ہے جو ریاستی ادارے کے تحت آتا ہو۔“

نورا مسکرائی اور کہا کہ فون بک یعنی ٹیلی فون ڈائرکٹری لاؤ۔ میں نے کاؤنٹر پر جا کر فون بک لی اور کیبن میں آ گیا اُس نے اپنے پرس سے کچھ رنگین کپڑوں کے ٹکڑے نکال کر ڈائرکٹری کے دائیں طرف رکھ دیئے پھر آنکھیں بند کر کے تاش کے پتوں کی طرح ڈائرکٹری کے صفحات کو چھیڑا۔ اُس کے بعد دو تین دفعہ کھولا بند کیا پھر بالآخر ڈائرکٹری کو کھول کر بند آنکھوں سے دائیں جانب کے صفحے پر دائیں ہاتھ کی انگلیاں پھیریں، ایک جگہ اُنگلی رکھ کر اپنی آنکھیں کھول دیں اور بغیر دیکھے کہا کہ اِس نمبر پر فون کر لو۔

اب جو میں نے وہ صفحہ دیکھا تو دانتوں تلے انگلیاں آ گئیں۔ یہ صفحہ اور اس سے ملحق کچھ اور صفحات ’رئیل اسٹیٹ‘ کے تھے اور خاص وہ صفحہ جہاں اُس نے انگلی رکھی تھی ہاؤسنگ اینڈ اربن ڈیولپمنٹ والوں کی پراپرٹی کا تھا۔

مجھے حیرت زدہ دیکھ کر وہ بولی۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم اب ہمارے ہو“۔ یہ کہا اور اُس نمبر پر فون تھما دیا۔ اُن سے کیا بات ہوئی وہ الگ ہے مگر کمال یہ ہوا کہ مخاطب بھی چرکی تھا۔ نورا نے کہا کہ وہ مجھے گھر دلانے میرے ساتھ 100 میل سے زیادہ کا آنا جانا بخوشی کرے گی۔ یوں ہم دونوں متعلقہ پتے پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ انٹر اسٹیٹ 64 موٹر وے (ایم 2) سے خاصی قریب تھی۔ ایک وسیع قطع میں قدرے نئے بنے ہوئے ایک منزلہ مکانات نظر آئے۔ راہنمائی کے اشارات کی مدد سے ہم اِس کمپلیکس کے دفتر پہنچ گئے۔ یہاں کے انچارج اور اُن کی بیوی بھی چرکی تھے۔ نورا نے آنے کا منشاء بتایا اور آناً فاناً وہ سب کاغذی کارروائی ہو گئی جو سرکاری طور پر کئی دِنوں میں ہوتی۔ چونکہ میری بیوی اور تین بچوں کو بھی یہاں رہنا تھا لہٰذا مجھے 3 کمروں والا ٹاؤن ہاؤس الاٹ ہوا۔ سامنے کی جانب ایک چھوٹی سی خوبصورت کیاری کے ساتھ مین گیٹ۔ نیچے کی منزل میں ایک لونگ روم، ایک بیڈ روم، ایک غسلخانہ اور باورچی خانہ اور اوپر کی منزل میں دو بیڈ روم اور ایک غسلخانہ۔ گھر کی پچھلی جانب چھوٹا سا باغ اور اسٹور روم۔ میرا گھر قطار کا آخری مکان تھا۔ اس سے کچھ فاصلہ پر ایک خشک برساتی ندی تھی جہاں درمیان میں پانی بھی تھا۔ ندی کے پار غیر آباد علاقہ اور اُس سے آگے جنگل۔ میرے گھر اور ندی کے درمیان بلدیہ والوں نے ایک بڑا سا موٹے پلاسٹک کا کوڑے دان رکھا ہوا تھا۔

واپسی کے سفر میں شدید برف باری ہو رہی تھی۔ مجھ سے زیادہ نورا خوش تھی۔ اُس کو اُس کے ٹریلر ہاؤس میں چھوڑا تو نورا نے کافی کی پیشکش کی۔

”تم کب شفٹ ہو رہے ہو؟“ کافی پیتے ہوئے بغیر تمہید کے اُس نے سوال کیا۔

’’کل دوپہر تک‘‘۔میں نے جواب دیا۔

کچھ سوچ کر وہ بولی۔’’کل رات تمہارے گھر مہمان آئیں گے اُن کی خدمت کرنا۔‘‘اِس پر میں نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا اور بائی بائی کر کے چلا آیا۔

میری کیا تیاری ہونا تھی اُس وقت تو صرف مسافری سامان ہی تھا جو کار میں آسانی سے سما گیا اور یوں میں دوپہر سے قبل ہی ٹاؤن ہاؤس میں منتقل ہوگیا۔فارمیسی کے مالک کی بیوی بھی میری مدد کرنے آئی اور میرے سازوسامان کو دیکھتے ہوئے ازراہِ ہمدردی اپنے ہاں سے کچن کی روزمرہ استعمال کی اشیاء اور کچھ برتن وغیرہ بھجوا دیئے۔میں ایک قصبہ سے آیا تھا اور یہ شہر... تھا لہٰذا گھومنے پھرنے اور نئی کھلنے والی فارمیسی دیکھنے چلا گیا جہاں مجھے کل سے کام کرنا تھا۔یہاں کی فارمسسٹ لبنانی تھیں۔وہ مجھے شہر کے دو انڈین اسٹوروں میں لے گئیں جہاں سے میں رات گئے گھر لوٹا۔اس وقت بھی ہلکی برفباری ہو رہی تھی۔میں نے دروازے میں چابی گھمائی ہی تھی کہ میاؤں کی آواز کے ساتھ دو عدد بلّی کے بڑے سائز کے بچے نظر آئے۔بے اختیار میں نے اُن کو پچکارا تو وہ دونوں میرے پیروں سے لپٹنے لگے۔دیکھنے میں تو عام سے تھے لیکن جو خاص چیز اِن میں بالکل واضح نظر آ رہی تھی وہ یہ کہ اُن پر برف کا کوئی نام ونشان نہیں تھا نہ ہی نرم برف پر اُن کے چلنے سے پاؤں کے نشان پڑ رہے تھے جو کہ دونوں ہی چیزیں ناممکن تھیں۔میں اِنہیں پچکار کر اندر لے آیا۔پلیٹ میں کچھ دودھ ڈال کر اُن کے آگے رکھا۔اور تھوڑی دیر اُن کو پیار کرنے کے بعد فرش پر بستر بنا کر لیٹ گیا۔دونوں بلّیاں میرے اوپر اُچھل کود کرنے لگیں۔رات کو سونے کے اعمال پڑھ کر بلند آواز سے اُن سے کہا کہ میں سونے لگا ہوں اپنا گھر سمجھ کر رہیں اور برائے مہربانی گندگی سے پرہیز کریں ۔ رات آرام سے گزری۔صبح اُن میں سے ایک میرے بازو پر دوسرا میرے پیٹ پر استراحت فرما رہا تھا۔اُن کی پلیٹ دیکھی جو ویسی ہی بھری ہوئی تھی۔پھر بھی میں نے وہ دودھ گرا کر پلیٹ کو اچھی طرح سے دھو کر دوبارہ دودھ ڈال کر اُن کے سامنے رکھا۔جو کہ اُنہوں نے سونگھ کر چھوڑ دیا۔میں ناشتے سے فارغ ہو کر فارمیسی جانے کی تیاری کرنے لگا۔جبکہ وہ میرے ساتھ ساتھ ننھی رہے۔دروازے سے باہر نکلا تو یہ بھی نکل کر کیاری میں بیٹھ گئے۔گھر کے اندر ان کو چاہتے ہوئے بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا کیوں کہ معاہدے کے تحت میں اپنے گھر میں پالتو جانور نہیں رکھ سکتا تھا۔ایک مرتبہ اور، دِن کی روشنی میں اِن کے برف پر چلنے کے تازہ نشان دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ دکھائی نہیں دیئے۔

فارمیسی سے چھٹی کے بعد اسلامک سینٹر چلا گیا وہاں سے انڈین اسٹور کے ٹھاکر پٹیل اور اُن کی بیوی کرن سے گپ شپ کی اور پھر گھر آ گیا۔حسبِ معمول دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ وہی بلّے دوبارہ نمودار ہوگئے۔وہی کل والی کہانی ہوئی فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے آج کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کیا اور وہ گھر کا معائنہ کر کے میرے سامنے ہی بیٹھ گئے۔اِسی طرح دو دِن اور گزر گئے لیکن انہوں نے گھر میں کوئی گندگی نہیں کی نہ ہی دودھ پیا۔یوں سنیچر کا دِن آ گیا۔اب دو دن میری چھٹی تھی۔میں دوپہر کو نورا سے ملنے اُس کے ٹریلر ہاؤس اوک ہل آیا۔وہ تپاک سے ملی۔

’’کہو!مہمان آئے؟‘‘ اُس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

’’آئے تو تھے!لیکن بات چیت نہیں ہوسکی۔‘‘میں نے جواب دیا۔

’’اچھا؟‘‘اس نے کہا۔

’’میں اُن کی زبان سمجھنے سے قاصر رہا۔‘‘میں نے جواباً کہا۔’’لیکن وہ میرے پاس خوش ہیں لیکن وہ ہیں کون؟‘‘لوہا گرم دیکھتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

’’تم سے اور تمہاری اشیاء سے مانوس ہونے کے لیے بھیجے گئے تھے۔تم نے ہمارے بزرگوں کو پسند کیا اُنہوں نے تم کو.....‘‘وہ کچھ اور کہتی کہ ایسا لگا جیسے کسی نے اُس کو بات کرنے سے منع کر دیا۔اِس کے بعد کسی سوال جواب کی ضرورت نہ رہی۔

میں نے کوئی اور سوال نہیں کیا۔اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

اس علاقے میں آنے کے بعد میں نے اپنا میوزک کا کام بھی شروع کر دیا۔گھر، فارمیسی، میوزک اور گھومنا پھرنا۔یہی مصروفیت تھی وقت گزرتا رہا۔یوں 2001ء آ گیا۔

وقت پر لگا کر اُڑ رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ستمبر کا مہینا آیا اور 11 تاریخ کو نیویارک ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں دہشت گردی کے واقعات ہوگئے۔ابھی کرسمس اور نئے سال کی چھٹیاں شروع نہیں ہوئی تھیں جب مجھے میوزک پروگرام کے سلسلے میں ہفتہ اتوار کی چھٹی کے ساتھ ایک چھٹی مِلا کر جرمن ٹاؤن، میری لینڈ جانا پڑا۔واپس آیا تو لبنانی فارماسسٹ کہنے لگی کہ ایف۔بی۔آئی والے تمہارا پوچھتے ہوئے آئے

تھے۔ کم وبیش یہی بات میرے محلہ والوں نے کہی کہ ہاؤسنگ اینڈ اربن ڈیولپمنٹ والے تمہارے بارے میں پوچھ گچھ کرتے پھر رہے تھے۔ میں گھر پہنچا تو ایک نظر میں علم ہوگیا کہ گھر کی تلاشی لی گئی ہے۔

اگلے روز دن کے دس بجے میڈیکل ریپ کی طرح کے لمبے اور چھوٹے قد کے دو افراد فارمیسی میں آئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ انتظار فرمائیں "فارمسسٹ ابھی آتی ہیں۔"

"ہم تم سے ملنے آئے ہیں!" اور اپنے ایف۔ بی۔ آئی کے بیج دکھائے۔

"ادھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" میں اُن دونوں کو لے کر سامنے رکھی کرسیوں تک آیا۔

اُنہوں نے کہا کہ وہ کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ضرور کیجیے۔

"ہمارا پہلا سوال تو یہ ہے کہ آپ ہمیں دیکھ کر ڈرے کیوں نہیں؟"

مجھے ہنسی آگئی۔ "جناب یہ ریاست ہائے متحدہ امریکا ہے۔ آپ دونوں یہاں کی ایف۔ بی۔ آئی سے متعلق ہیں تو ڈرنا کیسا؟ ہاں! اگر یہ پاکستان ہوتا اور آپ پاکستانی پولیس والے ہوتے تو میں آپ لوگوں کو دیکھ کر بیساختہ کھڑکی سے چھلانگ لگا دیتا، چاہے ہڈی ٹوٹ جاتی۔ کیوں کہ ہماری پولیس ہم جیسے عام آدمی کو پہلے مارتی ہے پھر سوال کرتی ہے۔ کم از کم آپ لوگ مجھے مار پیٹ کے بغیر پوچھ رہے ہیں تو کیسا ڈرنا؟"

میری اس بات پر لمبے قد والا ایجنٹ کہنے لگا کہ یہ صرف تمہارے ملک کا معاملہ نہیں بلکہ تمام تیسری دنیا کا یکساں مسئلہ ہے۔

اُس نے بہت سے سوالات کیے، ان میں بعض ذاتی اور نجی نوعیت کے بھی تھے۔ پھر جاتے جاتے یہ کہہ گئے۔ "ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تمہارے پاس اسلامک سینٹر کی چابی ہوتی ہے، اور میوزک تمہاری روزی کا بڑا ذریعہ ہے۔ قبرستانوں ویرانوں میں گھومنا پھرنا تمہارا شوق ہے۔ ہم دونوں ایک مرتبہ اور آئیں گے۔" یہ کہہ کر دونوں چلے گئے۔

ایف بی آئی کا آنا لبنانی فارمسسٹ کے لیے پریشانی کا باعث تھا حالاں کہ وہ تو مسلمان بھی نہیں تھی۔ کہنے لگی کہ اُس کا تجربہ ہے کہ خفیہ والے اتنی آسانی کے ساتھ پیچھا نہیں چھوڑتے لہٰذا اب آئیں تو انہیں کہیں باہر ملنا۔ فارمیسی میں کاروبار متاثر ہوجاتا ہے۔

میں نے کہا بہتر! اب آئے، تو اُن سے درخواست کروں گا کہ کہیں اور چل کر بات کرتے ہیں۔

چند روز بعد وہ دونوں پھر صبح صبح وارد ہوگئے۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے تو آپ لوگوں کے یہاں آنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ میری فارمسسٹ کو الجھن ہوتی ہے۔"

لمبے قد والا شخص کہنے لگا۔ "ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے۔" میرے گرین کارڈ سے متعلق کچھ بات چیت کی اور کہا کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جو ہوم ورک ہم کر کے لائیں اور سامنے والے کے جوابات اُس سے 100 میل کھا جائیں۔ تم خوش قسمت ہو۔" پھر کچھ توقف کے بعد سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"اپنے قریبی ساتھیوں (ہم وطنوں) سے بہت ہوشیار رہنا۔ ہمیں اُن ہی کی اطلاع پر بھیجا گیا ہے۔ اور اپنی جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ کا پُرزا نکالا۔ اِس پرچی پر پنسل سے ایک ٹیلیفون نمبر لکھا ہوا تھا۔ اسے بڑھاتے ہوئے بولا۔ خبردار رہنا، تمہارے قریبی لوگ، اوچھا وار کریں گے۔ جب بھی ایسا ہوا تو اس نمبر پر پیغام چھوڑ دینا۔ میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔ یہی کاغذ کا پُرزا ایف۔ بی۔ آئی۔ سے تمہارا صداقت نامہ ہے۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے پرزے کو ڈائری میں رکھ دیا۔

اِسی دوران پاکستان سے میرے والد صاحب، میری ہمشیرہ کے ہاں آگسٹا، جارجیا میں رہنے کے لیے آئے۔ اِن کی وجہ سے بہن کی طرف بھی آنا جانا لگا رہا۔ پھر وہ میرے خالہ زاد بھائی کے پاس کلینٹن، ریاست ایلاباما بھی گئے۔ اُن 7 ماہ میں میری ٹویوٹا ٹرسل نے 30000 میل کا سفر طے کیا۔ ہر ایک مرتبہ لمبے سفر پر جانے سے قبل میں اپنی وفادار ٹویوٹا ٹرسل ماڈل 1989ء کو فارمیسی کے پڑوس میں واقع بریک اینڈ مینٹیننس کی ورک شاپ میں لے جا کر اُس کو سفر کے قابل کرواتا۔ گورے میاں بیوی، آنرا اور باربرا یہ کاروبار چلاتے تھے۔ واضح ہو کہ 1500 ڈالر کی خریدی ہوئی اِس کار پر بتدریج اس سے کہیں زیادہ خرچ ہوچکے تھے۔ جیسے ورک شاپ والے کہتے میں ویسے ہی کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ آخر وقت تک یہ چلتی رہی۔ باربرا اور آنرا کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے میری اور کار دونوں کی مثال اپنے ریکارڈ میں رکھی ہوئی ہے کہ پرانی کار میں بھی 7 ماہ میں 30000 ہزار میل جاسکتے ہیں اگر موٹر ورک شاپ والوں کے مشوروں پر عمل کیا جائے۔

میری کار کے بارے میں باربرا نے کہہ دیا تھا کہ اب اسے شہر سے باہر نہ لے جایا جائے۔ اور مجھے اُس نے اپنی

والدہ کی 1992ء کی پانٹیک کار 2500 ڈالر میں دلوا دی۔ نورا اِس کار سے بہت خوش تھی کہا کرتی تھی۔ ''اِس کی قدر کرو یہ تمہاری خدمت اپنے آخری دم تک کرنے والی ہے۔''

راقم کے ساتھ ماضی میں بارہا ایسے واقعات پیش آئے تھے جن کا ''16'' کے عدد سے کوئی خوشگوار تعلق نہیں ہوا کرتا تھا۔ میں توہم پرست نہیں لیکن ایمان داری کی بات ہے اِس کار کا بھی سولہواں دن بری طرح سے تجسس میں گزرا کہ اب کچھ ہوا کہ جب۔ اِس کار کی عظمت یہ ہے کہ اِس کا پہلا ہی دِن تھا سنیچر کی چھٹی تھی، میں اپنی ہمشیرہ کے ہاں اگستا، جارجیا جانے کی نیت سے نکلا۔ راستے میں نورا کے گھر ہیلو ہائے کرنے کے لیے رُکا ہی تھا کہ ایک بنگلہ دیشی طالب علم، شفقت کا سیکی، (اوک ہل کے پاس) شہر سے فون آیا کہ اُس کا چھوٹا بھائی فہیم جو ڈھاکا سے آرہا تھا وہ چارلسٹن ویسٹ ورجینیا کی بجائے چارلسٹن ساؤتھ کیرولینا جا اُترا ہے۔ ظاہر ہے بے چارے اسٹوڈنٹ کے اتنے وسائل کہاں کہ ٹیکسی میں تقریباً چار سو میل جا کر بھائی کو لے کر آئے۔ ماشاءاللہ میری اِس کار کی یہ پہلی خدمتِ خلق تھی۔

یوں 2003ء ہو گیا۔ نورا سے ملنا جلنا اور اکٹھے ویرانوں، پرانے قبرستانوں اور مقابر میں آنا جانا جاری رہا۔ اِس دوران میوزک کی وجہ سے جب معاشی حالات مزید اچھے ہوئے تو اپنی زندگی کی پہلی نئی کار لی۔ میں ویک اینڈ پر ہی میوزک سے پیسے کمایا کرتا تھا لہٰذا نورا سے ملنا جلنا اب کچھ کم ہو گیا تھا۔ گاڑی کو لیے پندرہ روز ہوئے ہوں گے تو ایک ویک اینڈ پر کار دکھانے کے لیے نورا کے پاس گیا۔ اُس نے ایک نظر دیکھ کر کہا کہ ''اشارے ٹھیک نظر نہیں آتے۔'' پھر خاموش ہو گئی۔

میں نے دور کسی ویرانے میں چلنے کی خواہش کا اظہار کیا جس پر اُس نے کہا چلوں گی لیکن اپنی کھٹارا میں۔ پورے راستے اُس نے کوئی بات نہیں کی۔ لہٰذا میں بھی چپ رہا۔ اُس کی موجودگی میں پتا نہیں کیوں ایسا لگتا تھا کہ جیسے ہم کسی حفاظتی حصار میں ہیں اور ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اب کی دفعہ وہ کسی دریا کی قدیم گزرگاہ میں لے آئی۔ امریکی جس کو دریا کہتے ہیں وہ ہمارے ہاں کے دریاؤں ... کے مقابلے میں بہت کم چوڑے ہوتے ہیں۔ بہرحال وہ بھی کسی پرانے دریا کی گزرگاہ رہی ہوگی لیکن اب چارسو وحشت برس رہی تھی۔ وہاں کی خاک بھی برف آلود ہو چکی

تھی۔ مجھے لے کر وہ وہاں آلتی پالتی مار کے خود بیٹھ گئی اور مجھے بھی ایسا کرنے کو کہا۔ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ معلوم نہیں البتہ ایسا کرنے سے مجھے بہت سکون ملا۔ ایسا لگا گویا گرمی میں ٹھنڈے پانی سے غسل کیا ہو۔ پھر ہم واپس اُس کے ٹریلر ہاؤس آئے اور کافی پی کر جب میں رخصت ہونے لگا تو وہ کچھ رنگین پتلے پتلے کپڑوں کے ٹکڑے لائی اور میری نئی کار کے تمام شیشوں پر پھرا کر، بغیر کچھ بولے مجھے جانے کا اشارہ دیا۔ وہ رات کے ایک بجے کا وقت ہوگا جب میں اُسے بائی بائی کہہ کر گھر روانہ ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد میں انٹر اسٹیٹ پر تھا۔ مجھے ابھی چلتے ہوئے آدھ گھنٹا ہی ہوا ہوگا کہ اپنے پیچھے کچھ گڑ بڑ محسوس ہوئی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے پیچ در پیچ سڑک کے موڑ شروع ہو رہے تھے۔ واضح ہو کہ ریاست ویسٹ ورجینیا بالکل مری کی طرح ہے۔ میری کار آٹو ڈرائیو پر 65 میل فی گھنٹے کی رفتار سے جا رہی تھی۔ مجھے یوں لگا گویا کوئی میرے عقب میں بمپر ٹو بمپر چلا آتا ہے۔ میں نے پیچھے سے آنے والے ٹریفک کو دیکھتے ہوئے سڑک کے آہستہ رفتار والے حصہ کی جانب آنا چاہا تو پیچھا کرنے والے، جو میں ابھی سوچ ہی رہا تھا، وہ کر بھی گزرے یعنی وہ خود آہستہ رفتار والے حصہ میں آ کر باقاعدہ مجھے کنکریٹ کے میڈین median (جیسے ہماری موٹر وے میں آنے اور جانے والی ٹریفک کے درمیان کنکریٹ کی رُکاوٹ ہوتی ہے) کی جانب دبانے کی کوشش کرنے لگے۔ اب ایک طرف کنکریٹ کی ٹھوس رُکاوٹ اور دوسری طرف ایک کار جس میں کئی افراد سخت سردی میں بھی کھڑکیاں نیچے کیے قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے حتی الامکان کنکریٹ سے بچنے کی کوشش کی اور گاڑی کو سیدھا رکھنے کی سعی کرنے لگا۔ تب میں نے دیکھا کہ اب تو وہ کار میری کار سے خطرناک حد تک قریب آ چکی ہے اور ڈرائیور کی پچھلی نشست سے میں نے شاٹ گن کی نالی باہر نکلتے دیکھی۔ ٹھائیں! ایک فائر ہوا۔ میری کار کا ایک ٹائر پھٹ گیا۔ ٹھا! دوسرا فائر ہوا اور گاڑی یکدم قابو سے باہر ہوگئی۔ میری کار کے دائیں جانب کا اگلا اور پچھلا ٹائر تباہ ہوگیا۔ آٹو ڈرائیو پر 65 میل فی گھنٹے کی رفتار سے میری کار ایک دھماکے سے کنکریٹ سے ٹکرائی۔ بیٹری والی کھلونا کار کی طرح منہ سیدھا کر کے پھر اُسی رفتار سے 2 پھٹے ٹائروں کے ساتھ بے ڈھنگے طریقے سے چل کر ایک دفعہ اور ٹکرائی پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔

جب ہوش آیا تو میں ایک اسٹیٹ ٹروپر کی کار میں بیٹا تھا، کئی ایک پولیس والے بھی موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میرے جسم میں کوئی بڑی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی۔ ویسے تو ایک ایمبولینس اور پیرا میڈیکل اسٹاف بھی موجود تھا لیکن اللہ کے فضل سے ذہنی صدمے سے محفوظ رہا۔ اسٹیٹ پولیس والے نے بتایا۔ ''اِس جگہ کچھ لوگوں نے کھیل بنا رکھا ہے کہ ہفتے کی رات کوئی نئی کار، سستی، مہنگی، لیکن امپورٹڈ جس پر عارضی نمبر پلیٹ ہو، چلانے والا یا والی اکیلے ہو اور رات گئے کا وقت ہو تو یہ لوگ اُس اکیلے ڈرائیور کو ڈرا کر مجبور کرتے ہیں کہ وہ کنکریٹ سے ٹکرائے۔ یہی اِن کا کھیل ہے۔ موت کے اِس کھیل میں اب تک ۲ سے زیادہ اموات بھی ہو چکی ہیں۔ اسٹیٹ پولیس کے لیے یہ گروہ درد سر بنا ہوا ہے۔ اب تک تو یہ لوگ محض ڈرا کر ٹکرانے پر مجبور کرتے تھے لیکن آج پہلی مرتبہ فائرنگ بھی کی کیوں کہ تم نے اُن کو 'لفٹ' نہیں دیا۔ تم خوش قسمت ہو کہ اُنھوں نے سیدھے سیدھے تمھیں گولیاں نہیں ماریں صرف ٹائروں پر گولی چلائی۔''

میری گاڑی اتنا کچھ ہونے کے بعد صرف ایک طرف سے پچکی تھی باقی انجن، ٹرانسمشن، لائٹیں، بریک سب کچھ ٹھیک تھا۔ یہ کارروائی ایک پیچھے آنے والے ٹرک ڈرائیور نے دیکھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ کار ٹکرا کر کھڑی ہوگئی تو اُس نے یہ اطلاع اسٹیٹ پولیس کو دی اور فوراً روڈ پر محتاط رہیں' کے بہت سے چمکنے والے اشارے جا بجا پیچھے سے آنے والوں کے لیے رکھ دیئے کہ کہیں کوئی پیچھے سے آنے والا مجھ سے دوبارہ نہ ٹکرائے۔ تمھاری بے ہوشی کے دوران تمام قانونی کارروائی کر لی گئی ہے۔ انشورنس کمپنی کو...... بھی پولیس رپورٹ بھیج دی گئی۔ استعمال شدہ گولیاں اور کچھ خالی شیل بھی ڈھونڈ نکالے اور پولیس مکینک نے گاڑی کی تسلی کر لی کہ وہ ساؤتھ چارلسٹن تک آرام سے جا سکتی ہے۔

ہم لوگ اُٹھتے بیٹھتے امریکا مردہ باد کہتے رہتے ہیں، راقم آج جو یہ سطور لکھ رہا ہے وہ کسی انسان دوست امریکی کی بدولت ہی ممکن ہوا۔ مثلاً دنیا جہان کی کاروں میں صرف ایک اسپئر ٹائر ہوتا ہے۔ میری کار کے دو ٹائر گولی مار کر پھاڑے گئے تھے۔ اب اُن دونوں ٹائروں کی جگہ میری کار میں دو اور ٹائر موجود تھے۔ ایک تو میری کار کا اسپئر ٹائر ہوا لیکن دوسرا کہاں سے آیا؟ اِس سوال کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا۔

میں نے وہ کار ٹھیک ہونے کے لیے انشورنس کمپنی کے منظور کردہ موٹر گیراج میں دے کر کمپنی کے کھاتے میں ویسی ہی ایک رینٹل کار لے لی۔ نورا کو کار پر فائرنگ کا میں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ حادثے کے فوراً بعد والے ویک اینڈ میں اُس کی طرف جانے کا پروگرام بنا۔ میرے ساتھ اوپر تلے ہونے والے واقعات کی وجہ سے نورا پریشان تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے ایک بزرگ کے ہاں لے کر جائے گی۔

جب میں اُس کے ہاں پہنچا تو کچھ دیر وہ بالکل خاموشی سے مجھے تکتی رہی۔ پھر جب میں نے کار کے حادثے کی تفصیل بتانا چاہی تو اشارے سے منع کر دیا۔ مجھے بٹھا کر اندر گئی پھر وہ مکمل چر کی حلیے میں سج کر آ گئی۔ ہم دونوں اس رینٹل کار میں تقریباً 35 میل کے فاصلے پر واقع پریئٹ Pratt روانہ ہوئے۔ تقریباً 45 منٹ کا یہ سفر خوشگوار گزرا۔ یہاں نورا کے والد کے عزیز رہتے تھے۔ یہ بہت ہی چھوٹا قصبہ تھا۔ مکان پر ایک نگاہ پڑتے ہی بخوبی اندازہ ہو گیا کہ یہ کسی چر کی ریڈ انڈین کا گھر ہے۔ وہاں زیادہ تر اُنہی کے حلیے والے بچے بچیاں کھیل کود رہے تھے۔ یوں لگا کہ نورا بچوں میں کافی مقبول ہے۔ گھر کے سب چھوٹے بڑے مجھ سے ملنے آئے۔ گھر میں دو بزرگ بھی تھے ایک مرد اور دوسری خاتون۔ دونوں تپاک سے ملے البتہ اُن بزرگ خاتون نے میرے بائیں کاندھے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ کر کچھ کہنا شروع کیا جو میرے سر سے گزر گیا۔ میں نے پہلے بزرگ پھر نورا کے چہروں کی طرف دیکھا جس پر نورا نے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن بزرگ خاتون نے نورا سے کچھ کہا جو میں نہیں سمجھ سکا۔ مجھے نورا نے بتایا کہ یہ اُن کے خاندان کی ایک بڑی روحانی شخصیت ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ میں اب تک زندہ کیسے ہوں؟ اُصولاً تو اب تک مجھے خود اپنے تابوت میں ہونا چاہیے تھا۔ اب تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے عرض کرتا چلوں بعینہٖ یہی بات 8 سال قبل کراچی کی ایک روحانی شخصیت کہہ چکی تھیں۔ اور اُن کے کہنے پر کہ کراچی شہر سے فوراً نکل جاؤ، پر راقم نے عمل بھی کیا تھا۔ میں وہاں سے لوٹا تو بھی پریشانی گھیرے رہی۔

چھ مہینے اور گزر گئے، اب گرمیاں آ گئیں اور میرے اقتصادی حالات مزید بہتر ہو گئے۔ میں نے میوزک اور اس سے متعلق سامان، جیسے 16 ٹریک کا آڈیو مکسر، بھاری سامان کے اُٹھانے کے لیے فولڈ ہو جانے والی ٹرالی، ہال میں رکھے جانے والے بڑے اسپیکر، اسٹیج کے مانیٹر اسپیکر، اسٹیج لائٹنگ کا سامان، اسپیکر اور مائکروفون کی لیڈ کیبلز وغیرہ کے لانے لے جانے کے لیے اپنی کار واپس کر کے بالکل نئی ڈاج کارواں وین لے لی۔ اِس کی پچھلی سیٹیں نکال کر سامان برداری کی گاڑی بنا لیا۔ نورا نے اپنے اعتقاد کے لحاظ سے گاڑی کے سامنے والے بمپر پر رنگین کپڑوں کے ٹکڑے باندھ دیئے۔ وین کو لیے ابھی سولہواں دِن تھا۔ میں دواؤں کی ڈیلیوری دے کر واپس فارمیسی آ رہا تھا کہ سامنے روڈ پر آگے جانے والے ایک فارم ٹرک نے اچانک بریک لگائی۔ اُس کی بریک لائٹ خراب تھی میں نے بھی بریک لگائی لیکن میری وین کا اگلا حصہ اُس ٹرک سے جا ٹکرایا۔ اسٹیئرنگ وہیل اور ڈیش بورڈ کے ایئر بیگ نکل آئے اور انجن میں کوئی ایسی ٹوٹ پھوٹ ہوئی کہ وین اسٹارٹ نہ ہو سکی۔ انشورنس کے منظور شدہ گیراج والوں نے کہا کہ ایک نیا مرکزی کمپیوٹر کارڈ لگے گا جو پڑوس کے ملک کولمبیا میں بنتا ہے، یہ چھ ماہ سے قبل نہیں آ سکتا لہٰذا اب یہ وین اُس مدت کے بعد ہی مل سکے گی۔ نیز یہ کہ معاہدے کے حساب سے میں اپنی وین سے ملتی جلتی ایک رینٹل وین زیادہ سے زیادہ 3 ماہ کے لئے ہی استعمال کر سکتا ہوں اُس کے بعد مجھے اپنا انتظام خود کرنا ہوگا۔

وقت گزرتا رہا اور میری ڈاج وین تیار ہو گئی۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا کہ ایک دِن صبح وین کے اسٹارٹ کرنے پر ایک ایسی آواز آنے لگی جو پہلے نہیں سُنائی دی تھی۔ میں کھانے کے وقفے میں وین کو فارمیسی کے پڑوس کے گیراج میں لے گیا۔ میری بات سُن کر آئرے نے خود وین چلا کر ایک راؤنڈ لیا۔

''مبارک ہو!'' آئرا نے خوش ہو کر کہا۔

''کِس چیز کی؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ کیوں کہ میں تو کوئی منفی خبر سننے کو تیار تھا۔

''گاڑی میں مینوفیچرنگ فالٹ ہے۔ اب تمہاری لاٹری نکل آئی سمجھو۔''

میرے تاثرات سے عاری چہرے پر اُس نے رحم طلب نگاہ ڈالتے ہوئے اپنی بیوی باربرا کو آواز دے کر بلوایا۔ اور گاڑی میں خرابی کی تحریری رپورٹ دکھلائی۔ فرطِ خوشی سے باربرا کا بھی چہرہ دمک اُٹھا۔

''مسٹر لطیف!'' باربرا نے کہنا شروع کیا۔ ''آئرا نے

تحریراً، مینوفیچرنگ فالٹ کی رپورٹ دے دی ہے۔ ہم لوگ چونکہ ڈاج کمپنی کے منظور کردہ سروس اور ریپئیر شاپ والے ہیں لہٰذا اس کی بنیاد پر تمہارے حق میں کچھ بہتر ہونے والا ہے۔ تم اسی وقت، جہاں سے گاڑی لی ہے اُسی ڈیلر کے پاس وین لے جاؤ۔"

راقم تقریباً ساڑھے تین سو میل دور پڑوس کی ریاست میری لینڈ میں ڈیمپٹن ڈاج والوں کے پاس، سوا پانچ گھنٹوں میں پہنچ گیا۔ باربرا نے وہاں فون پر میری وین کی خرابی کا پہلے ہی بتلا دیا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اُن لوگوں نے رسماً وین کو چلایا اور فوراً ہی مجھے زبردست پیشکش کی، وہ یہ کہ میری پہلے والی 4 سیلنڈر، اسٹینڈرڈ ڈاج کارواں وین، 23 انٹرسٹ پر ملی تھی۔ اب بغیر کسی انٹرسٹ کے، 6 سیلنڈر والی فل لوڈڈ، گرانڈ کارواں اسپورٹس، جو اسٹینڈرڈ وین سے ایک فٹ لمبی اور ایک فٹ چوڑی بھی، مل رہی تھی۔ اِس کے ساتھ ایک سال کے لیے پیٹرول بالکل مُفت۔ اِس لکھت پڑھت کے بعد کہ میں نے یہ پیشکش اپنی رضامندی سے، بغیر کسی دباؤ کے قبول کی، مجھے یہ نئی وین مل گئی۔ یوں میں تھکن وکن سب بھول کر گھر کے لیے روانہ ہوگیا۔

اگلی شام فارمیسی بند کر کے میں سیدھا نورا کے ہاں گیا۔ یہ خبر سن کر وہ بھی خوش ہوئی گئی لیکن میری نئی وین میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔

"آخر تم نے مسلسل یہ تیسری نئی گاڑی سلور رنگ ہی کی کیوں لی ہے؟" نورا نے عجب سوال کر دیا۔

"پتا نہیں کیوں؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا تو تھا کہ کیا رنگ پسند ہے میں نے کہا کہ جو موجود ہو۔" اِس جواب کے بعد وہ خاموش ہوگئی اور میں جانے کے لیے اُٹھ بیٹھا۔ ویسے بھی رات ہو رہی تھی اور مجھے اگلی صبح 9 بجے فارمیسی کھولنا تھی۔

میں اِس نئی وین میں نیوجرسی، نیویارک اور اٹلانٹا، ریاست جارجیا بھی گیا، یوں 15 دِن ہوگئے۔ اور سولھواں دن آگیا۔ شام کے چھ بجے ایک اور ڈاج وین والے نے میری وین کو پیچھے سے ٹکر ماردی۔ ڈاج کے پچھلے اور اگلے بمپر جاپانی گاڑیوں کی طرح پلاسٹک کے نہیں بلکہ لوہے کے ہوتے تھے۔ میری گردن میں جھٹکا آیا اور گاڑی میں پیچھے خفیف سا ڈینٹ۔ اُس کی وین کو بھی کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وین چلانے والا کوئی گورا تھا۔ کہنے لگا کہ پولیس کیس نہ کرنا۔ ڈیل یہ ہوئی کہ وہ اپنی جیب سے میری وین کا کام کروائے گا اور میں پولیس اور انشورنس کے چکر میں نہیں پڑوں گا۔

یہاں ریاست ہائے متحدہ امریکا میں بھی 16 کے چکر سے واسطہ پڑ گیا۔ مزے کی بات یہ ہوئی کہ ڈینٹر پینٹر نے مجھے بڑی عزت سے اپنے سرپرست گاہک کا درجہ دے دیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ سرپرست کی حیثیت سے میں آئے دِن گاڑیاں مار کے اُس سے مرمت کروانے آؤں۔

حالات بتدریج بدلنے لگے۔ اور بقول ثاقب لکھنوی۔

اُن نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

قصہ مختصر یہ کہ پہلے میری ہفتے کی چھٹی ختم کی گئی پھر میرے پیسے بھی کم کر دیے گئے۔ قانونی طور پر میں ابھی یہاں سے کام چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ اِسی فارمیسی سے میرا ورک پرمٹ بنا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اب غلامی کا دور شروع ہوا۔ اوپر سے عین اُس زمانے میں فارمیسی والوں کے اِس "عمدہ سلوک" کی وجہ سے بیوی بچے میرے پاس آنے سے رہ گئے۔ اگر میرا میوزک کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید سب ٹھیک نہ ہوتا۔ میں نے اِس دوران روزانہ 5 سے 6 گھنٹے کی بورڈ کی خوب مشق کی۔ جب تک ممکن ہوا اِس کو کیش بھی کرایا۔ میرے زیادہ تر میوزک پروگرام ہفتے کی رات اپنی ریاست سے باہر ہوا کرتے تھے۔ اب جب ہفتے کی چھٹی ختم تو وہ کام بھی ختم۔ یوں مجھے مجبور ہو کر دیوالیہ پن چیپٹر 7 کا آٹومیٹک اسٹے لینا ہی پڑا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے دیوالیہ پن کے قوانین کے مطابق یہ حکمِ امتناعی فی الفور نافذ ہو جاتا ہے جس کی رو سے آپ کو قرض دینے والے، کریڈٹ کارڈ والے، گاڑی کی اقساط والے، کسی بھی قسم کے قرض خواہ اس چیپٹر کو فائل کرنے والے سے ایک ٹیڈی پائی کا تقاضا نہیں کر سکتے۔ اِس کا فیصلہ بینک رپسی کی عدالت میں ایک ہی نشست میں کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کا شکر کہ وہ میرے حق میں ہوگیا۔ ڈاج موٹر کمپنی، کریڈٹ کارڈ، کار انشورنس کمپنی کے نمائندوں نے عدالت میں اپنے موقف کے لیے کوئی وکیل یا نمائندہ سرے سے بھیجا ہی نہیں۔

ان سارے واقعات میں قارئین سمجھ چکے ہوں گے کہ چڑ کی خاتون نورا کے پاس ایسی کوئی نادیدہ قوت ضرور تھی جس نے مجھے ہر بار حادثات سے بچائے رکھا۔ میرا نقصان خود بخود پورا ہوا۔

سعید احمد خان

اس بات سے شاید ہی کوئی انکار کرے گا کہ اندازِ بیاں رنگ بدل دیتا ہے ورنہ تو اس دنیا میں کوئی بھی بات نئی نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے حروف کی گرہیں کھولتی، سماعتوں میں شہد گھولتی آواز جب ہوا کے دوش پر سفر کرتی، سات سمندر پار کے برصغیر پہنچتی تو اپنی الگ پہچان بنا کر ذہنوں کو اسیر کرلیتی۔ لوگ گھڑی پر نظریں جمائے اس آواز کو سننے کے لیے منتظر رہتے۔

فسوں ساز انداز بیاں کے ماہر کی روداد

ریڈیو کی دنیا بہت کمال کی ہوتی ہے۔ یہاں مصروف عمل اشخاص اپنی آواز سے لوگوں کو تعلیم تفریح اور معلومات پہنچانے کے لیے آواز کے اُتار چڑھاؤ سے تصویریں بناتے اور سننے والوں کو دکھاتے ہیں۔ سامعین تک جب ان کے جملے پہنچتے ہیں تو وہ بھی اپنے اپنے دماغ میں من چاہی تصویریں تخلیق کرنے لگتے ہیں۔

رضا علی عابدی بھی اپنی مدھور آواز سے تصویریں بناتے تھے۔ جادو جگاتے تھے اور دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ آواز کی

دنیا سے ان کا رابطہ بی بی سی سے ریٹائرمنٹ کے بعد ختم ہوگیا، لیکن اپنے تحقیقی کالمز اور تحریر کی سلطنت میں اپنے کام کی بنا پر دنیا بھر کے کروڑوں اردو بولنے والوں سے رابطہ، تعلق اور رشتہ استوار ہے اور یہ وہ رشتہ ہے جس میں سدا سلامت رہنے کی بہت قوت اور طاقت ہے۔

آواز کی دنیا میں شامل ہونے سے پہلے رضا علی عابدی اخبار سے جُوے ہوئے تھے۔ اس جہان رنگ و رعنائی میں اُن کی آمد تین نومبر انیس سو چھتیس کو رُڑکی اُتر پردیش میں ہوئی۔ یہ تاریخ پیدائش مختلف تحریروں کے مطابق ہے لیکن رضا علی عابدی نے ریڈیو پاکستان بہاول پور کے اسٹوڈیوز میں اُن کے اعزاز میں منائی گئی ایک شام میں اپنی حیات کے تمام بہار آفریں برسوں کی یادیں کچھ یوں سمیٹیں۔

میری تاریخ پیدائش 1935ء کی ہے، 1947ء سے پہلے جب تحریک پاکستان عروج پہ تھی میں کم سنی کے باوجود اس میں شریک تھا۔ اور ”لے کے رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان“ کے نعروں کی بچکانہ آوازوں میں ایک آواز میری بھی تھی، والد صاحب نے میرے لیے مسلم لیگ کے رضا کاروں کی یونیفارم سلوا دی تھی۔ میں ٹوپی اور یونیفارم پہن کر بہت فخر محسوس کرتا تھا۔ جلوسوں میں بھی شامل ہوتا تھا۔

بالآخر پاکستان بن گیا۔ ہم یوپی کے شہر رُڑکی میں رہتے تھے، 14 اگست کی رات بڑی ولولہ انگیز تھی، اس کی یادیں ہمیشہ میرے ہمراہ رہتی ہیں، اُسی رات آل انڈیا کے پاکستانی حصے کو ریڈیو پاکستان بننا تھا تو اس رات ہم جاگ رہے تھے۔ پاکستان کو انگریزی فرمان کے مطابق بننا تھا اور 14 اگست کی رات کو ہم نے جشن منانا تھا۔ میرے والد کی گراموفون اور ریڈیو کی دکان تھی۔ وہ دوسری عالمی جنگ کی خبریں بہت شوق سے سنا کرتے تھے گھر میں بہت عمدہ ریڈیو تھا۔ چھت پہ بہت بڑا ایریل لگا ہوا تھا، جس کی مدد سے وہ ریڈیو تہران، ریڈیو ماسکو، ریڈیو برلن سنا کرتے تھے، بعد میں بی بی سی شروع ہوا۔

14 اگست کی رات ریڈیو لاہور لگایا گیا اور ٹھیک 12 بجے وہاں سے مصطفیٰ ہمدانی نے پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس کا اعلان کیا، جس سے تاریخ کا دھارا مڑ گیا اور نیا عہد جنم لے کر تابندہ ہوگیا۔ اس وقت جگن ناتھ آزاد کا لکھا ہوا ملی نغمہ بھی سنایا گیا۔ گلیوں میں جشن کا سماں تھا، لوگ ناچ رہے تھے، گا رہے تھے۔

لوگوں نے قندیلیں بنائی تھیں ان کو روشن کر کے ہوا میں چھوڑا گیا۔ تاحد نگاہ دائرے کی شکل میں قندیلیں روشن تھیں۔ صبح ڈان اخبار میں پہلے صفحے پر پاکستان کا قومی پرچم اور صحیح سرکاری پیمائش دی گئی تھی۔ آزادی مل گئی، ہندوستان کی کچہری میں ساری رپورٹس ہندی میں لکھی جانے لگیں، یہ جذبہ دیکھیے کہ اُنھوں نے پندرہ اگست کے بعد یہ کام شروع کردیا تھا، ہم آج تک اردو کو نہیں اپنا سکے۔ شاید قومی جذبے میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔

ریڈیو پاکستان بہاول پور کے آنگن میں سجائی گئی شام میں رضا علی عابدی کے ساتھ سوال و جواب کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان کے فنی، تخلیقی اور تحقیقی سفر کی روداد کے دوران جب کسی جانب سے سوال اُبھرتا تو رضا علی عابدی گزرے دنوں کی بازیافت میں مصروف ہوجاتے تھے۔

وہ بتاتے ہیں۔ ”بچوں کے لیے کہانیاں میں نے بچپن میں ہی لکھنا شروع کردی تھیں۔ گھر میں ہفت روزہ پھول آیا کرتا تھا، لیکن وہ اس کے آخری دن تھے۔ امتیاز علی تاج اس میں تھے، قرۃ العین حیدر جو نو عمر لڑکی تھیں وہ اس میں لکھتی تھیں، پھول بند ہوا تو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پیام تعلیم نامی بچوں کا رسالہ نکلنا شروع ہوا وہ ہمارے ہاں آتا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیع الدین نیّر، حسان وغیرہ اس میں لکھتے تھے۔“

گزرے دنوں کی تصویریں بازیافت کریں تو اکثر دھندلی ہوتی ہیں لیکن رضا علی عابدی کا حافظہ کمال کا ہے۔ انہیں ان تصویروں کے ایک ایک رنگ، انگ اور انداز سے واقفیت ہے۔ وہ اپنے بچپن کی بازیافت کر رہے تھے۔ ”انہی دنوں دلی سے بچوں کے لیے کھلونا شروع ہوا۔ اس رسالے میں کرشن چندر، راجا مہدی علی خان جیسے لوگ بچوں کے لیے لکھا کرتے تھے، وہ رسالہ میں پڑھتا تھا اس میں اپنی تحریر بھی بھیجنے لگا تھا لیکن کبھی کچھ چھپا نہیں۔ ایک تقریب کا سلسلہ تھا۔ بڑے بھائی کی شادی کے سلسلے میں لکھنو، بذریعہ ریل گاڑی جارہے تھے، وہاں مجھے پہلی کتاب ملی، شفیق الرحمٰن کی لکھی ہوئی، حماقتیں۔ وہ میری پہلی بڑوں کی کتاب تھی جس میں عمدہ لطیفے تھے۔ میں نے حماقتیں کا لطیفہ کھلونا کو بھیجا وہ چھپ گیا، بعد میں ادریس دہلوی سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں بتایا کہ میں نے... حماقتیں آپ سے پہلے پڑھ لی تھی، تو انہوں نے جواب دیا جی میں ایسے معاملات میں ذرا دیر کردیتا ہوں بہر حال یوں میرا لکھنے کا سلسلہ جاری ہوا۔“

ہندوستان کی تقسیم نے مسلمانوں کو ایک نئی پناہ گاہ دی۔ دوقومی نظریے کی بنیاد پر جب ہندوستان، بھارت اور پاکستان کے نام سے ابھر کر سامنے آیا تو انگریز بہادر کو یہاں سے رخصت

ہونا پڑا۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہجرت عمل میں آئی۔ بہت سارے خاندان اور افراد تقسیم کے فوراً بعد ہی لٹے پٹے قافلوں کے ہمراہ اپنے اپنے مقام رزق تک پہنچ گئے، کچھ خاندانوں نے تاخیر سے سفر جاری کیا۔ جوش ملیح آبادی یہاں دیر سے آئے، رضا علی عابدی کا خاندان بھی ذرا دیر سے آیا۔ ان دنوں کی یاد رضا علی عابدی صاحب کے حافظے میں یوں محفوظ ہے۔ ''1950ء میں ہم کراچی آ گئے۔ یہاں میں نے روزنامہ جنگ میں بچوں کے صفحے میں لکھنا شروع کیا، پھر دوستیاں بڑھتی گئیں، فطرت میں صحافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، والد صاحب انجینئرنگ سے وابستہ تھے، میرے سارے بھائی بھی انجینئر بن گئے لیکن میں سب سے الگ تھا، کراچی آ کر میں نے میٹرک کیا۔ کالج میں داخلے کا وقت آیا تو فیصلہ ہوا کہ صحافت کی جانب جانا ہے، میرے لیے طے ہو گیا کہ یہ لڑکا ساری عمر جوتیاں چٹخاتا رہے گا اور خالی جیب لیے دُنیا گردی کرے گا، فاقے کرے گا۔ یہ بھی اور اس کے بال بچے بھی۔ صحافی اور وہ بھی اردو زبان کا! ہمیشہ بھوکا رہتا ہے۔ ان حملوں نے میرے عزم و حوصلے کو ڈگمگایا نہیں، ہاں یہ احساس ضرور ہوا کہ تمام بھائیوں میں، میں ہی ناکارہ ہوں۔ بی اے کے لیے اکنامکس رکھی۔ پولیٹیکل کا مضمون مجھے دلوایا گیا۔ اسی دوران جنگ میں مجھے ملازمت مل گئی۔ 1957ء میں، میں اخباری صنعت سے وابستہ ہو گیا۔''

''مجھے پہاڑ بہت پسند تھے۔ میں نے میر خلیل الرحمان سے کہہ رکھا تھا، مجھے راولپنڈی ضرور بھیجیے گا۔ چنانچہ مجھے تیس پینتیس کاتبوں کے ساتھ، ریل کے ڈبے میں بٹھا کر راولپنڈی بھیج دیا گیا۔

اخبار تیس پینتیس کاتبوں کے ساتھ چلتا تھا۔ ایڈیٹر دس بارہ ہوتے تھے۔ اس وقت تنخواہ ڈیڑھ سو روپے تھی۔ پنڈی میں پہلے دن جنگ نو ہزار، دوسرے دن گیارہ ہزار، تیسرے دن تیرہ ہزار چھپا، اور تیزی سے پندرہ ہزار کی تعداد تک پہنچ گیا اور ہماری تنخواہیں بڑھا کر دو سو کر دی گئیں۔ اس تنخواہ میں بھی ہم آٹھ آنے کے سالن اور چار آنے کی چپاتی میں گزار کرتے تھے۔ صعوبتیں تھیں، لیکن یہی صعوبتیں انسان کو بڑا بناتی ہیں، سخت جان کرتی ہیں۔

اسی دوران ویج بورڈ آ گیا، ہماری تنخواہ 330 روپے ہو گئی، اور ساتھ ہی شادی بھی ہو گئی، اسی (80) روپے کا فلیٹ کرایہ پر لیا، لیکن تنگی تھی۔ گزارہ مشکل تھا، حریت کراچی سے 500 کی آفر ہوئی تو وہاں چلے آئے۔ اسی دوران برطانیہ میں صحافت کی ٹریننگ کا موقع ملا، تو میں ویلز میں تین مہینے کی ٹریننگ کے لیے چلا گیا۔ یادگار اور خوشگوار دن تھے۔ وہ ملک مجھے بڑا منظم لگا۔ چنانچہ بی بی سی میں موقع ملا تو اطہر علی کی سفارش پر مختلف آزمائشوں سے گزر کر وہاں منتخب ہو گیا۔ یہ 1972ء کا واقعہ ہے''۔

اور یہی ایک صحافی کے براڈکاسٹر بننے کا مرحلہ ہے۔ یہ عابدی صاحب کی زندگی کا انوکھا تجربہ تھا جس میں عملی شمولیت نے انہیں شہرت عام بقائے دوام کے دربار میں لا کھڑا کیا۔ رضا علی عابدی اس منظرنامے کو کس طور دیکھتے ہیں، ذرا انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ ''میں تحریری شعبے سے تقریری شعبے میں آ گیا، یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ میری عبارت تقریری نہیں تحریری ہوا کرتی تھی، بی بی سی میں مجھے اپنی لکھی ہوئی عبارت کو پڑھ کے سُنانا تھا۔ بہت جلد میں نے اپنے آپ کو اُس ماحول میں ڈھال کر گفتگو کی زبان لکھنا شروع کر دی، کیونکہ دنیا بدل گئی تھی۔ اپنی لکھی ہوئی عبارت پڑھتے ہوئے مجھے پتا چلا کہ کون سے الفاظ کی ادائیگی مشکل ہے، کن الفاظ سے اب گریز کرنا ہے، میں نے بہت جلدی یہ بھید پا لیا کہ گفتگو کی زبان، سب سے زیادہ شیریں اور اثرانگیز ہوتی ہے، چنانچہ میں نے اپنی تربیت کی اور مجھے اس پر ناز ہے کہ میں بول چال کے لفظ لکھتا اور بولتا ہوں۔ میری کوئی سی کتاب پڑھیں، آپ کو لگے گا میں بول رہا ہوں، گفتگو کی زبان سے زیادہ شُستہ شائستہ، سہل زبان اور کوئی نہیں ہوتی۔''

''1972ء میں پہلے پہل جب ریڈیو کی دنیا میں داخل ہوا تو یہ گُر سکھایا گیا کہ اپنی آواز سے محبت کرو۔ حقیقی تربیت گزرتے وقت نے کی، اور میں نے یہ گُر، گرہ میں باندھ لیا کہ اپنی زبان سے نہیں، اپنے سُننے والوں سے محبت کرو، میں خوش نصیب ہوں میں نے سُننے والوں سے محبت کی جواب میں مجھے بھی محبت ملی۔''

اس واقعے اور تجربے کو رضا علی عابدی صاحب نے اپنی کتاب ریڈیو کے دن میں تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے اور اس میں انہوں نے اس اَمر کا بارِ دِگر اعتراف کیا ہے کہ سُننے والے سے محبت کریں گے تو وہ آپ کو محبت، چاہت اور اپنائیت کے بلند و بالا راج سنگھاسن پر بٹھا دے گا۔ جب آپ دوسروں کو اہمیت دیں گے تو جواب میں آپ کو محبت، توجہ اور عنایت ملے گی۔ اور پُرخلوص محبت کا تو کوئی مول ہی نہیں ہے۔ ہماری اخلاقی اقدار، رویے اور تعلیمات یہی سکھلاتی ہیں کہ دوسروں کو اہمیت دیں۔ انسانیت کا پیغام ہی یہی ہے۔

بات زندگی آموز رویّوں کی ہوئی، ہم ساری زندگی سیکھنے کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ دانشوروں کی باتیں بھی ہمیں زندگی کا حقیقی چہرہ و عکس دکھانے میں معاونت کرتی ہیں۔

لوگ برطانیہ اور پاکستان کا موازنہ کرتے ہیں، میں اُنہیں سختی سے ٹوک دیتا ہوں، میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ موازنہ نہ کریں، وہ اور دنیا ہے، یہ اور دُنیا ہے۔ ملتی جُلتی دنیا کا موازنہ بنتا ہے۔ انگریزوں میں خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہت جلدی پرکھ لیتے ہیں اور خوبیوں کو اوپر لاتے ہیں، میرا ریڈیو سے تیس سال تعلق رہا ہے، میں جو لکھتا تھا اُسے نشر ہونے سے پہلے کوئی نہیں دیکھتا تھا، ایک دو مرتبہ حماقتیں ہوئیں تو معذرت کرلی، لیکن میں نے کبھی کچھ ایسا نہیں کہا جو ناگوار گزرے، بہر حال مجھ پر اعتماد کیا گیا تو میں نے اُسے ٹھیس نہیں لگائی اُس کے لیے محنت کی۔

جب مجھے پتا چلا کہ رضا علی عابدی ایک حیثیت اختیار کر رہا ہے تو مجھ پر بھاری ذمے داری عائد ہوگئی کہ اپنی شہرت میں کمی نہیں آنے دینی، اور اپنے آپ کو راہ سے ہٹنے نہیں دینا، آف دی ٹریک نہیں ہونے دینا، وہ احساس آج تک ہے، آج بھی جنگ میں چھ کالم کی سطر مجھ سے کہتی ہے دیکھو تمہارے نام پہ کہیں حرف نہ آئے، یہ بات ستاتی ہے اور یہی بات حوصلہ بڑھاتی ہے، اسی بات نے مجھے ایک مقام پر قائم رکھا ہے، اور یہی اپنے آپ کو دریافت کرنا ہے۔

میں بے شمار لوگوں سے ملا، اُن سے گفتگو کی، مہدی حسن سے لے کر محمد رفیع تک، حکیم محمد سعید سے لے کر نوشاد علی تک لوگوں سے ملا، سیاست سے ہمیشہ گریز کیا، میرا رجحان فیچر کی طرف زیادہ تھا سو بے مثال فیچرز پیش کیے۔ مجھے سہولتیں ملیں، وسائل ملے۔ جرنیلی سڑک کرنے کے لیے جب میں کراچی ائیر پورٹ سے دلّی جا رہا تھا تو غیر ملکیوں کا پنجاب سے انڈیا میں داخلہ اندرا گاندھی کے قتل کی وجہ سے بند تھا، لیکن وسائل کے کمال کی وجہ سے میں کراچی سے دلّی گیا، وہاں میں نے کتب خانہ فیچر پروگرام کیا، یہ انڈیا آفس لائبریری کی کتابوں پر تھا، پروگرام مقبول ہوا تو جرنیلی سڑک کیا۔

پشاور سے کلکتہ تک سفر کر کے یہ فیچر پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ پھر شیر دریا کے ساتھ سفر ہوا۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے ریل کہانی ترتیب دی، اُس وقت تک فیچر کا رجحان ختم ہو رہا تھا اور کرنٹ افیئرز کے پروگرام مقبول ہو رہے تھے۔ بقیہ فیچرز کو تو میں نے جوں کا توں کتابی شکل میں ڈھال دیا، لیکن ریل کہانی کے لیے میں نے مزید تحقیق کی اور پھر اس کو مکمل کر کے چھاپ دیا۔ وہ بھی سفر نامہ ہے۔ میرے یہ سارے فیچرز یوٹیوب پر موجود ہیں۔

بچوں کا پروگرام شاہین کلب ہوا کرتا تھا اُس میں ڈاکٹر عائشہ صدیقہ کی والدہ جمیلہ ہاشمی مرحومہ بچوں کے لیے لکھ کر لایا کرتی تھیں وہ بھی یادگار دن تھے۔

بات ذرا چند برس پہلے کی ہے۔ ہمارے مزاج میں سیل فون شامل نہیں ہوا تھا۔ گفتگو اور رابطے کے لیے ٹیلیفون کا سہارا لیا جاتا تھا یا پھر چچا غالب کی پیروی میں خط لکھے جایا کرتے تھے۔ کیا دلکش، دلدار، سوہنی، سجیلی اور نستعلی روایت تھی۔ آدھی ملاقات کو الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی بُنت سے پوری ملاقات بنا لیا جاتا تھا۔ ریڈیو جو قوم اور عوام کے دل کی آواز ہے، اس کے سامعین مختلف پروگراموں سے منسلک رہنے کے لیے خط لکھا کرتے تھے۔ ہر اہم تہوار پر تہنیتی کارڈز بھیجے جاتے تھے۔ خطوط میں یوں لگتا تھا کہ ہم سب ایک قبیلے سے ہیں، چوپال سجی ہوئی ہے، بیٹھک جمی ہوئی ہے، داستانیں سنی جارہی ہیں، کہانیاں کہی جارہی ہیں، مشروبات سے تواضع کی جارہی ہے اور محبتیں بہار رنگ لٹاتی پھر رہی ہیں۔ موبائل فون نے تعلقات کی ساری چاشنی چھین لی اور بدلے میں صرف مادیت پرستی دی۔

بی بی سی لندن اردو سروس کا ایک اور مقبول پروگرام تھا انجمن۔ اس پروگرام میں سامعین کے خطوط کے جواب شامل ہوتے تھے، رضا علی عابدی سے پہلے یہ پروگرام تقی احمد سیّد کیا کرتے تھے۔ ایک بار تقی صاحب بیمار ہو گئے تو انجمن کا انتظام مجھے سونپ دیا گیا، اور پھر یوں ہوا کہ تقی صاحب صحت یاب ہو کر واپس آ گئے مگر انجمن پروگرام میرے ہی پاس رہا۔

’’میں نے تیس سال تک سننے والوں کے کانوں میں شائستہ، شُستہ، نفیس زبان پہنچائی اور مجھے اس پر ناز ہے۔ میرا سننے والوں سے گہرا رشتہ بندھ گیا تھا۔ میں نے پروگرام کا مزاج ہی بدل دیا۔ ہم نے سامعین کے مسائل اُن تک پہنچائے، اُن سے شیئر کیے۔ ایک خط آیا اجمیر شریف سے کہ برسوں گزر گئے ہمارے ہاں اولاد نہیں ہوئی، ہمارے لیے دُعا کرائیے۔ ہم نے خط پڑھا، لاکھوں لوگوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ سال بعد خط آیا کہ میری بیٹی پیدا ہوئی ہے، میں نے اس خط کو بھی نشر کیا۔ یہ اجمیر، محلہ شور گراں کا واقعہ ہے، میں وہاں دورے پر گیا تو خوشخبری والا خط رکھ کر لے گیا، گھر پہنچا، مشرف نام تھا ان کا، بیٹی کا نام رضوانہ رکھا تھا۔ انہوں نے میری بڑی خاطر مدارت کی، بہر حال کہنا یہ تھا کہ میرا اس طرح جو رشتہ سامعین سے بنا وہ میرا قیمتی اثاثہ ہے، اس پر مجھے ناز ہے، وہ

فرزانہ اب 33،32 سال کی ہے، پہلے کلو تھی، اب ''تمیں سال بعد'' کے عنوان سے کتاب لکھی تو اس میں اس کا حوالہ بھی ہے، اب اس کے ہاں تین بچے ہیں، میں نے اُسے گلو کہہ کر مخاطب کیا تو کہنے لگی۔ ''اب میں گوری ہوگئی ہوں۔'' اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد عوام میں ریڈیو کی حیثیت اُجاگر کرنا ہے۔''

انجمن میں تین طرح کے خطوط آتے تھے۔ تعریفی کلمات سے بھرے ہوئے خط۔ دوسرے نمبر پر شکایتی خط اور تیسرے نمبر پر وہ خطوط آتے تھے جن میں انسانی جذبات کا اظہار کیا گیا ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر دادا جان علیل تھے، چل بسے۔ والدہ بیمار ہیں مگر اس حالت میں بھی پروگرام سنتی ہیں۔ باجی کے ہاں جُڑواں بچے پیدا ہوئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ان جذبات کا احترام کرتے ہوئے حسب حال جواب دیتا تھا اور یہی عنصر مقبولیت کو فروغ دیتا ہے، دلوں میں بٹھاتا ہے۔ جب ہم دوسروں سے اُن کی، اُن کے مزاج کی اور ان کے دل کی باتیں کرتے ہیں تو وہ ہمارے بہت قریب ہوجاتے ہیں۔ ''انجمن'' کا مرکز ومحور نو برس تک بنا رہا۔ عابدی صاحب لوگوں سے ان کے دل کی باتیں کیا کرتا تھا اور یہ طے ہے کہ جو آپ سے آپ کی بات کرتا ہے، ہم سے ہماری ہی بات کرتا ہے ہم اس کو دل کی گہرائیوں میں برتر مقام دیتے ہیں۔ براڈ کاسٹنگ کا سب سے بڑا اعجاز یہی ہے کہ بات ایک دل سے نکلے اور دوسرے دل میں اُتر جائے۔

انجمن نے ریڈیو کی ریت روایت کے مطابق سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے اور لندن سے بولنے والے صداکاروں کو محبت کے ایک رشتے میں پرو دیا۔ اور یقین کر لیجیے کہ محبت کے موتیوں سے پروئی ہوئی لڑیاں بڑی پائیدار ہوتی ہیں، بہت مضبوط ہوتی ہیں۔

فیچر، خبر، لکھنے، پرفارم کرنے میں، سب سے مرکزی کردار زبان کا ہوتا ہے، چنانچہ زبان سادہ آسان اور عام فہم ہو تاکہ ابلاغ مکمل ہوسکے۔ دوسرے عناصر ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہماری کوشش ہو کہ زبان عام اور بول چال کی ہو۔

بہاول پور، دار السرور صحرائے چولستان کی سنگت میں سانسیں لینے والا خوبصورت ڈویژن ہے جس کے تین اضلاع ہیں، بہاول نگر، رحیم یار خان اور بہاول پور۔ صحرا، جنگل، میدان، زرعی رقبے سے آراستہ اس ڈویژن کے سارے قدرتی منظر، اور تہذیبی رویّے اپنی پہچان آپ رکھتے ہیں۔ بہاول پور ما قبل اسلامی ریاست تھی۔ نواب سر صادق محمد خان اس ریاست کے آخری فرمانروا تھے۔ انہوں نے پنڈت نہرو سے تاریخی جملہ

ثوبان رضی اللہ عنہ

(وفات 54ھ/673ء) صحابی۔ ابوعبداللہ کنیت۔ آپ یمن کے مشہور حمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ثوبان غلام تھے آنحضورؐ نے خرید کر آزاد کردیا اور فرمایا ''دل چاہے تو اپنے خاندان والوں میں چلے جاؤ اور دل چاہے تو میرے ساتھ رہو۔'' حضرت ثوبان نے اس شرف کو خاندان پر ترجیح دی اور آنحضورؐ کی خدمت میں رہنے لگے۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد مدینہ میں طبیعت نہ لگی اور یہاں سے شام چلے گئے اور رملہ میں سکونت اختیار کرلی۔ بعد میں رملہ سے حمص منتقل ہوگئے اور یہیں وفات پائی۔ ثوبان آنحضورؐ کے خادم خاص تھے اور مسلسل آپؐ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ انہیں آنحضورؐ سے استفادہ کرنے کا زیادہ وقت ملا تھا۔ انہیں 127 حدیثیں از بر تھیں بقول حافظ ابن عبدالبر ثوبان ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے حدیثیں محفوظ کیں اور ان کی اشاعت بھی کی۔'' ثوبانؓ کے تلامذہ میں معدان بن طلحہ، راشد بن سعد، جبیر بن نفیر، عبدالرحمان ابن غنم، ابوادریس فولانی قابل ذکر ہیں۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد جو جماعت صاحب علم وافتا تھی ثوبان اس کے ایک رکن تھے۔ لوگ ان سے احادیث سنتے تھے۔ ان کے معاصرین دوسروں سے سنی ہوئی حدیثوں کی تصدیق ان سے کراتے تھے۔ آنحضورؐ کی حیات مبارکہ میں اور وفات کے بعد بھی دونوں زمانوں میں آپ کا فرمان مبارک ثوبانؓ کے پیشِ نظر رہتا تھا۔ ایک مرتبہ زبان نبویؐ سے جو کچھ سن لیا وہ ہمیشہ جان کے ساتھ رہا جس چیز میں بھی آنحضورؐ کے حکم کی خلاف ورزی کا ذرا سا بھی پہلو نکلتا ہوتا وہ ہمیشہ اس سے محترز نہ رہتے۔

مرسلہ: نعمان اشرف، پشاور

کہتے ہوئے ریاست بہاول پور کا الحاق پاکستان سے کیا تھا۔ وہ جملہ ہے۔ ”پاکستان میرے گھر کا سامنے والا دروازہ ہے اور بھارت پچھلا دروازہ۔ ہر شریف آدمی اپنے گھر کے سامنے والے دروازے سے داخل ہوتا ہے، پچھلے دروازے سے نہیں۔ بہاول پور کی پہچان اس کی اعلیٰ علمی روایات، تہذیبی اقدار اور ثقافتی رویے ہیں۔ یہاں تعلیمی اداروں کی کثرت ہے۔ اسی بنا پر میں نے بہاول پور کو تعلیمی اداروں کا، درسگاہوں کا جمعہ بازار قرار دیا۔

یہ سال دو ہزار تیرہ کے ماہ نومبر کی بات ہے۔ حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ کی صوفیانہ شاعری کی تاثیر اس خطے کی ایک الگ شناخت ہے۔ ہفت زبان شاعر کی صوفیانہ فکر سے آراستہ اس شہر کی اُم الدرسگاہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور نے علمی، ادبی، صحافتی اور براڈ کاسٹنگ خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی اور یوں میری خدمات کو سراہا۔

اس کے علاوہ چند اور اعزاز اور ایوارڈ بھی حاصل کر چکا ہوں۔ تہذیب فاؤنڈیشن پاکستان نے مجھے دی لٹریچر ایوارڈ سے نوازا۔ پاکستان آرٹس کونسل کراچی نے سال دو ہزار چودہ میں اعتراف کمال شیلڈ عطا کی۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور نے adjunct professor بھی مقرر کیا۔

نومبر دو ہزار تیرہ میں جب میں اسلامیہ یونیورسٹی سے اعزازی ڈگری وصول فرمانے آیا تو ریڈیو پاکستان بہاول پور کے اسٹوڈیوز میں میرے اعزاز میں شام منائی گئی تھی جس کی صدارت جمیلہ ہاشمی صاحبہ کی دختر ڈاکٹر عائشہ صدیقی نے کی تھی۔ وہ مجھے ملنے کے لیے جناب سجاد پرویز کی دعوت پر خصوصی طور پر اسلام آباد سے تشریف لائی تھیں۔ اُنھیں اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تو وہ یوں گویا ہوئیں۔

”میری خوش قسمتی ہے کہ جب رضا علی عابدی شاہین کلب کیا کرتے تھے تو مجھے بھی اس میں بولنے کا موقع ملتا تھا، بچپن کی سنہری یادوں کے سنگ سنگ بے شمار برس گزار دیے، یقین جانیے اُن خوشگوار دنوں کی خوشبو آج بھی خوشیاں بکھیر دیتی ہیں، ایک سہانی اور سلونی یاد یہ بھی ہے کہ ان دنوں ایک پروگرام میں شرکت کے گیارہ پاؤنڈ ملا کرتے تھے، پیسے کما کر بڑی خوشی ملتی تھی، خرچے پورے ہوتے تھے۔ وہ ایک مختلف زمانہ تھا، جس میں بی بی سی کے پاس بڑے بڑے نام تھے، سحاب قزلباش تھیں، اچلا شرما تھیں، یہ لوگ اتنا خوبصورت بولتے تھے کہ لطف آ جاتا، اُن کا بولنا ایسا تھا جیسے کوئی موسیقی سن رہا ہو، اور اب اگر یہ کہا جاتا ہے کہ بی بی سی وہ بی بی سی نہیں تو یہ بھی حقیقت ہے، اب جو بچے وہاں پہ ہیں، وہ یوں بولتے ہیں ”آپ بتائیں نا آپ کیا کر رہی ہو؟“ یہ سن کر یوں لگتا ہے کہ بندہ سوچ میں پڑ جائے کہ یہ تمیز کی جا رہی ہے یا بدتمیزی ہو رہی ہے، یہ ایک نئی اردو نے جنم لیا ہے، جو نہ تیتر ہے نہ بٹیر، میں عابدی صاحب سے ایک سوال کرنا چاہوں گی کہ پچھلے دنوں لاہور میں آرٹ اینڈ کلچر کے نام سے ایک فیسٹیول ہوا، اس میں ایک سیشن تھا۔ جرنلسٹ خالد احمد اور انتظار حسین موجود تھے، اس سیشن میں اکثر باتیں لوگوں کے اوپر سے چلی گئیں، ایسی اردو سن کے یوں لگتا ہے کہ ہمارے سر کے اوپر سے گزر رہی، یہ Generation Change ہے، جس میں ہم لوگ اردو بھولتے جا رہے ہیں، اس گیپ کو کیسے پورا کیا جا سکتا ہے، اپنی زبان کی خاص طور پر بول چال کی زبان کی ترویج اور تحفظ کیسے کریں گے؟“

اسی الجھے کو میں نے یوں دیکھا۔ ”اس میں تو کوئی شک نہیں کہ زبان کے امکانات تاریک ہیں لیکن زبان کی موت کا منظر نامہ نظر نہیں آ رہا، اس لیے گرے پڑے حالات میں بھی اردو ایک توانا زبان ہے اور اپنے اظہار کے لیے تمام وسیلے اس کے اختیار اور رسائی میں ہیں، قصور حالات کا یہ ہے کہ زندگی میں اچانک ایک بہت بڑی تبدیلی آ رہی ہے، پہلے ٹیلی ویژن کی یلغار ہوئی پھر انٹرنیٹ نے جو راستے کھولنا شروع کیے وہ معاشرے کے رویوں کو بدل رہے ہیں، تین سال سے میں نے کسی کو خط نہیں لکھا، اب خط لکھنا بند ہو گیا ہے، ٹیلیفون نے رابطے آسان کر دیے ہیں رہی سہی کسر SKYPE نے پوری کر دی ہے، یہ تمام چیزیں ایک دن زبان پر تو اثر انداز ہوں گی، ہمارے ادب کے شہ پارے نئی نسل سے دور ہو جائیں گے، لیکن ایک چیز ہے، برطانیہ میں لوگوں کو شیکسپیئر کے ڈرامے جدید زبان میں لکھ کے عام فہم بنانا پڑا، پسپائی اختیار کرنا پڑی، اور پنجنل کالموں کو جدید انداز میں لکھا گیا۔ اسی طرح میری کتاب یہاں دستیاب تھی، مولانا محمد حسین آزاد کی حکایتیں جو اُنہوں نے 1880 میں لکھی تھی، میں نے اُنہیں نئی نسل کے لیے تمام زبان کو جدید زبان میں تبدیل کر دیا۔ آخر میں ایک ضمیمہ لگا کر اُس کی اور پنجنل زبان بھی رکھی، ایک رُخ کہ جو چاہے وہ بھی پڑھ لے، تو اس طرح کی صورتیں ہوتی تھیں، جیسے کہ میری خواہش ہے کہ میں اپنی کتابوں کا ایک نوجوانوں کا ایڈیشن بھی نکالوں، اسی کو دوبارہ لکھوں۔ برطانیہ میں سب عظیم کتابوں کے مختصر ایڈیشن بھی نکالتے ہیں، جلی، موٹے حروف میں بھی

ایڈیشن نکلتے ہیں، بچوں کے لیے بھی لکھا جاتا ہے،اس کے لیے کوششیں کرنا پڑتیں ہیں، اس کے بغیر کام نہیں ہوتا، ہمارے ہاں بدنصیبی یہ ہے کہ کوئی تحریک نہیں ہے، ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے،جو یہ کام کرے، ہر کام کے لیے حکومت کی طرف دیکھتے ہیں جس کی اور بھی اُلجھنیں ہیں،تو کون کرے گا یہ کام؟ ہاں کسی کو تو کرنا پڑے گا،تھوڑا تھوڑا بھی کرے گا تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا، لیکن ایک بات آپ کو محسوس ہوگی کہ دو شعبوں میں لوگ ذاتی طور پر کام کر رہے ہیں، صحت میں، تعلیم میں۔ بڑے بڑے گلوکار، فنکار اسپتال کھول رہے ہیں، تعلیمی ادارے کھول رہے ہیں، تحریک بھی ہے، خواہشیں اور اُمنگیں بھی ہیں، بہرحال ہوگا کچھ نہ کچھ ضرور، تاریخ میں تاریک ادوار گزر جاتے ہیں، رُکتے ٹھہرتے نہیں، مجھے بھی روشنی دکھائی دے رہی ہے، پتا نہیں عائشہ کو نظر آرہی ہے کہ نہیں۔"

ڈاکٹر عائشہ صدیقہ نے کہا۔" ابھی لاہور میں فریدہ خانم، غلام علی سے ملاقات ہوئی، وہ ریڈیو پاکستان کا ذکر کر رہے تھے، خاص طور پر ان دنوں کا جب ریڈیو کے سارے لوگ فن کی ترویج کے لیے خلوص اور لگن کے ساتھ کام کرتے تھے، آپ نے موجودہ صورتِ حال کے حوالے سے فرمایا کہ ریڈیو کم ہو رہا ہے، میرے خیال میں ریڈیو دوبارہ آرہا ہے، ایف ایم چینلز سُنے جاتے ہیں، ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ریڈیو بڑھنے کے.. باوجود وہ نہیں ہے جو اصل میں ہوتا تھا، جس سے سیکھا جاتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ تبدیلی کہاں سے آنے لگی ہے؟ ہمارے مزاج میں تبدیلی کیوں آئی ہے؟"

سوال مشکل تھا۔مگر رضا علی عابدی نے اس کا منطقی اور تسلی بخش جواب دیا، انہوں نے فرمایا۔ ذہنوں کی تبدیلی تاریخ کا تجزیاتی اور فطری عمل ہے جو کبھی رکتا نہیں، اس میں کوئی عمداً کوشش کر کے آپ کے ذہن کو نہیں بدلتا، ہر طرف سے بے شمار عوامل کام کرتے رہتے ہیں، جو آپ کی ترجیحات کو بدل دیتے ہیں، بعض اوقات غیر اہم چیزیں اسباب کی بنا پر اوپر چلی آتی ہیں۔ اہم چیزیں غیر اہم ہو کر پس منظر میں چلی جاتی ہیں، حالات بدلتے رہتے ہیں اور حالات پہ انسان کا بس ذرا کم چلتا ہے، ریشماں چلی گئیں، پھر سوچتے ہیں ہم میں سے سبھی کو جانا ہے، میری بڑی خواہش ہے کہ میں خاموشی سے چلا جاؤں کیونکہ میں نے اپنا کام مکمل کرلیا ہے، مجھے تسکین اور آسودگی حاصل ہے، اور خوشی ہے کہ میں نے اپنا کام مکمل کرلیا، مجھے بوڑھوں اور ضعیفوں کے مرنے کا واحد دکھ جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اُن کے ہاں جو رواداری، محبت، مروت ہوا کرتی تھی وہ اُن کے ساتھ چلی جاتی ہے اور اس کی نئی کھیپ نہیں آرہی۔ یہ الگ کیفیت ہے، وگرنہ تاریخ کا، قوموں کا، انسانوں کا ذہن ضرور بدلتا ہے، اس کے اسباب تلاش کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ کبھی کبھی اسباب ہوتے ہی نہیں۔

ہمیں تحریر و تقریر میں عام بول چال کی زبان استعمال کرنی چاہیے، اس طرح ابلاغ کامل ہوتا ہے، سُننے والے تک بات پوری پہنچتی ہے، اور سادگی میں جو تاثیر ہے وہ کمال حیثیت اور وقعت رکھتی ہے۔ زبان کو جس قدر عام فہم بنایا جائے گا اس قدر اس میں قوت ہوگی اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ بمبئی میں اردو تلفظ سکھانے والے ادارے وجود میں آچکے ہیں، وہاں فلموں کی زبان صاف ہو رہی ہے، اور یہ بات اردو کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ لتا منگیشکر کا اردو لب و لہجہ کمال تھا، نوشاد صاحب کے پاس لڑکیاں موسیقی سیکھنے آتیں تو سوال کرتے کہ کیا اردو آتی ہے، جواب نفی میں ہونے کی بنا پر فرماتے واپس جاؤ اردو سیکھ کر آؤ تب گانا سیکھ سکو گی۔ اردو زبان کانوں کو، دل کو بھلی لگتی ہے، فلموں میں پس منظر کی موسیقی اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی اہمیت مائکروفون پر بولے جانے والے الفاظ رکھتے ہیں، تو فیچر میں، پروگراموں میں زبان جس قدر شائستہ، شستہ، سہل اور صاف ہوگی مقصد اس قدر جلد حاصل ہوگا۔

عصرِ حاضر کی جدت طرازیوں کا مشاہدہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ ہم ای پیپرز، سیٹلائٹ چینلز، ٹی وی، انٹرنیٹ، بلاگس، ایس ایم ایس وغیرہ کے دور میں جی رہے ہیں، اس طرح کے منظر اور ماحول میں ریڈیو کا مستقبل کیا ہوسکتا ہے اور کیا اس کا Survival ممکن ہے؟ اس حوالے سے میرا کہنا ہے۔

ریڈیو مشکل میں ہے، اس کا سبب یہ نہیں کہ سُننے والے کم ہو گئے ہیں، بلکہ رجحان ٹی وی کی طرف بڑھ گیا ہے، تن آسانی لوگوں میں بہت ہے، ریڈیو کی کوئی گفتگو، کوئی بات سُن کے لوگوں کے ذہن میں اس کی تصویر بنانے میں ذرا سی زحمت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ٹیلی ویژن بات کے ساتھ تصویر بھی دکھاتا ہے۔ وہ لوگوں کو تن آسانی کے باعث بہت راس آتا ہے، ریڈیو پر ستم یہ ہوا کہ سُننے والوں میں اس کا مقام وہ نہیں رہا دوسرا ستم حکومتِ وقت کی نگاہوں میں بھی مقام ریڈیو کم ہونا ہے، یہ ریڈیو کے لیے Set Back ہے، ہم نے، آپ نے ریڈیو کے اچھے دن دیکھے ہیں، ٹی وی کو اٹھان، ریڈیو کے ہنرمند اور با صلاحیت ..... لوگوں نے دی۔ ماسٹر نثار، استاد جھنڈے خان بولنے والی فلموں کو اسٹیج سے ملے تھے، وہ خوشگوار زمانہ تھا، وہ لوگ تو ریڈیو کو چھوڑ گئے اور جو لوگ نئے ملے اُن کی تعلیم بھی کم ہے، ریڈیو پر

حصہ بھی کم ہے، تو یہ افسوس ناک تصادم ہے۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ٹی وی کو فروغ ملا ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ بہت عمدہ ٹیلی ویژن ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔

یہ ریڈیو ہی تھا جس نے فلم کو محمد علی جیسا جذبات نگار فنکار عطا کیا۔ یہ ریڈیو ہی تھا جس نے مہدی حسن کو شہنشاہِ غزل بنا دیا۔ یہ ریڈیو ہی تھا جس نے قصور کی اللہ وسائی کو ملکہ ترنم نور جہاں کا درجہ دلوایا۔ مصطفیٰ قریشی، غلام محی الدین، روبینہ قریشی ریڈیو ہی کی آوازیں تھیں جنھوں نے پردہ سیمیں پر اپنی بھرپور آواز کی بدولت، منجھی ہوئی آواز کی بدولت حکمرانی کی۔

☆......☆

رضا علی عابدی صاحب ایک مسافر ہیں۔ اس مسافر نے جب ریل کہانی کے لئے سفر کا آغاز کیا اور کوئٹہ پہنچے تو وہاں سے سامعین کو 1935ء کے زلزلے کی باتیں سنوائیں۔ ایک اور اہم واقعے سے روشناس کرایا۔ وہ مسافر کی زبانی کہتے ہیں۔

”کوئٹہ کا اسٹیشن پیچھے رہ گیا۔ وہی اسٹیشن جس کی عمارت 1935ء کے زلزلے میں ڈھے گئی تھی۔ اور پھر 28 اکتوبر 1939ء کو موجودہ عمارت کھولی گئی تھی۔ کوئٹہ ایکسپریس بلوچستان کے پہاڑوں سے سندھ کے ریگزاروں میں اترنے کے لیے درہ بولان کی طرف بڑھنے لگی۔ آگے بل کھاتی ریلوے لائن نظر آنے لگی جو پورے ایک سو دس سال پہلے 1886ء میں ڈالی گئی تھی۔“

”اُس وقت مرزا محمد ہادی رُسوا یاد آئے۔ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ انہوں نے امراؤ جان ادا جیسی یادگار کتاب لکھی مگر اب کسے یاد ہوگا کہ جب یہ ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی، مرزا صاحب کی ملازمت کوئٹہ میں تھی۔ وہ رُوڑکی انجینئرنگ کالج سے سند لے کر آئے تھے اور اس ریلوے لائن کے سروے میں شریک تھے۔“

”ہمارے ایک دوست کہتے ہیں کہ ہادی رسوا نہ ہوتے تو ایک شریف گھرانے کی لڑکی کوٹھے تک اور ہندوستان کے میدانوں کی ریل گاڑی کوئٹے تک نہ جاتی۔“

اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر رضا علی عابدی صاحب ریل کہانی کا ارادہ نہ باندھتے تو ہم بے شمار تہذیبی، ثقافتی اور علاقائی رسوم، رواج، عقائد اور روایات سے نا آشنا رہتے۔

رضا علی عابدی کا ایک رُخ متعین نہیں ہے۔ وہ چاروں کھونٹ دیکھنے، جانچنے، پرکھنے کے بعد پانچویں کھونٹ کی طرف بھی رختِ سفر باندھتے ہیں اور ہر جانب سے ایسے منظر ڈھونڈ... کرلاتے اور دکھاتے ہیں جو فکر و نظر کے زاویوں کو روشن کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسپرنذ جنکشن پہنچے تو پانچویں موسم کی تلاش کرتے ہوئے ایران، زاہدان چلے گئے، وہاں انہوں نے پہلی عالمی جنگ کے دوران ڈالی گئی سات سو کلومیٹر لمبی ریلوے لائن کو بنتے سنورتے اور اس پر سفر کرتے قافلوں کو دیکھا اور یہ بھی کہ ریل کی پٹڑی بچھنے سے پہلے اس بے آب و گیاہ دشت میں کسی بیماری کے پھیلنے سے اس راستے پر تین ہزار اونٹ ایک ساتھ مر گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ بس ان کے ڈھانچے رہ گئے۔

دورانِ سفر ہر ایک پڑاؤ پر مقامی لوگوں سے ملنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن صرف انہی کے لیے جو مسافرت کے فائدوں سے لطف اندوز ہونے اور نئی نئی باتیں سیکھنے سمجھنے کا شوق رکھتے ہوں۔ کوئٹہ سے کلکتہ جاتے ہوئے عابدی صاحب ارد گرد کے سارے مناظر اور ممکن ہونے پر معاشرتی رویوں کا مطالعہ کرتے گئے، لوگوں کے مزاج سمجھتے گئے، ان کی باتوں سے، پُراسرار گھاتوں سے حظ اُٹھاتے گئے۔ ”آبِ گم“ میں جگہ کی وجہ تسمیہ دریافت کی تو جواب ملا۔ ”یہاں اوپر پہاڑوں سے پانی آتا ہے، ادھر آ کے گم ہو جاتا ہے۔ آبِ گم، یعنی پانی گم ہو گیا۔ ظاہری معنی اس کے یہی ہیں۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔“ یہ حیرت کا مقام ہے۔ ”کیسے بھولے لوگ ہیں۔ علمی تحقیق کا کام بھی اللہ پر چھوڑتے ہیں۔“

اللہ پر چھوڑنا، ایک طرح کی تن آسانی ہے کہ جستجو اور تحقیق کی روش کو اپنانا ہی نہیں ہے۔ قوموں کی زندگی میں اس طرح کے رویے تعمیر و ترقی کے راستوں میں سدِ راہ بنتے ہیں۔ یہ علم و دانش کے روشن و رخشاں راستوں سے دور رہنے کی روش ہے جو کسی طرح بھی قابلِ قبول اور قابلِ تقلید نہیں۔ آج ہم یورپ کی ترقی اور خوشحالی کو اپنے آباء کی تحقیقات کا ثمر سمجھتے ہیں، یہ کیوں نہیں سوال اُٹھاتے اور سوچتے ہیں کہ ہم نے اب تک کیا کیا ہے اور تا حال کیا کر رہے ہیں۔ الزام لگانا، دوسرے کے سر ڈالنا سب سے آسان کام ہے اور اس کام کو ہم بڑے شوق سے کرتے ہیں۔

علم و دانش کے موتیوں کو یورپ میں دیکھیں تو بقول شاعرِ مشرق ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال، دل سہ پارہ ہوتا ہے۔ لیکن دوسری جانب تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ ہم نے باحیثیت قوم علم و دانش کے اثاثے سے منہ جان بوجھ کر موڑ رکھا ہے۔ وقت وقت کی بات ہے علم ہماری پہچان تھی، علم ہماری شناخت، کتابیں کہیں کہیں دستیاب ہوتی تھیں، ان تک رسائی ہر ایک کے بس میں ممکن نہیں تھا۔ مگر آفرین ہے شوق رکھنے والوں پر وہ طویل

سے طویل سفر طے کر کے دور دراز علاقوں میں جاتے اور درسگاہوں اور کتب خانوں سے مقدور سے بڑھ کر استفادہ کرنے کی کوشش کرتے۔ واپس آتے اور دوسروں کو اپنے علم سے مستفیض کرنے کی سعی کرتے۔ پھر چھاپہ خانوں کا دور آ گیا۔ کتابیں چھپنا شروع ہوگئیں، لیکن پڑھنے والوں کا قحط رہا۔ نامساعد حالات میں کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ کتابیں چھپتی رہیں۔ کچھ کتابوں کو قاری میسر آ گئے، کچھ کتابیں اس نعمت سے محروم رہیں۔ قدرت کے قوائد وضوابط کے مطابق ہر شے کی ایک عمر ہوتی ہے مگر یادوں اور کتابوں کی عمر نہیں ہوتی، یہ سانسوں کی روانی تک اپنی کہانی کہتی رہتی ہیں اور سننے والے سنتے رہتے ہیں۔

رضا علی عابدی پہلے صحافت سے وابستہ تھے۔ جانتے تھے کہ برصغیر میں لکھی جانے والی اور چھپ جانے والی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ لندن کی انڈیا آفس لائبریری اور برٹش لائبریری میں موجود ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ان میں سے بہت سی کتابیں جو برطانیہ نہ جاسکیں وہ ضائع ہوگئیں۔ اور اگر کچھ موجود ہیں تو ان تک رسائی بہت مشکل ہے۔ بار بار چھپنے والی اور مشہور کتب تو پڑھے لکھے گھرانوں میں دستیاب ہوتی ہیں لیکن وہ کتابیں جو قارئین کے نظر انداز کرنے کی بنا پر وقت کی دھول میں اَٹ گئیں کہ اب کہیں نہیں دکھائی دیتیں، ان کو تلاش کرنا بے حد ضروری ہے۔ پتا تو چلے موضوعات کیا تھے۔ آگاہی تو ملے کہ لوگوں کی دلچسپی کا محور و مرکز کیا تھا۔ خبر تو ہو اس وقت معاشرے کی اساس کن اصول وضوابط پر تھی؟ اور یہ سب کتابیں ہی بتلا سکتی ہیں کہ یہ اپنے عہد کی آئینہ دار وعکاس ہوتی ہیں۔

رضا علی عابدی نے سوچا کیوں نہ ان ساری کتابوں کی جستجو اور کھوج میں نکلا جائے۔ تلاش کر کے انہیں پڑھا جائے اور پھر بی بی سی لندن کے سامعین تک پہنچایا جائے۔ کام مشکل تھا۔ لیکن سوچ ہر مشکل کا حل ڈھونڈ لیتی ہے۔ بس جذبہ صادق ہونا چاہیے۔ عابدی صاحب جاننا چاہتے تھے کہ مشہور و معروف کتابیں جب پہلے پہل شائع ہوئی تھیں تو کیسا رنگ روپ رکھتی تھیں۔ ان کی زبان کا ذائقہ کیسا تھا، خیال کی لذت کیسی تھی؟ اور پیشکش کا انداز کیا تھا؟ مثنوی زہر عشق جب لکھنو میں شائع ہوئی تو عورتوں کو اسے دیکھنے، پڑھنے کی اجازت نہ تھی البتہ مردانے میں اس کا بہت چلن تھا، وہاں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھی۔ عابدی صاحب کے پیشِ نظر یہ بھی دیکھنا تھا کہ نظم اور نثر کی کتابیں جو ابتدا میں شائع ہوئیں ان کی تخلیق میں تخلیق کاروں کو کیسی کیسی مشکلات سے گذرنا پڑا۔ کس طرح ان کتابوں کو سجایا اور سنوارا گیا اور کس طور وہ عوام کے ہاتھوں میں پہنچ کر قبولیت کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں اور یہ کہ انہیں قبولیت کا اعزاز ملا بھی کہ نہیں؟ کیا وہ وقت سے پہلے ہی گردِ فراموشی اوڑھ کر دنیائے اذہان سے رخصت ہوگئیں؟

سفر طویل اور مشکل ہو تو کم زادِراہ سے بات نہیں بنتی۔ وسائل کا خزانہ ضروری ہوتا ہے۔ رضا علی عابدی کو بی بی سی کی تائید وحمایت کی صورت میں یہ زادِراہ دستیاب تھا۔ یہ منصوبہ انہوں نے بی بی سی کی اردو سروس میں شمولیت کے کچھ عرصے بعد ہی اربابِ اختیار کے روبرو رکھ دیا تھا۔ اور انہوں نے نادر و نایاب کتابوں کا احوال صرف بارہ ہفتوں یعنی ریڈیو کی زبان میں ایک سہ ماہی نشر کرنے کی اجازت دے دی۔

جھیل کی گہرائی کا اندازہ پانی میں اُترنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ عابدی صاحب کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ علم و حکمت، دانش ودانائی کے کتنے بڑے سمندر میں غوطہ زن ہونے جا رہے ہیں۔

سال انیس سو چھتر میں رضا علی عابدی نے انڈیا آفس لائبریری کے انچارج جناب سلیم قریشی اور برٹش لائبریری کے نگران قاضی محمود الحق سے ملاقات کی، مدعا بتلایا، کیٹلاگ دیکھا، کتابیں طلب کیں۔ انہیں کتابوں کی ترسیل کے لیے قوائد وضوابط سے آگاہ کیا گیا۔ اور پھر سفر کا آغاز ہوگیا۔ رضا علی عابدی کی زبانی سنیے۔ فرماتے ہیں۔ ”اس روز میرے سامنے دروازہ خاور کھلا۔“

”انیسویں صدی کیسے بڑے آدمیوں کی کیسی عظیم صدی تھی۔ چھاپہ خانہ نیا نیا تھا۔ لوگوں میں کتب بینی تو کیا، حصولِ علم کا شوق اور شعور کم تھا۔ کیسے کیسے دکھ اٹھا کر اردو ٹائپ بنایا گیا تھا۔ کیسے کیسے جتن کر کے مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی کا قرآن کا اردو ترجمہ اور کلیات میر تقی میر جیسی ضخیم کتابیں کپوز کر کے چھاپی گئی تھیں۔ انہیں دیکھیں تو حقیقت یہ ہے کہ دل ہوتا ہے سیپارہ۔“

”لیجیے صاحب تحقیق شروع ہوگئی۔ تین کتابوں کے لیے درخواست دی گئی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ایک ایک جلد میں چار چار پانچ پانچ کتابیں بندھی ہوئی ہیں۔ میں تین کتابیں دیکھنے گیا تھا، کوئی بارہ پندرہ کتابیں دیکھیں۔ اس کو انگریزی میں بونس کہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈھائی تین برس کی اس جستجو کے دوران میں نے انیسویں صدی میں چھپنے والی تقریباً ساری کتابیں دیکھ ڈالیں۔ میں کتابیں دیکھتا گیا اور حیرت کے سمندر میں ڈوبتا گیا۔“

جستجو اور تحقیق کے اس سفر نے رضا علی عابدی کی فکر پر کون سے دریچے روشن کیے، ذہانت کے کون سے دروازے کھولے دانائی کے کون سے جہانوں سے شناسائی کرائی، یہ ایک طویل گفتگو ہے۔ رضا علی عابدی کی زبانی سنیے۔ فرماتے ہیں۔ ''اس میں ایک فائدہ ہوا اور ایک نقصان۔''

''فائدہ یہ کہ علم اور حکمت کے سینکڑوں نسخے دیکھے اور جس قدر علم سمیٹ سکتا تھا، سمیٹا''۔

''نقصان یہ ہوا کہ اب تک اپنے جس علم میں فخر کا کچھ عنصر شامل ہو گیا تھا، اس کی پوری عمارت نیچے آ رہی اور اپنی کم علمی کے احساس نے ایسا زور مارا کہ باقی عمر کے لیے کتاب اور کتب بینی میرے وجود کا حصہ بن گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں کم مائیگی کا احساس بڑھتا جاتا ہے اور ہوس کا یہ عالم ہے کہ عمر کم ہے اور میرا منہ تکنے والی کتابوں کی تعداد زیادہ، بہت زیادہ۔''

انکساری کا انداز دیکھیے۔ ایسی ہی شخصیات جن کی ذات میں اپنے وجود کی اہمیت کا احساس نفی کی طرف رخ کر جائے مقبول ہونے لگتی ہیں، یہ بھی تو درویشی ہے۔ ڈپٹی کنٹرولر نیوز ریڈیو پاکستان بہاول پور جناب سجاد پرویز نے بھی اس اَمر کی تائید کی کہ عابدی صاحب کو کتب بینی کا شوق جنون کی حد تک لاحق ہے۔ خدا کرے یہ علت ہر ایک مسلمان کو لگ جائے اور اپنی اصل کی جانب گامزن ہو جائیں۔ علم جو ہماری شناخت اور پہچان ہے اس سے ہم دور رہنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ہماری پہچان علم کیوں ہے اس بارے میں جناب رضا علی عابدی نے ایک خوبصورت توجیہہ پیش کی ہے۔ جب آپ پروگرام انجمن کیا کرتے تھے اور چہار جانب سے آنے والے خطوط کے جواب دیا کرتے تھے، یہ تب کا قصہ ہے۔ اس بارے میں وہ کہتے ہیں۔ ''ایک بار باتوں باتوں میں دین اور عقیدے کا ذکر آ گیا۔ اس پر کراچی سے ایک انقلابی گھرانے کی خاتون کا خط آیا جنہوں نے خفگی کا اظہار کیا۔ اس روز پندرہ منٹ کے پروگرام میں وہی ایک تنہا خط تھا اور اس کا جواب تھا۔ چند لفظوں میں وہ جواب یہ تھا کہ جس زمانے میں جادوگری کا زور تھا۔ اس دور کے انبیاء نے ویسے ہی معجزے دکھائے اور جب طب اور معالجے نے زور پکڑا تو اس دور کے نبی نے مریضوں کو اچھا اور مردوں کو زندہ کرنے کے معجزے دکھائے۔ لیکن جب علم و آگہی کا دور شروع ہونے لگا اور آسمان سے پہلی آیت اتری تو اس میں پڑھنے، قلم اور کتاب کا ذکر تھا۔ لوگ اپنے پیغمبر سے مطالبہ کرتے تھے کہ کوئی معجزہ دکھائیے تو آسمان سے صدا آتی تھی کہ یہ کتاب ہی ہمارا معجزہ ہے۔ یہ بات طے ہے کہ یہودیت کی بنیاد خوف پر، عیسائیت کی بنیاد پیار پر اور کوئی مانے یا نہ مانے اسلام کی بنیاد علم پر رکھی گئی۔''

تو ہم جو مسلمان ہیں ہماری اساس علم ہے، کتاب ہے، پڑھنا، لکھنا اور سیکھنا ہے۔ رضا علی عابدی صاحب نے جب کتب خانے کھنگالنے شروع کیے تو تفویض شدہ سہ ماہی کو صاحبانِ ادارہ کو بلا توقف اور بلا تکلف بڑھانا پڑا۔ کتب خانہ کی تعریف، پسندیدگی اور مشوروں سے آراستہ خطوط کی قطار بندھ گئی۔ سامعین میں ذی وقار شخصیات شامل ہونے لگیں۔ رضا علی عابدی فرماتے ہیں۔ ''تعریفوں نے طول کھینچا اور اوپر سے یہ کہ نہایت اعلیٰ طبقے کے اہلِ علم حضرات کے خط آنے شروع ہوئے۔ پروفیسر آل احمد سرور، مولانا امتیاز علی خان عرشی زادہ اور ابنِ انشاء مرحوم کے خطوں نے بی بی سی کی انتظامیہ کو بہت متاثر کیا اور مجھے اشارہ مل گیا کہ بارہ ہفتوں کی پابندی ختم۔ جب تک چاہو پروگرام جاری رکھو اور ہر پروگرام جو صرف دس منٹ کا ہوتا تھا، اس کا دورانیہ بڑھا لو۔

''بس پھر جو یہ دامن کشادہ ہوا تو میں کتب خانوں سے جھولیاں بھر بھر کر کتابیں لایا اور باقاعدگی سے سننے والوں نے کہا کہ آپ نے ہمیں مالا مال کر دیا۔''

رضا علی عابدی کا کتب خانہ تقریباً اڑھائی برس تک آن ائیر جاتا رہا، لوگوں کو قیمتی ذخیرہ ملتا رہا، پروگرام لوگوں سے پسندیدگی کی سند لیتا رہا۔ یہ ایک اعلیٰ اور عمدہ پروڈکشن تھی جس میں اسکرپٹ تو ظاہر ہے عابدی صاحب کا ہی ہوا کرتا تھا لیکن بعض مقامات پر پیشکش کو بے مثال بنانے کے لیے صداکاروں کو بھی شامل کیا جاتا تھا۔ اداکار و صداکار محمود خان مودی، اداکار سعید جعفری، اداکارہ ایلا ارون، یاور عباس، نعمان الحق، سلیمہ ہاشمی، منصور معجز، راشد اشرف وغیرہ ان نایاب کتابوں میں سے اقتباسات وغیرہ پڑھنے میں شامل رہے۔ مقبولیت اور شہرت نے اس پروگرام کے قدم چومے۔ اڑھائی برس تک یہ پروگرام سامعین تک معلومات فراہم کرتا رہا اور پھر اختتامی لمحات کا نزول ہوا۔ کتب خانہ کے آخری پروگرام میں ابنِ انشاء نے بھی شرکت کی۔ بقول رضا علی عابدی۔ ''ابن انشا علاج کے لیے لندن آئے ہوئے تھے اور یہ ان کی زندگی کے آخری دن تھے۔ بے شمار لوگوں میں مسکراہٹیں بانٹیں، تب رخصت ہوئے۔''

رضا علی عابدی کو اس بات پر حیرت ہے کہ انیسویں صدی میں جب چھاپہ خانہ تو آ گیا لیکن لوگوں میں کتابیں تو کیا

پڑھنے ہی کا شعور نہ تھا۔اس وقت باکمال جواہر پارے وجود میں آئے، لکھنے والوں کی طبائع کو روانی ملی،اور طرح طرح کے موضوعات پر طبع آزمائی ہونے لگی۔ جو نادر و نایاب اور انمول جواہر پارے رضا علی عابدی کی جستجو بھری نگاہوں تک پہنچے ان کی تعداد و بے شمار ہے، چند ایک ناموں سے واقفیت حاصل کر لیجیے اور سوچیے کہ ہم کن خزانوں سے محروم ہو چکے ہیں۔مگر اس سے پہلے ایک حوالہ، ایک سوچ، ایک کرن جو راستہ دکھاتی ہے، اور یہ رضا علی عابدی ہیں۔

”لیکن ان کتابوں میں اردو نثر کا جو تاریخی شہ پارہ شامل ہے، میرے علم کے مطابق اس کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے اور وہ ہے قرآن مجید کا وہ اردو ترجمہ جو مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی نے 1790ء میں کیا تھا۔ جب اردو نثر لکھنے کا سرے سے رواج ہی نہیں تھا اور جو نثر لکھی جاتی تھی، اسے پڑھنا اور سمجھنا محال ہے۔ جب میر تقی میر اور سودا جیسے عظیم شاعر فارسی میں نثر لکھتے تھے اور جب انگریز حاکموں کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ گلی کوچوں میں رائج بول چال کی زبان کوئی نہیں لکھتا چنانچہ انہوں نے دلی سے منشیوں کو بلایا اور کہا کہ عام بولی کی زبان لکھو۔

اس ساری کارروائی سے بارہ تیرہ سال پہلے شاہ عبدالقادر عام بولی ٹھولی میں قرآن کا ترجمہ کر چکے تھے جو اتنا عام فہم تھا کہ بعد میں انگریزوں نے سنہ 1830ء کے لگ بھگ اسے کلکتے سے شائع کیا۔اردو زبان خصوصاً نثر کے ارتقاء کا مطالعہ کرنے والے محقق غالباً اس ترجمے کو ادب میں شمار نہیں کرتے۔تصور کیجیے کہ جب شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کچھ ایسا ترجمہ کر رہے تھے۔ یہ کتاب نہیں شک بیچ اس کے راہ دکھاتی ہے واسطے پرہیز گاروں کے۔“اس وقت شاہ عبدالقادر یہی ترجمہ یوں کر رہے تھے۔”اس کتاب میں کچھ شک نہیں، یہ راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو جو یقین کرتے ہیں بن دیکھے اور درست کرتے ہیں نماز اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔“اس کے علاوہ تفسیر میں تو شاہ صاحب نے بالکل آج کی زبان لکھی ہے۔سورۃ الفاتحہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔”یہ سورۃ اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ اس طرح کہا کریں۔“

اب دیکھیے وہ چند ایک کتب جن تک رضا علی عابدی کی رسائی ہوئی۔ویسے یہ فہرست بہت طویل ہے۔

اخلاق ہندی (1803ء)، رفاہِ خلائق (1874ء)، نزہت الناظر (1876ء)، معالجات شافیہ (1847ء)، مجالس النساء (1874ء)، داستان جمیلہ خاتون (1865ء)، لڑکوں کا کھیل (1871ء)، تہذیب الاخلاق (1891ء)، گلدستہ ریاست (1894ء)، دھارنا تیاگی (1870ء)، عجائب المخلوقات (1877ء)، عجائب وغرائب (1867ء)، مخزنِ حکمت (1870ء)، آثار الصنادید (1847ء)، تحقیقات چشتی (1864ء)، غرابت نگار (1876ء) تاریخ راجستان (1877ء)، حال جنگ کابل (1851)ء، تواریخ یادگار صوبہ دار مطبوعہ 1873ء، تاریخ عجیب، (1880ء)، تاریخ کشمیر (1846ء)، اور دوسری بے شمار کتب اس فہرست میں شامل ہیں۔

یہ ساری کتابیں اپنا بھرپور تعارف لے کر کتب خانہ میں موجود ہیں۔سال دو ہزار بارہ میں آرٹس کونسل پاکستان کراچی کے زیرِ اہتمام اس کی تقریب رونمائی ہوئی، عابدی صاحب سرخرو ہوئے۔ 1975ء۔1976ء میں پیش کیا جانے والا خیال حقیقت کے روپ میں ڈھلا تو چہرے چاندنی سے چمک گئے۔ ہندوستانی ادیبوں کے کمال کا اعتراف ”کتابیں اپنے آباء“ کی صورت میں بی بی سی لندن اردو سروس سے بھرپور پذیرائی پہلے ہی حاصل کر چکا تھا جو کتابیں اس پروگرام میں شامل ہونے سے رہ گئیں تھیں وہ کتب خانہ میں آ گئیں۔بیس مئی انیس سو پچاسی میں سیّد ہاشم رضا نے فرمایا تھا؛”کتب خانہ ایسی کتاب ہے جو رضا علی عابدی کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گی۔“ یہ ایک بڑی شخصیت کا دوسری بڑی شخصیت کے لیے اعلیٰ اعتراف ہے۔

رضا علی عابدی صاحب کی تخلیقات کا ذکر ہو تو صورت یوں سامنے آتی ہے۔

۱۔جرنیلی سڑک۔ گرینڈ ٹرنک روڈ۔ پشاور سے کلکتہ۔ بس پر سفر۔ بی بی سی سے یہ سفرنامہ مختلف اقساط میں نشر ہوا اور پھر 1986ء میں شائع ہوا۔

۲؛شیر دریا۔ 1992ء (لداخ سے ٹھٹھ تک کا سفر پاکستان میں)

۳؛جہازی بھائی۔1995ء۔

۴؛ریل کہانی۔1997ء کوئٹہ سے کلکتہ 16، اقساط پر مبنی ریڈیو ڈاکیومیٹری تھی۔

۵؛کتب خانہ؛نایاب کتابوں اور لائبریریوں کی جستجو۔

۶؛اردو کا حال

۷؛اپنی آواز (شارٹ اسٹوریز)

۸؛جان صاحب (شارٹ اسٹوریز)

۹؛حضرت علی کی تقریریں

۱۰؛جانے پہچانے

۱۱؛ ملکہ وکٹوریہ اور منشی عبدالکریم
۱۲؛ نغمہ گر
۱۳؛ پہلا سفر (۱۹۸۲ء میں ہندو پاک کا پہلا سفر۔ جون 2011ء میں آکسفورڈ نے چھاپا)
۱۴؛ ریڈیو کے دن (ذاتی یادداشتیں۔ 2011ء سنگ میل)
۱۵؛ اخبار کی راتیں (سنگ میل)
۱۶؛ تیس سال بعد (پہلا انڈو پاک سفر۔ اور ہمارے کتب خانے اضافوں کے ساتھ)
۱۷؛ پرانے ٹھگ؛ (انیسویں صدی میں برطانوی ہندوستان میں ٹھگوں کی کہانیاں)

رضا علی عابدی کی آواز میں جس طرح دوسروں کو گرفت میں لے لینے کا اعجاز مخفی تھا، اسی طرح ان کی تحریریں بھی پڑھنے والوں کو اپنے حصار میں جکڑ لینے کا ہنر رکھتی ہیں۔ ان کی ڈھیر ساری تصنیفات میں سے چار بی بی سی اردو سروس سے وابستگی کے دوران لکھی گئیں۔ رضا علی عابدی صاحب اپنی ان کتابوں کا بڑا خیال کرتے ہیں اور ان کا یہ خیال سو فیصد درست ہے۔ کتاب اپنے موضوع، اسلوب، خیال، انداز اور پیشکش کی ہنر کاری کے بھرپور استعمال سے قامت کی قیامت تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ اور رضا علی عابدی کی یہ چاروں ہی کتب یہی مان مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کے نام جان لیجیے۔

۱؛ کتب خانہ
۲؛ جرنیلی سڑک
۳؛ شیر دریا
۴؛ ریل کہانی

پہلی دونوں کتابوں کی اشاعت میں کراچی کے اسماعیل سعد صاحب کی کاوشوں کا رنگ بھرا ہوا تھا۔ تیسری اور چوتھی تخلیق سنگ میل پبلیکیشنز کے نیاز احمد کی محبتوں کی مرہون منت ہے۔ پہلی تینوں تصانیف بی بی سی اردو سروس کے لیے لکھے گئے ریڈیائی پروگراموں کی تصاویر ہیں۔ البتہ ریل کہانی کی داستان ذرا مختلف ہے۔ پہلی تینوں کتابیں ریڈیائی مسودوں پر مشتمل تھیں۔ ریل کہانی کے ریڈیائی مسودوں میں بہت کچھ کہنے سے رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس میں بعد میں اضافے ہوئے۔ رضا علی عابدی صاحب فرماتے ہیں۔ ”چوتھی کتاب ریل کہانی کا قصہ مختلف ہے۔ کوئٹہ سے کلکتے تک ریل کے سفر کا احوال سنانے کے لیے مجھے بہت کم وقت ملا تھا جبکہ میں نے لمبی چوڑی ریسرچ کی تھی اور بہت سی دلچسپ باتیں ریڈیو پروگرام میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں جس کا مجھے قلق تھا۔“

”آخر یہ ہوا کہ جب میں اس پروگرام کو کتابی شکل دینے بیٹھا تو وہ ہزار دلچسپیاں اس میں حلول کر گئیں اور اس طرح میں ریل کہانی کو اپنی چہیتی تصنیف تصور کرتا ہوں۔ اس دوران میں بی بی سی سے ریٹائر ہو گیا اور ریل کہانی کی نہ کوئی تعارفی تقریب ہوئی نہ کوئی منہ دکھائی۔ خیر اس کا مجھے اس لیے افسوس نہیں کہ میرے قارئین نے نہ صرف کتاب پڑھی بلکہ مجھے ایک نوجوان کی بات یاد ہے جس نے فون کر کے مجھ سے کہا کہ ریل کہانی آپ کی بہترین کتاب ہے۔“

رضا علی عابدی صاحب کا پہلا عشق کتاب ہے، کتاب پڑھنا، کتاب لکھنا اور کتاب پڑھنے کی جانب دوسروں کو مائل کرنا۔ یہ ایک جنون ہے، ایک جذبہ ہے، ایک شوق ہے، ایک عشق ہے جو مشک کہا جاتا ہے اور کہتے یہ بھی ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں جاتے۔ رضا علی عابدی نے بھی کتاب سے پیار کیا اور اس پیار کو کبھی قلم، کبھی کاغذ اور کبھی آواز کے وسیلے سے دوسروں تک پہنچایا۔

جرنیلی سڑک، گرینڈ ٹرنک روڈ، شیر شاہ سوری کی محنت اور محبت کا نشان صدیوں کی آوازوں اور پروازوں کو اپنا ہمراز بنائے ہوئے ہے۔ بہت دل چاہتا ہے کہ سفر کر کے جرنیلی سڑک کی ان نشانیوں سے من آنگن روشن کیا جائے لیکن ہر اک کے بس میں کہاں کہ وہ ابتدا سے انتہا تک کے ایک ایک پڑاؤ پر یادوں کا الاؤ روشن کر سکے۔ رضا علی عابدی نے یہ حوصلہ باندھا اور ہمیں ہمارے شاندار ماضی سے متعارف کرایا۔ محبتوں کی داستانیں روز روز نہیں لکھی جاتیں، اور جو داستانیں موجود ہیں ان سے آگاہی و آشنائی حاصل نہ کرنا کور چشمی کے زمرے میں آتا ہے۔

الطاف گوہر جرنیلی سڑک کو زندگی بھر کی یادیں قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”رضا علی عابدی نے کیا کتاب لکھی ہے، ہر صفحے پر جیسے رنگا رنگ شگوفے کھل رہے ہوں، دھیمے مزاح کے، لطیف نکتوں کے اور جذب میں ڈوبے ہوئے مشاہدات کے۔ کیسی سادہ زبان میں کتنی گہری باتیں کہہ گئے ہیں۔ کتاب پڑھ کر مصنف کے ایک تاریخی شاہراہ سے جذباتی لگاؤ کا اندازہ بھی ہوا اور یوں بھی لگا جیسے پشاور سے کلکتے تک تمام راستے زندگی بھر کی یادیں بھورے بادلوں کے ساتھ چلی آرہی ہوں۔“

”رضا علی عابدی ہلکے سے ایک تار چھیڑ دیتے ہیں اور ذہن میں پورا سازینہ جھنجھنا اٹھتا ہے، بول سلگنے لگتے ہیں، خیال لہراتے ہیں اور دھوپ میں جلتی ہوئی شاہراہ یادوں کا ایک سلسلہ

بن کر دکھنے لگتی ہے۔''

رضا علی عابدی نے جہاں جہاں کا سفر کیا، جس جس علاقے کا مشاہدہ کیا، جس جس خطے اور شہر کی سیر کی، اس کا پورا پس منظر اور پیش منظر کھلی آنکھوں سے دیکھا، پرکھا جانچا اور پھر مربوط خیال کو اپنے سینے میں اتار کر لفظوں کے ہار بنا کر ایک ایک کے گلے میں ڈال دیا اور کہہ دیا کہ اب ہر کوئی اپنی فکر، ہمت اور خیال کے مطابق اس سے لطف اندوز ہوتا پھرے انہیں کوئی اعتراض نہیں۔

پرت در پرت خیال کا جمال منفرد اور مختلف ہوتا ہے۔ رضا علی عابدی کی سوچ میں بھی ہمہ پہلو رنگوں زاویوں اور ذائقوں کی آمیزش ملتی ہے اسی لیے ہم ان کی تحریریں دل کی آنکھوں سے پڑھتے اور اس کو باطن کی ہزار رنگ دنیا میں بسا لیتے ہیں۔ تحریر کو کمال کی اس منزل تک پہنچانے کے لیے یقینی طور پر مشاہدے اور مطالعے کی رفاقت کے ساتھ، حرف بُننے کی ریاضت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ رضا علی عابدی نے اپنے سفر کا آغاز سننے سے کیا تھا۔ تعلیم کی تحصیل ہوگئی تو لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ طویل عرصہ کاغذ، قلم اور اخبارات سے تعلق استوار رکھا۔ درمیان میں وقفے آئے لیکن ان وقفوں میں بھی آرام سے تو نہ بیٹھے ہوں گے، سو قدرت اور فطرت کی رہنمائی میں آواز کی دنیا میں آگئے۔

عابدی صاحب آواز کی دنیا میں رہے تو محبتوں اور عقیدتوں کا دائرہ وسیع ہوگیا دنیا بھر سے روزانہ محبتوں کا خراج ملنے لگا۔ یہ ایسی نعمت ہے کہ فروزاں اور فراواں رہے تو نس نس میں جوش وجذبہ اور توانائی لہریں لیتی، کروٹیں بدلتی رہتی ہے اور اس کی ہر لہر میں ہر کروٹ میں عطاؤں کے ہزار رنگ ہوتے ہیں۔ رضا علی عابدی بھی نوازے جاتے رہے۔

معروف داستان گو، نقاد اور افسانہ نگار جناب انتظار حسین نے رضا علی عابدی کو نئے زمانے کا سندباد قرار دینے میں اک ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ روزنامہ ڈان کے 29 اپریل 1994ء کی اشاعت میں اپنے کالم میں انتظار صاحب نے فرمایا۔ بی بی سی کے معروف براڈکاسٹر رضا علی عابدی بارہا پاکستان کے شہروں اور دور دراز علاقوں میں گھومتے نظر آتے ہیں مگر اس بار وہ مختلف مہم پر ہیں اور سفر پر مبنی اپنی تیسری کتاب ''شیر دریا'' بغل میں دبائے۔ انہوں نے لاہور اور اسلام آباد میں ہونے والی تقریبوں میں شاندار خراج تحسین وصول کیا ہے۔ لاہور کی تقریب کی صدارت پنجاب کے اطلاعات کے سیکریٹری جناب منوچہر نے کی۔ جناب الطاف گوہر مہمانِ خصوصی تھے اور مستنصر حسین تارڑ نے نظامت کے فرائض انجام دیئے جو خود بھی سفر کے دھنی ہیں اور کئی مقبول سفر نامے لکھ چکے ہیں۔ کہتے ہیں۔

''اس تقریب میں سفرنامہ نگار کی حیثیت سے رضا علی عابدی کو جو داد و تحسین ملی اس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ مجھے ان کا سفرنامہ ''جرنیلی سڑک'' پہلی بار پڑھنا آج تک یاد ہے۔ میں لندن میں تھا اور مانچسٹر کی بس میں سوار ہو رہا تھا، اسی وقت میں نے یہ کتاب خریدی۔ جی تو چاہتا تھا کہ سفر کے دوران راستے کے سارے منظر دیکھوں مگر یہ کتاب عجب کام کر گئی۔ اس کے ورق کھولتے ہی میں برِصغیر کے شہروں میں کھو گیا۔ ایک بار تو جی چاہا کہ میں مانچسٹر نہیں بلکہ سہسرام جاؤں اور اپنی عقیدت کا خراج شیر شاہ سوری کی نذر کروں۔

جرنیلی سڑک ایک شاہکار ہے۔ دریاؤں، میدانوں، صحراؤں، سمندروں کی عکس گری تو اکثر کی گئی لیکن سڑک کو یہ مقام رضا علی عابدی نے عطا کیا۔ جرنیلی سڑک میں سے ایک انتخاب دیکھیے۔

''ہم سنتے آئے ہیں کہ بستیوں کے مقدر دریاؤں سے جُڑے ہوتے ہیں، دریا اپنا کنارہ چھوڑ کر دور چلے جائیں تو آبادیاں ویرانوں میں بدل جایا کرتی ہیں مگر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ عظمتوں کی نشانیوں کے مقدر سڑکوں سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ سڑکیں اپنی راہ بدل جائیں تو یہ نشانیاں راہ میں ماری جاتی ہیں۔''

''شیر دریا'' میں رضا علی عابدی نے دریائے سندھ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا سارا احوال پہلے بی بی سی اردو سروس کی وساطت سے سنایا اور پھر کتاب کے ذریعے پڑھایا۔ ہر جگہ منفرد انداز نے دلچسپی کے سلسلے کو قائم رکھا۔ دورانِ سفر عابدی صاحب نے اپنی ایک آنکھ دریا کی لہروں پر رکھی اور دوسری دریا کے کنارے آباد بستیوں پر۔ اس طرح وہ انسانوں اور بہتے پانیوں کے میل ملاپ اور اس سے ابھرنے والے زندگی کے الاپ کو دیکھتے اور محسوس کرتے رہے۔

جناب انتظار حسین نے اس شہ پارے کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا تھا۔

''کتاب پڑھتے ہوئے یہ خواہش بھی ہوئی کہ جا کر اس شیر کو دیکھوں جس کے منہ سے تبت والوں کے عقیدے کے مطابق دریائے سندھ کے دھارے پھوٹتے ہیں۔ رضا علی عابدی اس جگہ نہ پہنچ سکے۔ سندباد ہوتا تو جیسے بھی بنتا شیر کے اس دہن تک جا پہنچتا جس سے یہ دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا نکلتا ہے۔''

''شیر دریا'' کی بات ہو کہ ''جرنیلی سڑک'' کی۔ ریڈیو کے دن ہوں کہ اخبار کی راتیں۔ کتب خانہ کی بات چلے کہ منشی عبدالکریم ملکہ وکٹوریہ سے گفتگو کرے۔ جہازی بھائی ہوں کہ ریل کہانی۔ پرانے ٹھگ تو اب کتابوں میں ہی ملیں گے۔ رضا علی عابدی کی ہمت جوان ہے۔ تر و تازہ جذبوں کے ساتھ پڑھنا، لکھنا اور زندگی کے سارے رنگوں سے لطف اندوز ہوتے رہنا اب بھی ان کے معمولات میں شامل ہے۔ وہ پڑھتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر، تجزیہ کاری اصولوں کے مطابق پڑھتے ہیں۔ بھلی اور مثبت عادتیں زندگی کے ہر ایک پل کو خوشگوار بناتے ہوئے آنے والے ہر ایک پل کو مضبوط بناتی چلی جاتی ہیں۔ ریڈیو دنیا بھر میں اپنی وقت کی پابندی سے جانا، پہچانا اور مانا جاتا ہے، ریڈیو سے وابستہ لوگوں کی فطرت میں بھی وقت شناسی شامل ہو جاتی ہے۔ رضا علی عابدی کی سوچ، رویّوں اور عمل میں بھی یہ مثبت خوبیاں نمایاں انداز میں موجود ہیں۔ اور ان کے ہر ایک کام میں کھلی رہتی ہیں۔

شوق کے ہزار رنگ، بہار سجانے میں جو والہانہ انداز دکھاتے ہیں، ان کا روپ انوکھا، نرالا ہوتا ہے۔ فصلِ بہار میں جب جانِ بہار انداز و اطوار کا جادوگر ہو تب کیفیات کس کمال کو چھولیں گی اس کا اندازہ شاید ہی کوئی کر سکے۔ لیکن ہم نے ایسی بزم دیکھی جس میں شوق کے بے شمار رنگ روشن تھے اور جستجو کے ہزار زاویے جلوہ گر تھے۔ ہاں وہ محفل، آواز کی دنیا کے جادوگر، کئی کتابوں کے خالق، جانے انجانے، دیکھے ان دیکھے راستوں کے مسافر، بی بی سی اردو سروس میں سیر بین کو شہرت کے بلند مقام تک پہنچا دینے والے رضا علی عابدی کی رفاقت کا تحفہ تھی۔

رضا علی عابدی ایک بہت بڑا نام ہے، صحافت کا میدان ہو، ادب کا شعبہ ہو، آواز کی دنیا ہو، انہوں نے ہر جگہ شہرت و عظمت کے پرچم بلند کیے۔ اپنی ایک پہچان پیدا کی، اپنے سننے والوں سے ایک مضبوط رابطہ بنایا، تعلق قائم کیا اور اس کو نبھایا۔ انہوں نے آواز کے رابطے سے لوگوں سے جو رشتہ قائم کیا تھا، اس کے جواب میں دنیا بھر کے لوگوں نے انھیں جو محبت دی ہے، پزیرائی بخشی ہے، وہ بے مثال ہے۔ رضا علی عابدی ہمارے والہانہ پن کو جانتے ہیں، انہیں ہماری چاہتوں کی خبر ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جو کام کیا اس کو عروج تک لے گئے۔ اور سفر ابھی جاری ہے۔ خدا کرے محنت اور ریاضت کی سنگت میں جاری یہ سفر ہم پر فکر و خیال کے نئے دریچے کھولتا رہے، عابدی صاحب کا ہنر بولتا رہے اور ہم سنتے، دیکھتے اور پڑھتے رہیں۔

''سفر جاری ہے'' سے یاد آیا بعض لفظ، کچھ جملے، چند ڈائیلاگ ایک بار سنے جائیں تو زندگی بھر ساتھ نبھاتے ہیں، جیسے پکچر ابھی باقی ہے میرے دوست، جیسے تاریخ پہ تاریخ، ایسے ہی سفر جاری ہے۔

رضا علی عابدی فیملی سمیت برطانیہ میں آباد ہیں، مگر ان کے دل میں پاکستان کے شہر، گلی کوچے، قریے، گاؤں، دیہات دھمال ڈالتے رہتے ہیں۔ ان کے ارد گرد، ان کے من آنگن میں مشرق کی تہذیب، معاشرت، ثقافت اور ریت روایت کے سارے سنہرے رنگ جگمگاتے رہتے ہیں۔

ہر دم دھمالِ یار ہے سارے وجود میں
تم نے تو پور پور کو گھنگرو بنا دیا

☆☆☆

فلم نگری

مردِ بحران

انور فرہاد

اپنی جاذبِ نظر اداکاری کو اس نے زندگی کی صیقل پر چڑھاکر آب دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی الگ پہچان بنانے پر قادر ہوا کہ اداکاری بھی حقیقت لگتی۔ ممبئی کی فلم نگری میں پہنچتے ہی اس نے دھوم مچا دی۔

پاکستان کے ایک بڑے اداکار کے روز و شب کا احوال

اللہ اکبر...... اللہ بہت بڑا ہے۔ وہ ہم بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ اگر وہ کسی کی قسمت میں دکھ لکھ دیتا ہے تو یہ اس کی مصلحت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ جس بندے کو بھی دکھ دیتا ہے اس سے پیار نہیں کرتا، دراصل وہ اپنے بعض بندوں کو آزماتا ہے۔ ان کے صبر وتحمل، عزم و ارادے کو دیکھتا ہے کہ میرے یہ بندے کتنے صابر وشاکر ہیں اور اس دکھ کی گھڑی میں بھی مجھے یاد رکھتے ہیں یا نہیں؟

آج میں آپ کو جس فنکار سے ملاؤں گا، وہ اداکار بھی ہے، ہدایت کار اور فلمساز بھی ہے۔ بڑی اسکرین کے ساتھ ساتھ چھوٹی اسکرین کا بھی محبوب فنکار ہے۔ اسٹیج اور تھیٹر میں بھی اپنے فن کی جولانی دکھاتا رہا ہے۔ ریڈیو سے بھی اس کی آواز گونجتی رہی ہے۔ جب میں اس کی کہانی سناؤں گا اس کے فنی سفر کی روداد بیان کروں گا تو آپ کو پتا چلے گا کہ اتنی کامیابیاں سمیٹنے والا، اس قدر عزت، شہرت اور دولت حاصل کرنے والا بھی کس قدر صبر آزما دور سے گزرا ہے۔ کتنی تکلیفیں جھیلی ہیں۔ کس قدر مصائب وآلام سے گزرا ہے۔ اس کے باوجود اس نے کبھی ہمت نہیں ہاری، صبر وتحمل کا دامن نہیں چھوڑا۔ اپنی جدوجہد میں کمی آنے نہیں دی۔ ہمیشہ یہی سوچا کہ اللہ بہت بڑا ہے۔ آج اس نے دکھ دیا ہے تو کل سکھ بھی دے گا۔ اس کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر...... اللہ بہت بڑا ہے۔ یہ اداکار، فلم ساز و ہدایت کار جاوید شیخ ہے جس سے آپ یقیناً بخوبی واقف ہوں گے۔ میں جاوید شیخ کے بارے میں اس کی کہانی سناتے ہوئے ایسی باتیں بتاؤں گا جو ان کہی ہیں، ان کے متعلق شاید آپ نے پہلے نہیں سنا ہوگا۔ مثلاً اپنے ڈراموں اور فلموں میں اتنی صاف، شستہ اور شائستہ اردو بولنے والا اہلِ لکھنؤ کی طرح شیریں لب ولہجے میں مکالمہ ادا کرنے والا!! جاوید شیخ نسلاً پنجابی ہے۔ اس کی مادری زبان پنجابی ہے۔

اس کے والد شیخ رحمت اللہ راولپنڈی سے تعلق رکھتے تھے جب کہ ان کی والدہ جموں سے تھیں۔ جاوید شیخ کا گھریلو نام شیخ جاوید اقبال ہے۔

جو لوگ آج اس سے ملتے ہیں وہ اس کی شائستگی، خلوص، محبت اور نشست و برخواست کی تعریف کرتے ہیں۔ اللہ اللہ! اتنا بڑا فنکار۔ اور اس قدر عز و انکسار۔ اتنا خلوص و پیار۔

اس قدر تعریف کے قابل شخص کے بارے میں اگر میں آپ کو یہ کہوں کہ یہ بندہ جب بچہ تھا تو بہت گندا تھا۔ اس کا بچپن اور لڑکپن کا بڑا حصہ برے اور آوارہ دوستوں کی صحبت میں گزرا تھا تو آپ کو یقیناً تعجب بھی ہوگا اور دکھ بھی ہوگا مگر یہ سچ ہے، حقیقت ہے۔ اگرچہ یہ بہت پرانی بات ہے لیکن اس کا تعلق جاوید شیخ کی ذات سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

اپنے بھائیوں کے برعکس جاوید بچپن سے ہی لاابالی طبیعت کے مالک تھے۔ پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود انہیں لکھنے پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دلچسپی تھی تو کھیلنے کودنے اور شرارتیں کرنے کے علاوہ فلم بینی سے تھی۔ بس ہر وقت اسی فکر میں مبتلا رہتے کہ کس طرح فلم دیکھی جائے۔ گھر سے جو پیسے جیب خرچ کے طور پر ملتے تھے اسے کسی اور کام میں خرچ کرنے کی بجائے فلم کا ٹکٹ خریدنے پر ضائع کر دیتے۔ پیسے نہ ہوتے تو گھر کے کسی فرد کی جیب سے نظریں بچا کر نکال لیتے۔ بعد میں معلوم ہوتا، پکڑے جاتے تو سزا بھی ملتی۔ کئی بار والد سے مار بھی کھائی۔ ان کے والد شیخ رحمت اللہ بڑے سخت گیر تھے۔ اپنے دوسرے بچوں کے علاوہ خاص طور پر شیخ جاوید اقبال پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ جہاں اس کی ذرا سی بھی لغزش دیکھتے دھنک کر رکھ دیتے۔ کبھی کبھی پیار سے بھی سمجھاتے۔ ”دیکھو بیٹے! تم ایک اچھے اور شریف گھرانے کے چشم و چراغ ہو۔ اس لیے تمہیں بھی ایک اچھے لڑکے کی طرح رہنا چاہیے لکھ پڑھ کر اچھا انسان بننا چاہیے۔ وقت پر کھیلو کودو ضرور۔ مگر اچھے اور شریف لڑکوں کے ساتھ۔ برے اور آوارہ لڑکوں کے ساتھ رہو گے تو وہ تمہیں فلم دیکھنے جیسی بری بات سکھائیں گے۔“

جاوید دل ہی دل میں ہنستے۔ ”مجھے کوئی فلم دیکھنے کا سبق کیا پڑھائے گا؟ میں تو خود اپنے دوستوں کو کہتا ہوں۔ میں فلم دیکھنے جا رہا ہوں۔ تم بھی چلو۔“ مگر وہ دل کی بات زبان پر نہیں لاتے۔ ابا جی کی بے خبری پر دل ہی دل میں ہنس... رہ جاتے جب کبھی مار پڑتی تو روتے ہوئے آنسو بہاتے ہوئے وعدہ کرتے۔ ”ٹھیک ہے۔ آئندہ فلم دیکھنے نہیں جاؤں گا۔“

مگر وہ جو بڑوں نے کہا ہے ”چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی“ بہت سی بری باتیں، جیسے خودسری، بدتمیزی، لڑنا جھگڑنا، ہم عمروں کے ساتھ دنگا فساد وقت گزارنے کے ساتھ چھوڑ دی مگر فلم دیکھنے کا شوق ان کے سر پر سوار رہا۔

جاوید کی تمام بری باتوں کے باوجود ان کے بڑوں نے انہیں اچھا بنانے میں کبھی کسر نہیں چھوڑی۔ اسکول جانے کے قابل ہوئے تو اسکول میں داخل کرا دیا۔ شیخ جاوید اقبال کا پہلا اسکول ماڈل پبلک اسکول تھا جو راولپنڈی کے مرکز صدر میں واقع تھا جہاں انہوں نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ اس پورے عرصے میں انہوں نے اسکول کی پڑھائی سے زیادہ فلم بینی پر دھیان دیا۔ برے اور آوارہ دوستوں کی صحبت نے ان کو پڑھائی سے ہی دور نہیں کیا بلکہ انہیں خودسر اور بدتمیز بھی بنا دیا۔ یہ ایسی باتیں تھیں جو ان کے بڑوں کے لیے قابلِ برداشت نہیں تھیں۔ تنگ آ کر ان کے والد شیخ رحمت اللہ نے فیصلہ کیا کہ وہ جاوید کو لے کر کراچی شفٹ ہو جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید ماحول کی تبدیلی سے ان کا یہ بگڑا ہوا بچہ سدھر جائے اور لکھنے پڑھنے پر دھیان دینے لگے۔ جب اس بات کا جاوید کو پتا چلا تو اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں کسی نئی جگہ امی اور بھائی بہنوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا۔“

چند دنوں تک تو ان کی یہ ضد برقرار رہی۔ امی جان بھی اس فیصلے سے اندرونی طور پر خوش نہیں تھیں مگر اس کے بہتر مستقبل کے لیے رضامند ہو گئی تھیں۔ چند دنوں کے بعد حیرت انگیز طور پر ناراض منا کراچی جانے پر رضامند ہو گیا۔

”مگر میری ایک شرط ہے۔“

”کون سی شرط؟“

”یہی کہ مجھے کراچی میں کسی بورڈنگ اسکول میں داخل نہ کرایا جائے۔ ابا جی اگر میرے ساتھ رہیں گے مجھے وہاں چھوڑ کر واپس پنڈی نہیں آئیں گے تو میں کراچی چلا جاؤں گا۔“ یہ کہتے کہتے وہ رو پڑے۔ ماں اور بھائی بہنوں کو ان کے آنسو دیکھ کر جتنا دکھ ہوا اس سے کہیں زیادہ انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ آخر اس رضامندی کی وجہ کیا ہے؟

بات دراصل یہ تھی کہ جب انہوں نے اپنے دوستوں سے دل گرفتگی کے ساتھ یہ کہا۔ ”دوستو! ظالم سماج ہمیں تم

سے جدا کرنے پر تلا ہوا ہے۔"

"ابے! فلمی ڈائیلاگ مت بول۔"

"ہاں سیدھے سیدھے بتا، کیا بات ہے۔"

تب انہوں نے جو بات تھی بتا دی۔

"ارے یار! تو تو بڑا لکی ہے۔ کراچی جیسے بڑے شہر میں تیرے ابا جی تجھے لے جانا چاہتے ہیں۔"

"کیوں...... کراچی میں کیا بات ہے؟"

"کراچی میں فلم اسٹوڈیوز ہیں، فلمیں بنتی ہیں۔ جن فلمی لوگوں کو تو سینما کے اسکرین پر دیکھتا ہے انہیں تو نگار خانوں میں زندہ سلامت بھی دیکھ سکے گا۔"

"ایسا......؟"

"ہاں...... ایسا!"

"مگر میرے فلم دیکھنے کا شوق؟"

"ابے الو کی دم جس طرح تو یہاں اسکول سے بھاگ کر ناغہ کر کے سینما گھر پہنچ جاتا ہے وہاں بھی اسی طرح فلم دیکھنے کا شوق پورا کرتے رہنا۔"

"کیا وہاں...... میرا مطلب ہے کراچی میں سینما گھر ہیں؟"

ایک دوست نے ان کی پیٹھ پر زوردار دھپ لگائی۔

"کراچی، پنڈی سے کہیں بڑا شہر ہے۔ پنڈی سے بہت زیادہ سینما گھر ہیں وہاں۔"

جب ان ساری باتوں کا علم ہوا تو وہ بھلا کیسے کراچی جانے پر رضامند نہ ہوتے اور ایک دن ان کے والد انہیں اپنے ساتھ لے کر کراچی پہنچ گئے اور اپنے دوست محمد علی کے گھر جا پہنچے۔ محمد علی صاحب کراچی کی مشہور کاروباری شخصیت تھے۔ کراچی میں محمد علی صاحب کی ٹرام صدر سے چلتی تھی۔ وہ ٹرام وے کمپنی والے محمد علی کہلاتے تھے۔ شیخ رحمت اللہ اپنے دوست کے ساتھ ٹرام کمپنی کی انیکسی میں اپنے بیٹے جاوید اقبال کے ساتھ رہنے لگے جو مارٹن روڈ پر واقع تھی۔ یہاں آ کر جاوید پر شروع کے چند دن تو بہت بھاری گزرے لیکن جلد ہی وہ نئے دوستوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ مارٹن روڈ کی رہائش انہیں اس لیے پسند آ گئی کہ یہاں سینماؤں کا جمعہ بازار تھا۔ قدم قدم پر سینما گھر موجود تھے۔ ایروز، جوبلی، پلازہ، گوڈین اور چند قدم آگے بندر روڈ پر ناز اور نشاط۔

کراچی پہنچ کر جاوید کے ابا جی نے انہیں صدر کے علاقے میں واقع ماڈل اسکول میں داخل کروا دیا اور وہ تعلیم حاصل کرنے لگے مگر فلم بینی کا چسکا اور فلمی ہیرو بن کر فلمی پردے پر جگمگانے کا بھوت ان کے سر پر سوار رہا۔

دراصل ان کے دل و دماغ پر ایکٹر بننے کا بھوت لڑکپن ہی میں سوار ہو چکا تھا۔ جب وہ محض بارہ سال کے تھے۔ سینما گھر کے اندھیرے ماحول میں فلم کا لطف اٹھاتے ہوئے وہ خیالوں ہی خیالوں میں ان کہانیوں کا حصہ بن جاتے تھے اور تصور ہی تصور میں شمیم آراء، صبیحہ اور رانی وغیرہ کے سحر میں گم ہو جایا کرتے تھے اور پھر جب ایکٹر بننے اور فلم اسٹارز کو قریب سے دیکھنے کا جنون اپنی انتہا کو پہنچا تو جاوید نے اپنے ہم خیال دوستوں کو اکٹھا کیا اور اپنے والد کی جیب سے سو روپے اڑا کر لاہور بھاگ جانے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے مگر ٹرین میں عین اس لمحے دھر لیے گئے جب ریل گاڑی پلیٹ فارم چھوڑنے کی وسل بجا چکی تھی۔

اس واقعے کے بعد ان پر کڑی نظر رکھی جانے لگی اور

انہیں ان کے آوارہ دوستوں سے اور ان کی محفل سے دور کر دیا گیا تھا مگر یہ چند دنوں کی بات تھی۔ پھر وہی دوست تھے اور وہ تھے مگر اب یہ ساری باتیں پرانی ہو گئی تھیں۔ اب وہ ان دوستوں سے بچھڑ کر کراچی آ گئے تھے اور جلد ہی یہاں کے کچھ نئے لڑکوں سے ان کی دوستی ہو گئی۔ ماڈل اسکول سے وہ کچھ عرصے بعد میری گلاسگو سیکنڈری اسکول میں منتقل کر دیئے گئے۔ یہ وہی اسکول تھا جہاں سے وحید مراد نے بھی میٹرک کیا تھا۔

تھوڑے دنوں کے بعد شیخ رحمت اللہ کی پوری فیملی پنڈی سے کراچی آ گئی تو جاوید کے والد کو پلازہ سنیما سے متصل ایک بلڈنگ میں ایک فلیٹ حاصل کرنا پڑا بعد میں ان کی فیملی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر انہیں گرین اسٹریٹ میں واقع جوہر مینشن میں رہائش اختیار کرنی پڑی۔

اس دوران جاوید نے والد کے دباؤ اور خوف کے باعث تعلیم پر توجہ دینا تو شروع کر دی مگر فلم بینی کا شوق اور اداکاروں، اداکاراؤں کی ایک جھلک دیکھنے کی ٹھرک اپنی جگہ برقرار رہی۔ اسکول سے واپسی کے بعد جاوید کا ایک ہی مشغلہ تھا۔ سنیماؤں پر جا کر قدآدم ہورڈنگز اور ہال کے اندر آویزاں پوسٹرز دیکھنا یا پھر فلم بینی۔ جب بھی کوئی نئی فلم لگتی جاوید پہلی فرصت میں اسے دیکھنے کی جستجو کرتے۔

بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ)، گارڈن اور مارٹن روڈ پر واقع سنیماؤں کا اسٹاف جاوید اقبال سے خوب اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ ان میں سے کئی تو جاوید اقبال کے ایسے دوست بن گئے تھے کہ فلم اسٹار بننے کے بعد بھی وہ ان دوستوں کو نہیں بھولے۔ اس دوستی اور شناسائی کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ ٹکٹ کی قیمت ادا کیے بغیر فلم دیکھنے کی ٹھرک پوری کرنے لگے۔ فلم دیکھنے کے علاوہ جاوید کو اداکاروں اور اداکاراؤں کے پوسٹرز جمع کرنے کا بھی شوق تھا جس کے لیے سنیما اسٹاف ہی ان کے کام آتا تھا۔ اکثر وہ فلمی دفاتر یا سنیماؤں سے فلموں کے پوسٹرز مانگ کر یا پھر چوری چھپے اٹھا کر لاتے اور اپنے دوستوں پر فلم والوں سے اپنے تعلقات کی دھاک بٹھاتے۔

بارہ برس کی عمر میں گھر سے بھاگ کر لاہور جانے کا واقعہ سنا چکا ہوں۔ جاوید شیخ کو آج بھی یہ واقعہ یاد ہے اور اس کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو کے دوران اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔ ”میرے کچھ دوستوں نے لاہور جانے کا پروگرام بنایا کہ وہاں جا کر فلموں میں کام ڈھونڈا جائے۔ میں چھوٹا تھا۔ ٹرین نکلنے ہی والی تھی۔ قسمت اچھی تھی کہ والد اور ان کے دوستوں نے ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ والد نہیں چاہتے تھے کہ میں کسی غلط راستے پر نکل جاؤں۔ میں ہیرو نہ بنتا کچھ اور بن جاتا اگر وہ ٹرین ہمیں لے کر نکل جاتی تو میں وہاں نہ ہوتا جہاں اس وقت ہوں۔“

جاوید شیخ کی زندگی کا یہ واقعہ ابھرتی ہوئی عمر کے نوجوانوں کے لیے بڑا سبق آموز ہے۔ جاوید شیخ کی طرح کمسن اور ناپختہ ذہن کے لڑکوں کو ہرگز غلط راستے کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے۔ والدین جس طرح ان کے مستقبل کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں ان پر عمل کرنا چاہیے۔

بات ہو رہی تھی جاوید کے اس دور کی جب انہوں نے کراچی کے سنیما اسٹاف سے اچھی خاصی دوستی کر لی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب کراچی کی فلم انڈسٹری فعال تھی۔ یہاں کے اسٹوڈیوز میں فلموں کی شوٹنگز ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں ایسٹرن اور ماڈرن اسٹوڈیوز میں بے شمار فلمی دفاتر قائم تھے جن میں وحید مراد کا ”فلم آرٹس“ سب سے بڑا پروڈکشن ہاؤس تھا۔ ایسٹرن اسٹوڈیو میں دن بھر فنکاروں کا میلہ لگا رہتا تھا جب کہ شام ہوتے ہی یہ عالم ہوتا کہ گویا ستاروں کی کہکشاں آسمان سے زمین پر اتر آئی ہو۔ وحید مراد، شبنم، محمد علی، شمیم آراء، دیبا، کمال، زاہد، ساقی اور زیبا جیسے مقبول ستارے اکثر کسی فلور یا لان میں فوارے کے اردگرد شوٹنگ کرتے نظر آتے تھے۔ جاوید اقبال کو ان فنکاروں کی ایک جھلک دیکھنے اور شوٹنگ سے لطف اندوز ہونے کا ایسا جنون تھا کہ اکثر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ پیدل ہی گارڈن روڈ سے سائٹ ایریا کا سفر کرتے ہوئے ایسٹرن اسٹوڈیو آتے، جہاں گیٹ پر پٹھان چوکیدار ان کے ارمانوں پر پانی پھیرنے کے لیے موجود ہوتا تھا۔ جاوید شیخ آج ان باتوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے بڑے افسوس کے ساتھ کہتے ہیں۔

”آج ایسٹرن اسٹوڈیو کی ویرانی کا یہ عالم ہے کہ وہاں چوکیدار کی موجودگی بے معنی ہے۔ وقت اور حالات بدلتے ہیں تو کیسی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔“

جب جاوید شیخ، جاوید اقبال تھے، ایک ٹھرکی نوجوان لڑکے تھے۔ اسٹوڈیو کے گیٹ پر تعینات چوکیدار کی رعونت اور اکڑپن قابل دید ہوا کرتی تھی۔ اسٹوڈیو کے گیٹ کا چوکیدار گویا کسی مغل بادشاہ کے دربار کا پہرے دار نظر آتا تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی اسی احساس کے ساتھ سرانجام دیتا تھا کہ

اسے کسی قلعے کا سپاہی مقرر کیا گیا ہے۔ جس کی پسپائی کا مطلب تھا سلطنت کا دھڑن تختہ۔

ان باتوں اور جذباتوں کا اظہار جاوید شیخ اب کرتے ہیں تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان دنوں ان کے اور ان کے ٹھرکی دوستوں کے دلوں پر کیسی آری چلتی ہوگی۔

''اس بدتمیز، گھمنڈی اور جنگجو چوکیدار کے ہاتھوں میری اور میرے دوستوں کی کئی بار بے عزتی ہوئی مگر ہم جیسے جنونیوں کے ارادوں کو شکست دینا اس عاقبت نا اندیش چوکیدار کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بے چارہ یہ شعور کہاں رکھتا تھا آج جس اسکول بوائے کو وہ عام فلمی ٹھرکی سمجھ کر دھتکار رہا ہے، آنے والے وقت میں وہ اس تاج وتخت کا دعویدار ہوگا اور فلمی ریاست کا پرنس کہلائے گا۔''

سیدھے راستے سے انٹری نہ ملنے پر جاوید اقبال اور ان کے دوست چور دروازے سے اور اسٹوڈیو کے در و دیوار سے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے۔ جسے ناکام بنانا اسٹوڈیو انتظامیہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ ٹھرکی لڑکے اکثر نگار خانے کی دیواروں پر چڑھ کر لان میں بیٹھے فنکاروں کو دیکھ کر کچھ تسکین پالیتے تھے مگر یہ کام بڑا مشکل تھا۔ اس کے لیے انہیں ایک دوسرے کے کندھے استعمال کرنے پڑتے تھے۔

ایک دن جاوید اقبال اور ان کے دوست ایسٹرن اسٹوڈیو کی دیوار پر چڑھ کر اندر کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک فلم یونٹ میں شامل ایک شخص کی نظر ان لڑکوں پر پڑی۔ اس موقع پر جاوید اور ان کے دوست گھبرا کر چھلانگ لگا کر بھاگنے کی تیاری کررہے تھے کہ اس آدمی نے جاوید کو بڑی اپنائیت سے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد وہ شخص ان کے قریب آکر بولا۔ ''کیا فلم میں کام کرو گے؟''

جاوید اقبال اور ان کے دوستوں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ ایک دوسرے کو حیرانگی سے دیکھنے لگے۔ جیسے پوچھ رہے ہوں۔ کیا یہ آدمی ہم سے مذاق تو نہیں کررہا ہے؟

یہ تماشا دیکھ کر اس شخص نے اپنا تعارف کرایا۔

''میں ایکسٹرا سپلائر ہوں۔'' اور کہا۔ ''کیا تم لوگوں کو فلموں میں کام کرنے کی خواہش ہے؟''

''ہاں......ہاں......ہم فلموں میں کام کرنا چاہتے ہیں۔'' تمام لڑکوں نے بیک زبان کہا۔

اس کے بعد یہ لڑکے ایکسٹرا سپلائر کے ساتھ ایسٹرن

جاوید شیخ کی بھارتی فلمیں

شکیھر، رفتہ رفتہ، جانِ من، نمستے لندن، اپنے، اوم شانتی اوم، مائی نیم از انتھونی گنزالوس، جنت، ہنستے ہنستے، منی ہے تو ہنی ہے، یوراج، روڈ تو سنگم، گھوسٹ، صدیاں، کجرارے، نہ جانے کب سے، آ ئز کلنگ۔

(یہ فلمیں 2014ء تک ریلیز ہونے والی ہیں)

سندھی فلم

اکھاڑہ ایک ایسی فلم ہے جو اردو اور پنجابی کے علاوہ سندھی زبان میں بھی ڈب کر کے دکھائی گئی۔

ٹی وی ڈرامے

انسان اور آدمی، شمع، آگہی، پرچھائیاں، ان کہی، دوسری لڑکی، ادھوری کہانی، پناہ، آٹو گراف، مس فٹ، خوب صورت جہاں، ہاف فرائی، شکار، موسم، چاندنی راتیں، دیوار، فرار، کبھی کبھی، آذر کی آئے گی بارات، پت جھڑ کے بعد، جیسے جانتے نہیں، تم کہاں، ہم کہاں، تھوڑی سی محبت، بول میری مچھلی، کچھ دل نے کہا، ڈولی کی آئے گی بارات، ڈبل ٹرپل، دل سے دل تک، بریگیڈیئر اور میں، رسم، عشق عبادت، ایک ہلکی سی خلش، تانے کی آئے گی بارات، میرے چارہ گر، پیا رے میں کبھی کبھی، ننھی، ماتم، دل نہیں مانتا۔

(یہ وہ ڈرامے ہیں جو 2014ء تک آن ایئر ہو چکے ہیں)

سپر ہٹ پاکستانی فلمیں

کبھی الوداع نہ کہنا (ریلیز 1983ء ہدایت کار نذر شباب)۔ شادی مگر آدھی (ریلیز 1984ء ہدایت کار ظفر شباب)۔ مس کولمبو (ریلیز 1984ء ہدایت کار شمیم آراء)۔ بوبی (ریلیز 1984ء ہدایت کار نذر شباب)۔ لازوال (ریلیز 1984ء ہدایت کار محمد جاوید فاضل)۔ ہلچل (ریلیز 1985ء ہدایت کار پرویز ملک)۔ ہانگ کانگ کے شعلے (ریلیز 1985ء ہدایت کار جان محمد جمن)۔ جینے نہیں دوں گی (ریلیز 1985ء ہدایت کار سنگیتا)۔ مہندی (پنجابی) (ریلیز 1985ء ہدایت کار الطاف حسین)۔ زنجیر (ریلیز 1986ء ہدایت کار پرویز ملک)۔ یہ دل آپ کا ہوا (ریلیز 2002ء ہدایت کار جاوید شیخ)۔ نامعلوم افراد (ریلیز 2014ء ہدایت کار نبیل قریشی)۔

اسٹوڈیو کے اندر داخل ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آج کے سپر اسٹار جاوید شیخ نے فلم اسٹوڈیوز کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ ذرا سوچیے۔ ان کی اور ان کے دوستوں کی اس وقت مارے خوشی کے کیا کیفیت ہوگی۔

جاوید اور ان کے ساتھیوں کو اندر جا کر معلوم ہوا، انہیں جس فلم میں ''اداکاری'' کے لیے لایا گیا ہے۔ وہ ہدایت کار شیخ حسن کی فلم ''جاگ اٹھا انسان ہے'' جس میں محمد علی، زیبا، وحید مراد، کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ 1966ء کی بات ہے۔ اس فلم کا یونٹ آؤٹ ڈور کے لیے منگھو پیر جا رہا تھا جہاں پہاڑیوں میں ایک قافلے کی عکسبندی کی جانی تھی۔

یونٹ کے تمام لوگوں کے ساتھ جاوید اور ان کے دوستوں کو بھی منگھو پیر پہنچایا گیا۔ جب تمام لوگ لوکیشن پر پہنچ گئے تو جاوید شیخ اور ان کے دوستوں کو اونٹوں پر سوار کر دیا گیا۔ جاوید بہت خوش تھے کہ پہلی بار خود کو پردۂ سیمیں پر دیکھنے کا خواب سچ ہونے جا رہا ہے مگر اس وقت ان کے تمام ارمانوں پر اوس پڑ گئی جب ڈائریکٹر شیخ حسن نے یہ آواز لگائی۔

''ان تمام لڑکوں کو دوپٹے پہنا دو۔''

دراصل سچویشن یہ تھی کہ محمد علی مستورات کے قافلے کی نگہبانی کر رہے تھے۔ چونکہ مطلوبہ تعداد میں ایکسٹرا گرلز کا بندوبست نہیں ہوسکا تھا لہٰذا ان اسکول کے لڑکوں سے یہ کام لیا جا رہا تھا۔

جاوید اقبال کو جب اصل صورتِ حال کا علم ہوا تو انہیں بہت دکھ ہوا۔ وہ بہت مایوس ہوئے مگر ان کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگئی کہ وہ اپنے فیورٹ اداکار محمد علی سے ملاقات کرسکے۔

اس وقوعے کا سب سے دلچسپ اور اہم حصہ یہ ہے کہ شوٹنگ کے خاتمے پر محمد علی نے ان لڑکوں سے کہا۔ کیا کہا؟ یہ جاوید شیخ ہی کی زبانی سنیے۔

''علی صاحب نے ہمیں اپنے قریب بلا کر کہا۔ تم لوگ یقیناً اسکول سے بھاگ کر یا اپنے گھروں میں اطلاع دیئے بغیر یہاں آئے ہو۔ آئندہ ایسا ہرگز مت کرنا، اگر ایکٹر بننے کا شوق ہے تو پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو اور والدین کی اجازت لے کر اس شعبے کی طرف آؤ۔ اگر تمہارے والدین کی دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی تو پھر کوئی تمہیں آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتا۔''

جاوید شیخ آج تک محمد علی کی اس نصیحت کو نہیں بھولے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ''علی بھائی کی ان باتوں نے میرے دل ودماغ پر گہرا اثر کیا اور میں پہلے سے زیادہ اپنی تعلیم پر توجہ دینے لگا۔''

شاعر نے کہا ہے۔ ''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔''

جاوید شیخ کا کہنا ہے کہ اتنے بڑے فلم اسٹار نے اس پیار اور محبت سے ہمیں نصیحت کی تھی کہ میں پہلے سے کہیں زیادہ ان کا گرویدہ ہوگیا۔ لکھنے پڑھنے پر اس لیے توجہ دینے لگا کہ علی بھائی نے کہا تھا۔ ''ایکٹر بننے کا شوق ہے تو پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔'' جس کا یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ اداکار بننے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ بندہ پڑھا لکھا ہو۔ میں نے اپنے دوستوں کو بھی سمجھایا۔ ''دوستو! ہمارے لیے اسٹوڈیوز کے چکر لگانے سے زیادہ ضروری ہے کہ ہم پہلے لکھ پڑھ کر کچھ بن جائیں۔''

''ہاں یار! یہ ضروری ہے۔''

''ورنہ۔'' ایک لڑکے نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہمیں فلموں میں کام ملے گا بھی تو ایسا کہ ہم، ہم نہیں ہوں گے۔''

اس کے بعد ہم تمام دوست اپنی اپنی تعلیم پر توجہ دینے لگے۔ دوسروں کے بارے میں تو مجھے علم نہیں۔ میں تو جیسے علی بھائی کا مرید بن گیا تھا۔ اب میں نے فلمی ستاروں کے پوسٹرز وغیرہ جمع کرنے کا شوق بھی ختم کر دیا تھا۔ اس کی بجائے اخباروں اور فلمی رسالوں کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ خاص طور پر میں علی بھائی کے بارے میں شائع ہونے والی تحریریں بڑے شوق سے پڑھتا۔ اس مطالعے سے مجھے علی بھائی کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت سی اہم معلومات

حاصل ہوئیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنا فنی کیریئر ریڈیو میں صداکاری سے شروع کیا۔ پہلے ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے وابستہ رہے۔ پھر حیدرآباد سے کراچی آگئے اور ریڈیو پاکستان کراچی سے صداکاری کرنے لگے۔ یہاں انہیں بخاری صاحب جیسے براڈ کاسٹر کی سرپرستی اور تربیت حاصل ہوئی اور پھر ریڈیو کی صداکاری سے ہی فلموں کی اداکاری کا موقع ملا۔ اس کے بعد میں نے سوچا۔ ”کیوں نا میں بھی اداکاری سے پہلے صداکاری میں قسمت آزماؤں۔“ اور پھر وہ موقع کی تلاش میں رہے کہ کس طرح ریڈیو تک پہنچا جائے۔ ایک طرف تو وہ اسکول میں جی جان لگا کر پڑھ رہے تھے دوسری طرف اسی دور سے صداکاری کی دوڑ میں شامل ہونے کی جستجو بھی کرنے لگے۔

ایک دن انہیں معلوم ہوا کہ ریڈیو پاکستان کراچی میں ملی نغموں میں حصہ لینے کے لیے نئی آوازیں تلاش کی جارہی ہیں۔ لہٰذا وہ بھی آڈیشن دینے ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔ جاوید اقبال نے بھی آڈیشن دیا مگر اس امتحان میں، اس آزمائش میں وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ وہ اپنے اردو تلفظ کی وجہ سے مار کھا گئے تھے۔ چونکہ ان کی مادری زبان پنجابی تھی اور ان کا بچپن راولپنڈی میں گزرا تھا اس لیے ان کے لب و لہجے میں پنجابیت کی جھلک موجود تھی۔ وہ اس معیار کی اردو نہیں بول سکے جس کی ضرورت ریڈیو پاکستان جیسے ادارے کو تھی۔

انہیں جب معلوم ہوا کہ وہ آڈیشن میں کس وجہ سے ناکام ثابت ہوئے تو انہوں نے اپنے لہجے کی یہ خامی دور کرنے کی کوشش شروع کردی۔ ایسے لڑکے جن کی مادری زبان اردو تھی ان کی بول چال پر توجہ دینے لگے اور انہی کی طرح بولنے کی کوشش کرنے لگے۔

ان دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا۔ ”میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ جس طرح بھی ہو مجھے علی بھائی کی طرح ریڈیو کی صداکاری سے ہی اپنے فنی کیریئر کا آغاز کرنا ہے۔ میں آڈیشن کی ناکامی سے گھبرایا نہیں۔ گانے کے امتحان میں ناکامی ہوئی تو کیا ہوا۔ میں دوسرے شعبوں میں صداکاری کروں گا۔“

اور دھن کے پکے جاوید اقبال نے ایسا ہی کیا۔ وہ گاہے بگاہے ریڈیو کے چکر لگاتے رہے اور وہاں کے لوگوں سے شناسائی بڑھاتے رہے اور پھر ایک دن انہیں ایک ڈرامے میں صداکاری کا موقع مل ہی گیا۔ یہ پروڈیوسر رضی اختر شوق کا ایک ڈراما تھا جس میں دیگر صداکاروں کے

کامیاب فلمیں

فیصلہ (ریلیز 1986ء ہدایت کار محمد جاوید فاضل)۔ ایک سے بڑھ کر ایک (ریلیز 1987ء ہدایت کار نذر شباب)۔ قاتلوں کے قاتل (ریلیز 1988ء ہدایت کار ایم اے رشید)۔ آگ ہی آگ (ریلیز 1988ء ہدایت کار جاوید فاضلی)۔ غریبوں کا بادشاہ (ریلیز 1988ء ہدایت کار پرویز ملک)۔ استادوں کے استاد (ریلیز 1990ء ہدایت کار محمد جاوید فاضل)۔ چوروں کا دشمن (ریلیز 1990ء ہدایت کار زاہد شاہ)۔ آخری مجرا (ریلیز 1993ء ہدایت کارہ شمیم آراء)۔ جیوا (ریلیز 1995ء ہدایت کار سید نور)۔ جو ڈر گیا وہ مرگیا (ریلیز 1995ء ہدایت کار اقبال کاشمیری)۔ گنز اینڈ روزز (ریلیز 1999ء ہدایت کار شان)۔ مجھے چاند چاہیے (ریلیز 2000ء ہدایت کار فیصل بخاری)۔ میں ہوں شاہد آفریدی (ریلیز 2013ء ہدایت کار اسامہ)۔

علاوہ محمود علی اور عرش منیر جیسے کہنہ مشق فنکار بھی تھے۔ جاوید اقبال نے اپنا مختصر کردار بڑی خوب صورتی سے ادا کیا تھا۔ رضی اختر شوق اس کی صداکاری سے متاثر ہوئے تھے۔

ان دنوں کراچی ریڈیو سے ”اسٹوڈیو نمبر 9“ ریڈیائی ڈراموں کا بڑا مقبول پروگرام تھا جس سے بڑے اچھے اور معیاری ڈرامے نشر کیے جاتے تھے اور پسند کیے جاتے تھے۔ ”اسٹوڈیو نمبر 9“ کے کئی ڈراموں میں ابھرتے ہوئے صداکار جاوید اقبال کو بھی صداکاری کا موقع ملا۔ اس طرح آہستہ آہستہ وہ ریڈیو اسٹیشن میں جانے پہچانے لگے۔ وہ اپنے پروڈیوسرز کی ہدایات پر بھرپور طور پر توجہ دیتے، عمل کرتے۔ اپنے مکالمے کی ادائیگی میں ہر طرح کوشش کرتے کہ پورے اتریں۔

کام کوئی بھی ہو۔ اگر نیک نیتی سے کیا جائے۔ محنت اور لگن سے انجام دیا جائے تو اس کے دوررس نتائج ہوتے ہیں۔ جاوید نے جی جان لگا کر اپنے کردار ادا کیے تو نئے اور ابھرتے ہوئے صداکار کی حیثیت سے ریڈیو کے پروڈیوسروں سے قریب ہوتے گئے۔ پروڈیوسر آفتاب افغانی ان پر بہت مہربان ہوگئے۔ اپنے ڈراموں کے علاوہ دوسرے پروڈیوسروں کو بھی اس کے لیے کام کی گنجائش نکالنے کی سفارش کرنے لگے۔ افغانی صاحب کی دوستی ٹی وی پروڈیوسروں سے بھی تھی۔ جن میں سے اکثر ریڈیو سے

ہی ٹی وی پر گئے تھے۔

ایک دن پی ٹی وی کے نامور پروڈیوسر امیر امام ان سے ملنے آئے تو اتفاق سے ان کے قریب جاوید اقبال بھی موجود تھے۔ انہوں نے امیر امام سے کہا۔ ”یار! اس لڑکے کو بھی کبھی اپنے کسی ڈرامے میں چانس دو نا۔ بڑا ٹیلنٹڈ ہے۔ اپنی نوعمری کے باوجود بڑی دل جمعی کے ساتھ پرفارم کرتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ امیر امام بولے۔ ”دیکھتا ہوں اپنے کسی ڈرامے میں اس کے لیے کوئی جگہ نکلی تو اسے ضرور بلاؤں گا۔“

”تم مجھے فون کر دینا۔ میں اسے بھیج دوں گا۔“

چند روز بعد ہی افغانی صاحب کے پاس پروڈیوسر امیر امام کا ٹیلی فون آیا۔ ”کل اس لڑکے کو میرے پاس بھیج دو۔“

”ٹھیک ہے بھیج دوں گا۔ کون سا ڈراما ہے؟“

”ارے یار! وہی ڈراما سیریز ”آدمی اور انسان“ میں ایک کردار نکلا ہے۔“

جاوید اقبال کو آفتاب افغانی نے یہ خوش خبری سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ”شکریہ افغانی صاحب! آپ نے مجھے ریڈیو ڈراموں سے ٹی وی ڈراموں تک پہنچانے میں میری جو مدد کی ہے اس کے لیے جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔“

”میرا نہیں اللہ کا شکر ادا کرو۔“

جاوید اقبال پی ٹی وی وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ پروڈیوسر امیر امام نے انہیں ان کے کردار اور اس کی ادائیگی کے بارے میں بتایا۔

”دیکھو جاوید، طلعت حسین اس ڈرامے کے ہیرو ہیں۔ سین یہ ہے کہ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ دوران گفتگو وہ اپنے ملازم کو آواز دے کر کہتے ہیں۔ ”رمضو! چائے لاؤ۔“

تمہارا کردار رمضو کا ہے۔ تم بھاگتے ہوئے طلعت حسین کے پاس آتے ہو اور آکر کہتے ہو جی ابھی لایا۔“

”اور پھر تم اگلی انٹری میں چائے کی ٹرے رکھ کر خاموشی سے چلے جاتے ہو۔“

”جی سمجھ گیا۔ بالکل ایسا ہی کروں گا۔ جیسا آپ نے بتایا ہے۔“

جاوید اقبال کو اپنی زندگی کا یہ پہلا ٹا کی شاٹ دینے کا موقع ملا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیا۔ ”یا اللہ! میرا شاٹ پروڈیوسر کے حسب منشا ہو، پسند آئے۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے طلعت حسین کے آواز دینے پر انٹری دی۔ طلعت حسین نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”رمضو چائے لاؤ۔“

جس پر انہوں نے جواب دیا۔ ”جی ابھی لایا۔“ اور واپس لوٹ گئے اور پھر ذرا دیر بعد چائے کی ٹرے لے کر آئے اور اسے رکھ کر خاموشی سے لوٹ گئے۔

شاٹ او کے ہو گیا۔ طلعت حسین نے بھی تعریف کی۔

”بھئی آپ کا یہ نیا فنکار تو بہت اچھا ہے۔ ذرا نہیں گھبرایا۔ پہلا ہی شاٹ او کے کرا دیا۔“

رمضو کا یہ مختصر ترین کردار جاوید شیخ کے تابناک فنی سفر کا پہلا قدم تھا جس میں ان کی پرفارمنس سے ڈراما پروڈیوسر خوش ہوا تھا جب کہ طلعت حسین جیسے فنکار نے بھی اس نو آموز پرفارمر کی تعریف کی تھی یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ رمضو نے ان کے لیے ٹی وی ڈراموں کے دروازے کھول دیئے اور وہ کئی چھوٹے اور مختصر کرداروں میں نظر آنے لگے۔ اسی دوران انہیں اسٹیج پر بھی اداکاری کا موقع ملنے لگا۔ دراصل ان دنوں ٹی وی کا میڈیا بہت مقبول تھا۔ ٹی وی پروگراموں میں شرکت کرنے کا مطلب تھا اس آرٹسٹ پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنا کردار بھی بخوبی ادا کرے گا اور ناظرین کو بھی متاثر کرے گا۔

ریڈیو کے بعد ٹی وی اور پھر اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا تو جاوید اقبال کو اپنے آپ پر یقین آنے لگا کہ وہ آنے والے دنوں میں فن کی دنیا میں اپنے لیے ممتاز مقام بنا لے گا۔ اس دوران اس نے اپنے فیورٹ فنکار محمد علی کی نصیحت کو یاد رکھا اور اپنی تعلیم پر بھی توجہ دیتا رہا۔ ریڈیو کی طرح ٹی وی کے کرتا دھرتاؤں کو جب پتا چلتا کہ یہ نوعمر آرٹسٹ طالب علم ہے اور پڑھ رہا ہے تو اس کو کہتے۔ ”شاباش! تعلیم جاری رکھو۔ اب شوبز میں ان ہی لوگوں کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع ملے گا جو پڑھے لکھے ہوں گے، تعلیم یافتہ ہوں۔“

اس نے خود بھی محسوس کیا کہ شوبز میں انہی لوگوں کی عزت ہوتی ہے جو تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ علی بھائی نے اس سے اور اس کے دوستوں سے بہت پہلے ایسٹرن اسٹوڈیو میں

جو بات کہی تھی، جو نصیحت کی تھی وہ بھی تو یہی تھی کہ اگر ایکٹر بننا چاہتے ہو اور اس شعبے میں آنا چاہتے ہو تو پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔"

اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں جاوید شیخ نے کہا۔"میں نے اتنا طویل انتظار تو نہیں کیا۔ کیونکہ سر پر فنکار بننے کا جو بھوت سوار تھا اس نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ فنی سفر کے لیے جدوجہد کرنے پر مجبور کیا۔"

جب رب راضی تو پھر راستے کی رکاوٹیں ختم ہوتی جاتی ہیں۔ پہلے جس جاوید کی آواز لوگ ریڈیو سے سنتے تھے اس جاوید کو ٹی وی ڈراموں میں بھی دیکھنے لگے اور پھر اسٹیج ڈراموں اور دیگر پروگراموں میں بھی وہی جاوید نظر آنے لگا تو اسے دیکھنے والے اسے پسند بھی کرنے لگے۔ اس کی انٹری پر ناظرین تالیاں بھی بجاتے اور اس سے اپنی محبت کا اظہار بھی کرتے جب کسی آرٹسٹ کو عوام پسند کرنے لگتی ہے تو اشتہاری ادارے اسے اشتہاری فلموں میں بھی شامل کرنے لگتے ہیں۔ اب جاوید کو بھی گاہے بگاہے اشتہاری فلموں میں پیش کیا جانے لگا۔ یہ اشتہاری فلمیں ٹی وی کے علاوہ سنیما گھروں میں بھی دکھائی جاتی تھیں۔ ایسی اشتہاری فلموں کی نمائش سے جاوید کو مزید پذیرائی ملی اور فیشن شوز میں بھی انہیں شامل کیا جانے لگا۔ بلکہ نامور ملبوسات کے تشہیری شوز میں انہیں ریمپ پر واک بھی کروایا جانے لگا۔

ریڈیو، ٹی وی، اسٹیج اور پھر فیشن شوز، جاوید سب میں شامل ہو کر اپنے اندر کا فن اجاگر کرنے لگے مگر ابھی تک ان کے دل و دماغ کو تسکین حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ اس کے پرانے ساتھیوں اور دوستوں کو معلوم تھی کہ ان کے یار جاوید اقبال کی منزل کوئی اور ہے۔ ریڈیو، ٹی وی، اسٹیج اور فیشن شوز کے معرکے سر کرنے سے اس کے آگے بڑھنے کی پیاس نہیں بجھی ہے۔ یہ سب کچھ تو اس نے خود کو منوانے کے لیے کیا ہے۔"دیکھو لوگو! میں ہر روپ میں، ہر رنگ میں نمایاں نظر آ سکتا ہوں۔ مجھے جانو پہچانو اور میری صلاحیتوں کا امتحان بڑی اسکرین پر لو۔"

اس کے دوست اچھی طرح جانتے تھے کہ جاوید کا خواب بڑے پردے پر حکمرانی کا ہے۔ اس کی منزل سنیما اسکرین پر جلوہ گر ہونا ہے۔ وہاں پہنچ کر اپنے محبوب فنکار محمد علی کی طرح وہ بھی عزت اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

آج کا سپر اسٹار جاوید شیخ اس مقام تک پہنچنے کے لیے کیسے کیسے صبر آزما حالات سے نہیں گزرا۔ اسے اس منزل تک پہنچنے کے لیے ایک ایک قدم آگے بڑھانا پڑا بقول شاعر

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

اس کی قسمت میں مرزا نذیر بیگ کی طرح ایک دم ندیم بن کر جگمگانا نہیں لکھا تھا۔ جاوید کو فلم انڈسٹری تک لے جانے والوں میں کیمرا مین مدن علی مدن کا بڑا کردار ہے۔ مدن علی اس زمانے میں جب جاوید فنی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ایک بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ایشیاٹک کے لیے کمرشل بناتے تھے۔ اشتہاری فلمیں، فلمز کے کیمروں سے ہی شوٹ ہوتی تھیں۔ جاوید نے پہلی بار ایک کمرشل فلم کے لیے جس کیمرے کا سامنا کیا اسے مدن علی مدن ہی آپریٹ کررہے تھے۔ یہ ایک مشروب ساز ادارے کی برانڈ"ایپل سڈرا" کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس اشتہاری فلم میں جاوید کے ساتھ فاخرہ شریف نے ماڈلنگ کی تھی۔ واضح رہے کہ فاخرہ شریف، بابرہ شریف کی بڑی بہن ہیں۔ اس کمرشل فلم کے ہدایت کار بھی مدن علی تھے۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ یہ مدن علی مشہور بھارتی ہیروئن صومی علی کے والد تھے جنہوں نے بعد میں بہت سی پاکستانی فلموں کی عکاسی کی۔

جاوید کے اسٹیج پر اداکاری کرنے کے تجربے نے ان میں خاصا اعتماد پیدا کیا۔ وہ ایک اچھے اداکار ثابت ہونے لگے۔ خصوصاً کامیڈی پرفارمنس کے حوالے سے جاوید نے اس قدر امپریس کیا کہ جب وہ فلم کے ہیرو بنے تو انہیں کامک کرداروں کے حوالے سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ درحقیقت ان کے اندر چھپے ہوئے انتہائی باصلاحیت کامیڈی ہیرو کو محض چند ہدایت کار باہر لا سکے اور پھر خود جاوید نے بھی سنجیدہ سوشل ایکشن یا رومانوی کرداروں کو ترجیح دی ورنہ وہ زبردست کامیڈی ہیرو کی حیثیت سے یکتا مقام کے مالک بن سکتے تھے۔

تھیٹر نے جاوید کے اندر پوشیدہ شریر اور حاضر جواب فنکار کی تسکین کا بہتر سامان کیا۔ انہوں نے اپنے ابتدائی دور میں ہی اپنے وقت کے بڑے بڑے کامیڈینز کو باور کرایا کہ وہ تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گے۔ جاوید نے اسٹیج کے بڑے فنکاروں شہزاد رضا، عمر شریف، رزاق راجو، لیاقت سولجر اور اسماعیل تارا کے ساتھ کئی ڈرامے کیے اور خود اسٹیج ڈرامے پروڈیوس بھی کیے۔ ان کا سب سے مقبول کھیل"شادی ہو تو ایسی" کے 100 سے زیادہ شوز مختلف شہروں میں ہوئے۔

وہ اپنے گروپ کے ساتھ حیدر آباد اور راولپنڈی سمیت کئی شہروں میں یہ ڈراما کرنے گئے۔

ان ساری کامیابیوں کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھے۔ ان کا تو بس یہی خواب تھا کہ سینما گھروں کی بڑی اسکرین پر ہیرو بن کر جلوہ افروز ہوں۔ قدرت کے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے مگر اس بے صبرے کا یہ عالم تھا کہ کل کی بجائے آج ہی فلم کے ہیرو بننے کا چانس مل جائے۔ بہرحال وہ وقت بھی آگیا اور کراچی کے فلم پروڈیوسر مولانا ہپی نے اپنی فلم ''دھماکا'' کے لیے انہیں منتخب کرلیا۔ اس فلم ''دھماکا'' کی سب سے اہم اور خاص بات یہ تھی کہ یہ اس دور کے سب سے پاپولر جاسوسی ناول ''جاسوسی دنیا'' اور ''عمران سیریز'' کے ناول نگار ابن صفی کی کہانی پر بنائی جارہی تھی۔ مولانا ہپی اور ان کے ہدایت کار قمر زیدی، ابن صفی صاحب کے پیچھے پڑ گئے کہ ہمیں فلم بنانے کے لیے اپنا کوئی ناول عطا کیجیے وہ جاسوسی دنیا کا کوئی ناول ہو یا عمران سیریز کا ہو۔

ابن صفی جہاندیدہ انسان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ فریدی اور حمید ہو یا عمران۔ فلم بنا کر ان کرداروں کا امیج خراب کردیں گے اس لیے وہ انکار کرتے رہے۔

''ارے بھئی! میرے ناولوں کا مزہ ناولوں ہی میں موجود ہوتا ہے۔ فلم کی صورت میں وہ تاثر پیدا نہیں ہوگا۔''

مگر پروڈیوسر مولانا ہپی اور ڈائریکٹر قمر زیدی مان کر نہیں دیئے۔ ابن صفی کے پیچھے لگے رہے۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ ابن صفی کے ناولوں کی طرح ان کی کہانی پر بننے والی فلم بھی شہرت اور مقبولیت حاصل کرے گی۔ یاد رہے کہ جو لوگ اپنی صلاحیتوں پر بھروسا نہیں کرتے اپنی کامیابی کے لیے دوسروں کی بیساکھی استعمال کرتے ہیں انہیں اکثر مایوسی حاصل ہوتی ہے۔

جب ان دونوں نے کسی طرح ابن صفی کا پیچھا نہیں چھوڑا تو انہوں نے ان سے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں آپ لوگوں کی فلم کے لیے ایک کہانی لکھ دوں گا مگر اس میں نہ فریدی ہوگا، نہ حمید اور نہ ہی عمران۔ یہ بالکل نئے کرداروں کی کہانی ہوگی۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ یہ جاسوسی کہانی ہوگی۔''

دونوں نے ابن صفی کی بات مان لی۔ شاید یہ سوچ کر کہ فلم کی کامیابی کے لیے ابن صفی کا نام ہی کافی ہوگا۔

ابن صفی صاحب نے ''دھماکا'' کی جو کہانی لکھی اس کے دو کردار ظفرالملک اور جیمسن کلیدی کردار تھے۔ جیمسن کا کردار تو خود پروڈیوسر مولانا ہپی نے کیا جب کہ ظفرالملک کے کردار کے لیے نئے اداکار کا انتخاب بذریعہ آڈیشن کیا۔

اس فلم کے کیمرا مین مدن علی مدن تھے۔ مدن صاحب نے جاوید کو مشورہ دیا کہ وہ بھی اس موقع پر قسمت آزمائیں اور پھر جب آڈیشن ہوا تو سلیکشن کمیٹی نے جس کے ایک ممبر مدن علی مدن بھی تھے جاوید کو اس انتخاب میں کامیاب قرار دے دیا۔

شنید ہے کہ اس کمیٹی میں ابن صفی بھی موجود تھے۔ انہیں جاوید اتنا اچھا لگا کہ انہوں نے سوچا اگر ''دھماکا'' کامیاب فلم ثابت ہوئی تو عمران سیریز کی ایک کہانی پر ایک فلم خود بناؤں گا اور اس میں جاوید کو عمران کے کردار میں پیش کروں گا۔

ظفرالملک کے کردار کے لیے جاوید کا انتخاب ہوگیا تو ''دھماکا'' کی شوٹنگ شروع ہوگئی۔ جاوید کی اس پہلی فلم میں ان کی ہیروئن شبنم تھیں۔ جسے بھی اسکرین پر دیکھ کر وہ ہیروز کی قسمت پہ رشک کرتے تھے۔ جب کہ ''چندا'' اور ''تلاش'' کے سپرہٹ ہیرو رحمان، جاوید کے ساتھ سائیڈ ہیرو کے کردار میں کام کررہے تھے۔ ایک تو جاوید کا کسی فلم کے لیے منتخب ہونا، ہیرو کے کردار میں پیش ہونا ہی ان کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ اس پر شبنم اور رحمان جیسے بڑے فنکاروں کے ساتھ کام کرنا، ان کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ وہ بجا طور پر اپنی قسمت پر نازاں تھے۔ بڑی اسکرین کے ہیرو بننے کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا اس کی تعبیر اتنی حسین ہوگی، انہوں نے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ انہوں نے رب العزت کا شکر ادا کیا کہ اس نے انہیں یہ عزت اور مقام عطا کیا۔ ''دھماکا'' مکمل ہوگئی اور ایک دن سینما گھروں کی زینت بھی بن گئی مگر افسوس صد افسوس کہ جاوید شیخ کے کیریئر میں کوئی دھماکا نہ کرسکی۔ اس کی ہی نہیں اس فلم سے جڑے کسی بھی فرد کے لیے خوشی کا سبب نہ بن سکی۔ زبردست پبلسٹی کے باوجود باکس آفس پر سپر فلاپ ثابت ہوئی۔ اس فلم کے ساتھ ہی فلم کے ہدایت کار قمر زیدی، فلم ساز مولانا ہپی، رائٹر ابن صفی اور فلم کے ہیرو جاوید شیخ فلم انڈسٹری کے لیے شجر ممنوعہ قرار دے دیئے گئے۔

جاوید شیخ کی بات دوسروں سے مختلف تھی۔ ان کو سینماؤں کی اسکرین پر جلوہ بکھیرنے کا موقع تو ملا مگر فلم دیکھنے والوں نے انہیں قبول نہیں کیا، جو پذیرائی انہیں ریڈیو کی صداکاری میں ملی، ٹی وی ڈراموں میں ملی، اسٹیج پر ملی، کمرشل اور فیشن شوز میں ملی وہ فلم میں نہیں ملی۔

فلم ٹیم ورک کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بہت سے تخلیق کار مل کر ایک فلم بناتے ہیں مگر فلم کی ناکامی کا سارا ملبا فلم میں اداکاری کرنے والوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ جاوید شیخ کو اس فلم کی ناکامی پر دکھ اس بات کا تھا کہ یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ کامیاب ہوتی تو وہ بھی کامیاب ہیرو شمار کر لیے جاتے۔ اس کی ناکامی پر انہیں دودھ میں گری مکھی کی طرح اٹھا کر انڈسٹری سے باہر پھینک دیا گیا اور وہ دس سال تک نامساعد حالات کے تھپیڑے کھاتے رہے۔ آج جب وہ اللہ کے فضل و کرم سے ایک سپر اسٹار ہیں۔ اپنے ان دنوں کے بارے میں کہتے ہیں۔ ''دھماکا'' کی ناکامی کے بعد شروع ہونے والا سفر بڑا مشکل اور صبر آزما تھا۔ بڑے نشیب و فراز سے گزرا۔ برے سے برے وقت کا سامنا کیا مگر ہمت نہیں ہارا۔ ایسے مواقع پر بہت سے لوگ ہمت ہار جاتے ہیں اور پھر ان کا نام بھی کسی کو یاد نہیں رہتا مگر میں حوصلہ نہیں ہارا۔ میری کوشش یہی رہی کہ اس برے وقت میں بھی اپنی جدوجہد جاری رکھوں۔ میدان چھوڑ کر بھاگوں نہیں اور پھر وقت اور حالات نے ثابت کر دیا کہ وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ثابت قدم ہوتے ہیں۔ اپنی محنت اور لگن کو اپنا رہبر بنا کر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔

جاوید شیخ پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے حقیقت پسند بھی ہیں۔ اپنے بھلے دنوں میں انہیں اپنے برے دنوں کی غلطی کا بھی احساس ہے۔

''میں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا کہ میری اس خرابی میں میرا اپنا کردار بھی تھا۔ میں فلموں میں کام کرنے کے لیے اتنا بے تاب تھا کہ میں.... آنکھیں بند کر کے ''دھماکا'' میں کام کرنے پر رضا مند ہو گیا۔ ان دنوں میں اتنا ''پپو'' بھی نہیں تھا کہ مجھے فلموں اور فلم والوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھے بہت کچھ معلوم تھا۔ شوبز کے بہت سے شعبوں سے وابستہ ہونے اور ان سے جڑے لوگوں سے واقف ہونے کے علاوہ میڈیا کے ذریعے بھی فلم انڈسٹری کی بہت سی باتیں مجھے معلوم تھیں۔ مجھے مولانا ہپی اور قمر زیدی کے بارے میں اچھی طرح چھان پھٹک کے بعد ان کی فلم میں کام کرنا چاہیے تھا۔ ان دونوں کی اپنے شعبوں میں کوئی بہتر کارکردگی نہیں تھی۔ اگر وہ اچھے اور دوربین فلم والے ہوتے تو کسی جاسوسی کہانی پر فلم نہیں بناتے۔ جاسوسی فلمیں، رومانوی اور گھریلو فلموں کے مقابلے میں کم پسند کی جاتی ہیں۔ وہ بھی ایسی صورت میں

اردو اور پنجابی فلمیں

شیرنی (1988ء ہدایت کار داؤد جٹ)۔ میڈم باوری (1989ء ہدایت کار نذرالاسلام)۔ رنگیلے جاسوس (1989ء ہدایت کار اقبال کاشمیری)۔ امیر خان (1989ء ہدایت کار یونس ملک)۔ انٹرنیشنل گوریلے (1990ء ہدایت کار عزیز تبسم)، جنگجو گوریلے (1990ء۔ ہدایت کار عزیز تبسم)، راجا (1990ء ہدایت کار اقبال کاشمیری)۔ آخری ٹاکرہ (1990ء ہدایت کار سید رضا زیدی)۔ زہریلے (1990ء ہدایت کارہ سنگیتا)۔ کالے چور (1991ء ہدایت کار نذرالاسلام)۔ سات خون معاف (1991ء ہدایت کار اقبال کاشمیری)۔ دولت کے پجاری (1991ء ہدایت کار ادریس خان)۔ ناگ دیوتا (1991ء ہدایت کار مسعود بٹ)۔ حسن کا چور (1991ء ہدایت کار الطاف حسین)۔ تین یکے تین چھکے (1991ء ہدایت کار جان محمد)۔ بدمعاش ٹھگ (1991ء ہدایت کار ظہور حسین گیلانی)۔ بختاور (1991ء ہدایت کار اقبال کاشمیری)۔ ورندگی (1991ء ہدایت کار ایم مقبول)۔ دل لگی (1992ء ہدایت کار ظہور حسین گیلانی)۔ دہشت گرد (1992ء ہدایت کار وحید ڈار)۔ جوشیلے (1992ء ہدایت کار امتیاز رانا)۔ حسینوں کی بارات (1992ء ہدایت کار اقبال کاشمیری)۔ محبت کے سوداگر (1992ء ہدایت کار جان محمد)۔ ڈاکو راج (1992ء ہدایت کار ادریس خان)۔ نرگس (1992ء ہدایت کار نذرالاسلام)۔ خون کا قرض (1992ء ہدایت کار ایم اے رشید)۔ پرندے (1992ء ہدایت کار ایم اشرف بٹ)۔ عابدہ (1992ء ہدایت کار ایم اشرف بٹ)۔ اکھاڑہ (1992ء ہدایت کار الطاف قمر)۔ خدا گواہ (1993ء ہدایت کار مسعود بٹ)۔ پیدا گیر (1993ء ہدایت کار ظہور حسین گیلانی)۔ جھوٹے رئیس (1993ء ہدایت کار الطاف حسین)۔ نخرہ گوری دا (1998ء ہدایت کار اقبال کاشمیری)۔ صاحب جی (1998ء ہدایت کار ایم اے رشید)۔ حکومت (2001ء ہدایت کار مسعود بٹ)۔

جب بنانے والا پختہ کار ہو۔ مولانا ہپی اور قمر زیدی نے محض ابن صفی کے نام پر کامیابی کا خواب دیکھ لیا تھا اور اپنے ساتھ اس فلم سے جڑے لوگوں کا بھی دھڑن تختہ کر دیا۔''

فلم ساز و ہدایت کار نے اپنی فلم کی ناکامی کی وجہ یہ بتائی کہ ہم نے اس فلم کی نمائش کے لیے غلط وقت کا انتخاب کیا۔ یہ دسمبر کا مہینا تھا اور اس مہینے میں موسم بہت سرد ہوتا ہے۔ شائقین فلم اپنے گھروں سے کم ہی نکل کر سنیماؤں کی طرف آتے ہیں۔

''دھماکا'' 13 دسمبر 1974ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ میں ان دنوں کراچی میں موجود تھا اور شوبز صحافی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اس لیے مجھے ساری باتوں، سارے حالات کا بخوبی علم تھا۔ جس روز ''دھماکا'' ریلیز ہوئی اسی دن حسن طارق کی فلم ''امراؤ جان ادا'' بھی نمائش پذیر ہوئی تھی جس پر دسمبر کا سرد موسم کسی بھی طرح ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوا۔ ہر شہر اور ہر علاقے میں تماشائیوں کا جم غفیر سنیما گھروں میں موجود تھا۔ فلم اچھی ہو تو فلم بینوں کو سنیماؤں پر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس فلم نے ہر سرکٹ میں کامیابی کے جھنڈے لہرائے۔

دوسری طرف ''دھماکا'' کی ناکامی میں کئی عوامل کار فرما تھے جس میں بنیادی عنصر تو فلم کا اسکرین پلے تھا جو بہت برا اور ناقص تھا۔ اس کے علاوہ فلم کا ٹریٹمنٹ فلم کا سبجیکٹ اور مس کاسٹنگ بھی ناکامی کا سبب بنے۔ اس دور کے سارے ہی ناقدین اور مبصرین کی اجتماعی رائے یہ تھی کہ مولانا ہپی کا خود کو ہیرو کے روپ میں پیش کرنا اس فلم کی ناکامی کی سب سے اہم وجہ تھی۔

ہماری فلم انڈسٹری کی ریت ہے کہ قصور جس کا بھی ہو، فلم کی ناکامی کا ملبا آرٹسٹوں پر ڈال دیا جائے۔ ''دھماکا'' کی ناکامی کا سارا ملبا جاوید شیخ پر یہ کہہ کر ڈال دیا گیا کہ وہ نان اسٹار اور کمزور ایکٹر تھا اس لیے فلم کو کامیاب نہ کرا سکا۔ اس بہتان کے بعد اس پر فلم انڈسٹری کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اس کے بعد جاوید کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ لاہور کو الوداع کہہ کر واپس اپنے شہر کراچی آ کر نئے سرے سے اپنی جدوجہد کا آغاز کرے۔

کراچی واپسی کے کچھ عرصہ بعد ان کے والد شیخ رحمت اللہ نے انہیں اس بات پر رضا مند کیا کہ اب فلم کا خیال دل سے نکال دو اور ملازمت کر لو۔ بدقت تمام جاوید رضا مند ہوئے تو انہوں نے انشورنس کمپنی میں ملازمت کر لی۔

مگر اس ملازمت میں ان کا دل نہ لگا۔ انہوں نے شوبز سے جو دل لگایا تھا تو ان کا دھیان اسی طرف ہی لگا رہتا تھا۔ شاید اپنے آپ کو اس طرف سے نکالنے اور اپنے آپ کو ماضی کی یادوں سے بچانے کے لیے ایک دن وہ فرانس چلے گئے۔ غالباً انہوں نے یہ سوچا ہو گا کہ نئی جگہ اور نئے ماحول میں وہ ماضی کی تلخ یادوں کو بھول جائیں گے۔ شوبز سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے دور کر لیں گے۔

فرانس یورپ کا بڑا خوب صورت ملک ہے۔ وہاں کے لوگ اور ان کے رسم و رواج بہت پیارے ہیں۔ جاوید کو بھی وہاں پہنچ کر وہاں کی آب و ہوا اور ماحول نے متاثر کیا۔ ایک دن ایک فرانسیسی لڑکی کیرولین سے جاوید کی ملاقات ہوئی جس نے پہلی ملاقات ہی میں انہیں بہت متاثر کیا۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کا تعلق ایک تہذیب یافتہ اور دولت مند خاندان سے تھا۔ کیرولین کے والد پیرس میں پی آئی اے کے اسسٹنٹ مینیجر تھے۔ اس فیملی نے جاوید کو بے پناہ پیار اور عزت دی۔ جب کہ کیرولین نے جاوید شیخ کو جنٹل مین بننے میں مدد دی۔ انہیں مغربی دنیا کے طور طریقے سکھائے۔ فرنچ محبوبہ کی دوستی نے اس دھتکارے ہوئے نوجوان کو پیار بھرا سہارا دیا۔ زندگی سے بھرپور زندگی گزارنے کی طرف مائل کیا۔ اسے اچھا لباس پہننے اور خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی تربیت دی۔ پیرس میں جاوید شیخ نے اپنی زندگی کے وہ سنہرے دن رات گزارے جن کی یادوں کی خوشبو وہ آج بھی محسوس کرتے ہیں۔ جب بھی انہیں فرصت کے لمحات میسر آتے ہیں انہیں پیرس کے وہ شب و روز یاد آ جاتے ہیں اور وہ آہ بھر کر کہتے ہیں۔ ''آہ! کیا دن تھے وہ بھی!''

پیرس کا معاشرہ چونکہ آزاد تھا اس لیے کیرولین سے دوستی کے دوران اس کے بھائی سے بھی جاوید کی دوستی ہو گئی تھی۔ پھر جلد ہی ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے یہ تینوں ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے ہوں لیکن کیرولین کے لیے جاوید کے دل میں ایک خاص گوشہ تھا۔ اگر کیرولین کی فیملی اجازت دے دیتی اور وہ حسین فرانسیسی لڑکی پاکستان آنے پر رضا مند ہو جاتی تو ممکن تھا کہ جاوید شیخ کی زندگی میں وہ سب کچھ نہ ہوتا جس کی خلش ان کے دل پر اثر انداز ہوئی اور ان کے دل کے دورے کا موجب بنی۔ مگر خود جاوید

کا ماننا ہے کہ شاید کیرولین کا پاکستان نہ آنا ہی اچھا فیصلہ تھا اگر وہ پاکستان آبھی جاتی تو جلد ہی یہاں کے ماحول سے اکتا کر اپنے دیس واپس لوٹ جاتی جب کہ میرے لیے فرانس میں مستقل ٹھہرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے ہر حال میں واپس آنا تھا اپنے ادھورے خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے کے لیے۔

پیرس میں جس حسینہ سے دل لگ گیا تھا اس نے کچھ دنوں تک تو وقتی طور پر جاوید کو ذہنی طور پر شوبز کی دنیا سے دور کر دیا تھا مگر جیسے ہی کیرولین کی چاہت کی بندھن ڈھیلی ہونے لگی، وہ دائمی رفاقت پر رضامند نہیں ہوئی، جاوید کو پھر اپنا وطن اور وہاں گزاری ہوئی مصروفیات یاد آنے لگیں۔ ایک بار پھر سے ایکٹر بننے کی خواہش انہیں مہمیز کرنے لگی کہ گھر واپس چلو اور نئے سرے سے اپنے خوابوں کو پورا کرنے کی کوشش کرو۔

کیا ہوا گر چلتے چلتے تم نے ٹھوکر کھائی ہے
اٹھو کپڑے جھاڑ کر پھر اس میں کیا رسوائی ہے

ایک محبوبہ کا ساتھ چھوٹا تو دوسری معشوقہ یاد آئی اور وہ پیرس کی حسین یادوں کو وہیں چھوڑ کر پاکستان آگئے اور آتے ہی پرانی معشوقہ کو منانے کے لیے اپنی جدوجہد کا سفر شروع کر دیا اور اس بار فلم انڈسٹری کی طرف جانے کی بجائے ٹی وی اسٹیشن کے چکر لگانے لگے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب پروڈیوسر قاسم جلالی، فاطمہ ثریا بجیا کے اسکرپٹ پر مبنی ایک سیریل ''شمع'' کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے جس کی کاسٹنگ ہو رہی تھی۔ جاوید نے بھی آڈیشن دیا اور منصور کے کردار کے لیے کنفرم کر لیے گئے۔ جاوید کے ساتھ ایک نئی ہیروئن غزالہ انجم کو لیا گیا جو بعد میں غزالہ کیفی ہوگئیں اور ٹی وی ڈراموں کی صف اوّل کی ہیروئن کہلائیں۔

قاسم جلالی کی ڈائریکشن اور فاطمہ ثریا بجیا کی کہانی دونوں نے مل کر ''شمع'' کو سپر ڈراما سیریل بنا دیا۔ اس کی اگلی قسط کے انتظار میں ناظرین بے تاب رہتے تھے اور حسب روایت وہی ہوا جو یہاں کی ریت ہے۔ ''شمع'' کی عوامی مقبولیت نے اس کے دوسرے آرٹسٹوں کے علاوہ جاوید شیخ کو بھی چھوٹی اسکرین کا بڑا اسٹار بنا دیا جس کے بعد وہ پی ٹی وی کراچی کے ڈراموں کی ضرورت بن گئے۔ جاوید شیخ کی طویل عرصے کی بے قراری کو قدرے قرار آنے لگا اور وہ اپنے ادا کارانہ فن کی پیاس ٹی وی ڈراموں سے بجھانے لگے۔

پھر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ پی ٹی وی کے ایک کامیاب پروڈیوسر غضنفر علی کو متحدہ عرب امارات کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک فرد نے فلم بنانے کی غرض سے دبئی بلوایا اور انہیں پاکستانی اور بھارتی فنکاروں کے ساتھ ایک مووی بنانے کی پیشکش کی۔ غضنفر صاحب اس قسم کے ایڈونچر کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ لہٰذا پی ٹی وی کی ملازمت چھوڑ کر دبئی جا پہنچے اور ایک فلم کی پلاننگ شروع کر دی۔

یادش بخیر۔ یہ 1980ء کی دہائی کے اوائل کا واقعہ ہے۔ غضنفر علی کے اس اقدام کو پی ٹی وی حکام نے بغاوت سے تعبیر کیا۔ موجودہ دور کے قارئین کی معلومات کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ اب غضنفر علی صاحب پرائیویٹ ٹی وی چینل انڈس وژن کے روح رواں ہیں۔

غضنفر علی صاحب نے دبئی کے شاہی خاندان کے فرد کی آفر پر اپنی اچھی بھلی مستقل نوکری کو لات ماری اور فلم بنانے کے شوق میں پہلی فرصت میں دبئی پہنچ گئے۔ متعلقہ شخص سے بات چیت ہوئی اور معاملات طے ہونے کے بعد انہوں نے مجوزہ فلم کا کام شروع کر دیا جس کا نام ''دوسرا کنارا'' رکھا اور اس کی کاسٹنگ کے لیے پاکستانی اور ہندوستانی آرٹسٹوں کو اس فلم میں کام کرنے کی دعوت دی۔ پاکستان سے جن فنکاروں کو دعوت دی ان میں نمایاں نام جاوید شیخ، شفیع محمد اور بہروز سبزواری تھے جب کہ انڈین فلم انڈسٹری کے اسٹارز دیپی نول اور کچھ اداکاروں کو لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی فلم میں پاکستانی اور ہندوستانی آرٹسٹوں نے ایک ساتھ کام کیا۔ ''دوسرا کنارا'' کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر نسیم عرفانی تھے جنہوں نے بعد میں غضنفر صاحب کی جولانی طبیعت کی دلچسپ کہانیاں سنائیں۔ ان کے بیان کردہ واقعات سے بہت سی ان کہی باتیں سامنے آئیں۔ ان دنوں میڈیا آج کی طرح اتنا پاور فل نہیں تھا اس لیے اِدھر کی باتیں اُدھر جھٹ پٹ نہیں پہنچتی تھیں۔ نسیم عرفانی صاحب کی زبانی غضنفر علی اور ان کی فلم ''دوسرا کنارا'' کی کہانی سنیے۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب ''شمع'' کی کامیابی کے بعد جاوید شیخ، شفیع محمد اور بہروز سبزواری پروڈیوسر ظہیر خان کی سیریل ''افشاں'' میں پرفارم کر رہے تھے۔ جب کہ شعیب منصور کی ایک سیریل ''اجنبی'' کے لیے بھی یہ تینوں بک تھے جس کی ریکارڈنگ جلد ہی شروع ہونے والی تھی۔ غضنفر صاحب نے انہیں اپنی فلم میں اداکاری کرنے کی دعوت دی تو یہ لوگ تذبذب کا شکار ہوگئے۔

''سر جی! ہماری سیریل ''افشاں'' کی ریکارڈنگ جاری ہے۔''

''اور شعیب منصور صاحب بھی ''اجنبی'' کی ریکارڈنگ جلد ہی شروع کرنے والے ہیں۔''

''کیا آپ اس وقت تک انتظار نہیں کر سکتے جب ہم ان دونوں سیریلز سے فارغ ہو جائیں۔''

''نہیں انتظار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا پروڈیوسر فٹافٹ فلم شروع کر کے فٹافٹ ختم کرنا چاہتا ہے۔ تم لوگ ٹائم نہیں دے سکتے تو ہم فلمی اداکاروں سے معاملات طے کر لیں گے۔ میرا پروڈیوسر بھی یہی چاہتا ہے کہ فلمی فنکاروں کو اس کی فلم میں کاسٹ کیا جائے۔ میں تو تم لوگوں کے بہتر مستقبل کے لیے تمہیں فلمی اداکاروں پر ترجیح دے رہا ہوں۔''

غضنفر صاحب کی بات سن کر تینوں ٹی وی اسٹارز ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اس پر غضنفر صاحب بولے۔ ''دیکھو ایک طرف ٹی وی ڈرامے ہیں۔ دوسری طرف فلم اور فلم بھی ایسی جو پاکستان میں ہی نہیں بھارت میں بھی دکھائی جائے گی۔ دنیا بھر میں اس کی نمائش ہوگی۔''

فلم کے لالچ میں تینوں دوستوں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ جاوید شیخ کی تو اصل منزل فلم ہی تھی۔ اگر قدرت فلم میں کام کرنے کا موقع فراہم کر رہی ہے تو اسے ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہوگا۔ یہ بات جاوید دوسروں کو بھی سمجھاتا۔ جس کے نتیجے میں تینوں دوستوں نے پی ٹی وی کے پروجیکٹ ''افشاں'' کو ادھورا چھوڑا اور خاموشی سے دبئی پہنچ گئے۔ ان کے پہنچتے ہی غضنفر صاحب نے ''دوسرا کنارا'' کی شوٹنگ شروع کر دی جو مسلسل دو ہفتوں تک جاری رہی۔

اس فلم پر 18 لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی گئی تھی جو اس دور میں ایک بہت بڑی رقم تھی۔ اس زمانے میں پاکستان میں دو ڈھائی لاکھ میں فلم بنا لی جاتی تھی۔ غضنفر صاحب بہت خوش تھے کہ چھوٹی اسکرین کی فتوحات کے بعد اب وہ بڑی اسکرین کا میدان مارنے جا رہے ہیں۔ ان کی فلم کامیاب ہوگئی تو وہ بھی فلم ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنا مستقبل سنوارنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان دنوں وہ بہت موڈ میں رہتے تھے اور اکثر مجھ سے بھی کہتے تھے۔

''تسنیم عرفانی! تیری قسمت میں بھی جوانی آنے والی ہے۔ تو بھی میرا اسسٹنٹ بن کر فلم انڈسٹری پر راج کرے گا۔''

''دوسری طرف جاوید، شفیع محمد اور بہروز یہ سوچنے لگے تھے کہ یہ فلم کرنے کے بعد ان کے لیے فلم انڈسٹری کے دروازے کھل جائیں گے۔''

چونکہ یہ تینوں پی ٹی وی کے پروڈیوسروں سے بغاوت کر کے آئے ہیں گویا اپنی کشتیاں جلا کر دبئی آئے ہیں اس لیے ٹی وی کے دروازے ان کے لیے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے ہیں۔ اب انہیں جو کچھ آسرا تھا فلم انڈسٹری سے ہی تھا۔

بندہ کچھ اور سوچتا ہے اور قدرت کی رضا اور مرضی کچھ اور ہوتی ہے۔ تمام تر وسائل کے موجود ہونے کے باوجود ''دوسرا کنارا'' سے اس کے تخلیق کاروں کی امیدیں بر نہیں آئیں۔ فلم مکمل ہونے کے بعد جب اس کی نمائش کا مرحلہ آیا تو یکے بعد دیگرے کئی رکاوٹیں سامنے آئیں۔ وقت گزرتا گیا اور ''دوسرا کنارا'' کو کوئی کنارا نہیں ملا، کوئی سہارا نہیں ملا۔ یہ غیر متوقع حالات ایسے تھے کہ تینوں دوستوں کی امیدیں آہستہ آہستہ دھندلانے لگیں۔ وہ اس فلم کی نمائش کو کھٹائی میں پڑتا دیکھ کر انتہائی مایوسی کی حالت میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ انہیں واپس جا کر ٹی وی کا ہی دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ پاکستان واپس آ کر پی ٹی وی پہنچے اور اپنی غلطیوں کی معافی تلافی کی تو انہیں کہا گیا۔ ''آپ لوگ ٹھہرے فلمی فنکار، جن کے لیے ہمارے ڈراموں میں گنجائش نہیں۔ ہم تو چھوٹے موٹے ٹی وی آرٹسٹوں کو لے کر اپنے ڈرامے بناتے ہیں۔ اب ہمارے پاس تم لوگ آئے تو کیا آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ یوں بھی تمہارا جرم اتنا سنگین ہے کہ اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ تم لوگوں نے رنگ ڈراموں کو ادھورا چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ چوروں کی طرح منظر سے پس منظر میں چلے گئے۔ ذرا بھی نہیں سوچا کہ ''افشاں'' کے تخلیق کار کن مسائل کا شکار ہو جائیں گے۔''

واقعی ان کا جرم معافی تلافی کے قابل نہیں تھا لیکن پروڈیوسر شعیب منصور نے ان کی جنگ جم کر لڑی۔ ان کی سفارش میں ذاتی طور پر بڑی کوشش کی۔ ''ٹھیک ہے ان سے بہت بڑا جرم سرزد ہوا ہے۔ بہت بڑی بھول ہوئی ہے مگر بھول چوک انسانوں ہی سے تو ہوتی ہے۔ یوں بھی ان کی غلطیوں کی سزا قدرت کی طرف سے انہیں مل چکی ہے۔ جس مقصد کے لیے انہوں نے ہمیں نقصان پہنچایا تھا ان کا وہ مقصد پورا نہیں ہوا۔ اب جب وہ اپنی غلطی پر نادم ہیں اور

معافی کے طلب گار ہیں تو انہیں معاف کر دینا چاہیے۔ اللہ بھی توبہ کرلینے والوں کو بخش دیتا ہے۔ ہمیں بھی انہیں معاف کر دینا چاہیے۔''

شعیب منصور کی اس سفارش پر جاوید، شفیع محمد اور بہروز سبزواری کو معاف کر دیا گیا۔ ان پر لگی پابندی ختم کر دی گئی اور یوں جاوید شیخ پھر سے اس پروجیکٹ کا حصہ بنے جو ایکٹرز کی بغاوت کی وجہ سے دو سال تک ملتوی رہا۔ یہ سیریل ''اَن کہی'' کے نام سے آن ایئر ہوا اور جاوید شیخ کے اسٹارڈم کے حوالے سے سنگِ میل ثابت ہوا۔

جاوید شیخ یکے بعد دیگرے ٹی وی ڈراموں میں پہلے کی طرح کاسٹ کیے جانے لگے اور ان کے کام کو ناظرین کی جانب سے بھی پہلے کی طرح پسند کیا جانے لگا لیکن ان باتوں کے باوجود وہ اندر سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خواب تو سینما گھروں کی بڑی اسکرین پر جگمگانا تھا۔ قدرت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ فلموں کے چانس تو ملتے تھے مگر ان کے خوابوں کی تعبیر نہیں ملتی تھی۔ دبئی میں بننے والی فلم کے لیے انہوں نے اتنی بڑی قربانی دی کہ ٹی وی کی شہرت اور مقبولیت کو داؤ پر لگا دیا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شد۔

بہرحال وہ چھوٹی اسکرین کے بڑے اداکار کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور سوچتے رہے کبھی تو بڑی اسکرین کا ہیرو بننے کا موقع ملے گا اور پھر کچھ عرصے بعد ایسا ایک دن آ ہی گیا۔ انہیں ایک فلم میں بطور ہیرو کام کرنے کی آفر مل ہی گئی۔ فلم کا نام تھا ''بیوی ہو تو ایسی'' جو ایسٹرن اسٹوڈیو میں بنائی جا رہی تھی۔ اس کے ہدایت کار زاہد شاہ تھے اور فلم ساز غضنفر علی۔ وہی غضنفر علی جنہوں نے دبئی میں ''دوسرا کنارا'' بنائی تھی مگر جس نے انہیں کوئی سہارا نہیں دیا جس کے لیے انہوں نے پی ٹی وی کی لگی بندھی نوکری کو قربان کر دیا تھا۔ جاوید شیخ، شفیع محمد اور بہروز سبزواری کو تو پی ٹی وی حکام نے معاف کر دیا تھا مگر انہیں معاف نہیں کیا تھا کیونکہ وہ معافی مانگنے ہی نہیں گئے تھے۔ انہوں نے اب فلم کے میڈیم کو ہی اپنا کر اپنی جدوجہد جاری رکھی تھی۔ وہ جاوید شیخ کی اداکارانہ صلاحیتوں پر بہت بھروسا کرتے تھے۔ ٹی وی ڈراموں میں بھی وہ اس کی اداکاری سے مطمئن تھے جب کہ ''دوسرا کنارا'' میں بھی اس نے بڑی خوب صورت اداکاری کی تھی۔ اس لیے اب جب وہ فلم ساز کی حیثیت سے فلم بنا رہے تھے تو ہیرو کے کردار کے لیے جاوید شیخ ہی کو کاسٹ کرنا مناسب سمجھا۔ ان کی فلم میں ایک بار پھر جاوید کو

صرف پنجابی میں بننے والی فلمیں

مہندی (ریلیز 1985ء ہدایت کار الطاف حسین)۔ داغ (ریلیز 1988ء ہدایت کار اسلم ڈار)۔ پھولن دیوی (ریلیز 1989ء ہدایت کار مسعود بٹ)۔ بارش (ریلیز 1989ء ہدایت کار الطاف حسین)۔ پانی (ریلیز 1989ء ہدایت کار حیدر چوہدری)۔ ننگی تلوار (ریلیز 1989ء ہدایت کار حیدر چوہدری)۔ زخمی عورت (ریلیز 1989ء ہدایت کار اقبال کاشمیری)۔ ہوشیار (ریلیز 1990ء ہدایت کار ادریس خان)۔ وقت (ریلیز 1990ء ہدایت کار ادریس خان)۔ پیسا ناچ نچائے (ریلیز 1990ء ہدایت کار رشید ڈوگر)۔ سرمایہ (ریلیز 1990ء ہدایت کار ادریس خان)۔ اللہ شہنشاہ (ریلیز 1990ء ہدایت کار حسنین)۔ سائرن (ریلیز 1990ء ہدایت کار ایم اسلم خان)۔ انتشار (ریلیز 1991ء ہدایت کار ایم سلیم جعفری)۔ لاہوری بدمعاش (ریلیز 1991ء ہدایت کار شاہد رانا)۔ لشکر (ریلیز 1991ء ہدایت کار وحید ڈار)۔ فقیرا (ریلیز 1993ء ہدایت کار رشید ڈوگر)۔ رشتہ (ریلیز 1993ء ہدایت کار حسنین)۔

فلاپ فلمیں

دھماکا، جھومر چور، ہم سے نہ ٹکرانا، دیوار، داغ، شیش ناگ، پھولن دیوی، ننگی تلوار، طوفانی، بجلیاں، وقت، پیسا ناچ نچائے، سرمایہ، اللہ شہنشاہ، آخری ٹاکرہ، سات خون معاف، انتشار، حسن کا چور، خطروں کے کھلاڑی، لشکر، دہشت گرد، جوشیلے، محبت کے سوداگر، پامیلا، خون کا قرض، پرندے، اکھاڑہ، صوبے خان، شیدا ٹلی، یادگار، وردی، رشتہ، علاقہ غیر، پناہ، ہم نہیں یا تم نہیں، بازی گر، آؤ پیار کریں، عقابوں کے نشیمن، دل والے، نخرہ گوری دا، کھل نائیک، مہلت، صاحب جی، صاحب بی بی اور طوائف، دنیا سے کیا ڈرنا، چاند بابو، میری توبہ، کہاں ہے قانون، جان تیرے نام، میں اک دن لوٹ کے آؤں گا، لو میں گم۔

کام کرنے کی دعوت ملی تو ان کے ارمانوں کی منہ بند کلی کھل گئی۔ جاوید شیخ کو ایک بہت پرانی بات یاد آ گئی۔

''ارے یہ تو میرے ذاتی اسٹیج ڈراما ''شادی ہو تو ایسی'' سے ملتا جلتا نام ہے۔ میرا وہ ڈراما تو بہت کامیاب ہوا تھا اور اس کے کوئی سو شوز میں نے مختلف شہروں میں اسٹیج کیے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ فلم بھی اسی طرح کامیاب ہو۔''

اس نے غضنفر علی کی دعوت قبول کر لی مگر اس شرط پر کہ اپنی ٹی وی کی مصروفیات ترک نہیں کرے گا۔ اس نے کہا۔ ''سر جی! میں آپ کے ساتھ بھرپور تعاون کروں گا مگر آپ کو بھی میرے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔''

''کیسا تعاون؟''

''میرے ٹی وی ڈراموں کی ریکارڈنگ کے وقت آپ اپنی شوٹنگ نہیں رکھیں گے۔''

''اچھا اچھا میں سمجھ گیا۔'' غضنفر علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس بار تم اپنی کشتیوں کو سلامت رکھنا چاہتے ہو۔ یہ اچھی بات ہے۔ تم نے بڑی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا ہے۔''

اس کے بعد جاوید نے اس فلم کے معاہدے پر سائن کر دیا اور اس فلم کے لیے بھرپور تیاری شروع کر دی۔ اپنے کیریکٹر کو بڑی باریک بینی سے اسٹڈی کیا اور اداکاری کے دوران ان کو جو مکالمے بولنے تھے انہیں یاد کیا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کردار کو خود پر طاری کرنے کی مشق کی۔

اس فلم کی دیگر کاسٹ میں شبنم، آرزو، شفیع محمد، لہری اور کمال ایرانی شامل تھے۔ ایسٹرن اسٹوڈیو میں جہاں اس کا پروڈکشن آفس تھا روزانہ شام کو ہدایت کار زاہد شاہ اور فلم ساز غضنفر علی اسکرپٹ رائٹر کو ساتھ بٹھا کر اس کے ایک ایک سین پر بحث کرتے اور ہر طرح سے شوٹنگ سے پہلے اسکرپٹ کو پہلے سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے۔ سارے معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے کہ شوٹنگ شروع ہونے سے چند دن پہلے اچانک لاہور کے ڈسٹری بیوٹر نے فلم کی کاسٹ میں شامل نئے ہیرو جاوید شیخ پر اعتراض کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اسی صورت میں فلم کا سودا کرے گا اگر جاوید شیخ کی جگہ فیصل الرحمٰن کو کاسٹ کیا جائے گا۔ فیصل الرحمٰن ان دنوں جاوید کے مقابلے میں زیادہ مقبول اسٹار تھا اور ہر دوسری فلم میں اسے کاسٹ کیا جا رہا تھا۔

غضنفر علی نے ڈسٹری بیوٹر کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ جاوید شیخ اپنے ٹی وی ڈراموں کی وجہ سے گھر گھر میں دیکھا اور پسند کیا جاتا ہے۔ فلم میں بھی اسے فلم دیکھنے والے پسند کریں گے۔ یوں بھی جاوید بڑا ٹیلنٹڈ اداکار ہے مگر ڈسٹری بیوٹر کسی صورت مان کر نہیں دیا۔

''ٹھیک ہے آپ جاوید کو لے کر فلم بنائیں۔ میں فیصل الرحمٰن کی کوئی اور فلم کا سودا کر لوں گا۔''

جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو فلم ساز غضنفر علی نے ہتھیار ڈال دیے۔ فلم شروع کرنے سے پہلے کسی تقسیم کار کا ملنا بڑی بات ہوتی ہے۔ اس کے پیسے سے فلم ساز کو بہت سپورٹ حاصل ہوتا ہے۔ دل پر صبر کا سل رکھ کر انہوں نے جاوید کو کٹ کیا اور اس کی جگہ فیصل الرحمٰن کو کاسٹ میں شامل کر لیا۔

اس موقع پر شفیع محمد نے جاوید کی دوستی کے حوالے سے کہا۔ ''اگر جاوید فلم میں نہیں ہوگا تو میں اس میں کام نہیں کروں گا۔''

مگر غضنفر علی کی بجائے انہیں جاوید شیخ نے سمجھایا۔ ''میری وجہ سے تم کیوں اپنا نقصان کرتے ہو؟''

جاوید کے سمجھانے بجھانے کے بعد شفیع محمد اس فلم میں کام کرنے پر رضامند ہو گئے مگر خود جاوید شیخ ''بیوی ہو تو ایسی'' کے شوہر (ہیرو) نہ بن سکے۔

جاوید شیخ کو جو دکھ جو صدمہ ہوا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتے۔

کیا اس لیے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

اس بات کا انہیں بے حد ملال تھا کہ ان کی تقدیر ان کے ساتھ کھلواڑ کر رہی ہے۔ ''دھماکا'' بن کر ریلیز ہوگئی مگر سپر فلاپ ثابت ہوئی۔ ''دوسرا کنارا'' بھارتی فنکاروں کے ساتھ مکمل کروائی لیکن اس کی نمائش کا مرحلہ نہیں آیا۔ یہ نئی فلم ''بیوی ہو تو ایسی'' سے کچھ امید بندھی تھی مگر

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کر کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

چند دنوں بعد جب شوٹنگ شروع ہونے والی تھی جس کی میں نے بھرپور تیاری کر لی تھی میری جگہ کسی اور کو شامل کر لیا گیا اور مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا گیا۔

اس واقعے کو وہ اب تک بھولے نہیں ہیں۔ اکثر جب بیتے دنوں کی باتیں کرتے ہیں تو اس کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔

''یار! میرے ساتھ کیا کیا کچھ نہیں ہوا۔ اتنی طویل جدوجہد کے بعد جب بڑی اسکرین پر نمودار ہونے کے مواقع ملے تو میری بدقسمتی نے بار بار مجھے مایوسیوں کے اندھیرے میں پہنچادیا۔ اگر میں اس قدر سخت جان نہ ہوتا تو بہت سے نئے اداکاروں کی طرح گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو جاتا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور نئے سرے سے نئے عزم وارادے سے اپنے سفر کو جاری رکھا۔ اللہ اکبر! اللہ بہت بڑا ہے۔ بہت رحیم وکریم ہے۔ شاید اسے میری یہی ادا پسند آئی۔ میں ہر ناکامی کے بعد یہ سوچ کر، یہ جان کر اپنا سفر جاری رکھتا تھا کہ مجھے اپنے اللہ پر بھروسا ہے۔ ایک نہ ایک دن مجھے ضرور سرخرو کرے گا۔ کامیاب کرے گا۔ شاید ابھی میری آزمائش کا وقت ہے۔''

جاوید نے ایک دانشمندی کا ثبوت دیا تھا نئی فلم ''بیوی ہو تو ایسی'' کی اداکاری کی دعوت قبول کرتے وقت ''دوسرا کنارا'' کے وقت کی غلطی نہیں کی تھی۔ ٹی وی سے اپنا ناتا نہیں توڑا تھا۔ اپنی بنی بنائی ساکھ سے رشتہ نہیں منقطع کیا تھا۔

''پتا نہیں، وہ کیسی بیوی تھی میرے نکاح میں آنے سے پہلے ہی بے وفائی کر گئی کسی اور کی بن گئی۔'' جاوید شیخ خوشگوار لہجے میں کہتے ہیں۔ ''مگر اس فلمی بیوی کی بے وفائی کے بعد ایک حقیقی بیوی کی رفاقت کا خیال مجھے مہمیز کرنے لگا۔ ''یار جاوید!'' میں ان دنوں اکثر اپنے آپ سے کہتا۔ ''کیوں نہ میں سچ مچ کی ایک بیوی کا شوہر بن جاؤں۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' میں اپنے آپ سے سوال کرتا۔

''سنا ہے کہ عورت کی وجہ سے مرد کی مصیبت ختم ہو جاتی ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو چلو شادی کر کے دیکھتے ہیں۔''

پھر جاوید شیخ اپنے اردگرد دیکھنے لگے کہ کوئی ایسی لڑکی انہیں مل جائے جو ان کی بیوی بن جائے لڑکیاں تو بہت تھیں۔ ان کے اور ان کے دوستوں کے خاندان میں ان کی پرستار لڑکیاں بھی بہت تھیں لیکن جانے کیوں انہیں اپنی بیوی بنانے کے قابل کوئی سمجھ میں نہیں آئیں۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ ایک ڈرامے میں ان کے ساتھ کام کرنے والی اداکارہ زینت منگھی ان سے بولی۔ ''مجھے اس بات پر بہت دکھ ہے کہ تم ''بیوی ہو تو ایسی'' کے شوہر نہ بن سکے۔ تمہاری بجائے فیصل الرحمٰن اسے لے اڑا اور وہ بھی بخوشی اس کی بیوی بن گئی۔ ذرا بھی تمہارا خیال نہیں کیا۔ احتجاج نہیں کیا۔ روئی پیٹی نہیں چیخی چلائی نہیں۔''

''زینت! تم مجھ سے ہمدردی کر رہی ہو یا...... یا میری بدنصیبی کا مذاق اڑا رہی ہو؟''

''نہیں تمہاری قسمت یا تمہارا مذاق نہیں اڑا رہی ہوں۔ میں تو یہ کہوں گی کہ اچھا ہی ہوا۔ تم ایسی بیوی کے شوہر نہ بنے۔ میری تو دعا ہے کہ اللہ تمہیں کسی اچھی، پیاری اور وفادار بیوی کا شوہر بنائے۔''

''ایسی بیویوں کا شوہر تو کئی بار بنا مگر میری قسمت ہی بے وفا نکلی۔''

''میں فلموں یا ڈراموں کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ تمہاری سچی مچی بیوی کی بات کر رہی ہوں۔ ہاں جاوید اب تم حقیقی بیوی کے حقیقی شوہر بن جاؤ شاید......''

''شاید کیا؟''

''شاید تمہاری بیوی کی ہی وجہ سے تمہاری قسمت کی گردش تھم جائے۔''

''جاوید شیخ نے زینت منگھی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ بس یہ سوچتا رہ گیا کہ یہ پہلی لڑکی ہے جس نے اسے اتنا ہمدردانہ مشورہ دیا ہے۔''

زینت منگھی کو وہ بہت دنوں سے جانتا تھا۔ وہ ایک ماڈل اور اداکارہ تھی جب وہ کمرشل میں خود ماڈل کی حیثیت سے کام کرتا تھا تو اس دور میں بھی وہ اس کی سنگی ساتھی ہوا کرتی تھی۔ پھر اس کی طرح وہ ٹی وی ڈراموں کی پرفارمر بنی۔ دوسری اداکاروں کے مقابلے میں بڑے سوبر، سنجیدہ اور رکھ رکھاؤ کی حامل۔ اس کا کبھی کوئی اسکینڈل سامنے نہیں آیا۔ نہ ٹی وی کے حلقوں میں نہ میڈیا میں اس کے متعلق کسی نے کچھ کہا نہ کچھ چھپا۔

کئی دنوں تک وہ زینت منگھی کے بارے میں سوچتا رہا۔ ''یہ لڑکی میری بیوی کی حیثیت سے کیسی رہے گی؟''

''پتا نہیں وہ میری بیوی بننا پسند بھی کرے گی یا نہیں؟''

یہ اور اس قسم کی سوچ اور فکر میں وہ کچھ دنوں تک مبتلا رہا۔ پھر یہ فیصلہ کیا کہ اسے آزمایا جائے۔ دیکھا جائے کہ میرے بارے میں وہ کتنی سنجیدہ ہے۔

اس کے بعد اس نے زینت منگھی کے ساتھ ڈراموں میں اداکاری کرنے کے بعد کچھ وقت اس کے ساتھ گزارنے لگا۔ کبھی چائے پینے کے بہانے، کبھی یونہی تھکن

دور کرنے کے لیے کہیں بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگا ایسے ہی ایک موقع پر ایک دن زینت منکھی بول پڑی۔

''کیا ہوا شیخ صاحب! کوئی لڑکی ملی؟''

''روزانہ ہی بہت سی لڑکیاں ملتی ہیں۔''

''اوہو! میں عام لڑکیوں کے بارے میں نہیں پوچھ رہی ہوں۔ اس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں جسے تم اپنی بیوی بنانے کے لیے منتخب کرسکو۔''

جاوید شیخ نے اپنے سامنے کافی کے کپ سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ ''ہاں ایک لڑکی ملی تو ہے۔''

''گڈ! یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ پھر شادی کب کر رہے ہو؟''

''ارے یار! ایسے کیسے شادی ہو جائے گی۔''

''پھر کیسے ہوگی؟''

''ابھی تو میں نے اسے پسند کیا ہے۔ ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں۔''

''تو کیا تم نے اسے بتایا نہیں؟''

''کیا بتایا نہیں؟''

''یہی کہ تم نے اسے پسند کرلیا ہے۔ کیا تم بھی مجھے پسند کرتی ہو؟ میرے ساتھ شادی کروگی؟''

''نہیں، یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔''

''کیوں ہمت نہیں ہوتی؟''

''اس ڈر سے کہ اگر اس نے مجھے پسند نہیں کیا تو......''

زینت منکھی نے کافی کے کپ سے ایک سپ لینے کے بعد کہا۔ ''شیخ صاحب! ہمت کرو۔ حوصلہ کرو اور ایک بار اس سے کہہ ہی دو۔ اگر وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کردے گی تو کیا ہوگا؟ وہ نہ سہی اور سہی لڑکیوں کی کوئی کمی ہے کیا؟''

''نہیں اس کے انکار پر مجھے بہت دکھ ہوگا۔ اتنے دنوں کے بعد تو ایک لڑکی پسند آئی ہے اس نے انکار کردیا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔''

''ہوں۔'' منکھی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کرو کہ اس لڑکی سے مجھے ملا دو۔ میں اس کی مرضی معلوم کروں گی۔ اگر اس نے نہ بھی کہا تو میں کوشش کروں گی کہ وہ ہاں کہنے پر راضی ہو جائے۔''

''ہاں یہ ترکیب اچھی ہے۔ میں اس سے تمہیں ملا دوں گا۔''

''کب؟''

''بس یہاں سے جاتے وقت۔''

پھر جب وہ کافی پی کر اٹھے تو وہاں سے جاتے وقت ایک قد آدم آئینے کے پاس اسے کھڑا کر کے کہا۔ میں یہاں سے ہٹ جا رہا ہوں۔ جب تم اس سے بات کرلینا تو مجھے آواز دے کر بلا لینا۔''

''مگر وہ لڑکی کہاں ہے؟''

''تمہارے سامنے۔''

منکھی نے اپنے سامنے دیکھا۔ اس کے سامنے تو وہی کھڑی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے آپ کو سر سے پیر تک گھور کر دیکھا اور دل ہی دل میں کہا۔ ''زینت! تجھ میں کیا ایسی بات ہے کہ اس کھلنڈرے لڑکے کو تو بھا گئی؟''

ذرا دیر بعد وہ آئینے کے پاس سے ہٹ کر اس کے پاس گئی اور بولی۔ ''آؤ چلو۔''

''کیا ہوا؟''

''ہوگا کیا!''

''جلدی بتاؤ میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔''

''اپنے آپ کو سنبھالو اور یہاں سے چلو۔ میں بتاتی ہوں۔''

جاوید بوجھل قدموں سے منکھی کے ساتھ آگے بڑھا۔ وہاں سے کچھ دور کھلی فضا میں جا کر زینت منکھی نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی پھر کہا۔ ''بھئی! اس لڑکی نے تو......''

''بولو رک کیوں گئیں۔ میں اس کا ہر فیصلہ سننے کو تیار ہوں۔''

اس لڑکی نے مجھ سے کہا۔ ''میں تو اسے اس وقت سے پسند کرتی ہوں جب اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔''

''اتنی بڑی خوش خبری سنانے پر میرا جی تو چاہتا ہے کہ تمہارا منہ چوم لوں۔''

''نہیں ابھی نہیں۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔''

''کیسا امتحان؟''

''ہمارے تمہارے بڑوں کی رضامندی کے بغیر کیسے ہماری شادی ہوسکتی ہے۔''

''کیسے نہیں ہوسکتی۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا

قاضی؟"

"قاضی تو میں کچھ نہیں کر سکتا مگر ابا اماں کا راضی ہونا ضروری ہے۔" منگھی نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "یہ ایک مشکل مرحلہ ہے۔ تم لوگ پنجابی ہو۔ کیا تمہارے بزرگ کسی غیر پنجابی خاندان کی لڑکی کو اپنی بہو بنانا پسند کریں گے؟"

"میرے گھر کا مسئلہ تو میں حل کرلوں گا۔ کیا تمہارے گھر میں بھی؟"

اور جب ایک دن مناسب موقع دیکھ کر جاوید شیخ نے اپنے گھر میں یہ اعلان کیا کہ "میں جلد ہی اس گھر کی رونق میں اضافہ کرنے والا ہوں۔"

سب بہت خوش ہوئے اور پوچھا۔ "کیسی رونق؟"

"ایک بہو کو اس گھر کی زینت بنا کر اس گھر کی رونق بڑھانا چاہتا ہوں۔"

"ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ بس اب تم شادی کرلو۔ ہم تو بہت پہلے سے لڑکی کی تلاش میں ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ شریف گھرانے کے لوگ جب سنتے ہیں کہ ہمارا لڑکا اداکاری کے پیشے سے وابستہ ہے تو انکار کردیتے ہیں۔"

"آپ لوگوں کی اسی پریشانی کو پیش نظر رکھ کر میں نے خود ہی اپنی بیوی کا انتخاب کرلیا ہے۔"

"کون ہے وہ؟ کہاں رہتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟"

"یہیں اسی شہر میں رہتی ہے۔ میری ہی طرح وہ بھی اداکاری کرتی ہے اور اس کا نام ہے زینت منگھی۔"

"یہ شادی نہیں ہوسکتی۔"

نادر شاہی حکم سنا دیا گیا اور جن باتوں کا زینت منگھی نے خدشہ ظاہر کیا تھا وہی باتیں جواز کے طور پر پیش کردی گئیں۔ سب سے زیادہ مخالفت جاوید کے والد شیخ رحمت اللہ نے کی۔

"تم نے پہلے ہی اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ہمارے خاندان کو بدنام کیا ہے اب کسی اداکارہ کو میرے گھر کی بہو بنا کر لانا چاہتے ہو۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ اپنے گھر کے ماحول کو مزید بگڑنے نہیں دوں گا۔"

"شادی تو میں اسی اداکارہ سے کروں گا۔ آپ کو اگر اپنے گھر کی عزت کا خیال ہے تو میں اپنی زینت کو علیحدہ گھر لے کر اس کی زینت بنادوں گا۔"

بھائیوں نے، بہنوں نے بہت سمجھایا۔ یہ باور کرایا کہ ہم اس سے کہیں زیادہ اچھی لڑکی سے تمہاری شادی کرا دیں گے مگر جاوید پر کسی کی بات اثر انگیز ثابت نہیں ہوئی۔

نگار ایوارڈ

"غریبوں کا بادشاہ" بہترین اداکار 1988ء۔ "بارش" (پنجابی) بہترین اداکار 1989ء۔ "استادوں کے استاد" بہترین اداکار 1990ء۔ "کالے چور" (پنجابی) بہترین اداکار 1991ء۔ "زمانہ" (پنجابی) بہترین اداکار 1993ء۔ "زمانہ" (پنجابی) بہترین اداکار 1993ء۔ "مشکل" بہترین اداکار 1995ء۔ "گنز اینڈ روزز" بہترین معاون اداکار 1999ء۔ "یہ دل آپ کا ہوا" بہترین فلم ساز 2002ء۔ "یہ دل آپ کا ہوا" بہترین ہدایت کار 2002ء میں۔

گریجویٹ فلم ایوارڈ

"میڈم باوری" بہترین اداکار 1989ء۔ "انٹرنیشنل گوریلے" بہترین اداکار 1990ء۔ "کالے چور" بہترین اداکار 1991ء۔ "دہشت گرد" بہترین اداکار 1992ء۔ "مشکل" بہترین فلم ساز 1995ء۔ "مشکل" بہترین ہدایت کار 1995ء۔ "مشکل" بہترین اداکار 1995ء۔

نیشنل فلم ایوارڈ

"غریبوں کا بادشاہ" بہترین اداکار 1988ء میں۔ "یہ دل آپ کا ہوا" بہترین فلم ساز 2002ء میں۔ "یہ دل آپ کا ہوا" بہترین ہدایت کار 2002ء میں۔

بولان اکیڈمی ایوارڈ

"کالے چور" بہترین اداکار 1991ء میں۔ "جھوٹے رئیس" بہترین اداکار 1993ء میں۔ "مشکل" بہترین اداکار 1995ء میں۔ "چیف صاحب" بہترین ہدایت کار 1996ء میں۔ "یہ دل آپ کا ہوا" بہترین فلم ساز 2002ء میں۔ "یہ دل آپ کا ہوا" بہترین ہدایت کار 2002ء میں۔

''میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس کا انتخاب کیا ہے۔ وہ کسی بھی لڑکی کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے پر اس گھر کی بہو کے روپ میں اپنے آپ کو ڈھال لے گی۔ آپ میں سے کسی کو بھی کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔''

جاوید شیخ کی ضد اور پھر اس کی یقین دہانی پر گھر والوں کو اس کی بات ماننی پڑی۔ زینت منگھی کو بھی اسی طرح کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا مگر اس کی ضد کے آگے بھی کسی کی نہ چلی۔ جب دونوں خاندان والے ایک دوسرے سے ملے تو ان کے خدشات قدرے کم ہو گئے اور وہ دونوں کی شادی خانہ آبادی پر رضامند ہو گئے۔

زینت جاوید کی بیوی بن کر اس کے گھر آئی تو اس نے بہترین بہو بن کر دکھایا۔ گھر کے کسی فرد کو کبھی کسی بات کی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ جاوید اور زینت نے ایک مثالی جوڑے کی طرح خاندانی اقدار کی پاسداری کی اور اچھے میاں بیوی ثابت ہوئے۔

یہ ساری پریم کہانی ہم جیسے کھوجیوں تک بہت بعد میں پہنچی اور ان دونوں پریمیوں کے ذریعے ہی۔ بہت بعد میں چھپنے والے ان دونوں کے انٹرویوز کے ذریعے یا ان کے قریب ترین دوستوں کی زبانی۔ ورنہ یہ اندرونِ خانہ باتیں کیسے باہر آسکتی تھیں۔

زینت منگھی نے جاوید شیخ کی بیوی بن کر یہ ثابت کر دیا کہ بیوی ہو تو ایسی۔ نہ صرف شوہر کو بھرپور محبت دی بلکہ اس کے گھر کی زینت بن کر سچ مچ اس کے گھر کی رونق میں اضافہ کیا۔ بے شک وہ ایک اداکارہ تھی مگر اس نے ایک شریف گھرانے کی بہترین بہو بن کر ثابت کر دیا کہ عزت اور شرافت میں، میں بھی کسی سے کم نہیں۔ اس کے بہترین سبھاؤ سے اس کے اچھے عادات و اطوار سے گھر والے بھی خوش تھے۔ منہ سے کوئی کہتا نہیں تھا مگر دل ہی دل میں ضرور سب ہی کہتے ملے۔ ''جاوید کا انتخاب بہت عمدہ ہے۔ اس نے واقعی بہت چھان بین کے بعد اپنی بیوی کے لیے ایک اچھی لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔''

زینت منگھی کو جاوید اور جاوید کو زینت منگھی مل گئی تو کچھ دنوں تک ایسا لگتا تھا کہ دونوں کو دنیا جہان کی خوشیاں مل گئی ہیں۔ دونوں کی اس پیار بھری رفاقت کے نتیجے میں ان کے گھر آنگن میں دو پھول بھی کھلے۔ شہزاد شیخ اور مومل شیخ کے روپ میں۔ جناب شیخ رحمت اللہ کے گھر کی رونق اب دوبالا ہو گئی تھی۔ اس دور کی سب سے اہم بات ہے کہ زینت منگھی بے حد خوش قدم ثابت ہوئی۔ جاوید کی زندگی میں زینت کا آنا اس کی خوش بختی کا سبب بننے لگا۔ ''ان کہی'' ٹی وی سیریل کی بلاک بسٹرڈ کامیابی کے بعد فلم والوں نے بھی اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ شباب کیرانوی اور ان کے دونوں بیٹے نذر شباب اور ظفر شباب اس اصول پر کارفرما تھے کہ اپنی ہر فلم میں بڑے اور سپر اسٹارز کے ساتھ نئے اور ابھرتے ہوئے اداکاروں کو بھی کاسٹ کرتے تھے۔ اس طرح کاسٹنگ کے مد میں پیسا بچانا مقصود تھا۔ اس سلسلے میں شباب صاحب کی فلم ''میرا نام ہے محبت'' خاصی کامیاب رہی تھی جس میں غلام محی الدین اور بابرہ شریف جیسے ابھرتے ہوئے آرٹسٹوں کو لے کر فلم بنائی اور کامیاب رہے۔ جاوید شیخ کی عوامی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے نذر شباب نے اپنی فلم ''کبھی الوداع نہ کہنا'' میں چانس دیا اور یہ فلم ریلیز ہوتی تو ہٹ ہو گئی۔ اگرچہ اس کامیابی کے پیچھے کئی عوامل کارفرما تھے۔ شباب پروڈکشن ایک مستحکم فلم ساز ادارہ تھا۔ وہاں خاص فنی منصوبہ بندی کے تحت فلم بنائی جاتی تھی۔ کہانی، موسیقی اور ہدایت کاری پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ ان کی تشہیر بھی فلم کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی تھی اور جاوید شیخ کے حوالے سے یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اس بار ان کی بیوی ان کے لیے گڈلک ثابت ہوئی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہر کامیابی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے تو شاید یہ بات بھی تھی کبھی الوداع نہ کہنا کے بعد جاوید شیخ کے لیے فلم انڈسٹری کے سارے بند دروازے کھل گئے اور اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو کوئی نہ روک سکا۔ نذر شباب کی اس فلم ''کبھی الوداع نہ کہنا'' کی کاسٹ میں شبنم کے علاوہ سیتا اور ننھا بھی شامل تھے۔ یہ فلم ایک بے وفا شوہر کی ازدواجی زندگی اور ایک مثالی بیوی کے کرداروں کا احاطہ کرتی ہے جس میں جاوید نے بیک وقت دو عورتوں میں تقسیم مرد کا کردار بڑی خوب صورتی سے نبھایا۔ ان دنوں اس ٹائپ کی فلموں کا رجحان تھا۔ لہٰذا سماجی موضوع پر بننے والی ''کبھی الوداع نہ کہنا'' باکس آفس پر زبردست کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور یوں فلمی افق پر ایک نئے سپر اسٹار نے جنم لیا جسے بعد میں ندیم کے سب سے مضبوط حریف کا درجہ حاصل ہوا۔

''کبھی الوداع نہ کہنا'' کی بڑی کامیابی کے بعد جب جاوید شیخ فلم والوں کے لیے ہاٹ کیک بن گئے تو ان کا زیادہ سے زیادہ وقت لاہور میں گزرنے لگا۔ ایسے حالات

میں جب کسی اداکار کو بیک وقت بہت سے فلم ساز اپنی فلموں میں کاسٹ کرتے ہیں تو ان میں ہر طرح کی فلمیں ہوتی ہیں۔ جاوید شیخ کے ساتھ بھی اس دور میں ایسا ہی ہوا۔ انہیں ہر نوعیت کے کرداروں میں پیش کیا گیا۔ ایسا وقت بہت آزمائشی ہوتا ہے، کچھ اداکار اس امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں کچھ ناکام ثابت ہوتے ہیں لیکن جاوید شیخ چونکہ اس دشت کی سیاحی میں خاصا وقت گزار چکے تھے اور یہ بات بھی تھی کہ انہیں جنون کی حد تک اداکاری کا شوق تھا اس لیے ہر کردار کو اپنے لیے چیلنج سمجھ کر ادا کیا اور حتمی بات یہ ہے کہ اب قدرت بھی ان پر مہربان ہو گئی تھی اور ان کی بے پناہ چاہنے والی بیوی زینت منگھی کی نیک تمناؤں اور دعاؤں کا بھی اثر تھا کہ انہیں اردو اور پنجابی فلموں میں جو سماجی، رومانوی، طربیہ اور ایکشن کرداروں میں پرفارم کرنے کا موقع ملا، ان میں انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ ورسٹائل اداکار ہیں۔ ہر طرح کی اداکاری میں پورا اترنے پر فلم انڈسٹری میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ ان کی فلمیں کامیاب ہوئیں تو انہوں نے اچھا بزنس بھی کیا۔ فلم والے انہی اسٹارز کی قدر کرتے ہیں جن کی فلمیں چلتی اور کما کر دیتی ہیں۔

اس دور میں جاوید شیخ کی جن فلموں نے نئے ریکارڈز بنائے ان میں اردو فلموں میں شادی مگر آدھی، گھر کے سامنے، ببلی، کرائے کے گوریلے، مس کولمبو، ہلچل، ہانگ کانگ کے شعلے، زنجیر، فیصلہ جب کہ پنجابی فلموں میں مہندی، بھائی دیاں چوڑیاں، بارش وغیرہ شامل ہیں۔

ابتدائی دور میں شبنم اور سری لنکن اداکارہ سبیتا کے ساتھ جاوید کی جوڑی بے حد پسند کی گئی جس کے بعد بابرہ شریف، سلمیٰ آغا، کویتا، نیلی، نادرہ اور ریما کے ساتھ بھی جاوید شیخ کی کامیاب جوڑیاں بنیں۔

وہ جو کہتے ہیں کہ جو جیتا وہی سکندر۔ تو جاوید شیخ کی بھی کچھ ایسی ہی بات تھی۔ ان کی فلمیں یکے بعد دیگرے کامیاب ہوئیں تو فلم انڈسٹری کے سبھی ہدایت کاروں کے ساتھ انہیں کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا جن میں نذرالاسلام، محمد جاوید فاضل، سید نور، اقبال کاشمیری، مسعود بٹ، نذر شباب، ظفر شباب، شمیم آرا، سنگیتا، پرویز ملک، جان محمد، حسن عسکری اور الطاف حسین وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح فلمی صنعت کے تمام ہی بڑے فلم سازوں سجاد گل، ستیش چند آنند، میاں فرزند علی، میاں خالد فیروز اور جمشید ظفر نے جاوید کو اپنی فلموں میں بطور ہیرو کاسٹ کیا۔

جاوید شیخ کی کامیابی کے اس سفر میں جہاں انہیں بے حد عروج حاصل ہوا وہاں ان کی گھریلو اور ازدواجی زندگی متاثر ہوئی۔ لاہور کی فلموں میں کام کرنے کے لیے وہ کراچی سے لاہور جاتے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں زینت منگھی انہیں بہت مس کرتی تھیں مگر یہ ان کی مجبوری تھی۔ شوہر روزگار کے لیے اکثر باہر جاتے ہی ہیں۔ یہ سوچ کر وہ جاوید کی جدائی برداشت کرتی رہی۔ ابتدائی دنوں میں وہ تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد گھر آتے تھے اور چند روز رہ کر واپس چلے جاتے تھے مگر ان کی لاہور میں مصروفیات جیسے جیسے بڑھنے لگی گھر آنے کا وقفہ بھی طویل ہوتا گیا۔ زینت منگھی ہجر کے یہ دن رات بھی یہ سوچ کر گزارتی رہی کہ شاید جاوید کو بھی مجھ سے دوری کھلتی ہوگی۔ شاید اس دوری کو دور کرنے کے لیے وہ لاہور میں گھر لے کر مجھے بلا لیں گے۔ مگر وقت گزرتا گیا اور ایسا کچھ نہیں ہوا۔ پھر میڈیا کے ذریعے زینت منگھی تک یہ باتیں پہنچنے لگیں کہ جاوید شیخ اپنی فلموں کی ہیروئنز میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ ایسی خبروں کو پہلے پہل تو وفا شعار بیوی نے افواہ سمجھ کر نظر انداز کیا مگر جب جاوید شیخ سے ملاقات ہوئی تو ان کا موڈ مزاج بگڑا ہوا ملا پہلے جیسی بات دکھائی نہ دی۔ بیوی نے کوئی شکوہ شکایت کرنے کی بجائے کہا۔ ''اب تمہاری مصروفیات لاہور میں بہت بڑھ گئی ہیں اس لیے وہیں گھر لے کر مجھے بلا لو۔ یہاں آنے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑے گی۔''

''گویا تم میری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بننا چاہتی ہو؟''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں اور تمہاری ترقی میں رکاوٹ بنوں گی؟ یہ بات تم نے کیسے کہہ دی؟''

''اگر میں لاہور میں گھر لے کر تم لوگوں کو وہاں بلا لوں گا تو میری فلموں پر توجہ کم ہو جائے گی۔ مجھے تم لوگوں میرا مطلب ہے تم اور تمہارے بچوں کے لیے وقت نہیں نکالنا پڑے گا؟ میں جو اب ساری فکروں سے آزاد ہو کر اپنی ساری توجہ اپنا سارا وقت اپنی کارکردگی کو بہتر سے بہتر طور پر بنانے پر صرف کرتا ہوں۔ وہ متاثر نہیں ہوگا؟''

''مگر میں جو یہاں تمہارے بغیر متاثر ہوتی ہوں۔ اس کا تمہیں کوئی خیال نہیں؟''

''ٹھیک ہے میں تمہارا خیال کرنے کے لیے لاہور میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر تمہارے پاس چلا آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر جاوید نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا کپ زمین پر

دے مارا۔ ''یہ بھی نہیں سوچتی یہ عورت کہ یہ دن رات محنت میں اس کے اور اس کے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے کر رہا ہوں۔''

زینت منگھی سمجھ گئی کہ یہ اب پہلے والا جاوید نہیں رہا ہے۔ فلموں کی کامیابیوں نے اب اس کی نظر میں میری قدر و قیمت کچھ نہیں رکھی ہے۔ اخباروں میں چھپنے والی خبریں محض افواہ نہیں ہیں۔ اس کی ساری دلچسپیاں اب اس کی ہیروئنوں پر مذکور ہوگئی ہیں۔

کچھ دنوں تک زینت نے انتظار کیا کہ جاوید کے رویے اور سلوک میں کچھ بہتری آتی ہے یا وہ یونہی مجھ سے بیزار رہتا ہے مگر جب جاوید کی طرف سے کسی بہتری کی امید نہیں رہی تو اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ جاوید سے علیحدگی اختیار کرلے۔

جاوید کے گھر والے بھی جاوید کے اس نامناسب رویے اور لاابالی طبیعت سے نالاں تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جاوید کی بیوی جواب اس کے دو بچوں کی ماں بھی ہے جاوید سے اپنا رشتہ منقطع کرلے۔ مگر وہ زینت کی مجبوریوں کو بھی محسوس کرتے تھے۔ وہ آخر اس کی بیوی تھی اور میاں کے جیتے جی کوئی بیوی کیسے اس سے دور رہ سکتی ہے۔

بے پناہ محبت کا وہ رشتہ جو زندگی بھر ساتھ نبھانے کے لیے جوڑا گیا تھا ایک دن ٹوٹ گیا۔ زینت منگھی نے جاوید شیخ سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی دنیا الگ بسالی۔ اب اس کے دونوں بچے ہی اس کے زندہ رہنے کا سہارا بنے رہے۔ دونوں اس محبت کی نشانی تھے جس نے اسے پیار کے رشتے سے جوڑا تھا۔ وہ رشتہ جو اب برقرار نہیں رہا تھا۔ ایک یاد بن کر رہ گیا تھا۔

زینت منگھی نے جاوید شیخ سے علیحدگی کے بعد اپنے لیے کسی نئے شریکِ حیات کا سہارا نہیں لیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جاوید سے اب بھی اس بات کی توقع کر رہی تھی کہ کسی دن اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور وہ دوبارہ اسے اپنا لے گا۔

دوسری طرف جاوید بڑی اونچی اڑان اڑ رہا تھا۔ اسے ٹوٹنے والے رشتے کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ کوئی غم نہیں تھا کیونکہ اس کے اردگرد محبت کی پینگیں بڑھانے کے لیے صنفِ مخالف کی کمی نہیں تھی۔ اس کے لیے اس کے ساتھ فلموں میں کام کرنے والی کئی ہیروئنیں اس کے اشاروں پر ناچنے کے لیے تیار تھیں چونکہ ان دنوں اس کی قسمت کا ستارہ جگمگا رہا تھا۔ اس لیے اس سپر اسٹار کے سہارے کئی اداکارائیں آگے بڑھنا چاہتی تھیں۔ مگر جاوید شیخ کی نظریں زیادہ بلندی کی طرف تھیں۔ ان دنوں ایک پاکستانی نژاد برطانوی اداکارہ سلمیٰ آغا بھارتی فلم ''نکاح'' میں کام کرنے کے بعد اونچی ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اس کی اداؤں پر جاوید شیخ کا دل مچل گیا اور وہ اس اونچی اڑنے والی پنچھی کو اپنے پیار کے پنجرے میں بند کرنے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ یہ وہ وقت تھا جب زینت منگھی سے ان کی علیحدگی ہو چکی تھی۔

سلمیٰ آغا کی بھارتی فلم ''نکاح'' نے کامیابی حاصل کی تو پاکستانی فلم سازوں کو بھی اسے ہیروئن بنانے کا خیال آیا پہل جس نے کی وہ ہدایت کار حسن عسکری تھے۔ اسے اپنی فلم ''ہم اور تم'' میں کام کرنے کی دعوت دے دی۔ سلمیٰ آغا نے یہ آفر قبول تو کرلی مگر اس شرط پر کہ اس کی تمام تر فلمبندی لندن میں کی جائے۔ کیونکہ اس کی مستقل رہائش برطانیہ میں ہی تھی۔ حسن عسکری اور ان کے فلم ساز رضامند ہو گئے اور اپنی اس فلم کے لیے اس وقت کے سپر اسٹار جاوید شیخ کو بطور ہیرو کاسٹ کیا۔ جاوید کی تو گویا لاٹری نکل آئی۔ اس طرح جاوید شیخ، سلمیٰ آغا کے ہیرو کے طور پر پرفارم کرنے کے لیے یونٹ کے ساتھ لندن چلے گئے اور حسبِ پروگرام ''ہم اور تم'' کی ساری شوٹنگ لندن اور اس کے اطراف میں مکمل کی گئی۔ سلمیٰ آغا کے ساتھ جاوید کی یہ پہلی فلم تھی۔ اس فلم کی تکمیل کے دوران جاوید نے سلمیٰ آغا کے ہیرو کے طور پر کچھ اس طرح پرفارم کیا کہ دونوں فلم کے ہیرو ہیروئن نہیں رہے حقیقی زندگی میں بھی ایک دوسرے کے ہیرو ہیروئن بن گئے۔ جب یونٹ واپس پاکستان آیا تو دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے متعارف ہو رہے تھے۔ ''ہم اور تم'' کے ڈائریکٹر حسن عسکری ان دونوں کے اس نئے تعلق سے جس قدر پریشان تھے اس کا اظہار انہوں نے لندن سے واپسی کے اگلے روز ہی میڈیا کے سامنے کر دیا۔ یہ بتایا کہ جاوید شیخ نے لندن میں شوٹنگ کے دوران مجھے اور میرے یونٹ کو بہت تنگ کیا۔ ان کی ساری دلچسپی سلمیٰ آغا سے تھی۔ سلمیٰ آغا نے بھی فلم سے زیادہ جاوید میں دلچسپی لی۔ ان دونوں نے اکثر ہمیں لوکیشن پر گھنٹوں انتظار کروایا۔

لاہور واپس آنے کے بعد بھی جاوید کو اپنی اس فلم سے زیادہ سلمیٰ آغا ہی کی رفاقت عزیز رہی۔ انہوں نے اپنے

کیریئر کا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔ ان کی ساری دلچسپی سلمیٰ آغا تک محدود رہی۔ یہاں تک کہ وہ ''ہم اور تم'' کی ڈبنگ کے لیے بھی دستیاب نہیں ہوئے۔ لہٰذا ہدایت کار کو جاوید کی ڈبنگ فردوس جمال سے کرانی پڑی۔

سلمیٰ آغا کی وجہ سے جاوید شیخ کو اس فلم سے کوئی دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے اس فلم کو جو نقصان ہونا چاہیے تھا وہ ہوا اگرچہ یہ فلم سلمیٰ آغا کے ساتھ ان کی پہلی فلم تھی لیکن سلمیٰ آغا کی رفاقت میں وہ ایسے پاگل ہوئے کہ شروع سے ہی فلم کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ لندن میں بھی شوٹنگ کے دوران اس دلچسپی، لگن اور محنت کا مظاہرہ نہیں کیا جواب تک اپنی فلموں میں کرتے رہے تھے۔

سلمیٰ آغا کو کاسٹ کر کے جس نیت اور مقصد کے لیے ''ہم اور تم'' بنائی گئی تھی نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہوا۔ یہ فلم سپر فلاپ ثابت ہوئی۔ جاوید شیخ کے اس عروج کے دور میں یہ پہلی فلم تھی جو زبردست ناکامی سے دوچار ہوئی مگر جاوید کو اس ناکامی کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ اس لیے کہ اب وہ بولی وڈ کا اسٹار بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ سلمیٰ آغا کے تعلقات کا سہارا لے کر بھارتی فلموں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ''نکاح'' کی کامیابی کے بعد سلمیٰ آغا بولی وڈ میں اچھی طرح قدم جما چکی تھی۔

اسی سوچ کی وجہ سے وہ سلمیٰ آغا کے پیچھے پیچھے بمبئی پہنچ گئے۔ ادھر لاہور میں جاوید شیخ کی اس طرح بھارت چلے جانے پر فلم ساز پریشان ہو گئے۔ سلمیٰ آغا میں ان کی حد سے زیادہ دلچسپی ہی فلم سازوں کے لیے کچھ کم پریشانی کا سبب نہیں تھی کہ وہ چپکے سے سلمیٰ آغا کے ساتھ بمبئی چلے گئے۔ اس موقع پر فلم والوں نے یہی سمجھا کہ اب وہ وہاں سے لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ سلمیٰ آغا کے ساتھ بولی وڈ کے ہی بن کر رہ جائیں گے۔

اس دور میں فلم سازوں کی اوّلین پسند جاوید شیخ ہوتے تھے۔ جاوید کی عدم موجودگی کی وجہ سے فلم سازوں نے دوسرے ہیروز کو کاسٹ کرنا شروع کر دیا۔ جو فلمیں جاوید کو ملنے والی تھیں وہ اظہار قاضی، اسماعیل شاہ اور فیصل الرحمٰن کو ملنے لگیں۔ یہ خبر بمبئی تک پہنچیں، جاوید کو بھی معلوم ہوئیں مگر وہ بے پروائی کے ساتھ مسکرا کر رہ گئے۔ ان کو اس نقصان کی کب پروا تھی کیونکہ وہ تو بولی وڈ میں اپنا کیریئر بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ جس کی تعبیر کے لیے انہیں

کوڈک گولڈ میڈل ایوارڈ

''یہ دل آپ کا ہوا'' بلاک بسٹر ایوارڈ 2002ء۔

وحید مراد میموریل ایوارڈ

''محبت کے سوداگر'' بہترین اداکار 1992ء۔ ''زمانہ'' بہترین اداکار 1993ء۔ ''مشکل'' بہترین اداکار 1995ء۔

پرائیڈ آف پرفارمنس

حکومت پاکستان کی جانب سے فلم، ٹی وی اور اسٹیج پر طویل خدمات کو سراہتے ہوئے 2011ء میں جاوید شیخ کو پرائیڈ آف پرفارمنس کے اعزاز سے نوازا گیا۔

جاوید شیخ پر خصوصی ایڈیشن

2014ء میں جب جاوید شیخ کے فنی سفر کے چالیس سال مکمل ہوئے تو ان کے پرستاروں نے ان کی فنی خدمات پر ہفت روزہ نگار کا خصوصی ایڈیشن نکلوایا۔ جس کے لیے ان کے پرستار اعظم عبدالجبار ساگر بلوچ اور ان کے ساتھیوں نے جاوید شیخ کی شخصیت اور فن پر زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کیا بلکہ شنید ہے کہ اپنے پاس سے اور فیڈریشن کے فنڈ سے بھی مالی اعانت کی۔ 16 صفحات پر مشتمل اس ایڈیشن کی قیمت 40 روپے تھی جسے جاوید کے پرستاروں نے ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ اپنے دور دراز کے دوستوں اور عزیزوں کو بھی اپنے خرچ پر ارسال کیا۔

سلمیٰ آغا کے سپورٹ اور سہارے کی ضرورت تھی۔

بمبئی پہنچ کر جاوید شیخ کو اپنی جگہ بنانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ زیادہ وقت نہیں لگا۔ کیونکہ وہ بولی وڈ والوں کے لیے کوئی اجنبی نہیں تھے۔ ان کے یہاں آنے سے بہت پہلے ان کی کچھ فلموں سے بولی وڈ کے کچھ فلم والے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ جن میں ''بوبی'' خصوصی طور پر بہت اہم فلم تھی جو 1984ء میں پاکستان میں ریلیز ہوئی تھی اور جس نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ اس فلم (بوبی) کی کہانی پر بھارت میں تین فلمیں چالباز، انمول اور دادا گیری بنائی جا چکی تھیں۔ جب وہ (جاوید شیخ) سلمیٰ آغا سے شادی کے بعد اپنی اسٹار وائف کے ساتھ بمبئی پہنچے تو انہیں اپنے تعارف کے سلسلے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔

وہ باآسانی فلم میکرز کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بولی ووڈ میں پاکستانی ایکٹرز کو ہاتھوں ہاتھ لیا جارہا تھا۔ محسن حسن خان اور طلعت حسین بھارتی فلموں میں کام کر کے پذیرائی حاصل کر چکے تھے۔ جاوید شیخ کو جلد ہی دو تین پروجیکٹ مل گئے۔ جن میں سب سے بڑی آفر پہلاج نہلانی کی فلم ''خون بھری مانگ'' کی تھی۔ اس فلم میں وہ ریکھا اور سونو والیا کے ساتھ ہیرو کاسٹ کیے جارہے تھے۔ تمام معاملات تیزی سے طے ہو گئے۔ راکیش روشن کو ڈائریکٹر لیا گیا۔ شوہر پر حاوی رہنے کی خواہش مند اداکارہ وگلوکارہ کو جب یہ محسوس ہوا کہ اس کا شوہر نامدار بیوی کی بیساکھی کے بغیر بولی ووڈ میں جگہ بنانے جارہا ہے تو اس نے اس کی پذیرائی اور مقبولیت سے خائف ہو کر پہلے تو یہ پروجیکٹ چھوڑنے کی دھمکی دے دی۔ اس کے بعد اس کے خلاف منفی پروپیگنڈہ شروع کر دیا اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے مجھ سے یہ شادی ذاتی مفاد کے لیے کی تھی تاکہ وہ بھارتی فلموں میں میرے حوالے سے کام حاصل کر سکے۔

جاوید شیخ نے اس کے اس منفی رویے کے باوجود اسے سمجھانے بجھانے کی بہت کوشش کی جس پر وہ چراغ پا ہو گئی اور اس نے جاوید سے یہاں تک کہہ دیا۔ ''اب تم یہاں سے فوراً اپنا سوٹ کیس اٹھا کر چلے جاؤ۔''

بمبئی میں اس وقت جاوید سلمیٰ آغا کی ذاتی رہائش گاہ میں قیام پذیر تھے کیونکہ وہ اس کے شوہر تھے اس لیے اس کے ساتھ ہی رہ سکتے تھے۔

جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو جاوید شیخ کو اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر ہوٹل شفٹ ہونا پڑا۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ سلمیٰ آغا سے اپنی محبت برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ یہ رشتہ بچانا چاہتے تھے۔

اگلے روز جاوید نے پہلاج نہلانی کے پاس جا کر معذرت کر لی کہ وہ ان کی فلم ''خون بھری مانگ'' میں کام نہیں کرے گا۔ وہ اس انکار کی وجہ سمجھ گئے۔ ان تک بھی یہ بات پہنچ چکی تھی کہ سلمیٰ آغا اس بات پر خوش نہیں کہ اس کا شوہر اس کی بیساکھی کے بغیر اپنے لیے کوئی ممتاز جگہ بنائے۔ وہ جانتی تھی کہ جاوید اس کے مقابلے میں ایک تجربہ کار اداکار ہے اس لیے وہ اسے اپنے اوپر حاوی ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ فلم والے بھی جانتے تھے کہ جاوید بیوی کو بہت چاہتا ہے اور اسی کی انا کی تسکین کے لیے اس فلم میں کام کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ معاملہ چونکہ میاں بیوی کے تعلقات کا تھا اس لیے انہوں نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش نہیں کی اور جاوید کے انکار پر کبیر بیدی کو اس کی جگہ کاسٹ کر لیا۔

اگر جاوید نے یہ فلم کر لی ہوتی تو آج شاید جاوید شیخ کی سوانح میں بہت کچھ بدلا ہوا ملتا۔ یہ سلمیٰ آغا کے لیے اس کی بہت بڑی قربانی تھی مگر وہ ایک بے وفا عورت ہی رہی۔ وہ بار بار بیوی کی بے وفائی کو نظر انداز کرتے رہے مگر سلمیٰ آغا کے رویے میں کوئی مثبت تبدیلی آنے کی بجائے کج روی بڑھتی ہی گئی۔

پہلاج نہلانی سے معذرت کرنے کے بعد وہ ممبئی میں مزید نہیں رکے سیدھے پاکستان واپس آگئے۔ انہیں رہ رہ کر زینت منگھی یاد آرہی تھی۔ وہ بھی تو بیوی تھی اس کا تعلق تو شوبز سے بہت پرانا تھا۔ اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا اور یہ کیسی بیوی ہے۔ میرے ساتھ کیسا تکلیف دہ برتاؤ کر رہی ہے۔

جاوید شیخ کو آج بھی اس بات کا دکھ ہے کہ انہوں نے ایسی چاہنے والی اور وفا شعار بیوی کی قدر نہیں کی۔ اپنی کامیابیوں کے نشے میں اسے دکھ دیا۔ شاید قدرت کی طرف سے انہیں اسی بات کی سزا ملی۔ اسے ٹھکرا کر جسے اپنایا۔ اسی نے تڑپایا، ستایا اور شاندار مستقبل کو تباہ کر دیا۔

جاوید شیخ لاہور پہنچے تو ان کو ایک اور دھچکا لگا۔ فلم انڈسٹری نے بڑھ کر ان کا استقبال نہیں کیا۔ کسی نے یہ نہیں کہا۔ ''اچھا ہوا۔ تم لوٹ کر آگئے۔''

''یار! ہم تو تمہارے بغیر بے سہارا ہو گئے تھے۔''

جس نے دیکھا منہ پھیر لیا۔ نولفٹ دیا۔ انہیں محسوس ہوا کہ ان کے بغیر بھی فلم انڈسٹری کی گاڑی چل رہی ہے ان کی جگہ دوسرے اداکار کام کر رہے ہیں۔

کچھ فلم والوں سے ان کی بڑی دوستی تھی ان سے ملے تو انہوں نے شکایت کی۔

''یار تم نے بہت برا کیا۔ ایک عورت کے چکر میں پڑ کر فلم انڈسٹری کی بادشاہی کو ٹھوکر ماردی۔ تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔''

''تمہیں بمبئی جانا تھا تو فلم سازوں سے کہہ کر جاتے۔ بتا کر جاتے کہ چند دنوں بعد آجاؤ گے۔''

''تم جس طرح یہاں سے گئے لوگوں نے یہی سمجھا کہ اب واپس نہیں آؤ گے۔''

''اب واپس کیوں آگئے ہو؟ کیا وہاں تمہارا مشن امپاسبل نہیں ہوا؟ بولی ووڈ نے تمہیں ریجیکٹ کردیا، واپس جانے پر مجبور کردیا۔''

جاوید نے سب کی بات سن کر ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی پھر بولے۔ ''نہیں یہ بات نہیں۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

اب جاوید نے شرمسار لہجے میں اپنی دکھ بھری کہانی سنادی جسے سن کر سب کو افسوس ہوا۔ ''تم نے ایسی بے وفا اور بے مروت عورت کی بات پر عمل کرتے ہوئے اتنی بڑی اور شاندار آفر کو ٹھکرادی؟''

''ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم اس سازشی عورت کو ٹھوکر مار کر اپنی بہتری کے لیے پہلاج نہلانی اور راکیش روشن کی فلم مکمل کرتے۔''

''تم نہیں جانتے جاوید! تم نے اس فلم کو چھوڑ کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔''

''ارے پگلے! سلمیٰ آغا جیسی عورتیں تو ایک ہزار ایک مل سکتی ہیں مگر بولی ووڈ میں ایسا شاندار موقع دوبارہ نہیں مل سکتا۔''

اب عالم یہ تھا کہ جاوید نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ یہاں سے وہ بھریا میلہ چھوڑ کر وہاں گئے تھے اور وہاں سے اپنے بہترین مستقبل کو ٹھوکر مار کر واپس آگئے تھے۔ ان کے حالات سے آگاہی کے بعد کچھ فلم والوں کو ان سے ہمدردی بھی تھی۔ کچھ کو غصہ بھی تھا کہ جاوید نے صرف اپنے مفادات کے لیے ہم لوگوں کے نفع نقصان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ بہر حال آہستہ آہستہ انہیں پھر فلموں میں کاسٹ کیا جانے لگا۔

اس عرصے میں یہ ہوا کہ سلمیٰ آغا بھی بمبئی سے واپس لاہور آگئیں۔ شاید ان کے لیے بولی ووڈ میں وہ حالات باقی نہیں رہے تھے جو جاوید شیخ کے ساتھ بمبئی آنے تک تھے۔ ان کے اپنے شوہر کے ساتھ جو سلوک رہا۔ اس سے بمبئی فلم انڈسٹری کے لوگ بخوبی واقف ہوچکے تھے اور وہ اس کے بارے میں یہ اندازہ لگا چکے تھے کہ اس سے کسی کو بہتری کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ جو اس قدر چاہنے والے شوہر کی نہ ہوسکی، وہ کسی دوسرے کے لیے کیا سود مند ہوگی۔ بیویاں تو شوہروں کے لیے قربان ہوجاتی ہیں اگر یہاں اداکاری کر کے کامیابی حاصل کرتا تو اس کا فائدہ تو اسی کو ہوتا۔ یہاں بھی اس کے کردار سے فلم والے واقف ہوچکے تھے۔ اس لیے اب اسے وہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جو ہونی چاہیے تھی۔

محبت کا مارا جاوید شیخ اس موقع پر بھی سب کچھ بھول کر اس سے مفاہمت کرنے پر تیار تھا مگر اس بدمزاج عورت کی بدمزاجی اب بھی برقرار تھی۔ جاوید اسی نتیجے پر پہنچے کہ وہ اب مجھ سے کوئی تعلق برقرار رکھنا ہی نہیں چاہتی۔ قدرت کو بھی شاید یہی منظور تھا کہ ان حالات میں دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجائیں۔

جاوید، سلمیٰ آغا سے علیحدگی کے بعد چند روز تک تو پریشان رہے کہ جسے اس قدر ٹوٹ کر چاہا تھا اس نے ساتھ چھوڑ دیا پھر وہ نارمل ہوگئے اور اپنی فلموں سے دل لگانے لگے اور ان کے چاہنے اور چاہے جانے کی طبیعت نے ایک بار پھر انگڑائی لی اور وہ پھر کسی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوگئے۔ ان کی دل پھینک طبیعت نے انہیں زیادہ دن تنہا رہنے کا موقع نہیں دیا۔ اس بار ان کے دل و دماغ میں ہلچل مچانے والی اداکارہ نیلی تھی۔ پنجابی فلموں سے اپنے کیریئر کی ابتدا کرنے والی حسین و جمیل نیلی جب جاوید شیخ کے قریب آئی تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے مگر نیلی گیلی لکڑی کی طرح تھی۔ یعنی وہ فوراً ہی جذبات کی آگ میں جل اٹھنے والی نہیں تھی۔ اس کے دل میں بھی جاوید کی محبت کی آگ ایک دم نہیں بھڑکی۔ وہ عشق و محبت کے معاملے میں بہت سیانی نکلی۔ اس نے جاوید کو خوب داؤ پیچ دکھائے اور باور کرایا کہ وہ اتنا آسان شکار نہیں کہ وہ (جاوید) اسے ایک ہی نوالے میں نگل جائے۔ نیلی کو یقیناً جاوید کی رومانی ہسٹری معلوم تھی۔ زینت منگھی کے بعد سلمیٰ آغا سے پیار کے رشتوں کا بھی علم ہوگا۔ اس لیے بہت محتاط انداز میں آہستہ آہستہ قدم بڑھایا۔ محبت میں طے کیے جانے والے روایتی عہد و پیمان ضرور ہوئے لیکن دونوں جانتے تھے کہ یہ سمجھوتے کا تلن ہے۔ دونوں نے اس رشتے کا خوب خوب فائدہ اٹھایا اور پھر آنے والے دس سال تک ہر ایک کی زبان پر نیلی اور جاوید کے نام تھے۔ ایک کامیاب جوڑی۔ دو مثالی دوست اور قابل بھروسا رازداں۔

نیلی اور جاوید کی جوڑی ویسے ہی زیر بحث رہی جیسا کہ ماضی میں صبیحہ سنتوش، زیبا محمد علی یا بابرہ اور شاہد کی جوڑیاں مشہور تھیں۔ دونوں نے خوب اکٹھے وقت گزارا۔ ڈھیر ساری اردو پنجابی فلموں میں کام کیا۔ رنگیلے جاسوس، میڈم باوری، درندگی، پامیلا، عابدہ، آخری مجرا، سات

خون معاف، بختاور، زمانہ، کالے چور، طوفانی بجلیاں، یہاں تک کہ جاوید نے ڈائریکشن کی فیلڈ میں قدم رکھا تو ''مشکل'' میں کہانی کا سارا بوجھ نیلی کے کاندھوں پر ڈالا۔

''چیف صاحب'' میں بھی نیلی کو برابر کا کریڈٹ دیا اور پھر جب نیلی جاوید کی فلموں سے آؤٹ ہوئی تو جاوید کا ڈاؤن فال شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد ایک فلم فلاپ ہوئی۔ پہلے جاوید کی ڈائریکشن میں بننے والی فلموں کو عوامی حلقوں سے مسترد کیا جانے لگا۔ اس کے بعد بطور اداکار بھی فلم میکرز جاوید سے کترانے لگے۔ نیلی نے جاوید سے دوری کیا اختیار کی ایسا محسوس ہوا قسمت جاوید سے روٹھ گئی ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب جاوید شدید مالی بحران کی زد میں آگئے لیکن اس کڑے وقت میں بھی وہ خدا کی ذات سے مایوس نہیں ہوئے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ناکامی کی اتھاہ گہرائی میں جا کر بھی خدا کی قدرت سے دوبارہ ابھرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ اسی عزم نے جاوید کو ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار کرایا۔

جاوید کے قریبی دوستوں کا کہنا ہے کہ جاوید کو بنانے اور سنوارنے میں عورتوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ پیرس میں اسے جو فرانسیسی لڑکی کیرولین ملی تھی، اس نے اسے مہذب اور شائستہ انسان بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ پھر زینت منگھی نے اسے اپنا کر اس کی گھریلو زندگی بہت خوشگوار بنا دی تھی۔ اسی طرح نیلی کا بھی کردار ہے۔ (بس ایک سلمٰی آغا ہی تھی جس نے اس کی تباہی و بربادی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی) نیلی کے ساتھ جاوید کی جوڑی پاکستانی سنیما کی چند بے حد کامیاب جوڑیوں میں سے ایک تھی جسے دونوں کی رومان پرور فطرت کے باعث شہرت حاصل ہوئی۔ کوئی فلمی اخبار یا میگزین ایسا نہ تھا جس نے نیلی اور جاوید کے رومانس کی رنگین داستان اور لحہ بہ لحہ رنگ بدلتی ان کی محبت کو ہائی لائٹ نہ کیا ہو۔ سچ پوچھیے تو جاوید اور نیلی کو اس شہرت کی ضرورت بھی تھی۔

جاوید شیخ نے بطور ڈائریکٹر ایک نئے دور کی ابتدا کی اور ''مشکل'' کے بعد نیلی کے ساتھ سپر ہٹ فلم ''چیف صاحب'' بنائی جس میں اپنے بھائی سلیم شیخ کو بریک دیا۔ اس فلم کے ذریعے جاوید شیخ کو سنبھلنے کا موقع ملا اور وہ انڈسٹری جو جاوید شیخ کو بطور ہیرو مسترد کر چکی تھی ڈائریکٹر کے طور پر قبول کرنے کے لیے مجبور ہوئی۔

اس سے پہلے کہ جاوید شیخ کی ہدایت کاری پر مزید بات کروں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جاوید کے بارے میں ایک پرانی یاد تازہ کر دوں۔ جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ جاوید میں ہدایت کارانہ صلاحیتیں بہت پہلے سے موجود تھیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب سلمٰی آغا سے جاوید کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ جاوید سلمٰی کی وجہ سے بمبئی کی فلم چھوڑ کر پاکستان آگئے تھے اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد سلمٰی آغا بھی لاہور آ کر یہاں کی فلم انڈسٹری میں قدم جمانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ ابھی ان کی علیحدگی نہیں ہوئی تھی۔ اسی دوران سلمٰی آغا کے البم کے ایک گانے کی ویڈیو جاوید شیخ نے تیار کی۔ اس کی شاعری مسرور انور کی اور موسیقی امجد بوبی کی تھی۔ یہ مہدی حسن اور سلمٰی آغا کا پہلا ڈوئٹ البم تھا جس کی ڈائریکشن، پروموشن اور مارکیٹنگ جاوید شیخ نے خود کی تھی۔ یہ ڈائریکشن کے میدان میں جاوید کا پہلا قدم تھا۔ اگرچہ ان دنوں سلمٰی آغا سے ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس کے باوجود جاوید نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ قدرت نے ان کی یہ نیکی رائیگاں نہیں جانے دی۔ جب انہوں نے خود اپنی فلم بنانے کا ارادہ کیا تو اس بات کا بھروسا تھا کہ وہ اس کی ہدایت کاری بھی کر سکتے ہیں۔

''چیف صاحب'' کی خاطر خواہ کامیابی کے بعد جب اس بات کی توقع ہو چلی تھی کہ اداکار جاوید شیخ بطور ہدایت کار اپنے کامیاب سفر پر گامزن ہو جائے گا تو ایک نیا محاذ جاوید کے خلاف کھل گیا۔ ہدایت کاروں کی ایک بڑی تعداد نے انہیں لاہور چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں مختلف طریقوں سے پریشان کیا جانے لگا۔ کبھی ان کی فلم میں کام کرنے والے ایکٹرز کو شوٹنگ سے روکنے کی کوشش کی جاتی تو کبھی سرمایہ کاروں اور تقسیم کاروں کی جانب سے عدم تعاون کا مظاہرہ کروایا جاتا۔ ان حربوں کے باوجود جاوید نے ہار نہیں مانی۔ وہ مسلسل فلم بناتے رہے۔ ''چیف صاحب'' نے کراچی کے ایک ہی سنیما نشاط میں 28 ہفتے چلنے کا نیا ریکارڈ بنایا۔ اس حوالے سے بھی سازش کی گئی کہ کسی طرح یہ فلم سلور جوبلی نہ کر سکے اور 25 ویں ہفتے سے قبل اتار لی جائے مگر جاوید کے ارادے آڑے آگئے اور سازشی اپنے مذموم مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

آپ یقیناً یہ جاننا چاہیں گے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ لاہور میں جاوید کے خلاف ایک لابی محاذ آرائی پر اتر آئی؟ آپ کی طرح مجھے بھی اس بات کی جستجو تھی۔ میں نے اس سلسلے

میں اپنے کھوجی آزمائے تو مجھے چند باتوں کا اندازہ ہوا۔ جاوید شیخ نے ”کبھی الوداع نہ کہنا“ کے بعد جس تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کی تھیں، ان سے فلم میکرز کا طبقہ تو ان سے فائدہ اٹھاتا رہا مگر جن اداکاروں کو اس کے اس عروج سے دھچکا لگا وہ اندر ہی اندر اس کے دشمن بنتے گئے۔ اس کی یہ فنی اچھائی بھی کچھ لوگوں کو بری لگی کہ وہ عوامی طور پر ہر ہیروئن کے ساتھ پسند کیا گیا۔ اس بات نے بھی اس کی رقابت میں کچھ ہیروز کو جلنے پر مجبور کیا پھر جب وہ بھرا میلہ چھوڑ کر سلمیٰ آغا کے چکر میں ممبئی چلا گیا۔ تو اسے تمام افراد نے کھل کر اس کی مخالفت کی آگ بھڑکائی۔ جاوید کے خلاف ہر ممکن طرح پر منفی اقدام کیا۔ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو جی بھر کر ورغلایا کہ جاوید ایک مفاد پرست اداکار ہے۔ اسے پاکستانی فلموں اور فلم انڈسٹری کی بہتری اور بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ جب وہ کراچی کے ٹی وی ڈراموں میں کام کر رہا تھا اس وقت بھی اس نے دبئی میں بننے والی فلم ”دوسرا کنارا“ کا ہیرو بننے کے لیے ڈراما پروڈیوسروں کو اسی طرح نقصان پہنچایا تھا۔ وہ سراپا مفاد پرست ہے جو بھی اس پر بھروسا کرے گا وہ اسے اسی طرح نقصان پہنچائے گا۔ وہ قابل بھروسا شخصیت کا مالک نہیں۔ پھر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ بمبئی میں جاوید کی بات نہیں بنی اور تھوڑے ہی دنوں بعد وہ لاہور واپس آ گیا۔ مخالفین نے اس کے خلاف جو آگ بھڑکائی تھی اس کی چنگاریاں ایک بار پھر سلگ اٹھیں۔ کچھ دنوں تک وہ بائی کاٹ کا شکار رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے لیے بند دروازے کھلوانے میں وہ کامیاب ہوتا گیا۔ برے سے برے وقت میں وہ ہمت نہیں ہارا جس سے سازشی ٹولے کو ایک بار پھر سرگرم کر دیا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جاوید سے غلطیاں سرزد ہوئیں۔ جن باتوں کو بنیاد بنا کر مخالفین نے ان کے خلاف محاذ آرائی کی ان کے مرتکب ہونے کی وجہ سے ہی یہ صورت حال پیدا ہوئی مگر ہر بات کی وجہ ہوتی ہے۔ جاوید نے کبھی بھی ندیم کی طرح سوچ سمجھ کر کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ وہ بے چین طبیعت کے مالک ہیں۔ اپنے فنی سفر کے ابتدائی دنوں میں انہیں جن صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا اس نے انہیں بے صبرا بنا دیا۔ ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کے حصول کے لیے لپکے۔ لمحہ بھر ٹھہر کر یہ نہیں سوچا کہ اس کے لیے بھاگنے دوڑنے سے فائدہ ہوگا یا نقصان؟ کبھی کبھی حالات

ایک یادگار واقعہ

کبھی کبھی فنکاروں کے ساتھ کچھ غیر معمولی واقعات پیش آتے ہیں۔ ایسے حالات میں بھی انہیں اپنی فنی ذمہ داریاں نبھانی پڑتی ہیں۔ جاوید شیخ کے ساتھ بھی ایسے کئی واقعات پیش آئے جن میں سے ایک خاص واقعہ کا ذکر خود ان کی زبانی سنیے۔ ”نذر شباب نے اپنی فلم ”کبھی الوداع نہ کہنا“ میں مجھے شبنم اور سری لنکن اداکارہ سبیتا کے شوہر کا چیلنجنگ رول دیا تھا۔ اس فلم کا کلائمکس فلمایا جانے والا تھا۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں کہ اچانک میری والدہ کا راولپنڈی میں انتقال ہو گیا۔ لہٰذا نذر شباب سے خصوصی اجازت لے کر مجھے تجہیز و تکفین کے لیے پنڈی جانا پڑا۔ جاتے وقت میں نے ہدایت کار سے وعدہ کیا کہ میں دو دن بعد واپس آ جاؤں گا۔ کیونکہ ہمارا سیٹ مکمل تھا اور فلم کو عیدالفطر کے موقع پر ریلیز ہونا تھا۔ میں والدہ کی تدفین کے فوراً بعد حسب وعدہ واپس لاہور آ گیا اور سیٹ پر آ کر فلم کے کلائمکس مناظر عکس بند کرایا۔ یہ میرے لیے بے حد آزمائشی مرحلہ تھا۔ دل و دماغ پر غم و الم کے اتھاہ بادل چھائے ہوئے تھے مگر مجھے اسکرپٹ کے مطابق سین پکچرائز کروانا پڑا۔“

اور واقعات انسان کو ایسے ہی راستے پر گامزن کر دیتے ہیں۔

ان باتوں کے باوجود جاوید کے سینے میں ایک درد مند دل ہے اور اس دل سے مجبور ہو کر وہ دوسروں کو فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں۔ سلمیٰ آغا نے ان کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا مگر علیحدگی سے پہلے تک وہ سلمیٰ کے کام آتے رہے۔ اسی طرح جب نیلی کا ”ڈاؤن فال“ شروع ہوا تو اس نے آگے بڑھ کر دوستی کا حق ادا کیا۔ جاوید نے اپنی محبوبہ کو یہ احساس تک نہیں ہونے دیا کہ اس کا وقت ڈھل چکا ہے یا اس کی شہرت و مقبولیت کا سورج غروب ہو چکا ہے۔ اس سے جہاں تک ممکن ہوا اس دور میں بھی اس نے نیلی کی دلجوئی کی۔ اس کے ساتھ گزارے اچھے دنوں کا حق ادا کیا۔ پھر ایک دن اچانک نیلی کہیں غائب ہو گئی۔ نیلی کے اس طرح منظر سے پس منظر میں چلے جانے کی وجہ سے اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا ہو گیا ہے۔ وہ جیسی بھی تھی اس کی وجہ سے اسے

تنہائی کا احساس تو نہیں ہوتا تھا۔ وہ شخص جو بھیڑ میں رہ کر بھی تنہائی کا عادی رہا تھا۔ اس بار زیادہ شدت سے اکیلے پن کے احساس سے دوچار ہو گیا۔ پوری فلم انڈسٹری میں کوئی نہ تھا جو اس کا دکھ بانٹ سکتا۔ آخر کیا وجہ تھی کہ نیلی یوں اچانک جاوید شیخ کی زندگی سے اور فلم انڈسٹری سے نکل کر روپوش ہو گئی۔ کہیں گم ہو گئی۔ اس سوال کا جواب نہ اس وقت جاوید کو ملا اور نہ اسے اب تک مل سکا ہے۔

جس طرح نیلی کے ان کی زندگی میں آنے کے بعد ان کی خوش قسمتی کے سارے دروازے کھل گئے، بالکل اسی طرح نیلی کے جانے کے بعد سارے کھلے دروازے بند ہو گئے۔ ''چیف صاحب'' کے بعد جاوید شیخ کی کوئی فلم نہ چل سکی۔ ''یس باس'' نے اسے زبردست نقصان پہنچایا جس سے ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بطور ہدایت کار ان کی لگاتار تین فلمیں یس باس، مجھے جینے دو اور کہیں پیار نہ ہو جائے فلاپ ہو گئیں۔ ان کے ریگولر پروڈیوسرز ایونیو والے سجاد گل، لکی ایرانی سرکس والے میاں فرزند علی اور ایور ریڈی پکچرز کے ستیش چند آنند تھے۔ تینوں بڑی پارٹیاں جاوید شیخ سے مایوس اور ناراض ہو گئیں۔ ان حالات میں جاوید کے پاس اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ غیر معیاری فلموں میں کمزور کردار قبول کر کے اپنا کچن چلائیں۔

ایک طرف مالی مشکلات، قرضوں کا بوجھ تو دوسری طرف میڈیا کی تند و تیز تنقید نے انہیں ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیا۔ افسوس کہ ان حالات میں بھی جاوید کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ایسے حالات میں انہیں کسی غم گسار کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ جب کہ وہ تنہا تھے۔ ان مصائب سے لڑنے کے لیے ان کا کوئی سنگی ساتھی نہ تھا۔ مخلص دوستوں امجد بوبی، اسماعیل تارا، بہروز سبزواری کی قربت کے باوجود جاوید کی زندگی میں ایک خلا موجود تھا جس کی خلش انہیں زیادہ تکلیف دے رہی تھی۔ انہی دنوں ثناء ان کی زندگی میں آئی۔ دونوں ایک فلم ''مجھے جینے دو'' میں کام کر چکے تھے لیکن اس وقت تک ثناء، جاوید کے لیے محض ایک ساتھی اداکارہ تھی۔ جاوید شیخ اور ثناء کی قربت دراصل ''یہ دل آپ کا ہوا'' کی شوٹنگ کے دوران قائم ہوئی اور پھر سات برس تک دونوں خاموشی کے ساتھ اس پیار کے رشتے کو نبھاتے رہے مگر کبھی اس تعلق کا اقرار نہیں کیا۔ اس ریلیشن شپ کی اصل کہانی اس وقت سامنے آئی جب ثناء نے اچانک جاوید شیخ سے ہر تعلق توڑتے ہوئے ایک اسمال ٹائم ایکٹر فخر امام سے پہلے منگنی اور پھر شادی کا اعلان کیا۔

جو لوگ جاوید شیخ کو جانتے ہیں۔ پہچانتے ہیں وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ جسے چاہتے ہیں، ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ چاہے وہ ان کے دوست ہوں یا وہ عورتیں جو مختلف ادوار میں ان کی زندگی میں آئیں۔ جاوید محبت کے معاملے میں ہمیشہ انتہا پسند ثابت ہوئے۔ ثناء کے معاملے میں بھی ان کی یہی انتہا پسندی قائم رہی۔ یہی وجہ تھی کہ ثناء کی بے وفائی کا اس قدر شدید صدمہ ہوا کہ انہیں دل کے دورے پڑنے لگے۔ جس کے نتیجے میں انہیں اسپتال جانا پڑا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی خبر نہیں تھی۔ میڈیا کے ذریعے ایک عالم کو معلوم ہو چکا تھا کہ جاوید شیخ پر دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ ان کی تیمارداری کے لیے بہت سے لوگ آئے مگر ''وہ بے وفا'' نہیں آئی جس کے لیے ان کی نگاہیں راہ دیکھ رہی تھیں۔

اس بار بھی ان کی سخت جانی کام آئی اور وہ کچھ دنوں کے علاج کے بعد صحت یاب ہو کر گھر واپس آ گئے۔ ایک بار پھر زندہ رہنے کے لیے روزگار کی ضرورت محسوس ہوئی مگر اب صورتِ حال یہ تھی کہ نہ کوئی فلم میکر انہیں اپنی فلم میں کاسٹ کر رہا تھا نہ پی ٹی وی والوں کی طرف سے بلاوا آ رہا تھا۔ لہٰذا وہ اسٹیج ڈرامے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جاوید برسوں بعد اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ امان اللہ ڈرامے کے ہیرو تھے۔ کھیل اچھا گیا۔ جاوید کو پیسے بھی ٹھیک ٹھاک ملے مگر میڈیا والوں کو ان پر تنقید کرنے کا ایک موقع مل گیا۔ انہوں نے نہ یہ دیکھا نہ سوچا کہ جاوید اسٹیج پر کیوں پرفارم کرنے پر مجبور ہوئے۔ وہ غریب تو اپنے برے وقت کو ٹالنے کے لیے یہ کر رہے تھے۔ ابھی ایک فلم ''یہ دل آپ کا ہوا'' کا ذکر آیا تھا۔ اس فلم کے نزول کی بھی ایک کہانی ہے۔ ایک دن اچانک جاوید کی ملاقات ان کے ایک دیرینہ دوست اکبر خان سے ہو گئی۔ دونوں وفورِ جذبات سے لپٹ گئے۔ علیحدہ ہوئے تو اکبر خان بولے۔ ''ارے یار جاوید خان! تو کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟''

جاوید نے اسے گھور کر دیکھا اور دل ہی دل میں بولا۔ ''اتنے دنوں بعد ملنے والے دوست کو اپنا حال احوال بتا دوں گا تو کیا اسے دکھ نہیں ہوگا؟''

اسے سوچتا ہوا دیکھ کر اکبر خان بولا۔ ''بتاتا کیوں نہیں؟''

''کیا بتاؤں اکبر خاناں! بس ٹھیک ہوں۔''

''نہیں تو ٹھیک نہیں ہے۔ تیری حالت سے تو لگتا نہیں کہ تو ٹھیک ہے۔ سچ سچ بتا دے۔ ورنہ میں روٹھ جاؤں گا مجھے دکھ ہوگا۔''

اب جاوید نے نہایت اختصار کے ساتھ اپنی دکھ بھری کہانی سنادی۔

''یہ جان کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور دکھ بھی ہوا کہ تو نے شوبزنس میں اتنا نام بھی کمایا۔ شہرت بھی حاصل کی۔ اس بات پر بڑی خوشی حاصل ہوئی مگر دکھ اس بات کا ہوا کہ آج کل تیرا حال بہت پتلا ہے۔''

جاوید نے اکبر خان کی بات سن کر کوئی جواب نہیں دیا۔ کہتا بھی کیا۔ ہوا وہی جس کا اسے اندیشہ تھا۔ اکبر خان روداد غم سن کر دکھی ہوگیا۔

''جاوید خاناں! تیرے یار اکبر خان کے ہوتے ہوئے اب تجھے کسی غم کسی فکر کی ضرورت نہیں۔ تو پھر فلم بنا میں تجھے پیسے دوں گا۔''

جاوید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اکبر خان نے مسکرا کر کہا۔ ''اب میں وہ پھٹیچر اکبر خان نہیں ہوں۔ بہت بڑا بزنس مین ہوں۔ میں یورپ میں آئل کا بزنس کرتا ہوں۔ مولانا کی مہربانی سے میرے پاس بہت پیسا ہے۔ روپیا نہیں ڈالر ہے۔ اپنی دولت سے اگر اپنے یار کا مددگار نہیں ہوا تو مر کر مولا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

ذرا دیر تک تو جاوید کو اپنی ساعت پر یقین نہیں آیا کہ اگلا کیا کہہ رہا ہے۔

''بجٹ کی کوئی پرواہ نہ کرنا۔'' اکبر خان بولا۔ ''بس فلم ایسا ہو کہ انڈین فلموں کی ٹکر کا ہو۔''

جاوید شیخ جیسا اداکار و ہدایت کار جو اب تک پانچ فلمیں ڈائریکٹ کر چکا تھا۔ ان دنوں اس قدر مالی بحران کا شکار تھا کہ جب اکبر خان نے اسے پانچ لاکھ کا ایک چیک دے کر کہا۔ ''یہ ایڈوانس کا رقم ہے۔ تم ایک دم فلم کا تیاری شروع کر دو۔ پیسے کا فکر مت کرو۔ دل کھول کر خرچ کرو۔ کامیابی کی گرانٹی کے لیے اگر دل چاہے تو بولی وڈ کے گنگ خان، شاہ رخ خان کو بھی کاسٹ میں شامل کر لو۔''

اتنا تگڑا پروڈیوسر پا کر جاوید کی خوشیوں کی انتہا نہیں تھی۔ بغیر کسی تاخیر کے ''یہ دل آپ کا ہوا'' کی تیاری شروع کر دی۔ جاوید اپنی فلموں کے نام عموماً کہانی لکھنے سے پہلے ہی ڈیسائیڈ کر لیتے ہیں۔ ''یہ دل آپ کا ہوا'' جیسا رومانوی نام کہانی لکھنے سے پہلے رکھ لیا گیا اور اس نام کے خالق ریاض الرحمٰن ساغر تھے جو نامور نغمہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر تھے۔

''یہ دل آپ کا ہوا'' کی ابتدائی کاسٹ میں شاہ رخ خان کا نام بھی شامل تھا مگر ان کی مصروفیات اور عدم دلچسپی کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ پاکستانی اسٹارز ہی سے کام لیا جائے۔ لہٰذا کلیدی کرداروں کے لیے سلیم شیخ، معمر رانا اور ثناء کا انتخاب کیا گیا۔ ثناء کے لیے یہ ایک زبردست بریک تھرو ثابت ہوا۔ واضح رہے کہ ''یہ دل آپ کا ہوا'' سے پہلے چھ سالہ کیریئر میں ثناء کے کریڈٹ میں ''سنگم'' کے علاوہ کوئی قابل ذکر فلم نہیں تھی۔ ''یہ دل آپ کا ہوا'' کے بعد بھی وہ بکواس قسم کی فلموں میں اپنا امیج برباد کرتی رہی۔ جس کے بعد جاوید شیخ ہی نے اسے اپنی اگلی فلم ''کھلے آسمان کے نیچے'' میں اسے باوقار انداز میں پیش کیا۔ درحقیقت ثناء کا کیریئر جاوید کی ڈائریکشن میں بننے والی انہی دو فلموں پر انحصار کرتا ہے۔

فلم کی سیکنڈ ہیروئن کے لیے نور، زارا شیخ اور سارا چوہدری کے ناموں پر غور کیا گیا مگر قرعہ فال وینا ملک کے نام نکلا۔ اس وقت تک کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ یہ فلم اتنی بڑی اور ہٹ ثابت ہوگی۔ جاوید شیخ کو ایک تگڑا پروڈیوسر مل گیا تھا جو اس فلم پر پانچ کروڑ کی سرمایہ کاری کرنے پر رضا مند ہوگیا تھا لیکن فلم انڈسٹری میں جاوید شیخ کے مخالفین سے اس کی یہ کامیابی ہضم نہیں ہوئی کہ ایک ناکام ہدایت کار کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ فلم انڈسٹری کے حلقے اپنے ایک ساتھی کی کامیابی اور کوشش میں اس کا حوصلہ بڑھانے کی بجائے جاوید کی مسلسل حوصلہ شکنی کر رہے تھے۔ یہ کہا جانے لگا کہ پانچ کروڑ روپے کی فلم بنانے کا فیصلہ ہی احمقانہ ہے۔ کیونکہ پاکستان میں سینما کا سرکٹ محدود ہے۔ اس لیے اس سرمائے کی واپسی ممکن نہیں ہے لیکن یہ لوگ جاوید کے عزم اور ارادوں سے واقف نہیں تھے۔

''یہ دل آپ کا ہوا'' کی شوٹنگ اسپین اور سوئٹزرلینڈ میں ہونا تھی مگر جب فلم کے یونٹ کے پاسپورٹس ویزوں کے حصول کے لیے مذکورہ سفارت خانوں میں درخواست جمع کرائے گئے تو اسپیشل امیگریشن حکام کی جانب سے جاوید شیخ کے یونٹ کو ویزے دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا گیا کہ انہیں جاوید شیخ کے خلاف ایک درخواست موصول ہوئی ہے جس میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس یونٹ کی آڑ میں انسانی

اسمگلنگ جیسا گھناؤنا جرم عمل میں لایا جا رہا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ اسپین میں شوٹنگ کے تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے تھے۔ جاوید کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس کے مخالفین اسے اس کی کوششوں میں ناکام کرنے کے لیے ایسی مذموم حرکت کریں گے۔ وہ اس صورتِ حال پر پریشان تو ہوئے مگر حوصلہ نہیں ہارا اور اپنے ایک دوست کے توسط سے اسپین کے سفارت کاروں سے ملاقات کی اور ان سے اپنا کیس ڈسکس کیا اور یقین دلایا کہ ان کے کچھ دشمنوں نے ان کے خلاف غلط الزام لگایا ہے۔ آپ میرا ریکارڈ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ میں شوبز سے تعلق رکھنے والا ایک اداکار، فلم ساز اور ہدایت کار ہوں اور کسی غلط کام سے کبھی میرا تعلق نہیں رہا ہے۔ بڑی مشکلوں سے وہ سفارتی عملے کو رضا مند کرنے میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے ”یہ دل آپ کا ہوا“ کے پاکستانی یونٹ کو اسپین میں داخلے اور شوٹنگ کی اجازت دی۔

جاوید شیخ کے ساتھ جانے والے فنکاروں میں سے بھی کچھ نے انہیں شوٹنگ کے دوران بہت تنگ کیا جس کا اظہار جاوید نے واپس آنے کے بعد کیا کہ بابر علی اور معمر رانا نے شوٹنگ کے دوران مجھ سے تعاون کرنے کی بجائے جی بھر کر پریشان کیا پھر اس فلم کی نمائش سے پہلے اس کی تشہیری مہم کے موقع پر بھی غائب رہے۔

”یہ دل آپ کا ہوا“ جاوید شیخ کی بہت بڑی فلم تھی مگر اس کی تکمیل میں جو رکاوٹیں اور دشواریاں قدم قدم پر پیش آئیں۔ جاوید شیخ کا دل ہی جانتا ہے وہ کس قدر تکلیف دہ تھیں۔ اسپین میں جاوید شیخ کا یونٹ پاکستان کی مہنگی ترین اور پہلی DTS فلم بنانے کے لیے فنکاروں کا منتظر تھا اور دوسری طرف بابر علی اور معمر رانا بے فکری سے لاہور کے پروڈیوسروں کی فلمیں مکمل کرانے میں مصروف تھے۔ اس فلم کی کہانی لکھنے کے لیے چار فلم رائٹروں کو ذمے داری دی گئی تھی، یہ رشید ساجد، تنویر کاظمی، ایوب خاور اور آغا حسن امتثال تھے۔ انہوں نے اپنے اسکرپٹ مکمل کر کے جمع کرائے مگر جاوید کو ان میں سے کسی کا اسکرپٹ پسند نہیں آیا جس کے بعد بابر کاشمیری کی لکھی کہانی جاوید کے علاوہ پروڈیوسر اکبر خان کو بھی اچھی لگی۔ جس پر کام شروع ہوا۔ پروڈیوسر کی خواہش تھی کہ اس فلم کے گانے بھارتی نغمہ نگار جاوید اختر سے لکھوائے جائیں۔ ان سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے لکھ دوں گا۔“

اچھی خاصی ایڈوانس ادائیگی کے باوجود جاوید اختر نے گانے لکھنے میں کئی مہینے لگا دیے۔ اگرچہ رقم کی ادائیگی کے لیے جاوید اختر نے نیویارک میں فارن کرنسی اکاؤنٹ میں رقم وصول کی لیکن جب کئی مہینوں کے بعد بھی گیت لکھ کر نہیں دیے اور جاوید شیخ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے پروڈیوسر کی مرضی کے خلاف جاوید اختر کی جگہ ندا فاضلی سے گانے لکھوا لیے۔ اس پر اکبر خان کئی ہفتوں تک جاوید شیخ سے ناراض رہے لیکن جب پروڈیوسر نے ندا فاضلی کے لکھے گانوں کی ریکارڈنگ سنی تو انہیں بھی پسند آئی اور انہوں نے کہا۔

”اچھے ہیں، تم نے اس نخریلے جاوید اختر سے پیچھا چھڑا کر اچھا کیا۔“

”اگرچہ ہم ان کا منہ مانگا معاوضہ دینے پر تیار تھے۔“ جاوید نے کہا۔ ”اس کے باوجود انہوں نے وعدہ خلافی کی اور ہمیں خواہ مخواہ انتظار کی سولی پر لٹکائے رکھا۔“

بھارتی ماہر رقص سروج خان نے ”یہ دل آپ کا ہوا“ کے گانوں کی کوریوگرافی کی تھی۔ سروج خان اگرچہ اس سے پہلے شہزاد گل، ریما خان اور شہزاد رفیق کی فلموں کے گانوں کی کوریوگرافی کر چکی تھیں۔ لیکن اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا۔ ”جاوید شیخ پاکستان کا بہترین پروفیشنل ڈائریکٹر ہے۔“

پروڈیوسر اکبر خان نے دل کھول کر اس فلم میں سرمایہ کاری کی تو جاوید شیخ نے بھی بے شمار رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود اپنی بہترین فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور ہر طرح سے ”یہ دل آپ کا ہوا“ کو ایک کامیاب فلم بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف پاکستانی سنیما گھروں میں اس نے کامیابی کا جھنڈا لہرایا بلکہ کئی بیرونی ممالک میں بھی بھارتی فلموں کے مدمقابل زبردست بزنس کیا۔ خصوصاً برطانیہ میں اس فلم نے بے حد کامیابی حاصل کی اور باکس آفس پر زبردست بزنس کیا۔

اس فلم کی تکمیل کے دوران جہاں جاوید شیخ بہت پریشان ہوئے وہاں ان کی رومانی طبیعت نے بھی بڑی انگڑائی لی۔ ان کے معاشی حالات بہتر ہوئے تو وہ عشق و محبت کی وادیوں کے پھیرے بھی لگانے لگے۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران انہیں فلم کی ہیروئن ثناء سے قریب آنے کا موقع ملا تو اس کی چاہت میں آہستہ آہستہ کھونے لگے۔ ثناء نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا۔ ان کی محبت کا جواب اپنے پیار

سے دیا۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے عہد و پیمان ہوئے اور وہ فاصلے جو صدیوں میں طے ہوتے ہیں لمحوں میں سمٹ آئے۔ یہ بڑا انوکھا رشتہ تھا۔ ایک جواں سال اداکارہ اور عمر کی چھٹی دہائی میں داخل ہدایت کار کے درمیان قائم ہونے والا یہ پیار کا رشتہ بے حد خاموشی سے پروان چڑھا۔ پھر جب میڈیا تک یہ رومانی کہانی پہنچی تو جاوید یا ثناء نے اس تعلق کی تردید بھی مناسب نہ سمجھی جس سے یہ واضح ہوگیا کہ ثناء پوری طرح فلم انڈسٹری کے بگ شو مین کے سحر میں جکڑی جا چکی ہے لیکن پھر جانے کیا ہوا کہ جو فاصلہ طے کرنے میں دونوں نے لمحے بھی نہ لگائے تھے اتنی ہی تیزی سے بے وفا ثناء جاوید کی زندگی سے دور ہو کر کسی اور کی بانہوں میں سما گئی۔

''یہ دل آپ کا ہوا'' کے فوراً بعد جاوید نے اپنی اگلی فلم ''کھلے آسمان کے نیچے'' بنانے کا اعلان کردیا جس میں حسب توقع ثناء ہیروئن تھی۔ جاوید نے اپنی یہ فلم بھارت میں بنانے کا فیصلہ کیا جس کے پیچھے یقیناً یہ مقصد بھی کارفرما تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کی زیادہ سے زیادہ قربت کے خواہش مند تھے۔ اس فلم ''کھلے آسمان کے نیچے'' کے فلم ساز وہ خود تھے جس کے لیے فنانس جمع کرانے کا ٹاسک بھی تھا۔ لہٰذا بولی ووڈ میں میوزک ریکارڈنگ کے دوران انہیں جب چند بھارتی پروڈیوسرز کی جانب سے بھارتی فلموں میں کام کرنے کی آفر ہوئی تو جاوید بخوشی رضا مند ہو گئے۔ اس عرصے میں انہوں نے جان میتھم جیسے ڈائریکٹر کی ایک بڑی فلم ''شیکھر'' بھی کی جس میں انہیں امیتابھ بچن کا چھوڑا ہوا رول دیا گیا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جاوید شیخ بولی ووڈ کے لیے کوئی اجنبی اداکار نہیں تھے۔ سلمیٰ آغا کے ساتھ جب وہ ممبئی آئے تھے تو فلم ساز پہلاج نہلانی اور ہدایت کار راکیش روشن نے انہیں اپنی فلم ''خون بھری مانگ'' میں کاسٹ کیا تھا مگر سلمیٰ آغا نے انہیں اس فلم میں کام کرنے نہیں دیا اور وہ معذرت کر کے لاہور لوٹ گئے تھے۔

جاوید شیخ ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے اداکار تھے۔ انہوں نے ''شیکھر'' میں اپنی پرفارمنس سے متاثر کیا تو دوسرے بھارتی فلم میکرز نے بھی ان کی خدمات حاصل کرنا شروع کردیں جو دوسری فلمیں انہیں ملیں ان میں جان من، نمستے لندن، جنت، منی ہے تو ہنی ہے، مائی نیم از انتھونی گونزالوس ہیں۔ لیکن جاوید شیخ کی وہاں سب سے اہم فلم شاہ رخ خان کے ساتھ ''اوم شانتی اوم'' ثابت ہوئی۔ جس میں وہ شاہ رخ خان کے باپ کا کردار ادا کرتے نظر آئے۔

بھارتی فلموں میں مصروفیات کی وجہ سے جاوید کی اپنی پروڈکشن ''کھلے آسماں کے نیچے'' غیر معمولی تاخیر کا شکار ہوئی لیکن انہیں بھارت جا کر فلم بنانے سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اپنی فلم کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اسی طرح ثناء بھی کسی نقصان کی بجائے فائدے

نامعلوم افراد

''نامعلوم افراد'' جاوید شیخ کی بطور اداکار ایک ایسی فلم ہے جس کو پسندیدگی کی سند بولی ووڈ کے فلم میکرز نے بھی عطا کی ہے۔ جاوید شیخ کہتے ہیں۔ ممبئی سے ہدایت کار امتیاز علی نے فون کر کے مجھے مبارک باد دی کہ کیا فلم بنائی ہے۔ کیا کمال کام ہوا ہے اس فلم میں۔ میں نے یہ فلم دیکھی ہے۔ اس لیے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ سنی سنائی نہیں۔ آنکھوں دیکھی ہے۔ تمہاری اداکاری بھی بلندی پر ہے۔ نشاط اور ایٹریم سینماؤں کے روح رواں نواب حسن صدیقی کا کہنا ہے۔ ہدایت کار نبیل قریشی کی فلم نامعلوم افراد 2014ء کا ایک بڑا کارنامہ ہے جس نے اپنی نمائش کے دوران بھارتی فلموں کا جنازہ نکال دیا۔ اس کے تمام شعبوں کی کارکردگی کا معیار بہت بلند ہے۔ جاوید شیخ کی اداکاری اس فلم میں عروج پر ہے۔

جاوید شیخ کی ذاتی فلمیں

''مشکل'' ریلیز 1995ء، ہدایت کار... جاوید شیخ، باکس آفس پر اوسط درجے کی رہی۔ ''چیف صاحب'' ریلیز 1996ء ہدایات جاوید شیخ، باکس آفس پر کامیاب فلم۔ ''یس باس'' ریلیز 1997ء ہدایات جاوید شیخ، باکس آفس پر اوسط درجے کی رہی۔ ''مجھے جینے دو'' ریلیز 1999ء ہدایت کار جاوید شیخ، باکس آفس پر فلاپ۔ ''یہ دل آپ کا ہوا'' ریلیز 2002ء ہدایت کار جاوید شیخ، باکس آفس پر کامیاب رہی۔ ''کھلے آسمان کے نیچے'' ریلیز 2008ء ہدایت کار جاوید شیخ، باکس آفس پر فلاپ فلم۔

میں رہی۔ جاوید کی فلم ''کھلے آسمان کے نیچے'' کی تکمیل کے دوران اسے جاوید کی سفارش سے دو بھارتی فلموں میں مرکزی نوعیت کے کردار مل گئے۔ جن میں سے ایک فلم سنی دیول کے ساتھ ''قافلہ'' تھی جو مکمل ہوکر ریلیز ہوگئی جب کہ جاوید شیخ کے ساتھ دبئی میں فلمائی جانے والی فلم ''ستم'' حالات کا شکار ہوکر مکمل نہ ہوسکی۔

''کھلے آسمان کے نیچے'' جاوید کی فلم ان کی خواہش کے مطابق بھارتی لوکیشن میں تیار ہوئی لیکن ان کی خواہش کے مطابق کامیاب نہ ہوسکی۔ ان کے توقعات پر پوری نہ اتری۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جاوید کی بھارتی فلموں میں مصروفیات نے اس کی تکمیل میں غیر معمولی تاخیر کردی تھی۔ اکثر دیر سے مکمل کی جانے والی فلمیں ناکام ہوجاتی ہیں۔ فلموں کی کیمسٹری یہ ہے کہ جتنی جلدی مکمل ہوکر ریلیز ہو اس کے حق میں اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

''کھلے آسمان کے نیچے'' کی باکس آفس پر ناکامی سے جاوید کو بہت بڑا دھچکا لگا۔ انہوں نے اس فلم میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس فلم کی ناکامی کے ساتھ کچھ اور ''حادثے'' بھی پے در پے رونما ہوئے۔ جن کی وجہ سے یقیناً وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کے شکار ہو گئے ہوں گے مگر.....مگر وہ جاوید شیخ ہی کیا جو بحرانوں اور حادثوں سے شکست کھا جائے۔ یہ مرد بحران ابتدا ہی سے تند و تیز مخالف ہواؤں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتا رہا ہے۔ بدترین حالات میں بھی وہ حوصلہ نہیں ہارا۔ اس بڑی ناکامی کے موقع پر بھی ثابت قدم رہا اور آج بھی اپنی اسی ثابت قدمی کی وجہ سے اپنی جگہ ایک چٹان کی طرح ڈٹا ہوا ہے۔

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ حالات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ والد محترم شیخ رحمت اللہ صاحب کے انتقال پر ملال کے بعد ان پر اپنے بھائی بہنوں کی ذمہ داریاں بھی آئیں تو انہوں نے ایک شفیق بھائی کی حیثیت سے ہر ممکن طریقے پر ان کے لیے شجر سایہ کا کردار ادا کیا۔ جاوید شیخ ایک اچھے اداکار ہی نہیں بہت اچھے ساتھی اور دوست بھی ہیں۔ وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ جس طرح خلوص و محبت کا برتاؤ کرتے ہیں اسی طرح اپنے بھائی بہنوں کے لیے بھی خلوص و محبت کا پیکر ہیں۔ اپنی بہن سفینہ، بہنوئی بہروز سبزواری اور بھائیوں ناصر، سلیم، ظفر اور طارق شیخ سے بھی بے پناہ پیار کرتے ہیں۔ جاوید شیخ نے کبھی اپنے بھائی بہنوں کو احساس ہونے نہیں دیا کہ ان کے والد دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے بھی غافل نہیں رہے اور بھائی بہنوں کی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برا ہوتے رہے۔

آج جاوید شیخ کا گھرانا فنکار گھرانا کہلاتا ہے۔ وہ اپنے خاندان کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے شوبز کی دنیا میں قدم رکھا تھا جس پر انہیں والد کی طرف سے بڑی سختی کی گئی کہ وہ اس چکر میں نہ پڑیں۔ اس دور میں شرفا اس شعبے اور اسے اپنانے والوں کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ جناب شیخ رحمت اللہ نے جہاں تک ان سے ممکن ہوا اپنے پتر کو روکنے کی کوشش کی مگر اللہ ان کے درجات کو بلند کرے وہ اپنی جہد مسلسل میں کامیاب نہ ہو سکے۔ باپ کی سختی، مار دھاڑ، پیار محبت، ہر طریقہ کار کے باوجود وہ اپنی دھن میں لگے رہے اور اس جنونی لگن کے سلسلے میں بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اگرچہ اس کامیابی میں انہیں ایک طویل عرصہ لگا مگر دھن کے پکے جاوید اقبال نے جاوید شیخ بن کر شوبز کی دنیا میں اپنا ایک ممتاز مقام حاصل کرلیا۔

شوبز کی دنیا میں قدم جمانے کے بعد انہوں نے دوسرا انقلابی کارنامہ یہ انجام دیا کہ شوبز کی دنیا سے ہی اپنے لیے اپنی پہلی شریک حیات کا انتخاب کیا۔ یہ ماڈل اور اداکارہ زینت منگھی تھی۔ اس موقع پر بھی گھر کے تمام لوگوں کی مخالفت کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور زینت منگھی کو اپنے والدین کی بہو بنا کر ان کے گھر کی زینت بنایا۔ ان کی پسند کی اس شادی کے نتیجے میں مومل شیخ اور شہزاد شیخ نے جنم لیا۔ آج مومل شیخ اور شہزاد شیخ ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں اور فنکار کی حیثیت سے شوبز میں اپنے آپ کو منوا چکے ہیں۔ مومل شیخ نے فلموں کے علاوہ ٹی وی ڈراموں، ماڈلنگ اور اینکر پرسن کے طور پر نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ ان کے مشہور ٹی وی ڈرامے می رقصم، میرے جیون ساتھی، بھابی، عینی کی آئے گی بارات اور سوتیلی ماں شامل ہیں۔ جب کہ مومل نے اپنے والد جاوید شیخ کے ساتھ ایک بھارتی فلم میں بھی اہم کردار ادا کیا جو بوجوہ پاکستان میں ریلیز نہ کی جاسکی۔ علاوہ ازیں پاکستانی فلم ''میں ہوں شاہد آفریدی'' میں بھی ان کی پرفارمنس کو سراہا گیا۔

شہزاد شیخ نے بھی اپنے بڑے فنکار باپ کے حوالے سے شوبز میں اپنا فنی بھرم برقرار رکھا ہے۔

جاوید شیخ کے بھائی سلیم شیخ بھی ٹی وی اور فلم کی دنیا

میں اپنی فنکارانہ حیثیت منوا چکے ہیں۔ انہوں نے ٹی وی ڈراموں سے اپنی فنی کیریئر کا آغاز کیا۔ ان کی مشہور سیریل میں "دکھ سکھ اور راہیں" قابلِ ذکر ہے۔ جب فلموں میں قسم، ایک اور لو اسٹوری، چیف صاحب، یہ دل آپ کا ہوا، کھلے آسمان کے نیچے وغیرہ شامل ہیں۔ سلیم شیخ کی بھی دو بیٹیاں ہیں۔ ابھی تک وہ شوبز کی طرف نہیں آئی ہیں۔

بہروز سبزواری کا نام ٹی وی کے حوالے سے بہت مشہور ہے۔ وہ بچپن ہی سے ٹی وی پر کام کررہے ہیں۔ ان کی پہلی ڈراما سیریل "خدا کی بستی" تھی۔ بہروز ٹی وی کے زمانے سے ہی جاوید شیخ کے دوست تھے۔ دونوں کے درمیان گھریلو مراسم بھی تھے۔ اس دوستی کے ذریعے ایک نیا رشتہ بھی قائم ہوگیا۔ جاوید کی بہن سفینہ سے بہروز سبزواری کی شادی ہوگئی اور اس طرح وہ جاوید کے بہنوئی بن کر ان کے فنکار گھرانے کا بھی ممبر بن گئے۔ سفینہ نے بھی شوبز میں قدم رکھا اور کئی ٹی وی شوز میں نمودار ہوچکی ہیں جب کہ جاوید شیخ کی فلم "یہ دل آپ کا ہوا" میں بطور ڈریس ڈیزائنر بھی اپنے فن کا جوہر دکھا چکی ہیں۔

بہروز سبزواری اور سفینہ کا بیٹا شہروز سبزواری نے بچپن ہی سے اداکاری کے شعبے میں قدم رکھ دیا تھا۔ اس نے کئی کمرشل بھی کیے ہیں۔ "تنہائیاں" ڈراما سیریل کا سیکوئل بنا تو بہروز سبزواری اور شہروز سبزواری نے اس میں باپ بیٹے کا کردار ادا کیا۔ شہروز، جاوید شیخ کے فنکار بھانجے ہیں۔ حال ہی میں سید نور کی تازہ ترین فلم "چین آئے نہ" میں شہروز نے کلیدی کردار ادا کیا ہے جسے بہت پسند کیا گیا ہے۔ ڈراما سیریل "تنہائیاں" کے سیکوئل میں جس لڑکی نے شہروز کی منگیتر کا کردار ادا کیا وہ سائرہ یوسف تھی۔ اسی ڈرامے کی تکمیل کے دوران یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے اور ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ سائرہ یوسف، سائرہ شہروز سبزواری بن گئیں۔ یوں وہ بھی اس فنکار گھرانے سے وابستہ ہوگئیں۔ سائرہ کی ڈراما سیریلز میں "میرا نصیب" پہلی سیریل تھی جب کہ یہی اہم سیریل بھی تھی۔ ڈراما سیریل "درمیان" بھی ایک کامیاب سیریل تھی جس میں عدنان صدیقی اور ثانیہ سعید نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔

آج جاوید شیخ اپنی فنکار فیملی میں بہت خوش ہیں۔ سلمٰی آغا اور نیلی ان کی زندگی سے نکل چکی ہیں مگر زینت منگھی مومل شیخ اور شہزاد شیخ کی ماں کی حیثیت سے جاوید شیخ سے علیحدگی کے بعد بھی جڑی ہوئی ہیں۔ آج زینت نہ

جنجوعہ

جنجوعہ کے صدر مقامات مشرقی کوہستان نمک ہیں لیکن وہ سارے ملتان و ڈیرہ جات ڈویژنوں کے اندر تھوڑی بہت تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ جنرل کننگھم کی رائے میں وہ ہوشیار پور میں آریائی ہیں جو انوان، اعوان یا انو کے بیٹوں کی ایک شاخ ہیں۔ ان کے نام کے پہلے حصے میں جج ہے راولپنڈی میں ایک علاقہ پچ کو دریائے سندھ پر ہنڈ کے پرانے بادشاہوں سے جوڑتا ہے، جو پچ یا جج نام کے حامل تھے۔ مسٹر گریفن اس خیال پر راغب نظر آتے ہیں کہ وہ یادو بنسی راجپوتوں کی شاخ ہیں جس کی نمائندگی مرکزی طور پر اب بھٹی میں ہوتی ہے۔ بھٹی کشمیر میں پنجاب پر اسلامی غلبے تک آباد تھے۔ ابوالفضل بھی انہیں یادو ماخذ کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ جب کہ ان کا اپنا یہ کہنا ہے کہ وہ راجا مل راٹھور کی نسل ہیں جو تقریباً 980ء میں جودھ پور یا قنوج سے جہلم کو ہجرت کر گیا اور مالوت تعمیر کیا۔ جنجوعہ سلسلہ ہائے نسب راجا مل سے لے کر صرف 18 تا 23 پشتیں بتاتے ہوئے حیرت انگیز ہمہ گیریت ظاہر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کا ایک بیٹا "جوذ" کہلاتا تھا جو کوہستان نمک کا پرانا نام ہے۔

اقتباس: پنجاب کی ذاتیں / از: سر ڈینزل ابٹسن
مرسلہ: ندیم احسن صدیقی۔ لاہور

آرٹسٹ رہی ہیں نہ جاوید شیخ کی منکوحہ۔ وہ صرف مومل اور شہزاد کی ممتا بھری ماں ہیں جس نے ان دونوں کو جب وہ بچے تھے اور ان کا باپ ان سے دور کسی اور کے ساتھ وقت گزار رہا تھا انہیں لوریاں سنائیں۔ راجا رانی کی کہانیاں سنائیں۔ انہیں پال پوس کر بڑا کیا اور انہیں باپ کی کمی کا احساس ہونے نہیں دیا مگر ان کا حقیقی وارث ان کا باپ ہی تھا۔ جب وہ بھٹکا ہوا مسافر لوٹ کر گھر آیا تو اس کی امانت اسے سونپ دی۔ اس ماں کا درد، دردمند دل رکھنے والے ہی محسوس کرسکتے ہیں۔ وقت گزرنے کے لیے ہوتا ہے اور زخم بھرنے کے لیے۔ آج جاوید شیخ اپنی اولاد کے ساتھ ہیں اور ان کو وہ تمام خوشیاں دے چکے ہیں جو انہوں نے کسی اور کی جھولی میں ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر خوشیاں جس کے نصیب میں ہوتی ہیں اسے ہی ملتی ہیں۔

آج جاوید شیخ سے جڑا ہر رشتہ جاوید شیخ سے خوش

ہے۔ بس ایک کسک اور پچھتاوا جاوید شیخ نے زینت منگھی کے دل میں چھوڑ دیا ہے۔ کیا وہ کسک اور یادیں زینت کو بے چین نہیں کرتی ہوں گی؟ کیا ان سب رشتوں کے ساتھ یہ رشتہ پھر جڑ سکتا ہے؟ اگر ایسا ہو جائے تو کیا بات ہے۔

اس مردِ بحران کی داستان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس کی بولی ووڈ میں اڑان کی بات تفصیل کے ساتھ نہ کی جائے۔ بولی ووڈ کی فلموں میں کام کرنا، ان کی بہت پرانی خواہش ہے، بڑا دیرینہ خواب ہے۔ ان کے خوابوں کا بھی عجیب سلسلہ ہے۔ ایک وقت تھا جب وہ فلموں میں اداکاری کرنے کا خواب دیکھتے تھے۔ جب یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تو وہ سپر اسٹار بننے کا خواب دیکھنے لگے۔ جب ٹی وی اور فلموں کے سپر اسٹار بن گئے تو وہ لالی ووڈ کی فلموں کی طرح بولی ووڈ کی فلموں کے خواب دیکھنے لگے۔ ایک خواب کی تعبیر سے دوسرے خواب کی کامیابی تک بہت رگڑے ملے مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ممبئی کی فلموں میں کام کرنے کی للک میں انہوں نے سلمیٰ آغا کا سہارا لیا۔ اس کوشش میں جو دو چار ہاتھ جب لب بام رہ گیا تو سلمیٰ آغا نے ان کی وہ کمند ہی کاٹ دی جس کے سہارے وہ لب بام پہنچنے ہی والے تھے۔ پھر ایک عالم کے ساتھ سلمیٰ آغا نے بھی دیکھا کہ اس پنجرے کے پنچھی نے کیسے اس پنجرے سے باہر آ کر انڈین فلم ''شیکھر'' میں سپر اسٹار زاجے دیوگن اور شاہد کپور کے ساتھ ایک اہم رول پلے کیا۔ یہ فلم جان نیتھم کی فلم تھی جس میں اسے ایک پہنچے ہوئے سادھو جی کے اہم کیریکٹر میں پیش کیا گیا تھا۔

دھن کے پکے جاوید شیخ نے جب ''شیکھر'' کی آفر قبول کی تو وہ خود اس تذبذب کا شکار تھے کہ بھارتی فلم والے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے کیونکہ ندیم کو فلم ''درویش'' اور محمد علی زیبا کو فلم ''کلرک'' میں اداکاری کرانے کے باوجود ان کی فلموں کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ وہ ان کے پیش نظر تھا وہ سوچتے تھے۔ ''کیا میرے ساتھ بھی بھارتی فلم میکر یہی کچھ کریں گے؟ میرے کام کو کاٹ چھانٹ کر ماضی میں ندیم اور علی زیب کے ساتھ کیے گئے وہی سلوک دہرائیں گے۔ مگر ''شیکھر'' میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ البتہ انہیں اس بات پر افسوس ضرور ہوا کہ ''شیکھر'' باکس آفس پر خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ 2005ء میں ریلیز ہونے والی یہ بھارتی فلم اس لحاظ سے حوصلہ افزا ہی کہ بھارتی اخبارات و جرائد کے ناقدین اور مبصرین نے جاوید شیخ کو ان کے کردار کے حوالے سے سو فیصد کامیاب اداکار قرار دیا اور انہیں اس اداکاری پر ایوارڈ سے بھی نوازا۔ اس کے بعد انہیں چھوٹی موٹی اور سی کلاس بھارتی فلموں میں بھارتی کے کرداروں میں کاسٹ کیا جاتا رہا۔ ''شیکھر'' کے بعد کی فلم ''رفتہ رفتہ'' جو بعد میں ''ری اسپیڈ'' کے ٹائٹل سے ریلیز ہوئی۔ یہ فلم قابل ذکر نہیں تھی مگر جاوید شیخ کا جو بھی کردار تھا اس کی پرفارمنس اچھی تھی اور ناظرین اور مبصرین نے اس کی تعریف کی۔

یہ وہ دور تھا جب بال ٹھاکرے کی دہشت گرد تنظیم شیوسینا پاکستانی اداکاروں کی مخالفت میں سرگرم تھی۔ جاوید شیخ کو بھی ان مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ''جانِ من، اپنے، ہنی ہے تو منی ہے اور یوراج جیسی فلموں کے لیے انہیں جہاں شیوسینا کی مخالفت کی مار سہنی پڑی وہاں جاوید کے پرستاروں کی شدید مخالفت نے بھی جاوید شیخ کے صبر و سکون کو تہہ و بالا کر دیا۔ جاوید کے پرستاروں کی شدید مخالفت نے جاوید شیخ کے صبر و سکون کو تہہ و بالا کر دیا۔ جاوید کے پرستار اس بات پر ان سے زبردست ناراض ہوئے کہ پاکستان کا ایک سپر اسٹار بھارتی فلموں میں ایسے بھرتی کے اور معمولی کرداروں میں کیوں اپنی ساکھ کو داغ دار بنا رہا ہے؟ ان مخالفتوں کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے کہ جو کام وہ شروع کر دیتے ہیں اس میں ڈٹے رہتے ہیں۔ اس طرح انہیں کامیابی بھی ہوتی اور ناکامی بھی۔ بالی ووڈ کے شومین سبھاش گئی کی فلم میں انہیں سلمان خان، انیل کپور اور زید خان کے باپ کے کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم میں ان پر بیشتر مناظر فلمانے کے باوجود انہیں صرف مرحوم کے حوالے سے تصویر لٹکانے کے منظر میں دکھایا گیا۔ جاوید شیخ پر کیا گزری؟ جو بھی دکھ ہوا وہ تو اسے برداشت کر گئے مگر ان کے پرستاروں کے لیے یہ کاری وار تھا۔ ان کی بہت دل آزاری ہوئی تھی۔ ان کے نام پر بنائی جانے والی انجمن، آل پاکستان سپر اسٹار عوامی ہیرو جاوید شیخ فیڈریشن کے مرکزی چیئرمین عبدالجبار ساگر بلوچ احتجاج کے طور پر مستعفی ہو گئے۔ اپنے پرستاروں کے جذبات کا انہیں احساس تھا مگر ان کی سوچ یہ تھی کہ وقت اور حالات کے تحت بہت سی ناپسندیدہ باتیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ بھارتی فلم انڈسٹری بہت بڑی ہے۔ مجھے وہاں قدم جمانے کے لیے کچھ بڑی فلموں کے بینر سے آراستہ فلموں میں اپنی پی آر شپ بڑھانے کے لیے اس طرح کی

فلموں میں کام کرنا میری مجبوری ہے۔ مانا کہ ساگر بلوچ جیسے بے شمار فینز کو جاوید شیخ نے کمزور بھارتی فلموں کی وجہ سے ہرٹ کیا مگر جاوید کی سوچ بھی آخر کار سچ ثابت ہوئی۔ انہیں ''نمستے لندن'' کی صورت میں رشی کپور کے ہمراہ ایک بہت بڑا کردار ملا۔ اس فلم میں جاوید شیخ کے ہمراہ اکشے اور کترینہ کیف جیسی سپر اسٹارز بھی تھے۔ اس فلم کے ہر سین میں جاوید شیخ نے خوب رنگ جمایا۔ اسی طرح 2007ء میں خاتون ہدایت کارہ فرح خان کی فلم ''اوم شانتی اوم'' میں جاوید شیخ نے بولی ووڈ کے کنگ خان (شاہ رخ خان) کے باپ کے کردار میں زبردست پرفارم کر کے اپنا قد اونچا کیا اور اپنے لیے بولی ووڈ کے بند دروازے کھلوائے۔ ''نمستے لندن'' کے بعد ''اوم شانتی اوم'' جاوید شیخ کی دوسری بلاک بسٹر اور کامیاب ترین فلم تھی۔ اس فلم میں ایک گانے میں بولی ووڈ کے سینئر جونیئر آرٹسٹوں کے ہمراہ ''اوم شانتی اوم'' کے ٹائٹل سانگ میں جاوید شیخ کے نام گانے کی پرفارمنس کو خوب سراہا گیا۔ اسی دوران ''مائی نیم از انتھونی گنزالوس'' میں جاوید شیخ کے پولیس آفیسر کے کردار کو بھی بے حد پسند کیا گیا مگر یہ فلم بھی باکس آفس پر اپنا رنگ نہ جما سکی جب کہ ''جنت'' جاوید شیخ کی پہلی بولی ووڈ فلم تھی جو پاکستان میں بیک وقت پیش کی گئی۔ یہ فلم 2008ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ ''جنت'' میں بولی ووڈ کے عمران ہاشمی ہیرو تھے جب کہ جاوید شیخ کرکٹ میں میچ فکسنگ پر اکسانے والے منفی کیریکٹر میں دکھائے گئے جس میں جاوید شیخ نے حقیقت سے قریب تر اداکاری کر کے خوب داد سمیٹی جس کے بعد انہیں بے شمار انڈین فلموں کی آفر ہوئی۔ ''جنت'' نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ 2010ء میں پاکستانی اداکارہ مونا لیزا کو جاوید شیخ کی سفارش پر فلم ''کجرارے'' میں کاسٹ کیا گیا۔ اس فلم میں جاوید شیخ نے پاکستانی پولیس انسپکٹر کے رول میں بڑی خوب صورت اداکاری کی جسے دیکھ کر جاوید شیخ کے عام پرستار خوشی سے جھوم اٹھے مگر افسوس کہ یہ جاوید شیخ کے پرستار پاکستانی اسکرین پر دیکھ نہیں سکے۔ 2011ء میں ریلیز ہونے والی انڈین فلم ''روڈ ٹو سنگم'' ایک ایسی فلم تھی جسے بھارتی نقادوں نے جاوید شیخ کی پرفارمنس کی بڑی تعریف کی۔ یہ فلم کئی بین الاقوامی فلم فیسٹولز میں بھی خاصی سراہی گئی۔ فلم کا موضوع ہندو مسلم دوستی اور گاندھی کے آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر مبنی اس فلم میں جاوید شیخ نے اس مہارت سے جذباتی اور فطری اداکاری کی کہ ناظرین اور ناقدین و مبصرین نے دل کھول کر ان کی پذیرائی کی۔

ایک اور فلم ''صدیاں'' جو آزادی کے حوالے سے جاوید شیخ کی یادگار ترین کردار نگاری سے آراستہ تھی جس میں ہیما مالنی، ریکھا، رشی کپور جیسے بڑے اسٹار جاوید شیخ کے ساتھ شامل تھے۔ جاوید شیخ کا کردار سب پر حاوی نظر آیا مگر افسوس کہ ایک بار پھر یہ فلم اپنے بولڈ موضوع کی وجہ سے پاکستانی سینما گھروں میں پیش نہ کی جا سکی۔ کیونکہ سنسر بورڈ نے ''صدیاں'' کو ممنوع قرار دے دی تھی۔ یہ ہدایت کار راج کپور کی غالباً آخری فلم تھی۔ جو کمزور کاسٹنگ کی وجہ سے باکس آفس پر بری طرح ناکام ہو گئی۔ راج کپور اس فلم کی ناکامی برداشت نہ کر سکے اور اسی صدمے میں ان کا انتقال ہو گیا۔

''آزکلنگ'' بھارتی پنجاب کے سکھ کمیونٹی کی فلم تھی۔ اس فلم میں بھی جاوید شیخ کی کردار نگاری کو بے حد سراہا گیا۔

جاوید شیخ اگر پہلاج نہلانی کی فلم ''خون بھری مانگ'' میں بطور ہیرو کام کر لیتے تو آنے والے دنوں میں بولی ووڈ کے وہ کامیاب ہیروؤں کی صف میں شامل ہوتے مگر ان کی بدقسمتی نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ ایک طویل عرصہ بعد انہوں نے ایک بار پھر بالی ووڈ میں اداکاری کے شعبے میں قسمت آزمائی کی مگر اب پہلے جیسے حالات نہیں تھے۔ اب وہ، وہ جاوید شیخ نہیں تھے جو ''خون بھری مانگ'' کے وقت میں تھے۔ اب وہ ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے ہو گئے تھے۔ اس لیے انہیں ثانوی اور کیریکٹر رول ہی میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ فلموں کی یہ ایک اچھی یا بری ریت ہے کہ ہیرو ہیروئن کو جو مقام حاصل ہوتا ہے وہ دیگر کرداروں کو حاصل نہیں ہوتا۔ جاوید شیخ کو بھی ان کے اس دوسرے دور میں وہی پذیرائی اور کامیابی مل سکی جو ثانوی کردار کرنے والوں کو مل سکتی ہے۔ اس دور میں انہوں نے 18 بھارتی فلموں میں اداکاری کی اور اپنی فنی صلاحیتوں سے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا کامیابی حاصل کی۔ کیریکٹر رول کے حوالے سے ان کی فلم ''تماشا'' بھی ایک اہم فلم ہے جو ریلیز ہو کر پسند کی جا چکی ہے۔ اس میں جاوید شیخ کے ساتھ سپر اسٹار رنبیر کپور اور دپیکا پڈکون مرکزی کرداروں میں پیش ہوئے۔ آج بھی جاوید شیخ کو بھارتی فلمیں آفر کی جاتی ہیں مگر اب ان کی زیادہ توجہ قومی فلموں کی طرف مبذول ہے۔

❋❋

دھرتی کا بوجھ

مریم اے کاشف

اس وقت جب عراق کی سرزمین کو امریکی فوجی روند رہے تھے۔ عراق کے ہر گلی کوچے میں قتل و خون ریزی عام تھی ایسے وقت میں کچھ اپنے بھی ظلم و جور میں حصہ ڈال رہے تھے۔ وہ دھرتی کا بوجھ بن چکے تھے کہ حالات نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا۔

جنگ زدہ ملک سے ایک عبرت اثر واقعہ

ایمن نے زمین پر چھوٹا سا بیلچہ مارتے ہوئے دیکھا۔ گاؤں کے دائیں طرف سے گاڑیوں کا ایک قافلہ مٹی اڑاتا ہوا حارث خالد کے قلعے کی طرف جارہا تھا۔ حارث شمالی عراق میں ایک چھوٹے سے کرد گاؤں کا سردار تھا۔ وہ کوئی جدی پشتی سردار نہیں تھا اور نہ ہی گاؤں والوں نے اسے سردار بنایا تھا۔ حارث ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ نوجوانی میں اس نے عراقی آمر صدام حسین کی بعث پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی اور اس کے بعد وہ اتنا طاقت ور ہوگیا

کہ اس گاؤں کا سربراہ بن گیا۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ حارث کے خلاف بات کرتا۔ کرد باشندے خود کو عراق کا حصہ نہیں مانتے ہیں اور خاص طور سے صدام حسین سے وہ بے پناہ نفرت کرتے تھے کیونکہ اس کی دور حکومت میں عراق میں بسنے والے کردوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے تھے۔

کرد ایک قدیم قوم ہے اور کہتے ہیں کہ طوفان نوح کے بعد دنیا میں بننے والا سب سے پہلا قبیلہ کرد تھا اور بعد میں دوسری قومیں ان کردوں سے نکلیں۔ کرد شروع سے ایران ترکی اور عراق کی سرحدوں کے ملنے والی جگہ پر آباد ہیں اور وہ اس علاقے میں عظیم کردستان بنانا چاہتے ہیں لیکن ان کی بدقسمتی کہ ان کو تین بڑے طاقت ور ممالک کی فوج کا سامنا ہے اور وہ اکیلے ان سے لڑ رہے ہیں۔ آزاد کردستان کی لڑائی میں اب تک لاکھوں کرد باشندے اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ ان کی منزل ابھی بہت دور ہے لیکن وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

صدام حسین کے دور میں حارث مستقل قوت بڑھانے میں لگا رہا اس نے دولت کمانے کے لیے منشیات اگائی اور اس دولت سے اس نے بدمعاشوں کی ایک فوج بھرتی کر لی۔ کیونکہ وہ اس علاقے میں بعث پارٹی کا صدر بھی تھا اس لیے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھتا۔ یہاں کی انتظامیہ بھی اس کے تابع تھی۔ پھر حالات بدلے اور مہلک اسلحے کی تلاش میں امریکا کی سرکردگی میں مغربی طاقتیں عراق پر حملہ آور ہوئیں۔

حارث موقع پرست شخص تھا۔ اسے صدام حسین سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس نے اس کی حمایت کر کے طاقت حاصل کر لی تھی۔ جب عراق میں امریکی آئے تو اس نے وفاداری تبدیل کرنے میں ایک دن بھی نہیں لگایا اور جب امریکی دستے اس علاقے میں اترے تو وہ ان کا استقبال کرنے میں پیش پیش تھا۔ اس نے امریکیوں کے ساتھ کچھ ایسی والہانہ عقیدت دکھائی کہ وہ اس علاقے میں ان کا سب سے با اعتماد آدمی بن گیا۔ اس نے بعد میں اپنی کارکردگی سے بھی اپنی وفاداری ثابت کی اور اس کے صلے میں امریکا نے اسے اس علاقے میں من مانی کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔ یعنی اس کی سربراہی پہلے ہی کی طرح قائم رہی۔

حارث کے ساتھیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا اور پھر ان کو امریکیوں کی مدد بھی حاصل تھی اس لیے وہ آسانی سے اس علاقے پر قبضہ برقرار رکھے ہوئے تھا۔ کیونکہ یہاں کی اکثر آبادی کرد تھی اور کردوں کی عربوں سے لڑائی تھی۔ اس لیے جب عرب نژاد قبیلوں نے امریکی قبضے کے خلاف جدوجہد شروع کی تو شمالی عراق میں بسنے والے کردوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا اور وہ لڑائی سے بالکل الگ رہے تھے۔

چالاک حارث موقع کی مناسبت سے کام کرتا تھا پہلے وہ صدام حکومت اور بعث پارٹی کو خوش کرنے کے لیے اپنے ہم قوم افراد پر ظلم و تشدد کرتا تھا تو اب اپنے نئے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے گاؤں میں آباد عرب نژاد افراد کو تنگ کرنے لگا۔ صدام حسین منشیات کے خلاف تھا اس لیے حارث کو کھل کر کام کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور اسے خوف بھی لگتا تھا کہ وہ پکڑا نہ جائے۔ جب امریکی آئے تو انہوں نے اسے کھلی چھوٹ دے دی کہ وہ جو چاہے کرے۔

اب حارث کھل کر سامنے آ گیا، اسے بھرپور انداز میں اپنا کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے علاقے کی ساری زمین کو اپنی ملکیت قرار دے دی اور حد بندی کر کے منشیات کاشت کی جانے لگی۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنی زمین پر کاشت کریں گے اور فصل بھی ان کو ملے گی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کے لیے بھی کام کریں گے۔ لوگ حیران تھے کہ وہ اس کے لیے کیا کام کرتے کیونکہ یہ غربت کا ارا خطہ تھا جہاں وہ بہ مشکل اپنی ضرورت بھر کا اناج اگا پاتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس میں سے حارث کو کیا دیتے جس کے پاس ڈالرز کی ریل پیل تھی۔ پہلے اس کے پاس سادہ سی حویلی تھی اب اس نے ایک عالی شان سا قلعہ نما محل بنا لیا تھا جس میں دنیا جہان کی آسائشیں تھیں۔

حریت پسندوں کے خوف سے حارث نے اس قلعے کو بہت مضبوط اور مستحکم بنایا تھا۔ اگرچہ اس علاقے میں مزاحمتی تحریک نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے باوجود اسے خوف لگا رہتا تھا کہ اس کے قلعے پر حملہ نہ ہو جائے۔ اس لیے اس نے آس پاس بسنے والے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ قلعے کے چاروں طرف مکان بنا کر ان میں رہیں۔ حارث کا مقصد تھا کہ یہ لوگ اس کی ڈھال کی طرح ہوں اور ان کی وجہ سے اس کے قلعے پر حملہ نہ ہو۔

جب حارث کے دل سے حریت پسندوں کا خوف نکل گیا تو وہ اپنے اصل روپ میں سامنے آ گیا۔ اس نے سب سے پہلے گاؤں والوں کی زمینوں پر قبضہ کیا اور ان کو مجبور کرنے لگا کہ وہ اس کی ہدایت کے مطابق کاشت

کریں۔ جب گندم لگانے کا وقت آیا تو اس کے آدمیوں نے زمین کی حد بنا دی کہ وہ اس جگہ کاشت کریں اور اس جگہ کاشت نہیں کر سکتے۔ جب مقامی لوگوں نے گندم لگا دی تو حارث کے آدمیوں نے خالی چھوڑی جانے والی جگہ پر پوست کاشت کروائی اور یہ کام بھی انہوں نے گاؤں کے لوگوں سے لیا۔ اب انہیں... پتا چلا کہ حارث نے ان کی زمین پر قبضہ کیوں کیا تھا۔ عربوں کی تو ساری زمین اس نے قبضے میں لے لی تھی لیکن کردوں کی کچھ زمین چھوڑ دی تھی۔ اس کا مقصد تھا کہ وہ اس کے خلاف نہ ہو جائیں۔

حارث چالاکی سے گندم کی آڑ میں منشیات کاشت کر رہا تھا وہ بھی اس طرح کہ اگر حکومت ایکشن لے تو وہ سارا الزام گاؤں والوں کے سر رکھ کر صاف بچ جائے۔ آنے والے دو تین سالوں میں اس نے مزید پر پرزے نکالے تھے۔ منشیات کی دولت کی مدد سے اس نے مزید آدمی بھرتی کیے اور جب اس نے محسوس کیا کہ وہ گاؤں والوں کے مقابلے میں اتنا طاقت ور ہو گیا ہے کہ وہ بغاوت پر اتر آئیں تو ان کی بغاوت دبا سکے۔ اب وہ ان کے مال و آبرو پر ڈاکا زنی کرنے لگا تھا۔ اسے پتا چل جاتا کہ کس گھر میں دولت ہے یا کوئی خوب صورت عورت ہے تو اگلے ہی دن اس کے آدمی وہاں پہنچ جاتے اور زبردستی مال اور عزت چھین کر لے جاتے تھے۔ اگر کوئی راہ میں مزاحم ہوتا تو اسے بلا جھجک گولی سے اڑا دیا کرتے تھے۔ ایسے کئی واقعات ہوئے تو لوگ دہشت زدہ ہو گئے اور چپ چاپ مال دے دیا کرتے تھے جن گھروں میں لڑکیاں یا جوان عورتیں تھیں وہ ان کو چھپانے لگے تھے۔ وہ کسی سے داد فریاد بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس ملک میں جنگل کا قانون تھا۔

بہت سارے لوگ حارث اور اس کے ساتھیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر علاقہ چھوڑ گئے تھے ان میں اکثر عرب تھے جو عرب اکثریت والے علاقوں کی طرف چلے گئے مگر کرد بے چارے کہاں جاتے۔ بہت سارے ایسے غریب عرب بھی تھے جو کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ پھر لوگ جاتے بھی تو کہاں جاتے کہ اب تو ہر طرف حارث جیسے لوگوں کا راج تھا۔ اس لیے گاؤں اور علاقہ چھوڑ کر جانا بھی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ مگر جب عزت پر بن آتی تو ان کے جانے میں ہی عافیت ہوتی تھی۔ سب جا بھی نہیں سکتے تھے ان میں سے کئی ایسے تھے جن کے سر پر کوئی بڑا یا مرد نہیں تھا۔ عورتیں تھیں یا بچے تھے۔ ان کا کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔

جن گھروں میں مرد نہیں تھے ان میں ایک ایمن کا گھر بھی تھا۔ وہ مشکل سے پندرہ سال کی تھی۔ خوب صورت تو نہیں تھی لیکن جوان تھی اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ حارث اور اس کے آدمی کسی جوان لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ ایمن کا باپ اس وقت مرا تھا جب وہ صرف ڈھائی سال کی تھی۔ ایمن کا چھوٹا بھائی قادر راشد ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ باپ کے مرنے کے چار مہینے بعد پیدا ہوا تھا۔

جب حارث گاؤں کی زمین پر قابض ہوا تو ایمن کی ماں سے اس کی زمین بھی چھن گئی کیونکہ وہ عرب نژاد تھے۔ اس تھوڑی سی زمین پر ایمن کے باپ نے سیب کا باغ لگایا تھا۔ یہ باغ حارث کے آدمیوں نے کاٹ ڈالا اور ایمن کی ماں کو حکم دیا کہ وہ اس پر گندم کاشت کرے گی۔ وہ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ گندم کی کاشت کس طرح ہوتی ہے۔ سیب کے باغ کی دیکھ بھال وہ کسی نہ کسی طرح کر لیا کرتی تھی۔ اسے کھیت میں کام کرنا پڑا تو اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور پھر اس کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس علاقے میں موجود واحد ڈاکٹر نے خدشہ ظاہر کیا کہ اسے ٹی بی ہو گئی ہے لیکن نہ تو اس کا کوئی ٹیسٹ ہو سکتا تھا اور نہ ہی کوئی دوا دستیاب تھی۔ کیونکہ سوائے چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر اس پورے علاقے میں ڈاکٹرز اور دوائیں نایاب تھیں۔

امریکیوں کے آنے سے پہلے حالات پھر بھی بہتر تھے اب تو عراق میں سوائے موت اور بربادی کے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ایک طرف امریکی مار رہے تھے اور دوسری طرف آپس کی خانہ جنگی ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہی تھی۔ ایسے میں ایمن کی ماں کو دوا اور علاج کہاں سے ملتا اس لیے وہ خون تھوکتی تھوکتی مر گئی۔ صرف ایمن کی ماں ہی نہیں بلکہ علاقے میں اور بھی کئی افراد تھے جو اسی طرح ٹی بی کا شکار ہوئے تھے۔ اس سے پہلے ان کے علاقے میں ٹی بی نہیں ہوتی تھی مگر جب سے ایک قریبی گاؤں پر امریکی طیاروں نے بمباری کی اور وہاں پر ایسے بم پھینکے جن سے مکانات تو تباہ نہیں ہوئے لیکن انسانوں میں جو جہاں تھا وہیں مر گیا۔ اس کے بعد سے اس علاقے میں بھی عجیب و غریب امراض پھوٹ پڑے تھے۔ ان میں ایک مرض ٹی بی کا بھی تھا۔

ایمن تیرہ برس کی تھی جب اس کی ماں مری اور اب اس کا دنیا میں سوائے بھائی کے کوئی نہیں تھا۔ قادر اس سے تین سال چھوٹا تھا اور ماں کی جگہ وہ دونوں زمین پر کام

کرنے لگے۔ اس سے یہ ہوا کہ ان کو کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ ملتا رہا تھا۔ ایمن کی ماں کو مرتے مرتے یہ فکر تھی کہ اس کے بعد ایمن کا کیا ہوگا اور وہ حارث جیسے درندے سے کس طرح بچے گی۔ جب وہ عورتیں بھی نہ بچ سکیں جن کے گھر میں چار چار مرد تھے تو ایمن کیسے بچتی کہ اس کے سر پر نہ باپ تھا اور نہ بڑا بھائی۔ لیکن وہ سوائے فکر مند ہونے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ بہرحال اس نے ایمن کو دنیا کی اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے اپنی عزت کی حفاظت کرنے کو کہا تھا۔

ایمن نے ماں کی ہدایات یاد رکھی تھیں اور وہ گھر سے کم نکلتی تھی اور جاتی بھی تو خود کو اچھی طرح چادر سے ڈھک کر جاتی تھی۔ خود کو غیر نمایاں اور دبلا رکھنے کے لیے وہ کھاتی بھی کم تھی۔ ان کو ویسے بھی جتنی خوراک ملتی تھی اس سے بہ مشکل جسم و جان کا ناطہ برقرار رکھا جاتا تھا۔ اس میں سے بھی ایمن زیادہ قادر کو کھلا دیا کرتی تھی اور خود معمول سے بھی کم کھاتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی اٹھان اتنی تیز تھی کہ وہ گھر میں واحد آئینے میں خود کو دیکھتی تو ڈر جاتی تھی۔ شکل و صورت اچھی نہ سہی لیکن اس کا جسم آواز دینے لگا تھا۔ وہ اسے کہاں چھپاتی۔ گھر میں بیٹھنے سے کام نہیں چل سکتا تھا باہر جانا بھی تھا۔ وہ اور قادر زمین پر کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گھر کے لیے پانی اور چولہے کے لیے لکڑیاں وہ چن کر لاتی تھی اور کبھی کبھی نزدیکی جھاڑیوں سے پکانے کے لیے ساگ پات بھی اسے لانا پڑتا تھا کیونکہ زمین سے ان کو صرف سال بھر کی گندم ملتی تھی۔

اس روز بھی ایمن جھاڑیوں میں کوئی سبزی تلاش کر رہی تھی۔ بارش کے بعد اکثر یہاں خودرو سبزی اگ آتی تھی۔ وہ ایک جگہ سے سبزی چن رہی تھی کہ اس نے حارث کے قلعے کی طرف گاڑیاں جاتے دیکھی تھیں۔ یہ سب امریکی بکتر بند گاڑیاں تھیں اور مہینے میں ایک دو بار اس علاقے میں ان کا چکر لگتا تھا۔ گاڑیاں قلعے کے سامنے جا کر رکی نہیں بلکہ ان کے پاس پہنچتے ہی قلعے کا دروازہ کھلا اور بکتر بند گاڑیاں اندر چلی گئیں۔ ایمن نے نفرت سے زمین پر تھوکا۔ یہ لوگ اس کے ملک اور لوگوں کے دشمن تھے کتنے ہی بے گناہوں کا خون ان کے سر تھا۔ حارث جیسے لوگ تھے جو اپنوں کو مروا رہے تھے اور امریکنوں سے ڈالرز وصول کر رہے تھے۔

ایمن واپس جانے لگی کہ اس نے جھاڑیوں سے تین افراد کو نکلتے دیکھا۔ انہوں نے شانوں پر بھاری بیگ اٹھا رکھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ایمن ٹھٹک گئی تھی کیونکہ ان کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ حریت پسند تھے انہوں نے موسم کی مناسبت سے خاکی رنگ کی ٹی شرٹس اور سبز رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ شاید کوئی کارروائی کرنے جا رہے تھے۔ ان کا رخ اس شاہراہ کی طرف تھا جس سے گزر کر امریکی وہاں آئے تھے۔

ایمن نے جانے کا سوچا لیکن پھر تجسس نے اس کے قدم روک لیے تھے وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ لوگ کیا کر رہے تھے۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان میں ان کا پیچھا کرنے لگی۔ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھی اس لیے ان لوگوں کے علم میں لائے بغیر اسے تعاقب کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ وہ لوگ بھی بہت محتاط تھے اور آس پاس نظر رکھے ہوئے تھے۔ پھر وہ شاہراہ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اپنے بیگ زمین پر رکھے اور اس میں سے گول چپٹی سی پلیٹ نما چیزیں نکالیں۔ ان کا قطر ایک فٹ سے زیادہ تھا۔ ایمن کو ان چیزوں کے بارے میں پتا نہیں تھا لیکن اسے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ یہ کوئی ہتھیار ہے۔

یہ بارودی سرنگیں تھیں جو عام طور سے بڑی گاڑیوں کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ جیسے فوجی ٹرک یا بکتر بند وغیرہ۔ حریت پسندوں نے بارودی سرنگیں شاہراہ پر بچھانے کے بجائے جھاڑیوں میں آنے والے ایک راستے پر بچھانا شروع کیں۔ یہ راستہ تنگ تھا اور انہوں نے بارودی سرنگیں بھی اس طرح بچھائی تھیں کہ اس راستے سے گزرنے والی گاڑی لازمی ان میں سے کسی کے اوپر سے گزرتی۔ اس کے بعد انہوں نے اس راستے سے ذرا آگے ایک راستے پر بارودی سرنگیں اسی طرح بچھائیں۔ کیونکہ اس علاقے میں زمین سخت اور پتھریلی تھی اس لیے وہ زمین تھوڑی سی کھود کر اس میں بارودی سرنگ دبا دیتے۔

ایمن دل چسپی سے ان کی کارروائی دیکھ رہی تھی۔ یہ کام کر کے انہوں نے جھاڑیوں میں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ ان کا نشانہ واضح طور پر حارث کے قلعے میں آنے والے امریکی فوجی تھے۔ مگر ایمن کی سمجھ میں یہ نہیں آیا تھا کہ جب امریکیوں کو نشانہ بنانا تھا تو بارودی سرنگیں شاہراہ پر کیوں نہیں لگائی تھیں۔ دل چسپی کے ساتھ اسے خطرے کا احساس بھی ہو رہا تھا کیونکہ اگر حریت پسند اسے دیکھ لیتے تو راز داری رکھنے کے لیے اسے مار بھی سکتے تھے اس لیے وہ پیچھے آنے لگی اور اس نے ایک کسی قدر بلند ٹیلے پر جگہ سنبھال لی۔ یہاں سے وہ سب کو دیکھ سکتی تھی اور کوئی اسے نہیں دیکھ

سکتا تھا۔ اس جگہ سے حارث کا قلعہ بھی صاف نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد قلعے کا دروازہ کھلا اور اس سے تینوں بکتر بند گاڑیاں باہر آئی تھیں۔

جب وہ شاہراہ پر آئیں تو ایمن نے تین میں سے ایک کو اٹھ کر شاہراہ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ٹہل رہا ہو۔ پھر جب بکتر بند گاڑیاں پاس آئیں تو وہ سامنے آگیا۔ اس کے بعد اس نے بکتر بندوں کی طرف دیکھا اور پلٹ کر جھاڑیوں کی طرف بھاگا۔ ایمن نے گاڑیوں کی رفتار تیز ہوتے دیکھی۔ حریت پسند اس راستے سے جھاڑیوں میں گھسا جہاں انہوں نے بارودی سرنگیں بچھائی تھیں۔ اسے جھاڑیوں میں گھستے دیکھ کر پہلی بکتر بند اس کے پیچھے آئی تھی اور جیسے ہی وہ اس راستے پر مڑی کسی بارودی سرنگ پر اس کا ٹائر چڑھا اور دھماکا ہوگیا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ ایمن کانپ گئی تھی۔ بکتر بند ہوا میں اچھل کر جھاڑیوں میں جا الٹی۔ یہ دیکھ کر اس کے پیچھے آنے والی بکتر بند آگے نکل گئی تھی اور اس نے دوسرے راستے سے اندر جانے کی کوشش کی۔ اس کا بھی وہی انجام ہوا تھا دھماکے کے بعد وہ الٹ گئی تھی۔ ان گاڑیوں کے اندر موجود فوجی زندہ تھے یا مر گئے تھے لیکن گاڑیاں مکمل طور پر تباہ ہوگئی تھیں۔ پھر ایمن نے تباہ شدہ گاڑیوں سے امریکنوں کو نکلتے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی تینوں حریت پسندوں نے ان پر فائرنگ شروع کردی۔

بچ جانے والی بکتر بند باہر ہی رک گئی تھی اور اس سے حریت پسندوں کے خلاف جوابی کارروائی کی جانے لگی تھی۔ مگر حریت پسند جھاڑیوں میں تھے اور وہ امریکنوں کو نظر نہیں آرہے تھے۔ تباہ شدہ بکتر بندوں سے نکلنے والے بیشتر امریکن فائرنگ کا شکار ہوگئے تھے۔ جو مر گئے تھے وہ ساکت پڑے تھے اور جو بچ گئے تھے وہ زخمی ہو کر چلّا رہے تھے۔ تیسری بکتر بند سے فوجی اتر کر جھاڑیوں کے اندر آنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اپنے بچ جانے والے ساتھیوں کی مدد کرسکیں مگر ان کو بنا آڑ کے جھاڑیوں کے اندر آتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

اس دوران میں قلعے سے حارث کے آدمی بھی نکل کر آگئے تھے اور انہوں نے جھاڑیوں کو گھیرنا شروع کردیا۔ شام کا وقت تھا اور ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہاں ایک خوف ناک معرکہ شروع ہوگیا۔ ایمن اس سے پہلے ہی وہاں سے نکل آئی تھی ورنہ وہ بھی اس معرکے کی لپیٹ میں آسکتی تھی۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ سات امریکی مارے گئے تھے جب کہ دو حریت پسندوں کی لاشیں ملی تھیں تیسرا نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد گاؤں والے سہم گئے تھے کیونکہ جس آبادی کے قریب امریکنوں پر حملہ ہوتا تھا اس پر فضا سے بمباری کی جاتی تھی یا اسے نشانے کے طور پر چن لیا جاتا تھا اور بعد میں کسی بہانے سے بمباری کردی جاتی تھی جیسے کسی شادی کی تقریب میں کی جانے والی ہوائی فائرنگ کو بہانہ بنا لیا جاتا تھا یا کوئی جنازہ ان کو حریت پسندوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ اس قسم کی وحشیانہ بمباری میں سینکڑوں بے گناہ افراد مارے جاتے تھے۔

اصل میں امریکی حارث کے قلعے میں عیاشی کرنے آتے تھے۔ اس کے پاس روس سے اسمگل ہوکر آئی بہترین شراب ہوتی تھی اور اردگرد سے اغوا کر کے لائی گئی لڑکیاں ہوتی تھیں جنہیں وہ بے غیرت امریکنوں کو پیش کردیا کرتا تھا۔ اس روز بھی امریکی عیاشی کر کے جا رہے تھے کہ دست اجل نے ان کو اچک لیا تھا۔ ایمن کو اس خبر سے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس واقعے کے بعد حارث کے آدمیوں نے پورے گاؤں کو الٹ پلٹ دیا تھا۔ اسے شک تھا کہ حریت پسندوں کی مقامی افراد نے مدد کی تھی۔ انہوں نے گاؤں کی تلاشی لی اور جس پر شک ہوا اسے بے دریغ تشدد کا نشانہ بنایا۔ یہ بات غلط تھی مگر گاؤں والے بے بس تھے۔

اس حملے کے بعد سے امریکیوں نے قلعے میں آنا جانا بند کردیا اور حارث کے آدمی بھی باہر نکلنے میں احتیاط کرنے لگے تھے۔ حالانکہ اس علاقے میں حریت پسندوں کا یہ اوّلین حملہ تھا۔ کرد باشندے عام طور سے حریت پسندوں کی حمایت نہیں کرتے تھے۔ مگر امریکیوں اور حارث کے اشتراک نے ان کو اتنا تنگ کیا ہوا تھا کہ اس حملے پر یہاں کے باسی بہت خوش تھے۔ بعد میں ان کو بلاوجہ نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ ایمن نے کسی کو نہیں بتایا کہ اس نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لیکن اس نے قادر کو بتا دیا اور اسے سختی سے منع کیا تھا کہ یہ بات کسی اور کو نہ بتائے۔ قادر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی کو یہ بات نہیں بتائے گا۔ یوں بھی قادر کو حریت پسندوں میں شامل ہونے کا شوق تھا لیکن اتنی عمر میں اسے یہ خیال بھی تھا کہ اگر وہ چلا گیا تو پیچھے اس کی بہن کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ وہ محفوظ نہیں ہوگی۔ یہ تو اس نے سوچا نہیں تھا کہ وہ بہنیں بھی محفوظ نہیں رہی تھیں جن کے کئی کئی بھائی تھے۔

اس واقعے کے دو مہینے بعد حریت پسندوں نے ایک

رات حارث کے قلعے پر حملہ کر دیا اور جس وقت وہ اپنا دفاع کر رہا تھا۔ عین اس وقت حریت پسندوں کی ایک اور ٹولی نے حارث کی پوست کی کھڑی فصل کو آگ لگا دی۔ جب اس نے قلعے کی بلندی سے اپنے کھیتوں میں شعلوں کو بلند ہوتے دیکھا تو وہ پاگل ہو گیا تھا اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ باہر نکل کر حریت پسندوں کا صفایا کر دیں۔ لیکن اس کے آدمیوں کو زندگی سے پیار تھا انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ حارث بے بسی سے اپنی دولت تباہ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جب ساری فصل جل گئی تو حریت پسند اس وارننگ کے ساتھ واپس لوٹ گئے کہ اب حارث نے مقامی لوگوں پر ظلم کیا تو وہ زندہ نہیں رہے گا۔

مگر حارث جیسے فرعون اتنی آسانی سے کہاں مانتے ہیں۔ اگلے روز جب صبح ہوئی تو یہ گاؤں والوں کے لیے بھی ایک بری صبح تھی کیونکہ ان کی بھی فصلیں آگ کا نشانہ بن گئی تھیں۔ پھر روشنی ہوتے ہی حارث کے کرگے باہر آئے اور انہوں نے گھروں سے لوگوں کو مار مار کر باہر نکالنا شروع کر دیا۔ ایمن اس وقت نزدیکی جھاڑیوں سے لکڑی سمیٹ کر آ رہی تھی جب اس نے حارث کے آدمیوں کو دیکھا تو جلدی سے جھاڑیوں میں واپس چلی گئی تھی۔ وہ بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی اسے معلوم تھا کہ ایک بار ان درندوں نے اس کی بو سونگھ لی تو جب تک اسے اپنا شکار نہیں بنا لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

اسے یہ نہیں معلوم ہوا کہ گاؤں والوں پر کیا گزری لیکن کبھی کبھی اسے گاؤں کی طرف سے فائرنگ اور عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ اسے قادر کی فکر بھی تھی کیونکہ وہ گھر پر ہی تھا۔ وہ منتظر تھی کہ کب حارث کے آدمی واپس جاتے ہیں اور وہ گاؤں میں داخل ہو۔ دوپہر تک وہ جھاڑیوں میں چھپی رہی تھی۔ دوپہر کے قریب اس نے حارث کے آدمیوں کو گاڑیوں میں سوار ہو کر واپس جاتے دیکھا تو وہ باہر نکلی اور گاؤں میں داخل ہوئی۔ جہاں بین ہو رہے تھے۔

اس روز گاؤں کے لوگوں پر قیامت گزر گئی تھی۔ ان کی جان و مال اور عزت پہلے بھی لٹتی رہی تھی لیکن اس روز تو یہ سب سرعام ہوا تھا۔ حارث نے گاؤں کے جن لوگوں کو کھیتوں میں اپنی پوست کی فصل کی حفاظت کا کام سونپ رکھا تھا ان کو اور ان کی عورتوں کو گھروں سے نکال کر گاؤں کے میدان میں لائے پہلے مردوں کو باندھا اور پھر ان کے سامنے ان کی عورتوں کو بے آبرو کیا اور جب اپنے شیطانی کھیل سے فارغ ہو گئے تو جاتے جاتے ان مردوں کو گولی مار گئے تھے۔ گاؤں والے سخت مشتعل لیکن بے بس تھے ان کے سارے ہتھیار ان سے چھین لیے گئے تھے دو غیر متعلقہ افراد نے مزاحمت کی تو ان کو بھی مار دیا گیا اور اس کے بعد کسی میں ہمت نہیں ہوئی تھی۔ جن گھروں کے مرد مارے گئے تھے اور عورتیں بے حرمت ہوئی تھیں وہ تو جیتے جی مر گئے تھے۔ اس روز بیشتر گاؤں والوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہیں گے۔ وہ کہیں اور چلے جائیں گے۔

قادر نے پہلی بار جانا تھا کہ اگر آدمی کی کوئی عزت ہو اور وہ اس طرح سرعام لٹ جائے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔ جب اس نے ایمن کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں یہ سوال اتر آیا کہ اگر وہ بھی ان عورتوں میں شامل ہوتی تو وہ کیا کر لیتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مر سکتا تھا ایمن کو لٹنے سے پھر بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ اس نے ایمن سے کہا۔ ''ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم بھی چلے جائیں گے۔''

''لیکن ہم کہاں جا سکتے ہیں؟'' ایمن نے پوچھا تو قادر کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا ان کا کوئی دور دراز کا رشتے دار بھی نہیں تھا جس کے ہاں جا کر وہ پناہ لے سکتے۔ ان کے تھوڑے بہت رشتے دار اسی گاؤں میں تھے اور وہ خود پناہ کے لیے کہیں اور جانا چاہ رہے تھے۔ ان میں کوئی اتنا نزدیکی رشتے دار نہیں تھا جو اپنی ذمے داری محسوس کرتا اور ان کو بھی ساتھ لے جاتا۔ قادر نے ایک دور رشتے داروں سے بات کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا کہ ان کو خود نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں جائیں گے اس لیے ان دونوں کو کیسے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنی پڑی تھی۔

گاؤں والوں کو معلوم تھا کہ حارث ان کو آسانی سے جانے نہیں دے گا اس لیے انہوں نے رات کی تاریکی میں نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آنے والی رات میں گاؤں سے ان لوگوں کے قافلے نکلے تھے اور باقی رہ جانے والے ان کو حسرت سے دیکھ رہے تھے یہ وہ لوگ تھے جن کی کہیں جانے کی استعداد بھی نہیں تھی۔ ان میں ایمن اور قادر بھی تھے۔ وہ جا نہیں سکے تھے لیکن گاؤں کی حدود سے ان لوگوں کو جاتا دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ ہوا جس کا انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو حارث کے آدمیوں سے مزاحمت کی توقع کر رہے تھے لیکن انہوں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ان پر فضا سے حملہ ہوگا۔ ان کے قافلے میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ اور وہ

گاؤں سے کچھ دور گئے تھے کہ ان کے قافلے کو گن شپ ہیلی کاپٹروں نے گھیر لیا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے ان پر شیلنگ ہونے لگی۔

راکٹ اور بم برسنے لگے جو لوگوں کے پرخچے اڑا رہے تھے اور ان کے لیے کہیں بھی اماں نہیں تھی۔ بعض لوگوں نے بھاگ کر گاؤں واپس آنے کی کوشش کی تو ان کو بھی مہلت نہیں ملی۔ بیس منٹ کے اندر امریکی گن شپ ان نہتے لوگوں کو خاک و خون میں نہلا کر جا چکے تھے۔ تقریباً سب مارے جا چکے تھے اور جو معدودے چند بچے تھے وہ بھی شدید زخمی تھے۔ جب گاؤں والے گن شپس کے واپس جانے پر ان لوگوں تک پہنچے تو یہ زخمی بھی آخری دموں پر تھے۔ دو سو افراد پر مشتمل قافلے میں کوئی زندہ نہیں بچا تھا۔ ان پر سکوت طاری ہو گیا تھا ان لوگوں نے کبھی ایسی درندگی کا سوچا بھی نہیں تھا۔

اگرچہ گاؤں والوں نے چند سالوں میں بہت مظالم سہہ لیے تھے لیکن اس روز تو ان کی بھی چیخیں نکل گئی تھیں۔ سب ہی دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے قبریں کھودیں۔ لاشیں اتنی تھیں کہ سب کے لیے الگ الگ قبر کھودنا ناممکن تھا اس لیے بڑے بڑے گڑھے کھود کر ان میں لاشوں کو دفنا دیا گیا۔ بہت ساری لاشیں تو ٹکڑوں میں بٹ گئی تھیں اور ان کی پہچان بھی دشوار ہو رہی تھی کہ وہ مرد کی ہے یا عورت کی ہے اس لیے بنا کسی پہچان بہت ساری لاشوں کے ٹکڑوں کو ایک ساتھ ہی دفنا دیا گیا تھا۔ نماز جنازہ بھی اجتماعی پڑھائی گئی تھی۔

ایمن پتھرائی نظروں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ صرف اس کا نہیں بلکہ سب کا یہی حال تھا۔ جب لاشوں کی تدفین ہو گئی تو حارث کے قلعے سے گاڑیاں نکلیں اور گاؤں کے پاس آ کر انہوں نے میدان کو گھیر لیا۔ ایک گاڑی میں حارث خود بھی تھا۔ اس کے آدمیوں نے میگا فون پر تمام گاؤں والوں کو میدان میں آنے کا حکم دیا۔ ان کے پاس تکمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ حکم عدولی کا کوئی فائدہ نہیں تھا جو خود سے نہیں جائے گا وہ ذلت اور تکلیف سے لے جایا جائے گا۔ ان کو حکم سن کر گھروں سے نکلنا پڑا تھا۔

جو فرد میدان میں آتا حارث کے آدمی اسے تلاشی لے کر ایک طرف بٹھا دیتے تھے۔ وہ عورتوں کی تلاشی بھی لے رہے تھے اور کسی میں احتجاج کی ہمت نہیں تھی۔ ایمن چادر اوڑھ کر آئی تھی۔ اس کی تلاشی لینے والے نے اسے چادر اتارنے کا حکم دیا۔ اس نے دیر کی تو اس نے چادر کھینچ لی۔ پھر اسے دیکھ کر تلاشی لینے والے کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ اس نے ٹٹولنے کے انداز میں ایمن کی تلاشی لیتے ہوئے کہا۔ ”تو اب تک کہاں چھپی ہوئی تھیں۔

ایمن کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ چپ رہی اور تلاشی لینے والے نے اسے جانے دیا۔ گاؤں میں اب تھوڑے لوگ ہی رہ گئے تھے۔ ان میں سے بھی زیادہ تر بوڑھے اور بچے تھے۔ جن کے اوپر کوئی جوان نہیں تھا وہی پیچھے رہ جانے پر مجبور ہوئے تھے اور وہی بچے تھے۔ جوان عورتیں اور لڑکیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ تلاشی لینے والے ان کو خاص طور سے دیکھ رہے تھے۔ جب تمام گاؤں والے آ گئے تو حارث نے اپنی گاڑی کے اوپر کھڑے ہو کر ان سے خطاب کیا۔ اس نے پہلے تو اپنی طاقت کی بات کی اور اپنی نافرمانی کرنے والوں کو عبرت ناک موت کے انجام سے ڈرایا پھر اس نے کہا کہ آج سے گاؤں کے تمام لوگ اس کے غلام ہیں اور وہ زمین پر اس کے لیے پوست کاشت کریں گے۔ وہ سب گاؤں میں رہیں گے اور جس نے فرار کی کوشش کی اسے مار دیا جائے گا۔ ان کا کھانا پینا حارث کے ذمے ہوگا۔

تقریر کر کے حارث واپس اپنے قلعے میں چلا گیا لیکن اس کے آدمیوں نے پورے گاؤں کو اس طرح گھیر لیا کہ ان کی نظروں میں آئے بغیر کوئی وہاں سے باہر نہیں جا سکتا تھا کیونکہ گاؤں میں زیادہ تر عام لوگ رہ گئے تھے اس لیے ان لوگوں کو مزاحمت کا خوف بھی نہیں تھا بس یہ دھڑکا تھا کہ رہے سہے بھی فرار نہ ہو جائیں۔ ان لوگوں کو فرار سے روکنے کے لیے انہوں نے گاؤں کے چاروں طرف مٹی کی مدد سے اونچے مینار بنا لیے اور وہاں سے نگرانی کرتے تھے۔

گاؤں کے بچے کچھے لوگوں کو اپنا غلام بنا لینے کے بعد حارث مزید بے باک ہو گیا تھا۔ پہلے لوگ زیادہ تھے اور ان میں جوان مردوں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے حارث اسلحے کی طاقت کے باوجود ان سے ڈرتا تھا۔ اب کم لوگ رہ گئے تھے اور ان میں بھی بیشتر بوڑھے اور کمزور تھے۔ اس لیے اس نے بے خوف ہو کر گاؤں کی ساری زمین پر قبضہ کر لیا۔ وہ اس پر پوست اور حشیش کے پودے کاشت شروع کرانے لگا اور اسے دوسروں کی نظروں سے چھپانے کے لیے زمین کے اردگرد اور درمیان میں جھاڑیاں لگوانا شروع کر دیں۔

رازداری کا یہ سارا اہتمام وہ امریکنوں کے لیے کررہا تھا جو اس کے مربی اور آقا تھے اور اس کی ساری منشیات امریکا ہی جاتی تھی۔ امریکی ایک ایسے ناگ کی پرورش کررہے تھے جو اس کے لوگوں کو بھی اپنے زہر کا عادی بنا رہا تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ دنیا کی نوّے فیصد ہیروئن اور حشیش گولڈن ٹرائی اینگل سے آتی تھی۔ مشرق بعید میں تھائی لینڈ، لاؤس اور برما کے درمیان پھیلا ہوا گولڈن ٹرائی اینگل صرف منشیات اور دہشت گردی کی وجہ سے مشہور ہوا تھا۔ ایسا ہی ایک خطہ سنہری ہلال کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ سنہری ہلال ایران، ترکی اور عراق کے درمیان میں ایک خطہ ہے اور یہاں کے لوگوں کا سب سے بڑا پیشہ منشیات اگانا اور اسے فروخت کرنا ہے۔ اس سارے خطے میں کرد قوم آباد ہے۔ گویا کردوں کا سب سے بڑا پیشہ یہی ہے۔ حارث نے بھی اپنا آبائی پیشہ اپنا رکھا تھا۔

گاؤں کے بوڑھے، بچے اور عورتیں کمانے والوں سے محروم ہوگئے تھے اس لیے اب ان کو کھانے کے لالے پڑ گئے تھے۔ حارث کو ان سے کام لینا تھا اس لیے وہ ان کو خوراک مہیا کرنے لگا لیکن یہ بس اتنی ہوتی تھی کہ جسم و جان کا ناطہ برقرار رہے۔ ایمن بھی قادر کے ساتھ زمین پر کام کرتی تھی۔ ابھی فصل کی بوائی جارہی تھی۔ جب ان کو روکا گیا تھا تو ایمن کا خیال تھا کہ حارث کے درندے کچھ دن میں گاؤں کی بچی ہوئی جوان عورتوں اور لڑکیوں کو لے جائیں گے۔ لیکن جب ان کی طرف سے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا تو اسے حیرت ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ کام کرنے والی ایک عورت نے ایمن کو بتایا۔

”یہ اتنے اچھے نہیں ہیں۔ درندوں کو بھی ہم پر رحم آ سکتا ہے لیکن ان کو نہیں آ سکتا۔“ عورت نے تلخی سے کہا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ ان کو ابھی زمین پر کام کرنے والوں کی کمی ہے اس لیے یہ عورتوں اور لڑکیوں کو نہیں اٹھا رہے ہیں جب ان کا کام نکل جائے گا تو یہ بھوکے کتوں کی طرح ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔“

ایمن دہشت زدہ ہوگئی تھی اس نے بے ساختہ کہا۔ ”نہیں میں مرجاؤں گی لیکن ان لوگوں کو خود کو ہاتھ لگانے نہیں دوں گی۔“

”ہمارے اختیار میں اپنی مرضی سے مرنا بھی کہاں ہے؟“ عورت نے کہا تھا۔

ایمن سوچنے لگی کہ خدا کے سوا ان کو کون بچا سکتا ہے تو اس کے ذہن میں حریت پسندوں کا خیال ہی آیا تھا۔ لیکن وہ بے چارے خود مارے مارے پھرتے تھے ان کی مدد کے لیے خاص طور سے کیسے آتے۔ ویسے بھی ان کے ایک بار کے حملے کی سزا اب تک وہ لوگ بھگت رہے تھے۔ ایمن اور دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ حارث کے قلعے پر حریت پسندوں کے حملے کے جواب میں گاؤں کے لوگوں پر بمباری کی گئی تھی۔ یہ ایک طرح سے سزا تھی جو عام لوگوں کو حریت پسندوں کی خاموش حمایت پر دی جارہی تھی۔ امریکیوں کو اس سے کوئی غرض نہیں تھا کہ وہ جن کی حمایت کررہے تھے اور جن کو اس ملک کا مالک بنا دیا تھا وہ سب چھٹے ہوئے بدمعاش اور ظالم تھے۔ ان کے ہاتھ پہلے بھی بے گناہوں کے خون سے رنگے تھے لیکن جب وہ امریکی مدد سے ملک پر قابض ہوئے تو انہوں نے لوگوں پر قیامت ڈھا دی تھی۔ قتل و غارت گری، لوٹ مار اور عورتوں کی بے حرمتی کا طوفان امنڈ آیا تھا۔ ان کے مظالم کی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کرنے لگے تھے اور ان کی حمایت متحارب قوتوں سے بڑھ گئی تھی اور ان کو اسی کی سزا بلاوجہ کی بمباری سے دی جارہی تھی۔ ایسے پے در پے واقعات کی وجہ سے حریت پسند اپنی کاروائیوں میں محتاط ہوگئے تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ حملے آبادیوں سے دور رکھیں۔

ایمن نے ایک رات سونے سے پہلے قادر سے کہا۔ ”کیا تو یہاں سے نکل نہیں سکتا ہے؟“

”میں نکل کر کہاں جاؤں؟“ قادر نے سوال کیا۔

”تو جا کر حریت پسندوں کی مدد لا سکتا ہے وہی ان لوگوں سے ہمیں نجات دلا سکتے ہیں۔ ورنہ کچھ دن بعد....“ ایمن کہتے کہتے رک گئی۔ اسے بھائی کے سامنے یہ سب کہتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ قادر تیرہ سال کا تھا لیکن حالات نے اسے وقت سے پہلے سمجھ دار بنا دیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس کی بہن اور دوسری جوان عورتوں کو اپنی عزت کی فکر لاحق ہے۔

”اگر میں گیا تو یہ تجھ سے پوچھیں گے نہیں۔“

”نہیں میں کہہ دوں گی کہ تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور تجھے باری کا بخار ہوگیا ہے اس لیے تو دو تین دن نہیں آ سکتا۔“

”اگر ایسا ہے تو میں جا سکتا ہوں۔ لیکن مجھے زیادہ دن ہوگئے تو؟“

خود ایمن کے ذہن میں بھی یہ خدشہ تھا کہ قادر کو زیادہ

دن بھی لگ سکتے تھے اور یہ بھی ممکن ہوتا کہ وہ ناکام رہتا اور واپس ہی نہیں آپاتا۔ اس صورت میں ایمن کو عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑتا۔ لیکن ایسا نہ کرنے کی صورت میں بھی اس کا اور یہاں موجود دوسری عورتوں کا یہی انجام ہوتا۔ صرف زمین پر کام کرنے کی وجہ سے وہ بچی ہوئی تھی۔ اس بہانے اگر قادر نکل جاتا اور اس کی جان بچ جاتی تو ایمن کے لیے یہ سودا بھی مہنگا نہیں تھا۔

''تم اللہ کا نام لے کر نکل جاؤ۔'' ایمن نے کہا۔ ''ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے۔ آگے اللہ مالک ہے۔''

قادر کو خیال آیا۔ ''تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

''نہیں ہم دونوں غائب ہوئے تو ہماری تلاش شروع ہوجائے گی اور یہ ہمیں پکڑلیں گے۔ تم جاؤ گے تو میں چھپا لوں گی۔''

قادر مان گیا اس نے تیاری کی اور آنے والی رات چپکے سے گاؤں سے نکل گیا۔ اس ساری رات ایمن بے چینی سے جاگتی رہی تھی۔ ہلکی سی آواز پر اس کا دل دھڑک جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ ابھی فائرنگ کی آواز آئے گی اور اگلی صبح قادر کی لاش آئے گی۔ لیکن رات بھر امن رہا کوئی فائر نہیں ہوا۔ صبح جب وہ کھیتوں میں کام کرنے کے لیے باہر آئی تو حارث کے نگرانی کرنے والے آدمی نے اس سے کہا۔ ''تیرا بھائی کہاں ہے؟''

''اسے رات سے بہت تیز بخار ہے ابھی تو بے ہوش پڑا ہے۔'' ایمن نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا اگر نگران اس کی بات کا یقین نہیں کرتا اور قادر کو دیکھنے پر اصرار کرتا تو اس کا راز یہیں کھل جاتا۔ لیکن نگران نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اور اس کے ساتھی روز صبح گاؤں والوں کو جمع کرکے زمین پر لے جاتے تھے اور ان کو شام سورج غروب ہونے کے بعد واپس آنے کی اجازت ملتی تھی۔ حارث کی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ رقبے پر منشیات کاشت کرے۔ صرف بہت بوڑھے، معذور اور دس سال سے کم عمر بچوں کو چھوٹ تھی۔ باقی ہر شخص کو کام کرنا پڑتا تھا۔

آج کی دنیا میں منشیات کا مطلب دولت ہے اور دولت سے اسلحہ خریدا جاتا ہے اور جس کے پاس زیادہ اسلحہ ہوتا ہے وہی زندہ رہنے کا حق دار ہوتا ہے۔ اس لیے عراق کے بہت سارے جنگجو سردار جو امریکیوں کی حمایت سے اپنے لوگوں پر حکمرانی کر رہے تھے۔ وہ دولت سے اسلحہ اور جنگجو حاصل کرتے تھے۔ دولت کے لیے منشیات کاشت کرتے تھے۔ امریکی جوان کی حمایت کے محتاج تھے وہ ان کی منشیات کی فصلوں سے سرف نظر کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ عراق میں چند سال پہلے منشیات کی پیداوار نہ ہونے کے برابر تھی اب وہاں بہت بڑی مقدار میں منشیات پیدا کی جا رہی تھی اور مغرب کو بھیجی جارہی تھی۔

حارث صرف ایک تھا اور ایسے ہزاروں جرائم پیشہ پورے ملک میں بکھرے ہوئے تھے اور خاص طور سے سرحدی علاقوں میں منشیات کاشت کرنے میں مصروف تھے۔ لیکن وہ صرف منشیات کاشت نہیں کر رہے تھے بلکہ اس سرزمین پر تشدد اور مظالم کی ایسی فصل بو رہے تھے جو آنے والے دنوں میں خونریزی کی نئی کھیتی بننے والی تھی۔ ایک لاوا تھا جو اندر ہی اندر ان کے خلاف پک رہا تھا اور لوگ ان سے تنگ آچکے تھے۔ ان کو بھی معلوم تھا کہ وہ اس وقت تک اپنی جگہ پر ہیں جب تک ان کے مربی اور سرپرست امریکی یہاں ہیں جس دن امریکی عراق سے رخصت ہوئے اور اقتدار لوگوں کے ہاتھ میں آیا اس دن ان کو بھی یہاں سے بھاگنا ہوگا۔

ایمن اور اس کے گاؤں کے لوگ منتظر تھے کہ کب ان لوگوں کے مظالم سے نجات ملتی ہے۔ وہ مایوس تھے موجودہ حالات میں موت ہی ان کو نجات دلاسکتی تھی اور موت آجاتی تب بھی وہ اس کے احسان مند ہوتے۔ ذلت کے جینے سے عزت سے مرجانا بہتر تھا۔ مگر یہاں تو مرنا بھی اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ ایمن واپس گھر آئی اور اس رات اسے بہت ڈر لگا تھا۔ وہ اکیلی تھی اور سناٹے میں ذرا سی آہٹ بھی ہوتی تھی تو وہ اچھل پڑتی تھی۔ شدید گرمی میں بھی وہ دروازہ اندر سے بند کرکے سوئی تھی۔

اگلے روز نگران نے پھر اس سے پوچھا تو اس نے قادر کے بارے میں کہا۔ ''اس کا بخار ابھی تک نہیں اترا ہے۔ وہ تو چلنے کے قابل بھی نہیں ہے۔''

''اگر وہ کل نہیں آیا تو اس کے حصے کا راشن نہیں ملے گا۔'' نگران نے ایمن کو دھمکی دی۔ ''مفت خوروں کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''وہ بستر سے نہیں اٹھ پارہا ہے۔''

''اگر اٹھ نہیں سکتا تو بھوکا مرے۔'' نگران نے سفاکی سے جواب دیا۔

ایمن شام کو گھر آئی تو اسے فکر ہو رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ اگر کل بھی اس نے یہی بہانہ کیا تو نگران خود دیکھنے

آجائے گا کیونکہ ان دنوں کام جاری تھا اور ایک ایک آدمی کی اشد ضرورت تھی۔ قادر کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا وہ حریت پسندوں تک پہنچا تھا یا نہیں پہنچا تھا۔ تیسرے دن ایمن کام کے لیے گھر سے نکلی تو نگران نے اسے اکیلا دیکھ کر کہا۔ ''آج سے تیرے بھائی کا راشن بند ہوگا۔''

''وہ پہلے ہی بیمار ہے خوراک نہ ملی تو مر جائے گا۔'' ایمن نے التجا کی۔ اس کا مقصد تھا کہ نگران کو شک نہ ہو کہ قادر گھر پر نہیں ہے۔

''مر جائے۔'' نگران نے بے پروائی سے کہا۔ ''ہمارے پاس صرف کام کرنے والوں کے لیے خوراک ہے۔''

ایمن زمین پر آئی جہاں پودوں کی بوائی جاری تھی۔ وہ کام کرنے لگی۔ دوپہر کو حارث خود زمین کا معائنہ کرنے آیا تو اس نے قادر کی کمی محسوس کر لی تھی۔ اس نے نگران سے پوچھا۔ ''ایک لڑکا نظر نہیں آرہا ہے؟''

''وہ اس لڑکی کا بھائی ہے اور اس کی طبیعت دو دن سے خراب ہے۔'' نگران نے ایمن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

حارث نے بہ غور ایمن کو دیکھا۔ اس کی نگاہ میں ہوس چمک رہی تھی ''کیا ہوا تیرے بھائی کو؟''

''وہ بیمار ہے۔'' ایمن نے اس کی نگاہوں سے سہم کر جواب دیا۔

حارث نے نگران کی طرف دیکھا۔ ''تو نے اس کے بھائی کو دیکھا کہیں جھوٹ تو نہیں بول رہی ہے؟''

ایمن کا سانس رک گیا تھا اور نگران بھی پریشان نظر آنے لگا تھا۔ پھر اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے خود دیکھا ہے وہ گھر پر ہی ہے اور بیمار ہے۔''

نگران نے اس لیے جھوٹ بولا تھا کہ اگر وہ سچ بول دیتا تو حارث یہیں اس کی کھال اتار دیتا اور یہ بھی ممکن تھا وہ اسے گولی مار دیتا، اپنے آدمیوں کے معاملے میں بھی وہ کم سفاک نہیں تھا۔ نگران کی بات نے اسے مطمئن کر دیا۔ اس نے ایک بار پھر للچائی نظروں سے ایمن کی طرف دیکھا اور نگران سے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اس کا خاص خیال رکھنا۔''

نگران اس کی بات سمجھ گیا تھا اس نے دانت نکال کر کہا۔ ''آپ فکر ہی نہ کریں جناب۔''

نگران سمجھ گیا تھا کہ ایمن حارث کی نظروں میں آگئی تھی۔ وہ بلا کا عیاش آدمی تھا۔ وہ اب اس تباہ شدہ گاؤں کی بچ جانے والی جوان عورتوں اور لڑکیوں پر قابض ہونے کی فکر میں تھا۔

حارث کے جانے کے بعد نگران ایمن کے پاس آیا اور آہستہ سے کہا۔ ''تیرا بھائی گھر پر ہی ہے نا؟''

''ہاں۔'' ایمن نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

''میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔'' نگران اس کے لہجے سے اور بھی کھٹک گیا تھا۔ ''اگر وہ وہاں نہیں ملا تو تو سوچ سکتی ہے تیرے ساتھ کیا ہوگا۔''

ایمن لرز گئی تھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ اس نے ملتجی انداز میں کہا۔ ''اللہ کے لیے.... میرا بھائی گھر میں نہیں ہے۔''

نگران بھی پریشان ہوگیا تھا۔ ''پھر کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' ایمن نے جھوٹ بولا۔ ''وہ تین دن سے گھر سے غائب ہے۔''

یہ سن کر نگران کے ہوش اڑ گئے تھے۔ کیونکہ اس نے حارث سے کہہ دیا تھا کہ وہ ایمن کے بھائی کو گھر پر دیکھ چکا ہے۔ اگر حارث کے اس کے جھوٹ کا پتا چل جاتا تو عبرت ناک موت اس کا مقدر بنتی۔ نگران نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور کسی کو پاس نہ پا کر ایمن سے کہا۔ ''تم نے مجھے بھی مروا دیا ہے۔ اگر تمہارا بھائی نہ ملا تو میں بھی مارا جاؤں گا۔ وہ کہاں گیا ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' ایمن سہم گئی۔

نگران نے ایمن کا بازو سختی سے پکڑا اور بولا۔ ''آج شام تک اگر تیرا بھائی نہ ملا تو میں تجھے سردار کے سامنے لے جاؤں گا۔''

ایمن نے ذرا جرأت کا مظاہرہ کیا۔ ''اگر تم مجھے اس کے سامنے لے گئے تو میں تمہارے جھوٹ کا بھی بتا دوں گی۔''

نگران کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا تھا اگر قادر نہ آتا تب بھی اس کی شامت تھی اور اگر وہ حارث کو سب سچ بتا دیتا تب بھی مارا جاتا۔ وہ ایمن کو ڈرانے دھمکانے لگا کہ وہ بتا دے قادر کہاں چھپا ہے۔ ایمن نے کہا۔ ''میں خود نہیں جانتی شاید وہ گاؤں سے چلا گیا ہے۔''

نگران الجھ گیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورت حال سے کس طرح نکلے۔ شام ہوئی تو سب کو گھر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ ایمن سہمی ہوئی گھر تک

آئی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ اس کا انجام قریب تھا کیونکہ کل قادر نہیں ہوتا تو حارث کو لازمی شک ہو جاتا اور وہ اس کے گھر کی تلاشی لیتا تو قادر نہیں ملتا اور اس کے بعد اس کے ساتھ جو ہونا تھا اس کا سوچ کر ہی ایمن کی روح لرز رہی تھی۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ ایسا وقت آنے سے پہلے کچھ ہو جائے اگر قادر حریت پسندوں کی مدد لے کر نہیں آتا ہے تو اسے موت ہی آ جائے۔

یہ رات اس نے سہم سہم کر گزاری تھی۔ جیسے جیسے صبح قریب آ رہی تھی ایمن کی جان نکلی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ صبح کا سورج نہیں دیکھ سکے گی۔ صبح سے پہلے اسے ایک خیال آیا کہ وہ کوشش کیوں نہ کرے خود بھی گاؤں سے نکل جائے۔ اگر وہ کامیاب رہی تو بچ جائے گی اور ناکام رہی تو ماری جائے گی۔ اس طرح بھی وہ کم سے کم ان درندوں کا شکار ہونے سے تو بچ جائے گی۔ وہ ڈر رہی تھی لیکن صبح سے پہلے اس نے ہمت کر لی اور گھر سے نکل آئی۔ اس نے جھاڑیوں والے میدان کا رخ کیا۔ اس طرف کی نگرانی ذرا کم تھی اور وہ ان جھاڑیوں سے اچھی طرح واقف تھی اگر وہ ان میں گھس جاتی تو کوئی اسے مشکل سے ہی تلاش کر سکتا تھا۔

وہ گلیوں میں چھپتی چھپاتی ہوئی جھاڑیوں کی طرف جانے لگی تھی۔ وہ گاؤں کی آخری حد تک آئی۔ جس کے بعد ایک چھوٹا سا میدان تھا اور اس کے بعد جھاڑیاں شروع ہو جاتیں۔ اصل مرحلہ اس میدان کو عبور کرنا تھا۔ اس دوران میں پہریداروں کی نظر اس پر پڑ جاتی تو وہ اسے گولی مار دیتے۔ چاند نہیں تھا لیکن ستاروں کی ہلکی سی روشنی تھی۔ ابھی وہ میدان عبور کرنے کی ہمت کر رہی تھی کہ اسے قلعے کی طرف سے فائرنگ کی آواز آئی۔ وہ سہم کر ایک ویران مکان میں گھس گئی۔ فائرنگ کی آواز میں دم بہ دم تیزی آ رہی تھی پھر اس میں دھماکے بھی شامل ہو گئے۔ ایمن نے ہمت کر کے مکان کی چھت پر چڑھ کر دیکھا۔ حارث کے قلعے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ایمن خوش ہو گئی یقیناً وہاں پر حریت پسندوں نے حملہ کیا تھا لیکن حارث کے آدمی بھی شدید مزاحمت کر رہے تھے۔ یہ گھر قلعے سے زیادہ دور نہیں تھا اس لیے ایمن کو فائرنگ کرنے والے تک نظر آ رہے تھے۔ حریت پسندوں نے قلعے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جلد حارث کے بچے کچے ساتھیوں پر حاوی آ جائیں گے اور اس کے بعد حارث اور اس کے ساتھی کتے کی موت مارے جائیں گے۔

لیکن عین اس وقت جب حریت پسند قلعے میں گھسنے کے قریب تھے۔ صبح کی روشنی کے ساتھ ہی فضا میں دو امریکی گن شپ ہیلی کاپٹر نمودار ہوئے اور انہوں نے آتے ہی حریت پسندوں پر شیلنگ شروع کر دی۔ چند منٹ میں جنگ کا پانسا پلٹ گیا۔ حریت پسند جو کامیابی کے قریب تھے اب اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن آسمان سے برستی آگ سے کہیں جائے اماں نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے قلعے کے سامنے والا میدان حریت پسندوں کی لاشوں سے بھر گیا تھا اور جو زندہ تھے وہ شدید زخمی تھے۔ امریکی گن شپ ہیلی کاپٹر اپنا کام کر کے وہاں سے روانہ ہوئے تو اندر سے حارث اور اس کے بچے کچے ساتھی نکلے اور انہوں نے زندہ بچ جانے والے حریت پسندوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے جمع کرنا شروع کر دیا۔ وہ ان کو پکڑ کر اور ان کے ہاتھ باندھ کر ان کو قلعے کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر رہے تھے۔ ان کی تعداد چھ سات تھی۔ پھر ایمن نے دیکھا ان میں اس کا بھائی قادر بھی تھا۔ وہ شدید زخمی تھا اور اس کے ایک بازو سے مسلسل خون بہہ رہا تھا لیکن اس کی پرواہ کیے بغیر اسے بھی قلعے کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد حارث اور اس کے آدمیوں نے ان پر فائر کھول دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب بھی اپنے خون میں نہا گئے تھے۔ ایمن نے بڑی مشکل سے اپنی چیخیں روکی تھیں۔ وہ منہ دبا کر رو رہی تھی ورنہ اس کی دھاڑیں قلعے تک جاتیں جس کا بیشتر حصہ اب آگ کی لپیٹ میں تھا۔

حارث اور اس کے بچ جانے والے آدمی قلعے سے اپنا سامان اور اسلحہ نکال رہے تھے ان کے پاس تین چار گاڑیاں بھی تھیں۔ انہوں نے سامان اور اسلحہ نکالنے کے بعد گاڑیوں پر گاؤں کا رخ کیا۔ پہلے تو ایمن سمجھی کہ وہ شاید گاؤں والوں کو قتل کرنے آ رہے ہیں۔ مگر ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ اصل میں قلعے کی تباہی کے بعد حارث کے لیے اس جگہ رہنا ممکن نہیں تھا اور اب اس کے پاس زیادہ آدمی بھی نہیں رہے تھے جو باقی بچے تھے ان کی تعداد درجن سے زیادہ نہیں تھی اور اتنے آدمیوں کے ساتھ وہ یہاں اپنی حکمرانی قائم نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا تھا اور جاتے جاتے وہ گاؤں میں رہ جانے والی جوان عورتوں اور لڑکیوں کو بھی لے جانا چاہتا تھا۔

اس کے آدمیوں کو معلوم تھا کہ عورتیں اور لڑکیاں کن

کن گھروں میں تھیں۔ وہ ان گھروں سے ان کو کھینچ کھینچ کر باہر لانے اور گاڑیوں میں ڈالنے لگے۔ ایک بار پھر شور اٹھا تھا۔ عورتیں اور لڑکیاں چلّا رہی تھیں ان کے گھر والے شور کر رہے تھے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ کچھ نے مزاحمت کی تو حارث اور اس کے آدمیوں نے بلا تکلف ان کو شوٹ کر دیا۔ ایمن نے دیکھا کہ حارث نگران کے ساتھ اس کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ گویا وہ اسے بھولا نہیں تھا۔

ایمن کو خطرے کا احساس ہوا وہ لوگ اسے گھر میں نہیں پاتے تو لازماً گاؤں میں تلاش کرتے۔ یہاں چھپنے کی جگہ نہیں تھی وہ جلد یا بدیر اسے تلاش کر ہی لیتے۔ چھپنے کے لیے اس کے پاس ایک ہی جگہ تھی۔ یعنی جھاڑیاں جن میں وہ گھس جاتی تو اسے تلاش کرنا آسان نہ ہوتا۔ وہ مکان سے نکلی اور تیر کی طرح جھاڑیوں کی طرف بھاگی۔ نگرانی کرنے والی چوکیوں سے پہریدار حملے کے وقت ہی چلے گئے تھے۔ اس لیے وہاں سے اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا لیکن بدقسمتی سے عین اس وقت جب وہ جھاڑیوں میں گھسنے والی تھی۔ حارث کے ایک آدمی کی نظر اس پر پڑ گئی اور اس نے چلّا کر دوسروں کو خبردار کیا۔ فوراً ہی ایک گاڑی اس کے پیچھے آئی۔ لیکن اس دوران ایمن جھاڑیوں میں گھس چکی تھی۔ وہ اندر ہی اندر گھستی گئی اور ان جھاڑیوں کے سب سے گھنے حصے میں آ گئی۔

باہر شور تھا اس کی تلاش میں حارث کے آدمی جھاڑیوں میں گھس آئے تھے۔ ایمن نے حارث کے چلانے کی آواز سنی وہ اپنے آدمیوں سے کہہ رہا تھا کہ ایمن کو ہر قیمت پر تلاش کریں۔ وہ خود بھی جھاڑیوں میں اسے دیکھ رہا تھا۔ ایمن کو محسوس ہوا کہ وہ اس جگہ بھی محفوظ نہیں تھی۔ اس لیے وہ آہستہ آہستہ وہاں سے بھی دور جانے لگی۔ حارج اور اس کے آدمی منظم طریقے سے پھیل کر اسے تلاش کر رہے تھے اور وہ ایک ایک جھاڑی دیکھ رہے تھے۔ اب ایمن کو احساس ہوا کہ یہ جھاڑیاں اتنی بھی محفوظ نہیں تھیں اور تلاش کرنے والے زیادہ ہوں تو وہ جلد یا بدیر کسی کو بھی ان جھاڑیوں میں تلاش کر سکتے تھے۔ وہ رفتہ رفتہ ایمن کے قریب آ رہے تھے اور وہ ان سے دور جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسے احتیاط سے حرکت کرنا پڑ رہی تھی کیونکہ اگر وہ آہٹ کرتی تو اسے تلاش کرنے والے جان جاتے کہ وہ

ایجاد و صنعت کے لحاظ مسلمانوں کا اہم کام کاغذ کا رواج ہے۔ اس کے اصل موجد تو چینی تھے۔ مگر مسلمانوں نے بغداد، دمشق، نیشاپور، شیراز، خراسان، مراکش، قرطبہ، غرناطہ اور سسلی وغیرہ میں کاغذ سازی کے کارخانے لگائے اور پہلی بار انہیں کتابوں اور تحریروں کے لیے استعمال کیا۔ موسیو لیبان لکھتا ہے کہ کاغذ پر پہلی تحریر عربوں ہی کی تھی۔ اسی طرح قطب نما کا استعمال بھی مسلمانوں ہی نے کیا اور شورے کے استعمال کو ترقی دے کر بارود ایجاد کیا۔ توپ کو سب سے پہلے افریقا کے سردار یعقوب نے 1205ء میں استعمال کیا اور سلطان مراکش ابو یوسف نے پہلی بار توپ بنانے کا کارخانہ لگایا۔ مسلمانوں کی قابل ذکر ایجاد گھڑی اور کلاک ہے۔ مسلمانوں نے عجیب و غریب قسم کی گھڑیاں بنائیں۔ جن کے تذکروں سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ ول ڈیوران لکھتا ہے کہ اسپین کے ایک مسلمان ابن فرناس نے تین چیزیں ایجاد کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اول عینک کا شیشہ، دوم وقت بتانے والی گھڑی اور سوم ہوا میں اڑنے والی مشین۔ اسی طرح پہلا چھاپہ خانہ بھی اسپین میں لگا۔ جس پر عبدالرحمان اول (788ء) کے احکام چھپتے تھے۔ تاریخ میں ماہ نخشب کا ذکر عموماً آتا ہے۔ یہ وہ مصنوعی چاند ہے، جسے ترکستان کے ایک شخص حکم بن ہاشم نے بنایا تھا۔ یہ چاند نخشب کے ایک کنوئیں سے نکلتا، اندازاً سو مربع میل کے رقبے کو منور کرتا اور طلوع آفتاب سے پہلے ڈوب جاتا۔

اس دور میں چند شہر اپنی مصنوعات کی وجہ سے مشہور تھے۔ موصل کی ململ، دمشق اور طلیطلہ کی تلواریں، عدن کے ادنیٰ کپڑے، حلب کے شیشے، رے کے رنگین برتن۔ رقہ کے صابن، ایران کے قالین اور نیشاپور کا عطر مشہور تھے۔

مرسلہ: یعقوب عثمانی، کراچی

کہاں ہے۔ اس وجہ سے اس کی رفتار سست تھی جب کہ اس کے پیچھے آنے والے تیز حرکت کر رہے تھے۔ پھر کسی نے اس کی جھلک دیکھ لی اور چلا کر دوسروں کو خبردار کیا۔ ایمن جلدی سے دوسری جھاڑیوں میں گھسی اور پھر بے تحاشہ بھاگنے لگی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اس کے پیچھے شکاری کتے ہوں جو اسے پھاڑ کھانا چاہتے ہوں اور حقیقت میں کچھ دیر میں ایسا ہونے والا تھا۔ اس کے پیچھے آنے والے دو پیروں والے کتے تھے اور اصلی کتوں سے کہیں زیادہ خطرناک تھے۔

ایک جگہ جھاڑیوں میں اس کی چادر الجھی اور اس نے چھڑانے کی کوشش کی مگر چادر زیادہ ہی الجھ گئی تھی مجبوراً وہ چادر چھوڑ کر بھاگی۔ اس طرح اسے آسانی بھی ہو رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں میں جہاں راستہ نظر آرہا تھا گھسی جا رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا لیکن وہ رک نہیں سکتی تھی کیونکہ پیچھے آنے والوں کا شور کچھ زیادہ ہی سنائی دینے لگا تھا۔ وہ سچ مچ شکاری کتوں کی طرح اس کے پیچھے آرہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے ایک جگہ اسے ٹھوکر لگی اور اس نے دیکھا وہ شاہراہ کے سامنے تھی لیکن اس کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ جھاڑیوں میں رہے اس سے باہر نکلتی تو فوراً ہی پکڑی جاتی اور اس کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوتا اس کا سوچ کر ہی اس کی روح فنا ہونے لگی تھی۔ وہ فوراً کھڑی ہوگئی۔ لیکن جیسے ہی اس نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا۔ اس کا پاؤں مٹی میں دبی کسی چیز پر گیا اور کلک کی آواز آئی۔ اس کا پاؤں وہیں رک گیا تھا اور ایک لمحے کو اس کے دل کی دھڑکن بھی رک گئی تھی۔ اب اسے خیال آیا کہ یہ جگہ اسے جانی پہچانی کیوں لگ رہی تھی یہیں حریت پسندوں نے امریکی بکتر بند گاڑیوں کو تباہ کرنے کے لیے بارودی سرنگیں بچھائی تھیں۔ انہوں نے زیادہ تعداد میں سرنگیں استعمال کی تھیں جن میں سے کچھ ان کے کام آئی تھیں اور کچھ باقی رہ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک بارودی سرنگ پر اس کا نام لکھا تھا۔ اس کا پاؤں اس پر آنا تھا اور وہ اس وقت موت پر کھڑی تھی۔

بارودی سرنگیں دو طرح کی ہوتی ہیں ایک وہ جن پر جیسے ہی مطلوبہ وزن آتا ہے وہ پھٹ جاتی ہیں اور دوسری جب ان پر وزن آتا ہے تو وہ ایکٹی ویٹ ہوتی ہیں جیسے ہی وزن ہٹتا ہے وہ پھٹ جاتی ہیں یہ بکتر بند گاڑیوں کو تباہ کرنے والی بارودی سرنگ تھی اور یہ ایکٹی ویٹ ہو کر پھٹتی تھی جب بکتر بند کا ٹائر ان پر سے گزر جاتا اور فرش والا حصہ ان کے اوپر ہوتا۔ اس طرح نقصان زیادہ ہوتا تھا۔ اگر وہ پاؤں ہٹا لیتی تو سرنگ فوراً ہی پھٹ جاتی۔ اس کے لیے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اب اس کی زندگی اس وقت تک تھی جب تک وہ بارودی سرنگ پر دباؤ ڈالے ہوئے تھی۔ جیسے ہی وہ پاؤں ہٹاتی وہی اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہوتا۔

لیکن وہ پاؤں نہ ہٹاتی تب بھی بچ نہیں سکتی تھی۔ اس کے پیچھے لگے شکاری کتے کسی بھی لمحے اس تک پہنچنے والے تھے۔ وہ اسے یہاں سے لے جانے کے لیے بارودی سرنگ سے ہٹا دیتے۔ گویا ہر طرح سے موت ہی اس کا مقدر تھی۔ ایمن نے گہری سانس لی۔ تعاقب میں آنے والے پاس آگئے تھے۔ وہ درندوں کی طرح غرا رہے تھے اور اسے تلاش کر رہے تھے۔ وہ اسے پانے اور پھر پھاڑ کھانے کے لیے بے چین تھے۔

ایمن ان کی منتظر تھی پھر اسے ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا اور مسکرا دی تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا وہ اس دنیا سے اکیلے نہیں جائے گی بلکہ کچھ ظالموں کو اپنے ساتھ لے کر جائے گی۔ اسے تو مرنا تھا اگر وہ اس دھرتی کا کچھ بوجھ کم کر دیتی تو یہ سودا زیادہ برا نہیں تھا۔ پہلے وہ ان لوگوں سے بھاگ رہی تھی اور اب اسے ان کا انتظار تھا۔ ان لوگوں کی آوازیں قریب آرہی تھیں اور جب سب سے آگے حارث نمودار ہوا تو اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اسے سکون سے کھڑے دیکھ کر وہ بھی رک گیا تھا پھر اس نے دانت نکوس کر کہا۔ ''تجھے پتا چل گیا نا.... ہم سے بچ کر کہاں جائے گی۔''

''ہاں مجھے پتا چل گیا ہے میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' ایمن نے مرتعش لہجے میں کہا ویسے بھی اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ''آؤ مجھے لے چلو۔''

''تجھے لینے کے لیے تو آیا ہوں اب تو ہی تو ایک بڑی بچی ہے۔'' حارث اس کے پاس آتا ہوا بولا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ایمن چادر کے بغیر تھی اور وہ حریص نظروں سے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔

ایمن زور سے ہنسی۔ ''تم مجھے لینے کے لیے آئے ہو .....لیکن تم مجھے نہیں لے جا سکو گے۔ میں تمہیں لے جاؤں گی۔''

''بکواس نہ کر۔'' حارث نے غرا کر کہا اور اس کا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا تھا اور ایمن کا پاؤں بارودی سرنگ سے ہٹ گیا۔ دھماکا ہوا ایک پھول بکھر گیا اور دھرتی کا بوجھ کچھ کم ہوگیا۔

❋❋

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا اٹھارھواں حصہ

میں نے نسرین کو فون کیا۔ فون بند ہونے کے بعد بھی کچھ دیر تک میں پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑا رہا، سوچتا رہا پھر سر کو جھٹکا اور مڑا تو دیکھا تینوں میری جانب متوجہ تھے۔ ان کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔

شاید وہ پوچھنا چاہتے تھے کہ ہوا کیا ہے مگر میں نے جواب دینے کی بجائے جیکٹ پہنی اور انہیں نظر انداز کر کے باہر آگیا۔

آج سردی پورے زور پر تھی۔ تیز یخ بستہ ہوئیں چل

رہی تھیں۔ ہم سے اپنی جیکٹیں بھی سنبھالے نہ سنبھلتی تھیں۔ مارچ میں یہ موسم ایک ناگہانی آفت کی طرح نازل ہوا تھا۔ پھر بھی وہ سب میرے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔ کچھ دیر تک وہ سب خاموشی کی چادر اوڑھے رہے پھر یکا یک سرجی کی آواز گونجی۔ انہیں مخالف سمت چلتی تیز ہوا کی وجہ سے آگے بڑھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ کپکپاتے ہوئے ہوا سے مخاطب ہوئے۔ ''آج تو تیرے یہ مزاج ہیں کہ آج چلوں پھر نہ چلوں گی۔''

شہباز اپنے سر پر اپنی ٹوپی کو نیچے کھینچتے ہوئے بولا۔

''سرجی کے دماغ میں شاید فراسٹ بائٹ ہوگیا۔''

ہم اس عالم میں اپنی اپنی کہہ رہے تھے اور جواب کسی کو نہ دیتے تھے۔

ٹھنڈی ہوا ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔ جسم کو چھید رہی تھی۔

سرجی کی بات بجا تھی۔ بس کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑے رہنا دشوار تھا۔ شاید میری طرح ان سب کے دل و دماغ میں ایک ہی دعا گونج رہی ہو کہ بس جلدی آجائے لیکن دور دور تک بس کا پتا نہ تھا۔ شاید ٹھنڈ کی وجہ سے انتظار کا وقفہ طویل ہوتا محسوس ہورہا تھا۔ ہم مایوس ہو چلے تھے کہ سڑک پر دور بہت دور ایک دھبا سا نظر آیا جو دھیرے دھیرے واضح ہوتا جارہا تھا۔ وہ بس تھی جو ہمارے لیے خوشیوں کی نوید بن کر چلی آرہی تھی۔

ہم سب کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ سرجی نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ''ایسے آئے خوشی جیسے چلے پروائی۔''

''اپنا سیاپا بند کرو۔'' شہباز نے جھڑکا۔

سرجی بس کے پائیدان پر رک کر تیز نظروں سے اسے گھورنے لگے۔ میں پہلے ہی نسرین کے الٹی میٹم سے پریشان تھا کہ کہیں یہ دونوں لڑ نہ پڑیں اس لیے انہیں آگے کی طرف دھکیلا۔ وہ ہوں ہوں کرتے ہوئے بس میں داخل ہوگئے۔

بس کے اندر حدت تھی۔ سیٹ پر بیٹھے ہوئے مفتی نے کہا۔ ''اب ایک گھنٹے تک ٹھنڈ ستائے گی نہیں۔''

''کیوں؟ کیا ایک گھنٹے بعد بس کی تمام کھڑکیاں کھول دی جائیں گی؟'' سرجی نے پوچھا۔

''نہیں تمہیں بس سے نیچے دھکا دے دیا جائے گا۔'' شہباز نے عادتاً جملہ کسا۔

ہم ایک گھنٹے میں اس اسٹیشن پر پہنچ گئے جہاں سے ہمیں ٹرین پکڑنی تھی۔ بس کے بعد ٹرین پر بیٹھے اور مارتھم جا پہنچے۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر کچھ دیر انتظار کیا اور ٹھٹھرتے رہے۔ سردی کی شدت پر سرجی کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ایک لمبی سی گاڑی آرکی۔ ایک باوقار خاتون نے شیشہ کھولا اور جلدی سے ہمیں گاڑی میں بیٹھنے کو کہا پھر شیشہ بند کردیا۔

ہر ایک ہوا کے تھپیڑوں سے بچنا چاہ رہا تھا، اسی لیے ہم دروازہ کھول کر پھرتی سے اندر بیٹھ گئے۔ میں نے ایک ٹانگ گاڑی میں رکھی ہی تھی کہ باوقار خاتون نے گاڑی چلا دی۔ میں لڑکھڑا گیا۔ آدھا گاڑی میں اور آدھا باہر تھا مگر دروازے کو پکڑے ہوئے تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ سرجی نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا اور ان خاتون نے گاڑی روک لی۔

رکنے پر گاڑی چلانے والی خاتون نے بھرپور معذرت کی اور میں شرمندہ شرمندہ سا بیٹھا ''کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں'' کی تسبیح کرنے لگا۔ حالانکہ میری ٹانگوں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر وقار بھی ملحوظ خاطر رکھنا تھا، اپنے ساتھ خاتون کا بھی۔

گھر بھی گاڑی کی طرح شاندار تھا۔ ہم لاؤنج سے کچن میں آئے۔ ایک بڑا اور نفیس کچن تھا۔ کاؤنٹر پر بوفے لگا تھا۔ کاؤنٹر کے آگے بریک فاسٹ ٹیبل رکھی تھی۔ ٹیبل کے پیچھے ایک فل امریکن کچن تھا۔ بڑا کوکنگ ایریا ایسے پڑا تھا کہ جیسے کبھی استعمال بھی نہیں ہوا ہو۔ اوپر کیبنٹ کے پاس میکرو ویو تھا۔ کچن کی ساری مشینیں صاف وشفاف پڑی تھیں جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہی ہوں کہ ہم کو کوئی کام میں لے آؤ۔

مفتی نظروں ہی نظروں میں ہمیں ہدایات دے رہا تھا کہ کوئی بدتمیزی سرزد نہ ہو۔ یہاں مجھے معلوم ہونا شروع ہوا کہ مفتی ہمارے علاوہ سب سے دب کر رہتا ہے۔ خاتون خانہ نے ہم سے پوچھا کہ کھانا ابھی تناول کرنا ہے یا بعد میں؟

ہم نے سوالیہ نظروں سے مفتی کی جانب دیکھا اور اس نے اسی نظروں سے خاتون خانہ کی جانب دیکھا۔ وہ بھی سوالیہ نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔

بالآخر اس مسئلہ کا حل انہی خاتون نے نکالا کہ پہلے ہم ہاتھ منہ دھوئیں گے اور پھر کچن میں پندرہ منٹ بعد حاضر ہوں گے۔ ہم کو سیڑھیاں چڑھا کر مفتی ایک کمرے میں لایا۔ پہلے یہ تاکید کی کہ چڑھتے وقت لکڑی کی سیڑھیوں پر آواز بلند نہ ہو۔

شہباز بولا۔ ''کیا رینگ کر چڑھیں؟''
مفتی نے کہا۔ ''نہیں انسانوں کی طرح۔''
سرجی ہنسنے کو تھے کہ انہیں زبردستی روک دیا گیا کہ یہاں زور سے ہنسنا جائز نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے دہانے کو سختی سے اپنے ہی دونوں ہاتھ سے بند کرلیا۔

ایک کمرے میں دو بیڈ تھے۔ میں نے ایک سنبھال لیا اور دوسرا سرجی نے مفتی نے شہباز سے کہا کہ ہم دوسرے کمرے میں سوئیں گے۔ شہباز سرگوشی سے بولا۔ ''میں کرفیو میں نہیں سو سکتا۔''

وہ سرگوشی میں اس لیے بول رہا تھا کیونکہ اونچی آواز میں بولنا دربار کے آداب کی کھلی خلاف ورزی تھی۔

ہم نے احترام سے ہاتھ منہ دھوئے جیسے آب زمزم کا استعمال کررہے ہوں۔ کپڑے درست کیے اور آہستگی سے نیچے اتر آئے۔ سرجی کان میں بولے۔ ''ایسے تو بلیاں بھی نہیں چلتی ہوں گی۔''

کچن میں پہلے کی طرح سناٹا تھا۔ کھانا کاؤنٹر پر لگا تھا۔ خاتون خانہ بھی کہیں سے نمودار ہوئیں اور ہم سب باادب ہوگئے۔ انہوں نے مسکرا کر ہمیں کھانے کا اشارہ کیا اور ہم ایک روبوٹ کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے۔ مفتی نے ہمیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اٹھتے بیٹھتے کرسی گھسیٹنے کی آواز نہیں آنی چاہیے۔ سرجی نے کرسی اٹھا کر پیچھے رکھی اور بمشکل میز اور کرسی کے درمیان سے نکلے۔

خاتون خانہ پھر کہیں چلی گئیں مگر مفتی موجود تھا۔

کھانے میں حلیم، پائے بریانی اور قورمہ تھا۔ شہباز ندیدہ ہوا مگر مفتی کا بروقت اشارہ دیکھ کر سوبر بن گیا۔ ایک پلیٹ میں پہلے مفتی نے دو کھانے کے چمچ کے برابر چاول ڈالے۔ پھر ساتھ قورمہ کی گارنش کی۔ پائے میں چمچ ڈال کر اسے ہلکا سا تر کیا اور چاولوں کے اوپر برکت کے لیے گول گول گھمایا۔ حلیم کو چمچ کے کونے پر رکھا اور اپنی پلیٹ میں انڈیل دیا۔ کچھ قورمہ بھی شاید ڈالا تھا جو نہ ہمیں دکھتا تھا اور نہ پلیٹ کو محسوس ہوا ہوگا۔ ہم تینوں مفتی کو رزق حلال کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر مفتی نے نان کی بجائے چھری کانٹا اٹھا لیا اور ساتھ دو چار نیپکن بھی لے لیے۔

پھر ہماری باری آئی تو مفتی کرسی پر بیٹھا نہیں بلکہ ہمارے سر پر کھڑا ہوگیا۔ شہباز آگے تھا اور میں نے یہ منمناہٹ اس کی جانب سے آتی ہوئی محسوس کی۔ ''یار کیا سیاپا ہے۔''

سرجی کی کہنی مارنے پر وہ مؤدب ہوا۔ مفتی نے اپنے سے زیادہ شاید کسی کو نہ کھانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ شہباز ذرا گستاخ ہوا اور ایک پایا بھی اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔ سرجی یہ کہتے سنے گئے۔ ''تم تو سدا کے بھوکے ہو۔ آج کم کھالو گے تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔''

شہباز نے آنکھ بچا کر کچھ حلیم بھی اپنی پلیٹ میں ڈال لی۔ وہ فارغ ہوا تو سرجی کی باری آئی۔

مفتی نے سرگوشی میں سرجی سے کہا۔ ''آپ میری والی پلیٹ لے لیں۔ میں دوسری خود بنا لوں گا۔''

سرجی نے اس کی پلیٹ میں جھانکا تو کچھ نہ پایا۔ پھر ہلکا سا مسکرا کر کہا۔ ''میں اتنا زیادہ کیسے ہضم کر پاؤں گا؟''

پھر اپنی پلیٹ میں تھوڑا بہت ڈالا اور شکر اللہ کہتے ہوئے اپنی کرسی پر احتیاط سے بیٹھ گئے۔ اب میری باری تھی۔ شہباز میری جانب دیکھ رہا تھا۔ مفتی نے بھی اپنی نظروں میں مجھے رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک بڑا پیالہ اٹھایا۔ اس میں آدھے پائے پلٹے۔ دو نان اٹھائے۔ ایک خالی پلیٹ ہڈیوں کے لیے لی۔ سپرائیٹ کی پوری بوتل میز پر رکھی اور کرسی پر بیٹھنے سے پہلے ایک چمچ ساتھ لانا نہ بھولا۔ سب حیرت سے منہ کھولے مجھے دیکھ رہے تھے اور کوئی کہیں بھی متوجہ نہ تھا۔ مفتی نے آنکھیں نکال کر مجھے اشارہ کیا۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

میں نے جواب میں کہا۔ ''آپ کو حلیم چاہیے؟'' وہ خاموش رہا۔ میں نے پیٹ بھر پائے کھائے۔ باقی کا شوربا چمچ سے چڑھا گیا۔ مفتی کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ میں نے سپرائیٹ پینے کے بعد مفتی کی جانب دیکھا۔ وہ بت بنا مجھے دیکھ رہا تھا۔ سرجی اور شہباز نے میری واردات دیکھ کر کچھ جسارت کی اور اپنے لیے کچھ اور کھانے کو لے آئے۔ میں نے مفتی کو دیکھ کر کہا۔ ''اگر تم اس طرح مجھے گھورتے رہے تو میں شہباز سے کہوں گا کہ کھانے کے بعد ڈکار بھی مارے۔''

مفتی ڈھیلا پڑ گیا اور نظروں نظروں میں التجا کرنے لگا۔

میں نے مفتی سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ ''باجی واقعی اتنی سخت ہیں یا آپ بہت زیادہ ڈھیلے ہیں؟'' میری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا اور سرگوشیوں میں بولا۔ ''یہ لوگ پچھلے پچیس سال سے یہاں پر ہیں اور ان کا طرز زندگی مکمل تبدیل ہوچکا ہے۔'' اور وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ہمیں بہت زیادہ سلجھے ہوئے انداز سے یہاں ایک رات بسر کرنی ہوگی۔

مجھے معلوم نہیں کیوں یہ احساس ہورہا تھا کہ مفتی اپنی

بہن کو بہت زیادہ سیریس لے رہا ہے۔ وہ ایک سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ ہمارا بہت خیال رکھ رہی تھیں۔ مفتی نے اس گھر کو شیشے کا مکان ہمارے لیے بنایا ہوا تھا کہ ذرا سی آہٹ اسے زمین بوس کردے گی اور سب کے علاوہ مفتی اس کی کرچیوں سے زخمی ہوجائے گا۔

سرجی اپنی پلیٹ پر نظریں رکھے اسے گھور رہے تھے۔ شہباز کبھی سرخ ہوجاتا اور کبھی زرد۔ ہم خاموش بیٹھے تھے۔ باہر رات کا اندھیرا گہرا ہوچلا تھا۔

پھر اس خاموشی میں ایک طوفان اٹھا۔ سرجی کی ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ میں بھی گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ ایسا ہوا تھا کہ ایک موٹی تازی بلی نے کہیں سے سرجی پر لینڈنگ کی تھی۔ اس آفت پر سارا جمود ٹوٹ گیا۔ سرجی کی چیخ نے بلی کو دہلا دیا تھا اور بلی سے زیادہ ہم کانپ رہے تھے۔ مفتی کی ہمشیرہ بھاگی بھاگی آئیں اور ٹھسّری بلی کو گود میں اٹھا کر چومنا شروع کردیا۔ بلی کاؤنٹر پر کہیں دبکی بیٹھی تھی۔ مفتی کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ بلی کو کوسے یا سرجی کو۔ بلی خاتون خانہ کی بانہوں میں لپٹی کن انکھیوں سے سرجی کو دیکھتی اور واویلا کرتی تھی۔ خاتون خانہ اسے دلاسے دیتی نظر آرہی تھیں۔ شکر ہے کہ میں پایوں کا پیالہ پہلے ہی چڑھا چکا تھا ورنہ اس سانحے کے بعد کچھ بھی کھانا میرے لیے دشوار ہوجاتا۔

میں جس شہر یا ماحول میں پلا بڑھا تھا وہاں بلیوں کو دیکھ کر جوتا اٹھالیا جاتا تھا نہ کہ ان کو گود میں ڈال کر چوما چاٹا جاتا۔ وہ بھی ایسی بدتمیز بلی کو جو سیدھا آپ کی پلیٹ میں جمپ لگاتی۔ مفتی کی بہن اس بات پر زیادہ پریشان تھی کہ بلی خوف سے دہل گئی ہے۔

یہ بہت بعد کی بات ہے کہ میرے بچوں کو شوق چرایا کہ وہ کوئی بلی گھر پر لائیں گے۔ میں سالوں سے ان کی یہ فرمائش رد کرتا آیا تھا مگر بچوں کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑا۔ ٹورنٹو اور ڈیلاس میں میری جاننے والی فیملیز رہتی ہیں۔ ایک بار ٹورنٹو گیا تو دیکھا کہ انہوں نے گھر میں بلی پال رکھی تھی۔ ان کے گھر کا ہر فرد مجھ سے زیادہ بلی سے باتیں کررہا تھا۔ ہمارے پوچھنے پر بتایا کہ ہماری ساری ڈپریشن اس بلی کے آنے سے دور ہوگئی ہے۔ ڈیلاس میں بھی دوست کی بیوی اپنی بلی کو گود میں لیے یہی بات کرتی نظر آئی۔

میرے بچوں نے بلی لانے کا تقاضا کیا تو مجھے ہامی بھرنی پڑی۔ ہمارے ہاں لوگوں کے یتیم خانے ہوتے ہیں تو یہاں امریکا میں کتوں اور بلیوں کے ہوتے ہیں۔ بچوں نے ایک ایسے ادارے سے رابطہ کیا۔ وہاں کی نگران خاتون نے پہلے ایک فارم ای میل کیا جس میں مختلف سوالات پوچھے گئے تھے۔ جب ان سوالوں کا اسے تسلی بخش جواب ملا تو میرے بچوں کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ ان سوالوں میں چند سوال ذیل ہیں۔

آپ کے گھر میں کتنے افراد رہتے ہیں؟ گھر کے کمرے کتنے ہیں؟ کسی کو جانوروں سے الرجی ہے؟ کیا آپ کی سالانہ آمدن اتنی ہے کہ کوئی بلی پال سکیں؟ اگر کبھی بلی اداس یا پریشان ہوجائے تو آپ کیا کریں گے؟ بلی کا آپ کس طرح سے خیال رکھیں گے؟ کتنی بار آپ بلی کو ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے جاسکیں گے؟ بلیوں کے لیے مقوی غذائیں کیا کیا ہوتی ہیں؟ کیا آپ کا گھر بلی کے لیے اتنا محفوظ ہے کہ وہ آرام سے آزادانہ گھوم پھر سکے؟ آخری سوال بہت بھیانک تھا کہ اگر آپ کی وفات ہو جائے تو کون بلی کا خیال رکھے گا؟

اس سوالات کے بعد بہت سی ہدایات بھی تھیں کہ بلی کا نام یہ ہے اور اگر آپ اس کا نام تبدیل کرنا چاہیں تو پہلے ہم سے اجازت لیں گے۔ کہیں آپ گھومنے جائیں تو بلی کے لیے بے بی سیٹنگ کا انتظام کریں گے۔

جب اس مرحلے کو پار کیا تو تین دنوں تک بلی کے آنے کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ آن لائن اس کا ایک گھر، کھلونے، کھانے کے برتن، اون کے گولے اور معلوم نہیں کیا کچھ منگوایا گیا۔ بیٹا مجھے یہ دکھلا رہا تھا اور میں کھڑا اپنا سر کھجا رہا تھا۔

سرجی کی کوئی دادرسی نہ کرتا تھا مگر بلی کی فکر سب کو پڑگئی تھی۔ میں سرجی کو سہارا دے کر کمرے میں لایا۔ ان کو لٹایا، کمبل ڈالا تو کپکپی ختم ہوئی اور پھر وہ سوگئے۔ میں بھی تھکا ہوا تھا اور جلدی سوگیا۔

رات نیند میں بے آرام رہا۔ وجہ وہ سیٹیاں تھیں جو سرجی کے منہ سے بج رہی تھیں۔ مجھے صبح معلوم ہوا کہ سرجی کو جب بخار چڑھتا ہے تو وہ سیٹیاں بجاتے ہیں۔ صبح اٹھے تو انہیں بخار چڑھا تھا۔ ان کا ماتھا تپ رہا تھا۔ مفتی کو اطلاع دی گئی۔ وہ کچھ بخار اتارنے کی پلو لے آیا۔ سرجی سے بخار کی وجہ پوچھی تو انہوں نے میرے کان میں بلے کو قصوروار ٹھہرایا۔ کہہ رہے تھے کہ مجھے رات بھر یہ خواب آتے رہے کہ میں اور بلا گتھم گتھا ہیں اور بلا حاوی ہورہا ہے۔

میں نے کہا۔ ”خاتون خانہ فرمارہی تھیں کہ بلے کو بھی

رات بھر بخار رہا اور اسے بھی آپ ہی کی طرح کے خواب آتے رہے۔ میں نے تو مذاق کیا تھا مگر وہ اسے سنجیدہ لے گئے۔ کہنے لگے۔ ''وہ خونخوار بلا جھوٹ بول رہا ہے۔''

سرجی کو کچھ افاقہ ہوا۔ ہم نے انہیں یہ پیشکش کی کہ وہ گھر پر ٹھہر جائیں۔ نماز پڑھ کر ہم واپس آجائیں گے۔ وہ کہنے لگے کہ سولی چڑھ جاؤں گا مگر اس گھر میں نہیں رکوں گا۔

ہم نے شلوار قمیص پہنی جو پاکستان سے ساتھ لائے تھے۔ مفتی سے اس کے پرفیوم کے چند چھینٹے ہر ایک نے مستعار لیے۔ اپنی طرف سے بن ٹھن کر نیچے کچن میں ناشتا کرنے آبیٹھے۔

ناشتا اس طرح کیا کہ گھر والوں نے بلے کو سرجی سے چھپایا ہوا تھا اور ہم سرجی پر پہرہ دے رہے تھے۔ خوف کے سائے میں کچھ ناشتا کیا اور چائے پینے کے بعد ہم اس خوفناک گھر سے باہر نکلنے کی تیاری کرنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گھر والے بھی ہم سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔

ہم مفتی کے بہنوئی کی ایک اور بڑی گاڑی میں بیٹھ کر عید کی نماز پڑھنے پکرنگ (Pickering) گئے۔ مفتی کا بہنوئی بہت ہنس مکھ انسان تھا مگر صرف ہمارے لیے۔ کیونکہ اس کا نشانہ مفتی ہی رہتا تھا، اسی لیے وہ منہ بنائے بیٹھا رہا اور اس کے بہنوئی قہقہے برساتے رہے۔ اب مجھے مفتی کے دب کر رہنے کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ وہ ان کے بہنوئی تھے جو مفتی کو روندتے رہتے تھے۔

ہم پکرنگ کی عیدگاہ پہنچے۔ وہ ایک بڑی عمارت تھی بلکہ ایک فلی مارکیٹ تھی جہاں ویک اینڈ پر بازار لگتا تھا۔ مسلمانوں نے عید کے رش کی وجہ سے اسے کرائے پر ایک دن کے لیے لے لیا تھا۔ ہزاروں نمازیوں کی گنجائش تھی اور پارکنگ میں جیسے گاڑیوں کا جمعہ بازار لگا تھا۔ ایک وسیع پارکنگ میں دور دور تک ہزاروں گاڑیاں نمازیوں نے پارک کر رکھی تھیں۔

اس دن بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ ٹورنٹو کو ایک بار پھر سردی اپنے لپیٹے میں لے چکی تھی۔ ہم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ سرجی سے سوال کیا۔ ''ابھی تک بلے کے خوف سے کانپ رہے ہیں؟''

انہوں نے بہت برا منایا۔ کہنے لگے۔ ''بلا نہ ہوا، کوئی لاہوری شیر ہو گیا۔''

ڈارفر کا بحران
(Darfur Crisis)

سوڈان کا مغربی شورش زدہ علاقہ، فروری 2003ء میں اس علاقے میں وہ سیاہ فام افریقی باغیوں کے مابین ڈارفر میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے اور اس قدرتی وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے باہمی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا اور یہ دونوں گروپ مسلح تصادم پر اتر آئے۔ طالع آزما عناصر نے سوڈانی حکومت کے مخالف عناصر نے اسے عرب قبائل اور سیاہ فام افریقی قبائل کے مابین محاذ آرائی کی سی کیفیت پیدا کر دی اور 1989ء میں جنجا ویڈ (Janja Weed) تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔

دونوں قبیلوں کی باہمی لڑائی کے نتیجے میں ایک لاکھ افراد سے زائد ہلاک ہو چکے ہیں۔ جب کہ دو لاکھ ہمسایہ ملک چاڈ کے کیمپوں میں مقیم ہیں۔ فریقین کے مابین اپریل 2004ء میں جنگ بندی کا معاہدہ بھی طے پایا تھا، لیکن فریقین نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور مصالحت کنندگان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا کیونکہ وہ فرانس کے سائز کے برابر علاقے میں خورد و نوش کی اشیاء فراہم نہ کر سکیں۔ علاقے میں خوراک کی عدم دستیابی کے باعث وہاں کے لوگوں کا جینا مشکل ہو گیا۔ 30 جولائی 2004ء میں اقوام متحدہ نے ایک قرارداد منظور کی، جس میں سوڈان کی حکومت سے کہا گیا تھا کہ وہ 30 دنوں کے اندر ڈارفر کے بحران کو حل کرے ورنہ اقتصادی پابندیوں کے لیے تیار ہو جائے۔ سوڈانی وزیر خارجہ نے اقوام متحدہ کی دی گئی مدت کو ناکافی قرار دیتے ہوئے کہا کہ سوڈان کو اس سلسلے میں 120 دن درکار ہیں، کیونکہ ڈارفر کا بحران بڑا پیچیدہ ہے، تاہم اگست 2004ء میں سوڈانی حکومت اور اقوامی متحدہ کے مابین ڈارفر کے بحران کے حل کے لیے لائحہ عمل کے معاہدے پر خرطوم میں دستخط کر دیے۔ جس کی رو سے سوڈانی حکومت تیس دن کے اندر مہاجر کیمپوں کے علاقوں کو محفوظ بنائے گی، تاکہ شہریوں کو خوراک اور پانی کے حصول کی سہولت حاصل ہو سکے اور وہ کسی حملے کے ڈر کے بغیر کھیتی باڑی کر سکیں، نیز سوڈانی پولیس ڈارفر میں چوکیاں اور محاصرے بھی قائم کرے گی اور عرب ملیشیا کے حملے روکنے کے لیے پولیس اور فوج مل کر کام کر سکیں گے۔

مرسلہ: مبطین صدیقی، شورکوٹ

ان کی بات سیاسی محسوس ہونے لگی تو ہم نے چپ سادھ لی۔

گاڑی کہیں پارک کر کے مفتی کے بہنوئی واپس آئے تو مفتی ہمارے پیچھے ان کی نظروں سے چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔

ہم اندر داخل ہوئے تو دور دور تک صفیں بچھی تھیں۔ ہزاروں لوگ بیٹھے مولانا صاحب کے خطبے کو سن رہے تھے۔ ایک طرف عورتیں اور بچے بیٹھے نظر آرہے تھے اور وہاں سے ایک متواتر شور اٹھ رہا تھا۔ سامنے دیوار پر خانہ کعبہ اور روضہ رسول کی بڑی بڑی تصاویر لگا کر اس ہال کو اسلامی رنگ دیا گیا تھا۔

ایک سائیڈ پر کھانے پینے کے اسٹال لگے تھے۔ سموسے، پاپ کارن، چکن رول کے اسٹالوں پر رش تھا۔ سرجی کو جلیبیاں نظر آئیں تو مچلنے لگے۔ شہباز بمشکل انہیں بازو سے پکڑ کر صفوں کی جانب گھسیٹنے لگا۔

نمازی روایتی شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔ نئے کپڑوں نے عید کا حقیقی سماں باندھ دیا تھا۔ عورتوں اور بچوں نے اپنی بھرپور تیاری کی تھی۔ مہندی لگائے بچیاں خوش و خرم دمک رہی تھیں۔ اونچی ہیلوں والی جوتیاں پہنے بمشکل چلتی اندر آرہی تھیں۔ انہیں بہت دن بعد پاکستانی انداز میں بننے سنورنے کا موقع ملا تھا اس لیے انہوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ہم چاروں بھی شلوار قمیص میں ان جیسے لگ رہے تھے۔ سامنے سے دو پٹھان سروں پر پگڑی باندھے چلے آرہے تھے۔ ہر مرد نے کشیدہ کاری والے شوخ رنگوں کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ پورا ہال خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ کوئی جناح کیپ سر پر رکھے چلا آرہا ہے۔ کچھ نے شیروانی زیب تن کی ہوئی تھی۔ کوئی بچوں کو بتلا رہا تھا کہ یہ مسلمانوں کی عید نماز ہے۔ وہ بچوں کو عید کے تہوار پر آگاہی دے رہے تھے۔

یہ میری پاکستان سے باہر پہلی عید کی نماز تھی۔ سرجی شہباز کو تکبیریں پڑھانے کی کوشش کرنے لگے اور مفتی کے بہنوئی نے مفتی پر ایک اور نشتر چلایا اور قہقہہ لگا کر بولے۔ ”مفتی کو تکبیروں کے ساتھ ساتھ نماز پڑھنا بھی سکھا دیں۔“ یہ کہہ کر پھر سے ہنسنے لگے۔ ہم ان قہقہوں پر مؤدب رہے۔ مجھے اچھا نہیں لگا کیونکہ ایک دو بار میں مفتی کو سجدہ ریز دیکھ چکا تھا۔

ہمیں مناسب جگہ ملی اور ہم پھیل کر بیٹھ گئے۔ ہر ایک اردگرد زیادہ دیکھتا تھا اور امام صاحب کیا فرما رہے ہیں اس جانب کسی کی توجہ نہ تھی۔ یہاں ہر فرقے کا بندہ ایک ساتھ نماز پڑھتا ہے۔

ہم نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو سب برابر ہو گئے۔

نماز پڑھی گئی پھر سب ایک دوسرے سے گلے ملے۔

مجھے بہت سے لوگ گلے ملے اور بہت سوں کو میں جا ملا۔ کوئی کسی کو نہ جانتا تھا پھر بھی سب ایک دوسرے کو عید کی مبارک دے رہے تھے۔ سب کی خوشیاں سانجھی ہو گئی تھیں۔ دو افراد ایک دوسرے سے گلے نہ ملے۔ ان میں سے ایک مفتی اور دوسرا ان کا بہنوئی تھا۔

لاؤڈ اسپیکر سے یہ اعلان ہونے لگا کہ دوسری نماز آدھ گھنٹے بعد ہو گی جو لوگ پہلی نماز سے رہ گئے ہیں۔ وہ دوسری میں نماز میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اب تو کئی مقامات پر تین تین عید کی نمازیں ہوتی ہیں۔ ویسے جمعہ کو دو نمازیں تو ہر مسجد میں ہوتی ہیں۔ اعلان کو نظر انداز کر کے ہم سب باہر آگئے۔ باہر آتے ہی سرد ہوا نے دل کھول کر استقبال کیا۔

ٹورنٹو کی منجمد فضا کی منجمد عید نے میرے دل و دماغ کو سرد کر دیا تھا۔

وطن سے دور، بچوں سے دور، رشتے داروں سے ایک ایسی عید جو کچوکے لگا رہی تھی۔ دل کو چھید رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر اپنے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کی بقرعید یاد آرہی تھی۔ ڈیرہ میں جب بڑی عید آتی تھی تو ہم بچوں کو دگنی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی عیدگاہ سے، بڑوں کی نظریں بچا کر میں دوسرے بچوں کے ساتھ ہو لیتا۔ ہم سب ٹولیوں کی شکل میں آس پاس کے گلی محلوں میں خوب گھومتے۔ کہیں گائے ذبح ہو رہی ہوتی تو کہیں دنبہ اور کہیں بکرے یا اونٹ، ہر جگہ ہم سب تالیاں بجا بجا کر چیختے، شور کرتے، قسائیوں کی پھرتی پر اسے داد دیتے اور پھر کسی دوسری گلی کی جانب دوڑ لگا دیتے۔ پھر جب گھر کے کسی بندے کی نظر پڑ جاتی تو ڈانٹ ڈپٹ کے بعد گھر کی راہ دکھا دی جاتی۔ گھر پہنچتے تو گرما گرم بھنی ہوئی کلیجی سامنے رکھ دی جاتی۔ اس کلیجی کا ذائقہ اس وقت ٹھٹھرتے ہوئے موسم میں زبان پر محسوس ہو رہا تھا، منہ میں پانی بھر رہا تھا۔ آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

دل رو رہا تھا اور میں مسکراتے ہوئے دکھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے ٹورنٹو پہنچ کر محسوس ہوا تھا کہ میں بہت بڑا وطن پرست ہوں۔ اپنے ملک اور اپنے شہر سے میری

لگاوٹ میرے لیے بھی حیران کن تھی۔ اپنی اس عادت کا مجھے اندازہ اپنے شہر اور ملک میں رہ کر کبھی نہ ہوا تھا۔ لوگ مجھے خوش قسمت سمجھتے تھے کہ میں کینیڈا میں ہوں اور میرے لیے وہ سب معرفت کے مقام پر تھے کہ وہ اپنے وطن کی مٹی پر قدم رکھتے ہیں۔

مفتی کے بہنوئی ہمیں لے کر کار کی جانب آئے، مفتی ان سے چھپ چھپا کر ہمارے پیچھے چل رہا تھا۔ شہباز نے پوچھا۔ ''آہستہ کیوں چل رہے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''سردی بہت ہے۔''

اس جواب سے اس کے بہنوئی کو لقمہ مل گیا اور وہ قہقہہ لگا کر بولے۔ ''یار مفتی! تمہارے دماغ کا انجن سردی میں شاید جام ہو جاتا ہے، اسی لیے الٹے سیدھے جواب دے رہے ہو۔''

سرجی خونخوار بلے کی وحشت سے باہر نکل آئے تھے چہرے کی شادابی لوٹ آئی تھی۔ وہ چہک کر بولے۔ ''اس لیے تو کہتا ہوں کہ میری طرح گرم ٹوپی پہن لیا کرو۔ اس سے دماغ کی قلفی نہیں بنتی۔''

مفتی نے انہیں گھور کر دیکھا تو سرجی نے چہرہ گھما لیا اور تیز قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔

گاڑی میں بیٹھے اور ہیٹر آن ہوا تو کچھ ہی دیر میں گاڑی دہکنے لگی۔ سرجی کو گرمی لگی تو ٹوپی اتار لی۔ شہباز موقع کی تلاش میں تھا فوراً بولا۔ ''لگتا ہے کہ سرجی کی قلفی پگھل رہی ہے۔''

مفتی اور سرجی کے علاوہ سب نے قہقہہ لگایا۔ سرجی قدرے ناراض ہو کر گاڑی کے شیشے سے سر ٹکا کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔

آج واقعی ٹورنٹو کو سرد ہواؤں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ یخ بستہ جھکڑ چل رہے تھے۔ سردی رخصت ہو کر نہ جانے کیوں پلٹ آئی تھی۔ اور پلٹی بھی تو اس ادا سے کہ جسم کا خون منجمد ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مارچ کے مہینے میں یہ موسم منحوس لگ رہا تھا۔ مفتی کے بہنوئی نے گاڑی ایک کافی شاپ پر روک دی۔ گاڑی رکتے ہی سب کے سب نہایت تیزی سے اترے اور تقریباً دوڑتے ہوئے کیفے میں داخل ہو گئے۔ کافی شاپ ہیٹر کی وجہ سے نعمت محسوس ہوا۔ ہم سب ایک خالی ٹیبل کے گرد بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پیپر گلاس میں گرما گرم کافی بہت مزہ دے رہی تھی۔ معدے میں کافی اتری تو سب کے چہرے پر بشاشت نظر آنے لگی۔ تبھی مفتی

کے بہنوئی نے کہا۔ ''یہاں بچوں کے لیے حکومت جو ڈالر دیتی ہے وہ سب حرام ہے۔''

''اچھا مگر کیوں؟'' سرجی نے پوچھا۔

''وجہ یہ ہے کہ والدین یہ رقم بچوں پر خرچ نہیں کرتے۔''

میں نے پوچھا۔ ''پھر کیا کرتے ہیں؟''

''مجھے کیا معلوم لیکن بچوں پر خرچ نہیں کرتے۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

میں حیران بیٹھا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ والدین اپنے بچوں کو کچھ کھلاتے پلاتے نہیں ہیں۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا تو وہ بولے۔ ''وہ اپنے پیسوں سے بچوں کو کھلاتے پلاتے ہیں مگر بچوں کے پیسے ان پر خرچ نہیں کرتے۔''

میں نے بردباری سے اپنا سر ہلایا کہ میں ان کی دانائی کا معترف ہوں۔ میری جانب سے داد و تحسین ملنے کے بعد وہ گویا ہوئے۔ ''اگر آپ کو پیسے ملیں تو بچوں کے نام پر اکاؤنٹ کھلوا لینا اور پیسے اس میں رکھتے جانا جب بچے بڑے ہوں تو ان کی اسٹڈی کے لیے یہ رقم کام آئے گی۔''

ان کی نصیحت کو میں نے سیریس لے لیا تھا۔ جب میرے بچے آئے تو میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ اب وہ بڑے ہو رہے ہیں تو ان کے اکاؤنٹس میں ان کی پڑھائی کے لیے ایک معقول رقم جمع ہے۔

مفتی کے بہنوئی کی نظروں میں سب سے معتبر میں تھا اس لیے وہ خوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اب چلنا چاہیے۔''

ہم واپسی کے لیے کھڑے ہوئے تو سرجی سرگوشی میں بولے۔ ''میں نے اس خبیث بلے والے گھر میں اب نہیں جانا، اس موئے ڈرائیور سے کہہ دو کہ ہمیں کسی بس اسٹاپ پر اتار دے۔''

ہم گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے سرجی نے کھسر پھسر لگا رکھی تھی۔ مفتی کے بہنوئی نے بیک ویو مرر سے دیکھا اور پوچھا۔ ''سب ٹھیک تو ہے ناں؟''

میں نے کہا۔ ''سرجی کو اپارٹمنٹ جانا ہے۔''

''مگر ابھی تو گھر جا کر تکہ بوٹی کھانی ہے۔''

میں نے اپنی جانب سے بات گڑھی۔ ''سرجی کہہ رہے ہیں کہ تکہ بوٹی کھانی ہے یا بلے سے میری تکہ بوٹی کروانی ہے؟''

بہنوئی صاحب نے زوردار قہقہوں کے بیچ میں کہا۔

”جناب، وہ تو ایک سیدھا سادہ بلا ہے۔ اس سے ڈرنا کیا؟“

سرجی زور زور سے قسمیں کھانے لگے کہ یہ بات انہوں نے نہیں کی۔ لیکن جملہ میں نے کہا تھا اس لیے سرجی کی بات پر کسی نے یقین نہ کیا۔

بہنوئی صاحب نے قہقہہ لگایا ان کے قہقہے تھے تو ماحول میں کسی قدر سکون اترا اور وہ سنجیدہ نظر آنے لگے۔ ہم نے بھی سکھ کا سانس لیا مگر اچانک وہی قہقہے دوبارہ ابل پڑے۔ سرجی اللہ خیر اللہ خیر کرتے رہ گئے اور شہباز زرد چہرے کے ساتھ بولا۔ ”یہ سیاپا ندیم بھائی کا پھیلایا ہوا ہے۔“

گاڑی میں جملوں کی بارش تب بند ہوئی جب ہم ان کے گھر کی ڈرائیووے میں اترے۔

سرجی باہر کھڑے کپکپا رہے تھے۔ یہ بات سمجھ نہ آئی کہ سردی سے کپکپا رہے ہیں یا بلے کے خوف سے۔ ان کا گھر جتنا باہر سے خوب صورت تھا اتنا ہی اندر سے بھی تھا۔ دو منزلہ گھر جس کو باہر سے سفید پینٹ کیا گیا تھا۔ اوپر کی منزل کی کھڑکیاں باہر سڑک پر کھلتی تھیں۔ سب گھر ایک جیسے تھے۔ باہر مکمل خاموشی تھی سوائے مفتی اور سرجی کی تکرار کے۔ مفتی سرجی کو اس طرح کھینچ کر اندر لے جانے کی کوشش کررہا تھا جس طرح بقر عید کو قسائی بکرے کو لے جاتا ہے۔ شہباز نے کہا کہ اس کی ٹانگیں باندھ دو۔

بہنوئی صاحب بڑی تمیز سے ہماری جانب آئے۔ سرجی سے بولے۔ ”ہمیں آپ سے زیادہ بلے کی فکر ہے کیونکہ وہ رات سے سخت سہما ہوا ہے اور ہم نے اسے محفوظ مقام پر چھپادیا ہے۔“

سرجی بے یقینی سے دیکھنے لگے کہ اتنے میں بہنوئی صاحب نے انہیں ایک ہلکا سا دھکا دیا اور دوسرے ہی لمحے سرجی گھر کے اندر تھے۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے تکہ بوٹی کا انتظار کرنے لگے کیونکہ قسائی کے پاس سے گوشت ابھی آیا نہیں تھا۔

یہاں قربانی کرنے کا طریقہ بھی نرالا ہے، پاکستان کی طرح نہیں کہ عید سے چند دن قبل بکرا لے کر آجائیں۔ پھر عید کے دن قسائیوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہیں۔ گھر والے مسالے تیار کرکے کھونٹی سے بندھے بکرے کو دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر زبانیں پھیرتے رہیں۔ یورپ اور نارتھ امریکا میں یہ تجربہ ہوا کہ یہاں آپ قربانی کا جانور دیکھ بھی نہیں سکتے۔ آپ فون کرکے قسائی کے پاس جانور کی بکنگ کروالیتے ہیں وہ آپ سے نام پتا لے لیتا ہے۔ دو سو ڈالر کے قریب قربانی کے جانور کا نرخ ہوتا ہے۔ اس میں ذبح کرنے سے بوٹیاں بنانے تک کا معاوضہ شامل ہوتا ہے۔ یہ معاوضہ پچھلے پندرہ سال سے میرے سامنے نہ کم ہوا اور نہ زیادہ۔ فون کے ذریعے ہی آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ گوشت تیار ہے۔ آپ گاڑی لے کر جاتے ہیں اور تین چار بڑے بھاری لفافے اٹھا کر گھر لے آتے ہیں۔ اس میں نہ سری پائے ہوتے ہیں اور نہ کھال کا دھندا ہوتا ہے۔ عموماً لوگ تین حصے کرتے ہیں۔ پہلا حصہ خود کھاتے ہیں اور باقی دو حصے بھی خود کھاتے ہیں کیونکہ گوشت کو کہاں کھپائیں؟

میں اپنے جانور کی قربانی پاکستان میں کرتا ہوں۔ یہاں بھی قربانی کرتا ہوں اور گوشت غریب کالونی میں بانٹ دیتا ہوں اور کچھ مسجد میں رکھوا دیتا ہوں۔ یہاں غریب یا متوسط لوگ بکرے کا گوشت سال میں ایک بار بھی نہیں کھا پاتے۔ بکرے کا گوشت آٹھ ڈالر کا ایک پاؤنڈ ملتا ہے اور چکن 70 سینٹ کی ایک پاؤنڈ ملتی ہے۔ ہر جگہ قربانی کا اپنا انداز ہے۔

بہنوئی صاحب قسائی کو کئی بار فون کرچکے تھے مگر گوشت ابھی تیار نہیں ہوا تھا۔ آخر ہمارے اور بہنوئی صاحب کے بیچ یہ معاہدہ طے پایا کہ ہم تینوں واپس ہو جائیں۔ شام کو جب مفتی اپارٹمنٹ آئے گا تو ہمارا حصہ لیتا آئے گا۔

ہمیں بہنوئی صاحب نے اپنی کار میں بس اسٹاپ پر اتارا۔ سرجی کو دیکھ کر قہقہہ لگایا اور اپنے بلے کو یاد کرتے ہوئے چلے گئے اور میں ان دونوں کو پاکستانی بازار جیرالڈ اسٹریٹ لے آیا۔

پچھلی قسطوں میں بیان کرچکا ہوں کہ جیرالڈ اسٹریٹ دیسیوں کا بازار ہے۔ پاکستانی اور انڈین نے دکانیں کھول رکھی ہیں۔ یہ دکانیں دونوں سائیڈ پر ایک لمبی قطار میں بنی ہوئی ہیں مسلمانوں کی عید ہو یا ہندوؤں کی دیوالی، یہ بازار کلچرز ثقافت کا ایک اہم مرکز بن جاتا ہے۔ اب تو ٹورنٹو کے ہر حصے میں بڑے بڑے ہال لے کر عید بازار، رمضان بازار کھولے جاتے ہیں۔ ہر قسم کے کھانے، کپڑے، مصنوعی جیولری، مہندی اور چوڑیاں بیچی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی کھانوں کے اسٹال لگے ہوتے ہیں۔ پاکستان کے ہر علاقے کا بہترین کھانا یہاں دھڑا دھڑ بک رہا ہوتا ہے۔ ان اسٹالوں

پر خوب رش ہوتا ہے۔ والدین اپنے بچوں کو عید میلہ دکھلانے یہاں لاتے ہیں تاکہ وہ بچے روایات کو اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھا سکیں۔

جیرالڈ بازار میں ہم اترے تو وہ تیز جھکڑوں کی زد پر تھا۔ عید کا دن تھا اور میلہ کل رات ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب یہاں تیز برفانی ہوائیں بلا روک ٹوک چل رہی تھیں۔ ہمارے علاوہ شاید ہی کوئی اور ان فٹ پاتھوں پر نظر آیا ہو۔ ہم سراسیمہ ہو کر اردگرد دیکھنے لگے۔ ٹھنڈ کی وجہ سے سرجی کے محاورے بھی قلفی بن گئے تھے۔ وہ بس میں پورا راستہ خاموش رہے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہاں جیرالڈ بازار میں انہیں جلیبیاں بھی یاد نہ رہی تھیں۔ میرے جیرالڈ اسٹریٹ آنے کا مقصد یہ تھا کہ فون کرنے کے لیے کالنگ کارڈ لے لوں۔ ویسے تو کالنگ کارڈ ہمارے علاقے میں بھی ملتے تھے مگر یہاں اسّی ڈالر میں دس کارڈ مل جاتے تھے۔ ہمارے علاقے میں دس ڈالر کا ایک کارڈ ملتا تھا۔ بیس ڈالر ہمارے لیے بہت بڑی رقم تھی اور اسی رقم کو بچانے کے لیے ہم نے اتنا لمبا راستہ طے کیا تھا۔

میں نے دس کارڈ خریدے تو سرجی نے مجھ سے یہ کہتے ہوئے دو کارڈ لے لیے۔ شہباز نے اپنی شاپنگ خود کی۔

ہم ایک گروسری کی دکان میں داخل ہوئے اور کالنگ کارڈ کی فرمائش کی۔ دکاندار انڈین تھا۔ اس نے کارڈ کا بنڈل بڑھا دیا۔ سرجی کی نظر کونے میں رکھے ایک توے پر پڑی تو وہ کہنے لگے۔ ''بہت دن ہو گئے میں نے پراٹھا نہیں کھایا۔''

میں متعجب تھا کہ کالنگ کارڈ سے پراٹھے کی جانب ان کی سوچ کا زاویہ کیسے تبدیل ہو گیا۔ تبھی شہباز نے ٹوکا۔ ''سرجی سارا سیاپا آپ پر ختم ہے۔ یہ بیچ میں پراٹھا کہاں سے آ گیا۔''

انہوں نے توے کی جانب اشارہ کیا تو ہمارے دل بھی مچل گئے۔ ہمیں مفتی کا خوف تھا کہ وہ توے جیسی چیزوں کو دقیانوسی سمجھتا ہے مگر کہاں ہاتھ سے بنی گرم گرم روٹیاں اور کہاں فریج میں پڑے بے ذائقہ پکے پکائے نان۔ میں نے انجام کی پروا کیے بغیر وہ توا اٹھا لیا۔ سرجی بولے۔ ''اس کے ساتھ بیلنا ہو تو روٹی پکانے کا مزہ آ جائے۔''

دکاندار نے ایک الماری سے نکال کر بیلنا ہمارے حوالے کر دیا۔ ہمیں شاپ میں کھڑے کھڑے گرم گرم روٹیوں کی بھینی بھینی خوشبو آنے لگی۔ کہیں یہ خوشبو چھن نہ جائے اس خیال سے ہم باہر آ گئے۔ تیز ہواؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے بس اسٹاپ تک پہنچے۔ ہم نے سردی کی وجہ سے دونوں ہاتھوں کو پینٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

ابھی ہم بس اسٹاپ پر آئے ہی تھے کہ بس بھی آ گئی اور جلد بازی میں ہم سب بس میں سوار ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹ کا سفر طے کر کے ریلوے اسٹیشن پر اترے اور وہاں سے ٹرین میں سوار ہو گئے۔

ایک گھنٹے کے بعد ہم اپارٹمنٹ پہنچے۔

مفتی قربانی کا گوشت رکھے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہم حیران تھے کہ وہ اتنی جلدی کیسے پہنچ گیا تو معلوم ہوا کہ بہنوئی صاحب اسے ڈراپ کر گئے ہیں۔ پھر اس نے ہم سے طرح طرح کے سوالات پوچھنا شروع کر دیئے کہ کہاں تھے، کہاں گئے اور کیا کرنے گئے تھے؟

ان سب سوالات کا سرجی نے کچھ اس انداز سے جواب دیا کہ جیکٹ کے اندر سے توا نکال کر اس کے آگے رکھ دیا۔ پہلے تو وہ حیران ہو کر توے کو دیکھتا رہا اور پھر وہ سیدھا مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ کس لیے اٹھا لائے؟''

میں نے کہا۔ ''چند ماہ بعد فیملی آ رہی ہے تو سوچا کہ لگے ہاتھوں توا بھی خرید لوں۔''

اس نے منہ بنا کر کہا کہ آٹے سے کچن خراب ہو جاتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ پکے پکائے نان خریدے جائیں۔''

سرجی بولے۔ ''میں بھی تو یہی سمجھتا رہا مگر انہوں نے کہا کہ میں زندگی کے معاملات میں کسی کی غیر ضروری مداخلت برداشت نہیں کرتا۔''

یہ سن کر مفتی خاموش ہو رہا۔ مفتی کے سامنے سے سرجی نے وہ توا اٹھایا اور اسے کچن میں جا کر رکھ دیا۔ پر سرجی کچن سے باہر نہیں نکلے تھے کہ شہباز نے منت سماجت کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''ندیم بھائی کی فیملی تو تین چار ماہ بعد آئے گی۔ کیوں نہ اسی دوران ہم بھی تازہ اور گرم روٹیاں کھا لیں۔''

سرجی نے کچن کے اندر سے آواز لگائی۔ ''شہباز کو تو ہر وقت کھانے پینے کی پڑی رہتی ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ مفتی صاحب کا غصہ کتنا گندا ہوتا ہے۔ غصے میں تو اپنے بہنوئی کو بہنوئی بھی نہیں سمجھتے۔''

میں سنجیدہ چہرہ لیے اندر سے ہنس رہا تھا کہ سرجی کس طرح سے مفتی کو رگید رہے ہیں۔

مفتی سر جی کے کلمات سن کر غور و فکر میں مبتلا ہو گیا کہ سر جی نے واقعی تعریف کی ہے یا کوئی چوٹ کر گئے ہیں۔
شہباز بیچ میں بولا۔ ''مگر آٹا کہاں سے ملے گا؟''
سر جی بولے۔ ''میں نے خود گلاٹی اسٹور میں بڑے بڑے تھیلے دیکھے ہیں۔''
سر جی کے خاموش ہوتے ہی شہباز یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ابھی لے آتا ہوں۔''
مفتی اس دوران حیران و پریشان بیٹھا ہمیں دیکھ رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے گھر پر کس طریقے سے قبضہ کیا جارہا ہے۔
شہباز باہر نکل گیا تھا۔ سر جی کچن میں کھڑے پیاز اور لہسن چھیل رہے تھے۔ میں واش روم میں جا گھسا مگر مفتی سوچوں میں غرق اپنے میٹرس سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔
کچھ دیر بعد کچن سے خوشبو آنے لگی جو بھوک کو بڑھا رہی تھی۔ سر جی نے گوشت کو بھوننے کا عمل شروع کر دیا تھا۔
دس بارہ منٹ میں شہباز آٹے کا تھیلا اٹھائے آگیا اور سر جی ماتھے پر شکنیں ڈالے بڑی سنجیدگی سے آٹا گوندھنے لگے۔
مسالوں کی خوشبو کی وجہ سے شہباز بار بار دیگچی میں جھانک رہا تھا اور مفتی ابھی تک سکتے کے عالم میں تھا۔
کچھ دیر بعد اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک ہوئی۔
سر جی نے گھبرا کر مشورہ دیا۔ ''دیگچی چھپا لیتے ہیں، خان ہو گا۔''
میں نے دروازہ کھولا تو وہاں واقعی خان تھا مگر اس کے ہاتھ میں ایک بھری ٹرے تھی۔
اندر داخل ہوتے ہی پہلے کھی کھی والا قہقہہ لگایا اور پھر بولا۔ ''تم بھوکوں ننگوں کے لیے کلیجی اور گوشت بنا کر لایا ہوں۔'' پھر ناک چڑھا کر سونگھنے لگا اور بولا۔ ''کچن میں کیا جل رہا ہے۔''
ہم نے بتایا کہ قربانی کے گوشت کا سالن بن رہا ہے تو ٹرے لے کر خود کچن میں گھس گیا۔ وہاں جب سر جی کو آٹا گوندھتے دیکھا تو وہیں اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ہنستے ہنستے کچن کی کھڑکی سے مفتی کو مخاطب کیا۔ ''مفتی! لگتا ہے کل ندیم تمہیں اپارٹمنٹ سے باہر کھڑا کرے گا اور خود مالک بن بیٹھے گا۔'' آٹا دیکھ کر ہی اسے یہ خیال آیا کہ اس کے پیچھے میری ہی کارستانی ہو گی۔
اب ہمارے پاس کھانے کا ذخیرہ بڑھ گیا تھا۔ روٹیاں خان بھی لے آیا تھا کہ اتنے میں دوبارہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شہباز نے پیٹ کھجلاتے ہوئے دروازہ کھولا تو ہمارا پٹھان دوست مطیع اللہ تھا۔ پہلے ہمیں باریک سی آواز میں السلام علیکم کی آواز آئی اور پھر وہ شہباز سے بولا۔ ''یہ تم کینیڈا میں کس حالت میں گھومتی پھرتی رہتی ہے۔''
دراصل شہباز نے حسبِ عادت شرٹ اتار کر صرف قمیص پہنی ہوئی تھی اور بے پناہ زرد اور سرخ چہرے کے ساتھ اپنا بدن کھرچ رہا تھا۔ اتنے میں مطیع اللہ لیونگ روم میں داخل ہوا اور شہباز سے بولا۔ ''سوات میں تو تمہاری بھی قربانی جائز بنتی ہے۔''
اس سے پہلے کہ دونوں میں تکرار ہو جاتی میں نے بڑھ کر عید مبارک کہا اور اسے مفتی کے پہلو میں بٹھا دیا۔
اب جب اتنے لوگ اکٹھے ہوئے تو لیونگ روم میں ہنگامہ برپا ہونا ہی تھا۔ مطیع اللہ شہباز کو خان کو رگیدنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں آرام سے ڈور وال سے ٹیک لگائے بیٹھا لطف لینے لگا۔
''اور کینیڈا میں زندگی کیسے گزر رہی ہے۔'' خان نے مطیع اللہ سے پوچھا۔
''گوروں کے ملک میں مسلمانوں کی زندگی خنزیروں والی ہی ہوتی ہے۔ وہی گزار رہا ہوں۔''
''مطیع اللہ بھائی! خنزیروں والی مت کہو بلکہ یہ کہو کتوں والی۔''
''کیا پھرق (فرق) پڑتا ہے دونوں حرام ہیں۔'' پھر وہ پلٹ کر شہباز کی طرف متوجہ ہوا۔ ''یہاں سب خنزیروں کی زندگی گدھوں والی بھی ہے۔''
''مگر گدھا حرام تو نہیں ہے۔'' شہباز ہنستے ہوئے بولا۔
''گدھا اپنے آپ کو حلال نہیں کہے گا تو کیا حرام کہے گا۔'' مطیع اللہ بولا۔
اس بات پر قہقہے بلند ہونا ضروری تھے شہباز نے آستینیں چڑھالیں، اس سے پہلے کہ گھمسان کا رن پڑتا کہ سر جی نے سب کے سامنے جلیبیاں اور چائے رکھ دی اور منمنا کر نصیحت کی۔ ''عید کے دن صرف خنزیر، کتے اور گدھے لڑتے ہیں۔''
سر جی کی پھرتیاں دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔
میں نے مسکرا کر ٹیک لگایا اور چائے پینے لگا۔
کھانا کھانے کے بعد مطیع اللہ نے انکشاف کیا کہ اس نے دو دن پہلے ہیموسال میں انٹرویو دیا ہے۔ وہ کوالٹی

کنٹرول میں جاب حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سب اسے خفیہ انٹرویو کی مبارک باد پیش کررہے تھے۔ میں بھی حیران تھا کہ مطیع اللہ نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ہر بات کو انتہائی خفیہ رکھنے کا عادی تھا۔

سب کی مبارک بادیں وصول کرنے کے بعد اس نے مفتی سمیت ہم سب پر یہ بم چھوڑا کہ اگر اس کی ہیموسال میں جاب ہو جاتی ہے تو وہ بھی ہمارے ساتھ اسی اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائے گا۔

یہ سن کر مفتی کے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھلکا اور کارپٹ گیلا ہو گیا۔ شہباز واویلا کرنے لگا۔ ''ایک اور سیاپا۔''

سرجی کو اپنی پڑ گئی کہ کہیں ان کی یہاں سے چھٹی نہ ہو جائے۔ میں خود حیران و پریشان بیٹھا تھا کہ مطیع اللہ کو سب کے سامنے بات کرنے سے پہلے ہم میں سے کسی سے بات کرلینی چاہیے تھی۔ یہ بات مناسب نہیں لگ رہی تھی کہ آپ مالک مکان کو صرف اطلاع دے رہے ہوں کہ میں آپ کے گھر میں شفٹ ہو رہا ہوں۔

بوکھلایا ہوا مفتی مجھے دیکھ رہا تھا اور میں مطیع اللہ کو۔ ہیموسال ہمارے گھر کے قریب تھا اور جہاں مطیع اللہ رہتا تھا وہاں سے ایک گھنٹے کا فاصلہ تھا۔ اسے یہاں بہت سہولت تھی کہ فاصلہ صرف پندرہ منٹ کا تھا مگر ہم پہلے ہی ایک کمرے میں تین بندے رہ رہے تھے اور لیونگ روم پر اکیلے مفتی کا قبضہ تھا۔

میں نے مطیع اللہ کے سامنے جگہ کا مسئلہ رکھا تو بولا۔ ''ہم فقیر لوگ ہیں پاؤں میں بھی سو جائیں گے۔''

اپارٹمنٹ کا ماحول ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ خان اپنی خالی ٹرے لے کر کھسک گیا۔ مطیع اللہ بولا۔ ''سوچتا ہوں کہ آج رات یہیں رک جاؤں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی جیکٹ اتاری۔ مفتی کے میٹرس پر لیٹ کر رکھی اور اپنا سر ٹکا کر آنکھیں موندھ لیں۔ مفتی اپنی اور اپنے میٹرس کی یہ توہین برداشت نہ کرتا ہوا بےبسی سے میری جانب دیکھ رہا تھا بلکہ سرجی اور شہباز بھی میری جانب دیکھ رہے تھے اور میں سوچوں میں گم مستقبل میں اس اپارٹمنٹ کا نقشہ بدلتا بگڑتا دیکھ رہا تھا۔

مطیع اللہ کا معاملہ ہم نے بیچ میں چھوڑا کہ جب اس کی جاب ہو جائے گی تو دیکھ لیں گے۔ دوسرے دن سے سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ سرجی اپنی سیکیورٹی گارڈ والی جاب سے خاصے مطمئن تھے اور اسی میں لگا رہنا اپنا نصیب سمجھ بیٹھے تھے۔ شہباز نے ایک کیمیکل لیب میں انالسٹ کی Co-op کی جاب شروع کردی تھی اور اس کا رعب سرجی پر ڈالتا تھا۔ میں نے باقاعدہ ہیموسال میں ٹریننگ کے بعد اپنی جاب شروع کی تھی اور ہفتے میں پانچ دن کام کرنے کے بعد ویک اینڈ پر ہولڈنگ سینٹر کی لمبی شفٹیں کرتا تھا جو دوپہر بارہ سے لے کر رات بارہ بجے تک کی ہوتی تھیں اس سے مجھے کچھ ایکسٹرا ڈالرل جاتے تھے۔

میرے بچے چند ماہ میں آنے والے تھے۔ مجھے اپارٹمنٹ کرائے پر لینا تھا اور اس کے لیے دو ماہ کا ایڈوانس کرایہ جمع کروانا تھا۔ فرنیچر اور گھر کا سامان لینا تھا۔ بیوی بچوں کے لیے ایئر ٹکٹ لینے تھے۔ اس لیے میں ایک مصروف شیڈول کا شکار ہو گیا تھا۔ ہفتے میں کوئی ایک دن بھی فارغ نہ ہوتا تھا اور یہ میرے مزاج کے خلاف تھا۔ میں یہ زندگی زیادہ عرصہ نہیں گزار سکتا تھا۔

ہیموسال میں ٹریننگ کے بعد مجھے یہ خوشگوار حیرت ہوئی کہ انہوں نے مجھے سب سے ہائی ٹیک ڈپارٹمنٹ ''کراس لنکنگ'' کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ اس میں مجھے ماڈرن مشینری کے علاوہ ماڈرن ٹیکنالوجی میں بھی تجربہ حاصل ہو سکتا تھا۔ میں پورے دل و جان سے اپنے کام میں جت گیا۔ جب میری صبح کی ہیموسال میں شفٹ ہوتی تو صبح سات بجے جاتا اور تین بجے واپسی ہوتی۔ شام کی شفٹ دوپہر ایک بجے سے رات آٹھ بجے تک کی ہوتی۔ میرے ساتھ ٹریننگ پر کیٹی، فرڈی، ڈایانا تھیں اور انہیں ان کی تعلیم کی مناسبت سے واشنگ پر لگا دیا گیا تھا۔

کراس لنکنگ میں ایک جین تھی۔ عمر یہی کوئی پینتیس کے قریب ہوگی۔ سڈول جسم اور دماغ کی تیز تھی۔ اس نے سبز اور گول آنکھوں سے مجھے پہلے ہی دن گھور کر دیکھا۔ میں نے نظر انداز کر دیا پھر ایک دن اس سے تلخ کلامی بھی ہوئی۔ ہمارا پہلا جھگڑا اس بات پر ہوا تھا کہ میں اس سے پوچھ بیٹھا تھا کہ تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ اس بات کا اس نے بہت برا منایا اور کہا کہ مجھے شادی کی ضرورت کیا ہے، میرے کئی بوائے فرینڈز ہیں۔ کئی بوائے فرینڈز کا ذکر اس نے کیوں کیا یہ بات نہ میری سمجھ میں آئی اور نہ مفتی کی۔ میرے ساتھ ڈپارٹمنٹ میں فلپائن کا ایک تیز طرار اور بہت چھوٹے قد کا چیتو تھا اور ساتھ ہی ایک سیاہ فام اوٹمن تھا۔ ان دونوں کو مجھ سے بیر ہو گیا اور وہ دونوں میرے خلاف

سازشیں کرنے لگے۔ شاید میرا کام سیکھنے کا جنون انہیں پسند نہ آیا تھا۔ ان کے رویے سے میں یہ جان گیا کہ سیاست اور سازشیں صرف پاکستان میں ہی نہیں، مغربی ممالک میں بھی ہوتی ہیں اور ہم سے بہت زیادہ ہوتی ہیں۔

میرے ساتھ والے ڈپارٹمنٹ میں مفتی کام کرتا تھا اور اس کے ساتھ ایک یہودی ''مریکا'' بھی تھا۔ وہ تنزانیہ کا سیاہ فام تھا اور ہر وقت ہم پاکستانیوں اور انڈین کے گروپ کے ساتھ زیادہ خوش رہتا تھا۔ زندگی کے اس ٹریک پر چڑھنے کے بعد اپنی افتاد برقرار رکھنے کے لیے شروع میں مجھے کچھ دشواری پیش آئی مگر پھر ہر ایک کی طرح میں بھی اس راستے کا عادی ہوتا گیا۔

میری مصروفیت بڑھی تو نسرین کے ساتھ ساتھ سرجی کی شکایتیں بھی بڑھنا شروع ہوگئیں۔ سرجی کو گلہ یہ تھا کہ میں اس معصوم کا دل دکھا رہا ہوں۔ میں اپنی مصروفیت کا بتاتا تو وہ کہتے کہ جب تین بجے آجاتے ہو تو اس معصوم سے مل لیا کرو۔ یہ بات سرجی نے نسرین کو بھی بتا دی تھی اور اسی وجہ سے اس کی ناراضگی میں شدت آگئی تھی۔

ایک دن جب میں ہیمو سال سے واپس آیا تو گھڑی تین بجا رہی تھی۔ ہاتھ میں کافی وقت تھا۔ سوچا نسرین کو فون کرلوں۔ اپارٹمنٹ سے اسے فون ملایا تو خلاف توقع اس کے بیٹے کی بجائے اس نے خود فون اٹھایا اور میری آواز سن کر چہکنے لگی۔ اس کے لہجے کی کھلکھلاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ بہت خوش ہے۔ میں نے خوشی کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دینے کی بجائے جلترنگ مچاتی ہنسی ہنس دی۔ دوبارہ استفسار کیا کہ تمہارے شگوفے کیوں پھوٹ رہے ہیں۔

''یہ بتا دیا تو آنا پڑے گا۔'' اس نے ہنس کر کہا اور میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ ماجرا کیا ہے۔ کہیں اس کا بھائی تو امریکا سے نہیں آگیا مگر یہ ممکن نہ تھا کیونکہ وہ تو بستر پر زخمی پڑا تھا۔ نسرین سے ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ اسپتال میں ہے۔ میں نے خوش دلی سے پوچھا۔ ''کیا یہ رونقیں میری وجہ سے ہیں؟''

''آج سعد کی سالگرہ ہے۔''

میں ہلکا سا شرمندہ ہوا مگر پھر سنبھل گیا اور پوچھا۔ ''تو مجھے سالگرہ کا کیوں نہیں بتایا؟''

کہنے لگی۔ ''پچھلی بار پارک میں بتایا تو تھا لگتا ہے شاید تم بھولنے لگے ہو۔''

میں خاموش سا ہو کر سوچنے لگا مگر اب کیا کروں تبھی وہ بولی۔ ''کیا تم آرہے ہو؟''

اب میرے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے کیک کا پوچھا تو کہنے لگی۔ ''سب موجود ہے بس تم آجاؤ۔'' میں نے فون رکھ دیا۔

میں ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ گفٹ کیا لے کر جاؤں کہ اتنے میں سرجی سیکیورٹی گارڈ کی وردی میں آنکھیں ملتے ہوئے روم میں کھڑے مجھے گھورے جا رہے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولے۔ ''کہاں کی تیاری ہے؟''

میں نے کہا۔ ''کہیں کی نہیں مگر آپ وردی میں کیوں سو رہے تھے؟''

اپنے دیدے مٹکاتے ہوئے بولے۔ ''سب سن لیا ہے، ہمیں الو مت سمجھیں۔ ہم آپ کے بھی چچا ہیں۔''

''ایک تو الو سمجھا نہیں بلکہ بنانا ہوتا ہے اور ہاں آپ ہمارے چچا خدانخواستہ کب سے ہوگئے؟''

فرمانے لگے۔ ''مطلب یہ ہے کہ ہم آپ سے تو کم از کم زیادہ عقل رکھتے ہیں اور الو بنانا ہو یا سمجھنا، آپ اہل زبان کی درستگی کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔''

میں نے سوچا کہ یہ بحث کے موڈ میں ہیں۔ انہیں موقع دینا مناسب نہیں، اس لیے کھسک جانا ہی بہتر ہے۔ اپنے خیال کو عملی جامہ دینے کے لیے میں اندر والے کمرے میں چلا آیا۔ کچھ دیر بعد وہ چائے کا مگ پکڑے آئے۔ میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ''سرجی! کم از کم میرے لیے چائے مت بنایا کریں۔ ضرورت ہوگی تو خود بنا لیا کروں گا۔''

''یہ آپ کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے بنائی ہے۔''

میں ایک بار پھر شرمندہ ہوگیا۔ وہ ہنس پڑے اور مگ مجھے تھما دیا کہ آپ ہی کے لیے ہے۔

میں نے ڈھنگ کے کپڑے پہنے، موسم خوشگوار ہو رہا تھا۔ کل ہفتے کا دن تھا اور مجھے بارہ بجے ہولڈنگ سینٹر جانا تھا۔ جیکٹ میں نے موسم کی مناسبت سے پہنی اور لیونگ روم میں لوٹ آیا۔ ایک لفافے میں سالگرہ کے گفٹ پر کچھ ڈالرر کھے، یہ دیکھ کر سرجی بولے۔ ''نسرین باجی کو میرا اسلام کہہ دینا۔''

وہ شرارت کے موڈ میں تھے اور میں نے چہرے پر مکمل طور پر مصنوعی سنجیدگی چڑھا لی تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر بولے۔ ''آپ جاتے ہیں، پھر واپس چلے آتے ہیں۔ یہ

آنے جانے سے آپ کا کوئی فائدہ اور نہ اس سے نسرین کا کوئی نقصان۔''

میں نے بھنا کے گھوم کر دیکھا مگر وہ واش روم میں جا گھسے تھے۔ میں ذرا سا چکرایا اور اٹکھیلیاں کرتی ہواؤں سے لطف اندوز ہوتا ہوا بس اسٹاپ پر آیا۔ جمعہ کی شام مغرب میں بہت رنگین ہوتی ہے۔ گو ابھی شام ہونے میں بہت وقت تھا مگر ہر ایک کے چہرے پر ویک اینڈ کی خوشی چھپاں تھی۔ جمعہ کو یہ لوگ بہت خوش ہوتے ہیں TGIF اس کا مطلب پوچھنے پر مجھے بتایا گیا کہ Thanks god its friday کا مخفف ہے۔

بس اسٹاپ پر مجھے جواں سال لڑکے اور لڑکیوں کے چہروں پر TGIF لکھا ہوا دکھائی دیا۔

بس میں بیٹھا تو اس کی گرمائش یعنی Heating بند تھی۔ پہلی بار میں ٹھنڈی بس میں گرم بیٹھ رہا تھا۔ بس آگے ہی آگے چلی جا رہی تھی۔ تازہ ہوا کے جھونکے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ جب بس کہیں رکتی اور اس کا دروازہ مسافروں کے لیے کھلتا تو کئی مسافر آگے پیچھے چڑھ آتے اور کچھ اتر جاتے۔

چالیس منٹ بعد میں نسرین کے اپارٹمنٹ سے کچھ فاصلے پر واقع ایک بس اسٹاپ پر اترا۔ علاقہ بڑا نہ تھا۔ دو رویا سڑک کی ہر جانب چھوٹے بڑے اسٹور اور چند ایک مال تھے۔ آج پیدل چلنے والے بہت تھے۔ ان کے درمیان میں بھی آ شامل ہوا اور کچھ دیر بعد ایک چار منزلہ عمارت کے سامنے کھڑا تھا پھر لفٹ سے دوسرے فلور پر پہنچا۔ راہداری سے داہنے ہاتھ پر بنے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجائی۔

دروازہ اس کے بیٹے سعد نے کھولا۔ میں پہلے بھی اس سے مل چکا تھا۔ آج سعد اپنی سالگرہ کے دن خوب بنا سنورا کھڑا تھا۔ سیاہ چمکدار بال اور ایسی ہی آنکھیں اور ساتھ سرخ و سفید چمکتی ہوئی رنگت، ایسا بچہ جسے دیکھ کر ہر کسی کو پیار آ جائے۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ دروازے پر ہی پوچھنے لگا۔ ''انکل کیا واقعی آپ میری برتھ ڈے پر آئے ہیں؟''

میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے ہاں میں اپنا سر ہلایا۔ میں اس بچے کو دیکھ کر ہمیشہ یہی سوچتا تھا کہ ان کو واپس ایران چلے جانا چاہیے۔ ابھی یہ چھوٹا ہے اور اس کی پرورش کے سخت مراحل باقی ہیں۔ نسرین میں ہمت تو تھی کہ اس کو پال پوس سکے مگر یہ ہمت کبھی بھی دم توڑ سکتی تھی۔ وہ تھک بھی سکتی تھی۔ میں سعد کی خوب صورت آنکھوں میں جھانک کر یہی سوچ رہا تھا کہ نسرین کچن سے بھاگی ہوئی دروازے پر آئی۔ براؤن رنگ کا گھٹنوں سے نیچے آتا اسکرٹ اور میچنگ شرٹ میں بہت بھلی لگ رہی تھی۔ سیاہ بال کھول کر اپنے کندھوں پر جمع کیے ہوئے تھے۔ مسکراتی آنکھوں سے میرا استقبال ہاتھ ہلا کر کیا اور بولی۔ ''میں سمجھ رہی تھی آپ نہیں آئیں گے۔'' یہ کہہ کر مجھے چھوٹے سے لیونگ روم میں لے آئی اور ایک صوفے پر بٹھا دیا۔

''نہیں! تم یہی سمجھ رہی تھیں کہ میں ضرور آؤں گا۔ اسی لیے اتنی ڈریس اپ ہوئی ہو۔''

وہ ہنس کر بولی۔ ''تیار تو میں بیٹے کے لیے ہوئی ہوں اور لگتا ہے کہ جاب ملنے کے بعد تمہیں اپنے آپ پر بہت زیادہ اعتماد ہو گیا ہے۔''

میں مسکرا دیا اور وہ ''ابھی واپس آئی'' کہہ کر کچن میں چلی گئی۔

میں نے لیونگ روم کا جائزہ لیا تو اسے خاصا صاف و شفاف پایا۔ ایک بڑا آرام دہ صوفہ اور ساتھ میں لیدر کی سنگل سیٹ جس پر میں بیٹھا تھا۔ فرش پر چھوٹا سا ایرانی قالین جس پر کافی ٹیبل رکھی تھی۔ کھڑکیوں پر نفیس سفید کرٹن اور ایک کونے میں رکھا ٹی وی اور ساتھ ہی سعد کے بہت سے کھلونے۔ بائیں ہاتھ پر دیوار کے ساتھ چار کرسیوں والی چھوٹی ڈائننگ ٹیبل۔ ٹھیک میرے پیچھے کچن اور دائیں ہاتھ پر ایک واش روم اور ساتھ ہی بیڈ روم کا دروازہ۔ چھوٹا سا مگر خوب صورت اپارٹمنٹ تھا۔

دیوار پر لگی پینٹنگ کی جانب دیکھا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ میں ملتان یونیورسٹی میں ماسٹر کر رہا تھا تو ہاسٹل میں میرے کمرے کی دیوار پر یہی پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ فراک پہنے ایک جواں سال ایرانی لڑکی کی تصویر جو سر سبز کھیتوں اور کھلیانوں میں چھڑی اٹھائے بھیڑیں چرا رہی ہے۔ خوب صورتی میں ایک بلند مقام تک پہنچی ہوئی آنکھیں اور ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ۔ اپنے قدرتی ماحول میں وہ دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آتی تھی۔ میں اپنی اسٹڈی سے جب تھک جاتا تو یہی چہرہ دیکھ کر آنکھیں آسودگی سے موندھ لیتا تھا۔

وہ بھی کیا دن تھے اور کیا سوچیں تھیں۔ دس سال گزرنے کے باوجود میں اس پینٹنگ کو بھول نہ سکا تھا اور آج پھر وہ تصویر ٹورنٹو میں نسرین کے اپارٹمنٹ میں

آویزاں مجھے مل گئی تھی۔ میں اس زمانے میں پہنچ گیا جب فریبوں میں گھرا تھا اور سرابوں کو جھیلیں سمجھ بیٹھا تھا۔

سعد میری گود میں کھیل رہا تھا اور میں اس تصویر کو دیکھ کر کہیں اور پہنچ گیا تھا کہ نسرین آگئی۔ ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر پینٹنگ دیکھتے پاکر بولی۔ ''اس چہرے کو جانتے ہو؟''

میں نے بے خیالی میں کہا۔ ''نہیں، اس چہرے کو نہیں بلکہ ان لمحوں کو جانتا ہوں جب اس چہرے کو دیکھا کرتا تھا۔''

اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی اور وہ بولی۔ ''ان لمحوں میں کوئی اور چہرہ اس میں ڈھونڈتے تھے؟''

میں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''نہیں، کوئی ایک چہرہ نہیں بلکہ سب شکلیں اس مسکراہٹ کے پیچھے تلاش کرتا تھا۔''

''بڑے رومانٹک تھے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''عمر ہی ایسی تھی۔'' میں ہنس کر بولا۔

''کیا اب عمر زیادہ ہوگئی ہے؟''

''نہیں زندگی میں اور لوگ بھی آگئے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ بات کوئی اور رخ اختیار کرتی کہ سعد میرا بازو کھینچ کر مجھے اپنے کھلونے دکھانے لگا اور نسرین مجھے بغور دیکھتی ہوئی دوبارہ اندر چلی گئی۔

وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ چائے کب سے پینے لگی ہو؟''

''میں نہیں پیتی بلکہ تمہارے لیے ایک انڈین اسٹور سے اور بھی بہت سی چیزوں کے ساتھ یہ بھی لائی تھی۔''

میں نے سوچا کہ چائے کی پتی تو لے آئی ہے مگر چائے بنانا اس کے بس کا روگ نہیں ہے مگر جب ایک گھونٹ بھرا تو ذائقہ بہت اچھا تھا۔ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بولی۔ ''چائے اور پاکستانی کھانا بنانے کا طریقہ میں نے انٹرنیٹ سے سیکھا ہے۔''

میں حیرت سے بولا۔ ''کیا کھانا بھی بنایا ہے؟''

''جی ہاں یہ سرپرائز ہے۔''

وہ کچن میں کام کر رہی تھی اور میں چائے پینے کے بعد سعد کے ساتھ اس کے کھلونوں سے کھیلنے لگا۔ مجھے اس گھر کا ماحول بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مغرب کی نماز کا ٹائم ہوا تو اس نے مجھے جاء نماز لا کر دے دی۔ میں نے نماز پڑھ کر کمر سیدھی کرنے کے لیے صوفے پر لیٹنے کا ارادہ کیا تو سعد کمرے سے تکیہ لے آیا۔ وہ بہت سمجھدار اور تمیزدار بچہ تھا۔

میں اس گھر میں اجنبیت محسوس ہی نہیں کر رہا تھا۔

میں کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹا تو نیند نے دبوچ لیا۔ جب بیدار ہوا تو نسرین پر نظر پڑی۔ وہ ساتھ والی چیئر پر بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی اور سعد قالین پر بیٹھا کھیل رہا تھا۔ ماں بیٹے کو دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا کہ یہ رشتہ بھی کیا ہے۔ ہر عورت ممتا کا جذبہ لے کر پیدا ہوتی ہے اور جب وہ ماں بنتی ہے تو یہ جذبہ پوری قوت سے بیدار ہوجاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔ ایک ماں کسی اور کو دھوکا دے یا کوئی اس ماں کو دھوکا دے یہ دونوں جذبے ماں کے رتبے اور شان کے خلاف ہیں۔

جب میں بیدار ہوا تو نسرین نے اپنا میگزین سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر کہا کہ تم فریش ہوجاؤ اتنے میں، میں کھانا لگاتی ہوں۔

میں سر ہلاتا ہوا واش روم کی جانب بڑھ گیا۔ روشن کھڑکیوں سے شام کی سیاہی جھانکنے لگی تھی۔ میں باہر آیا تو ڈائننگ ٹیبل پر نسرین نے کھانا لگا دیا تھا۔ میں کھانے دیکھ کر ششدر کھڑا تھا۔ اس نے اپنی جانب سے پاکستان اور ایرانی کھانوں کا مکس بنایا تھا۔ پلاؤ میں گوشت کے علاوہ کشمش اور کاجو بھی تھے۔ کوفتوں میں لوبیا ڈالا تھا۔ خشک میووں کے ساتھ زعفران بھی شامل تھا۔

ایک دوسری چھوٹی ٹیبل پر کیک رکھا تھا۔ میں اس ٹی ٹیبل کی جانب بڑھ گیا۔ وہ دونوں بھی نزدیک آگئے۔ نسرین نے بیٹے کے ہاتھ میں چھری تھمائی، میں نے موم بتیاں جلادیں جسے سعد نے پھونک مار کر بجھایا پھر کیک کاٹا۔ اسی دوران ماں بیٹے نے کیک کے ٹکڑے میرے منہ میں ڈال دیئے۔ یہ ہنگامہ میرے صوفے پر بیٹھتے ہی ختم ہوگیا۔ میرے ایک قدم بڑھانے سے انہیں خوشی مل گئی تھی۔

میں صوفے پر بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ نسرین نے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ ہر ڈش ذائقہ دار تھی۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی میز کو نسرین نے صاف کیا اور سامان کچن میں لے گئی۔ سعد چھلانگ لگا کر میری گود میں آبیٹھا۔

قہوہ بنایا گیا تو ساتھ زعفران اور خشک میوہ جات تھے۔ بلیک ٹی کا قہوہ واقعی ایرانی ہی بنا سکتے ہیں۔

قہوہ پیتے ہوئے نسرین بولی۔ ''تم نے آکر میرے بیٹے کو بہت بڑی خوشی دی ہے۔ میں بہت مشکور ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اور تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''

''میں کیا محسوس کر رہی ہوں یہ تم کو معلوم نہیں ہے۔''

میں خاموش رہا تو بولی۔ ’’تم کیا محسوس کر رہے ہو۔‘‘
’’میں نے کہا وہی جو سعد محسوس کر رہا ہے۔‘‘
اس پر وہ برملا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ ہنسی تو سعد سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔
قہوہ ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ’’رات زیادہ ہو گئی ہے۔ مجھے اب چلنا چاہیے کہ بسیں بعد میں ملیں کہ نہ ملیں۔‘‘ پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ نسرین کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور پھر اتر گیا مگر سعد نے سنا تو میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچنے لگا اور یہ کہتا جا رہا تھا۔ ’’انکل آج رات ادھر ہی سو جائیں۔‘‘
اس کی فرمائش سن کر میں بوکھلا گیا۔ میں نے کہا۔
’’مجھے کل صبح جاب پر جانا ہے ورنہ ضرور رکتا۔‘‘
نسرین خاموش رہی۔ اب حالت یہ تھی کہ میں ایک قدم بڑھاتا تو وہ مجھ سے لپٹ جاتا۔ ماں میری جیکٹ لینے جاتی تو اس سے لپٹ جاتا۔ میں عجیب و غریب چویشن میں پھنسا کھڑا تھا۔ اب تو باقاعدہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔
میں شرمندگی سے نسرین کی جانب دیکھتا اور نسرین سعد کو ڈانٹ رہی تھی۔ اس پر وہ باقاعدہ رونے لگا۔ میں نے نسرین سے کہا کہ تم ڈانٹو نہیں میں پندرہ بیس منٹ رک جاتا ہوں اور جیسے یہ چپ ہو گا تو سمجھا کر چلا جاؤں گا۔ وہ خاموش ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی میں دوسرے صوفے پر ٹیک لگا کر جا بیٹھا اور سعد میری گود میں آ گیا۔ اپنا سر میرے سینے پر رکھا اور ہچکیاں لینے لگا۔ نسرین یہ سب حیرت اور خوشی سے دیکھ رہی تھی اور میں صرف سعد کے گالوں پر پھسلتے وہ آنسو دیکھ رہا تھا جو اب خشک ہو رہے تھے۔
سعد کی آنکھیں بند تھیں اور ہچکیاں بھی رک چکی تھیں۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں آخری بس بھی مس نہ ہو جائے۔ میں جانے کے لیے اٹھنے لگا تو سوتا ہوا سعد کسمسایا اور اپنے ننھے بازوؤں سے مجھے جکڑ لیا۔ اب میں نے پریشان اور بے بسی سے نسرین کو دیکھا۔
نسرین نے کہا۔ ’’اگر تم نے جانا ہے تو چلے جاؤ۔‘‘
’’یہ بعد میں جب آنکھ کھلے گی روئے گا۔‘‘
’’ایک بار ہی تو روئے گا بس سنبھال لوں گی۔‘‘
میں نے اپنے دونوں بازوؤں سے سعد کو سینے سے لگایا ہوا تھا۔ مجھے اس پر پیار بھی بہت آ رہا تھا۔ اس کو تو پیدا ہونے کے بعد ماں کے علاوہ کسی کا بھی پیار نہ ملا تھا۔ میں نے ذرا سا پیار کیا تو وہ معصوم نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا۔
میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا تو نسرین بولی۔ ’’مجھے معلوم تھا کہ کل تمہیں بارہ بجے ہولڈنگ سینٹر جانا ہے اور اگر رکنا چاہتے ہو تو رک جاؤ۔‘‘ پھر میری جانب دیکھ کر اپنی بات آگے بڑھائی۔ ’’میں صوفے پر سو جاؤں گی اور تم دونوں اندر بیڈ روم میں سو جانا۔‘‘
میں یہ سن کر اس کی آنکھوں میں تادیر دیکھتا رہا۔ وہاں مجھے بے انتہا اعتماد نظر آ رہا تھا۔ میں رات کے دس بجے بسوں کے چکر میں دھکے کھانے سے ڈر رہا تھا۔ اس لیے بحالتِ مجبوری میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
سعد میرے سینے پر لیٹا تھا۔ میں اس کے نرم ملائم سیاہ بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ نسرین سے کہا کہ مجھے ایک تکیہ دے دے۔
اس نے تکیہ لا کر میرے سر کے نیچے رکھ دیا۔ میں نے کمبل منگوایا تو وہ بھی لے آئی۔ میں نے سعد کو صوفے کے ایک کونے پر سلایا اور خود نسرین سے دوسرا تکیہ لے کر دوسرے کونے پر لیٹ گیا۔ اپنے سیکورٹی شوز بمشکل اتارے پھر نسرین سے کہا۔ ’’میں اور سعد صوفے پر سوئیں گے اور تم کمرے میں سو جانا۔‘‘
وہ کہتی رہی کہ میں تنگ ہوں گا اس لیے کمرے میں سو جاؤں مگر مجھے مناسب نہیں لگ رہا تھا کہ اس کے بستر پر سو جاؤں۔
وہ سامنے بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ آخر اس سے کہنا پڑا۔ ’’مجھے سونے دو اور دماغ مت کھاؤ۔‘‘
وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں مجھے بھی نیند نے آ لیا۔
آنکھ اس وقت کھلی جب اپنے سر پر لمس محسوس کیا۔ دیکھا تو نسرین نے دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھا ہوا تھا اور اسے قدرے ہلا کر مجھے جگا رہی تھی۔ ٹائم دیکھا تو صبح کے سات بجے تھے۔ ایسی صبح کی مجھے توقع ہرگز نہ تھی کہ میں بیدار ہوں تو نسرین کا کھلتا چہرہ اور مسکراتی آنکھیں مجھ پر جھکی ہوں۔ کھڑکیوں کے پردوں سے صبح کی سپیدی لیونگ روم میں آ رہی تھی مجھ پر کمبل ڈالا ہوا تھا اور سعد صوفے پر نہیں تھا۔ وہ خود ہی بولی۔ ’’رات سعد کو میں بیڈ روم میں لے گئی تھی۔ تم سردی سے سکڑے ہوئے تھے تو کمبل ڈال دیا تھا۔

میں نے صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی تو میرے کندھے پر دباؤ ڈال کر مجھے پڑا رہنے دیا۔ میرے بائیں بازو کو اپنے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ میری کہنی صوفے پر تھی اور ہتھیلی کو بند کر کے اپنی ٹھوڑی کے نیچے ٹکا دیا تھا۔ آنکھوں میں شرارت تھی۔ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔ ''یہ صبح صبح کیا کرنے جا رہی ہو؟''

کہنے لگی۔ ''کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔'' پھر پوچھا۔ ''ناشتے میں کیا پسند کریں گے؟''

''میں نے کہا کہ بریڈ کے دو سلائس، آملیٹ اور اس سے پہلے بلکہ ابھی گرم گرم چائے۔''

''میں ابھی چائے لاتی ہوں تم صوفے پر ہی لیٹے رہو۔''

وہ چلی گئی۔ میں نے لیٹے رہنے سے بہتر سمجھا کہ اٹھ بیٹھوں۔ وہ دو کپ بنا لائی۔ ہم نے چائے پی اور میں واش روم میں گھس گیا۔ گرم پانی کا شاور لیا۔ فریش ہو کر بال بنا کر باہر نکلا، ناشتا ٹیبل پر تیار تھا۔ میں ناشتا کر رہا تھا کہ اس نے پوچھا۔ ''تمہاری فیملی کب آ رہی ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''دو تین ماہ اور لگیں گے۔''

وہ اپارٹمنٹ وغیرہ کی ضروری تفصیلات پوچھتی رہی۔ نو بجنے والے تھے اور مجھے نکلنا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میری جیکٹ لا کر مجھے دی۔ سعد کو میں نے ایک نظر کمرے میں جا کر دیکھا اور اس کے ماتھے پر بوسا دیا۔ وہ یہ سب دیکھ رہی تھی میں واپس مڑا تو وہ دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے بولی۔ ''تم نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟''

میں چونک کر رک گیا۔ ''کون سا فیصلہ؟''

''میں ایران واپس چلی جاؤں یا یہیں رکوں۔''

''وہ بات تو ہم کر چکے ہیں۔''

''میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔ اس کے لہجے میں ایک التجا تھی کہ مجھے روک لو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔

مجھے عجیب سے احساس نے گھیر لیا تھا۔ دل کچھ کہتا، دماغ کچھ اور۔ میں عجیب سی کشمکش میں گرفتار تھا۔ اس لیے خاموش کھڑا رہا پھر اچانک وہ لپکی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

میں اس کے لیے تیار نہ تھا اور بری طرح گھبرا گیا۔ وہ اپنے بازوؤں کے گھیرے میں مجھے لیے اپنا سر میرے کندھے پر رکھے شاید رو رہی تھی کیونکہ اس کے آنسوؤں کی نمی میری گردن پر محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ آنسو نہیں بے شمار سوالات ہیں جن کے جوابات میں بھی جانتا ہوں اور وہ بھی جانتی ہے۔ میں بار بار دہرا نہیں سکتا اور وہ بار بار سن نہیں سکتی تھی نہ میرے کہنے کا فائدہ اور نہ اس کے سننے کا فائدہ تھا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ اپنے کندھے سے اٹھایا، اپنے ہاتھوں کے انگوٹھوں سے اس کے آنسو صاف کیے اور بولا۔ ''اگر میں چاہوں بھی تو یہ ممکن نہیں ہے۔''

وہ میری بات سمجھ گئی۔ ایکدم مجھ سے علیحدہ ہوئی اور میرے جاتے جاتے یہ کہتی رہی۔ ''میرے لیے نہیں تو سعد کے لیے آ جایا کرو۔''

میں نے ہامی بھری اور باہر نکل آیا۔

میں باہر تو نکل آیا تھا مگر میرا وجود شاید کہیں اندر رہ گیا تھا۔ باہر کی تازہ اور خنک ہوا کے دھیرے سے چلتے ہوئے ہلکورے بھی مجھے اندر کی قبر سے آزاد نہ کر سکے تھے۔ میں ایک ایسے رشتے کی قربت سے آزردہ تھا جسے میں کوئی نام بھی نہیں دے سکا تھا۔ اس رشتے کو قبول کرنا نہ میرے لیے ممکن تھا اور نہ معاشرے کے لیے مگر یہ کیسا دکھ درد تھا کہ ان سب حقیقتوں کے باوجود میں اسے چھوڑ بھی نہ پایا تھا۔ وہ نہ جانے کون سی ڈور تھی جو میرے اور اس کے درمیان بندھ ملی تھی جسے میں نہ توڑ سکا تھا اور نہ باندھ سکا تھا۔

میں اپارٹمنٹ پہنچا تو ہولڈنگ سینٹر جانے کے لیے میرے پاس ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔

سر جی ابھی تک سو رہے تھے۔ شہباز اور مفتی لیونگ روم میں بیٹھے ٹی وی پر کوئی پاکستانی پروگرام دیکھ رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر پہلے دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے۔ تبھی سر جی بیڈ روم سے اٹھ کر باہر گئے خاموشی سے میرے پاس سے گزرے کونے میں ڈور وال کے ساتھ اپنی جگہ سنبھالی، گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور پھر مجھے سلام کیا۔ اب تین تین نگاہیں مجھ پر ٹکی تھیں جو یہ جاننا چاہتی تھیں کہ رات کہاں گزاری ہے۔ سب سے پہلے سر جی بولے۔ ''رات کہاں تھے؟''

میں خاموشی سے کمپیوٹر ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

پھر شہباز نے پوچھا۔ ''کیا جمال کی طرف چلے گئے

تھے؟"

میں اپنے گال سہلانے لگا تو شہباز بولا۔ "یہ جھوٹ مت بولو کہ نسرین نے رات روک لیا تھا۔"

میں نے بڑا سادہ جواب دیا اور جھوٹ بولنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ "جب معلوم ہے تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟"

یہ کہہ کر میں نے ڈور وال کے شیشوں کے پار نیلے آسمان کو دیکھا جہاں آہستہ آہستہ بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔ سرجی ابھی تک شش و پنج میں بیٹھے تھے۔ پھر خاموشی کے پردے چاک کیے۔ "باہر آب برسے گا نہیں مگر ڈر ہے کہ کہیں آپ پر پانی نہ پھر جائے۔"

میں نے کہا۔ "میری عزت اتنی کمزور نہیں کہ ہر چھوٹی بات سے خراب ہونے لگے۔"

"میں آپ کی نہیں اس معصوم کی بات کر رہا ہوں۔"

اسی دوران مفتی صرف پلکیں جھکائے مجھے دیکھتا رہا۔

ان سب کو یہ شک تھا کہ میں رات کہیں نسرین کی طرف نہ ٹھہر گیا ہوں لیکن وہاں میرے رکنے پر ان کو یقین کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ درمیان میں الجھے رہیں اور مجھ سے زیادہ سوال و جواب نہ کر سکیں۔ میں کچھ دیر میں تیار ہوا اور ہولڈنگ سینٹر جانے کے لیے نکل گیا۔

ٹیکس فائل کرنے کے دن تھے۔ ہر وہ شخص جس نے پچھلے سال کچھ بھی کمایا ہے اسے حکومت کو بتانا پڑتا ہے۔ اگر آپ ٹیکس فائل نہیں کرتے تو یہ جرم ہے اور اس سے بڑا جرم ہے کہ جب کوئی اپنی آمدن کم بتائے یا کم بتانے کی کوشش کرے۔ تنخواہ دار کی تنخواہ سے ٹیکس کاٹ کر حکومت کے خزانے میں جمع کرا دیا جاتا ہے۔ اصل معاملہ ہوتا ہے بزنس مین کا جس کو اپنی آمدنی اور اخراجات کا حساب دینا پڑتا ہے۔ اخراجات کے اندراج پر وہ اعتبار کر لیتے ہیں اور بہت سی چیزوں کی رسیدیں سنبھال کر رکھنی پڑتی ہیں۔ ٹیکس فائل کرتے وقت کوئی رسید نہیں دینی پڑتی مگر جب آپ کی فائل انکوائری پر آجائے تو آپ کا عرق نکال دیتے ہیں۔ تنخواہ دار اپنا ٹیکس خود فائل کرتے ہیں۔ ورنہ شاپنگ مال میں اور کل وقتی اکاؤنٹنٹ اپنی دکانوں یا دفتروں میں بیٹھ کر ہم سے بیس سے پچاس ڈالر لے کر یہ کام بآسانی کر دیتے ہیں۔ میری آمدن پچھلے سال صرف ایک سو اسی ڈالر تھی۔

جب میں ہولڈنگ سینٹر آیا تو بیدی ہیڈ گارڈ تھا۔ اسلام بٹ بھی اپنے آرٹ کے شہ پاروں کے ساتھ موجود تھا۔ کرنل حسب معمول اخبار میں کھویا ہوا تھا۔

بیدی کلین شیو سکھ تھا۔ پہلے میرے ساتھ اس کا رویہ بہت جارحانہ تھا مگر جب میں نے کینیڈا کے قوانین اسے یاد کروائے تو اب دوستی پر اتر آیا تھا۔ دوسرا اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ میری ایک اور اچھی جاب ہو گئی ہے اور اب میرے لیے سیکیورٹی گارڈ کی جاب کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور اگر مجھے زیادہ تنگ کیا گیا تو اپنے ساتھ کسی دوسرے کو بھی کھینچ لوں گا۔

سلام دعا کے بعد بیدی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "ٹیکس فائل کیا ہے یا نہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے اپنے بیگ سے ٹیکس فارم نکالا۔ مجھ سے کوائف پوچھے۔ اسے یہ بھی بتایا کہ ہم گھر میں چار افراد ہیں۔ ان سب کا اندراج کیا۔ کچھ جمع تفریق کرنے کے بعد بولا کہ تم کو ڈھائی سو ڈالر حکومت واپس کرے گی۔ میں حیران تھا کہ آمدن ایک سو اسی ڈالر اور ریٹرن ڈھائی سو ڈالر۔ پھر سب نے مل کر مجھے سمجھایا کہ اگر آمدن کم ہو اور فیملی بڑی ہو تو حکومت آپ کی امداد کرتی ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد میل سے مجھے ڈھائی سو ڈالر کا چیک مل گیا۔

جب شروع میں یہاں کوئی امیگریٹ آتا ہے اور اپنی جاب کی وجہ سے فیملی اسپانسر کرنے سے کتراتا ہوتا ہے تو یار دوست اس سے ایک سوال ضرور کرتے ہیں کہ بچے کتنے ہیں اور ان کی عمریں کتنی ہیں۔ جس کے بچے زیادہ ہوں تو اس کو تھپکی دی جاتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا کوئی بڑا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ جیسے اس کے پاس کوئی بہت بڑی ڈگری یا تجربہ ہو۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ گورنمنٹ کینیڈا ہر شہری کو بچوں کا الاؤنس دیتی ہے۔ تین بچے ہوں اور ان کی عمریں اٹھارہ سال سے کم ہوں تو سب ملا کر مہینے کا ایک ہزار ڈالر تک مل جاتا ہے۔ اوسط درجے کا گھر چلانے کے لیے دو ہزار ڈالر بھی نعمت ہیں جس میں اپارٹمنٹ کا کرایہ بھی شامل ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ بچوں کی پرورش اور نگہداشت پر حکومت کتنی توجہ دیتی ہے۔

رات بارہ بجے جاب ختم ہوئی تو باہر نکلے۔ دیکھا تو آسمان بادلوں سے صاف تھا اور ہلکی خنکی لیے ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ ہوا کی سرسراہٹ میں بہار کی خوشبو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ ٹورنٹو وہ نہ تھا جو پچھلے پانچ ماہ میں ہمیں ملتا رہا تھا۔ میں نے جوش میں آکر اسپرنگ جیکٹ کی زپ بھی کھول لی۔ ایسا کیف موسم اس سے پہلے نہ میں نے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

دیکھا تھا اور نہ محسوس کیا تھا۔ گو کہ درخت اپریل میں بھی بے برگ تھے اور نئے موسموں کی نوید چہار جانب فضاؤں میں تھی۔

اپارٹمنٹ پہنچا تو وہی منظر تھا جو چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے سب کو سلام کیا اور سب نے گھور کر مجھے جواب دیا۔ مجھے دیکھتے ہی سب شاید خاموش ہو گئے تھے۔ شاید سب کے دلوں میں ایک ہی سوال ابھی تک تھا کہ رات میں کہاں تھا۔

میں کپڑے تبدیل کر کے آیا تو سرجی نے خاموشی سے میرے لیے کھانا لگا دیا۔ میں نے دوسروں سے پوچھا تو سب نے یک زبان جواب دیا۔ ''ہم کھا چکے ہیں۔'' یہ بول کر سب دوبارہ خاموش ہو گئے۔ میں بھی سوچ سوچ کر کھانا کھاتا رہا۔ اندر سے میں بھی لطف لے رہا تھا۔ کھانے کے دوران کبھی چھت کو دیکھنے لگتا۔ کبھی پہلو بدل کر باہر آسمان کی طرف نظر دوڑاتا پھر پانی پیتا پھر کچھ سوچتا اور کچھ سوچ کر پھر کھانا کھانے لگتا۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے برتن کچن میں رکھے اور بیڈ روم میں سونے چلا گیا۔ شہباز چلا کر بولا۔ ''اب کہاں جا رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''کل جاب کے لیے بھی جانا ہے۔ کیا تم لوگوں کی طرح ہڈحرام ہوں۔'' میں مسکراتا ہوا سو گیا اور باہر سے بہتوں کی آہ وزاری مجھے سنائی دیتی رہی تھی۔

میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ میرے بیڈ کے ساتھ کمرے کی ڈور وال تھی۔ ڈور وال کا شیشہ دروازے کی طرح اندر سے کھل جاتا تھا۔ سردیوں میں جب بھی کمرے کا درجہ حرارت بڑھتا تو میں ڈور وال کو ایک سائیڈ سے سرکا دیتا تو دروازے میں ایک درز بن جاتی جو باہر کی سردی کو اندر لا کر چند منٹ میں کمرے کو فریزر بنا دیتی تھی۔ سردی کا زور ٹوٹنا شروع ہوا تو میں اکثر ڈور وال کو ہلکا سا کھولے رکھتا تھا۔ ڈور وال کے پرے سوکھی جھاڑیاں تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ ازلوں سے کملائی ہوئی ہیں۔ سردیوں میں ان پر برف پڑی رہتی تھی۔ ان دنوں برف سے نجات حاصل کر کے وہ خشک اور جلی ہوئی ٹہنیاں ہی بچ گئی تھیں۔

صبح میں جب بیدار ہوا تو اجالا رات کے اندھیرے سے باہر آنے کی جستجو میں تھا۔ اس وقت باہر جھاڑیوں کے آس پاس میں نے چڑیوں کی چہچہاہٹ سنی، ان کی آواز متواتر چلی آرہی تھی۔ میں نماز میں سجدے میں گیا تو ان کا ورد زیادہ بلند ہو گیا۔ مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ بہار کالسں میں ان ہواؤں سے محسوس کر رہا تھا جو ڈور وال کی درز سے اندر آرہی تھی اور اس کا ترانہ چڑیوں کی چہچہاہٹ کی صورت اپنی منادی کر رہا تھا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ چڑیاں صرف پاکستان میں ہوتی ہیں آج کے دن پرندوں کی بولی سن کر میرا یقین پختہ ہو گیا کہ اللہ کی قدرت اور نعمتیں دنیا کے ہر حصے میں یکساں ہیں۔ اکثر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسباب کی بھرمار یہاں ہم سے بہت زیادہ ہے۔

میں نماز پڑھ کر دوبارہ اپنے میٹرس پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ شیشے کے پار باہر کا منظر جادوئی ہو گیا تھا جہاں کبھی برفانی جھکڑ چلتے تھے، وہاں آج دھیرے سے اٹکھیلیاں کرتی ہواؤں کا راج تھا جہاں پہلے برف کا سناٹا ہوتا تھا آج پرندوں کی مختلف بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔ درخت اپنی جگہ جھوم رہے تھے۔ آسمان کا مالک اپنی حمد وثناء سن کر اپنی رحمتیں نازل کر رہا تھا۔ ایک سرمئی ماحول نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ کوئی روشنی آسمان سے نیچے اتری اور ملگجے اندھیرے کو روشن کرتی گئی۔ اتوار کی چھٹی کی وجہ سے باہر سناٹا تھا۔ دن نکلنے کا اندازہ مجھے تب ہوا جب شہباز کی سوتے چہرے کو سورج کی روشنی اور زیادہ دور کرنے لگی اور وہ جب بڑبڑانے کی آڑ میں گالیاں دینے لگا۔

میں باہر نکلا تو مفتی جاگ رہا تھا اور ہلکی آواز میں ٹی وی میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا تو بڑے خوشگوار موڈ میں سلام کیا اور فوراً ہی چائے بنانے چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں چائے بنا کر کپ میرے حوالے کیا اور بولا۔ ''وہ دونوں پریشان ہو رہے ہیں۔ اب انہیں بتا ہی دو کہ رات کہاں گزاری تھی۔''

میں نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ ''انہیں اپنے اندازے لگانے دو۔''

کہنے لگا۔ ''چلو مجھے تو بتا دو۔''

میں جان تو گیا تھا کہ یہ چائے مجھے اس لیے پلائی جا رہی ہے کہ کوئی کھٹی میٹھی کہانی اس کو سناؤں لیکن میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تم مجھے لوفر لفنگا سمجھتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''قسم سے نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میرا اعتبار تو ہے ناں؟''

سیریس ہو کر بولا۔ ''بہت ہی زیادہ بلکہ اپنے سے بھی

بڑھ کر۔‘‘

میں نے جواب میں کہا۔ ’’تو بس میرا اعتبار کرو کہ میں کسی غلط جگہ پر نہیں تھا۔‘‘

میں نے بات یہیں ختم کردی۔

میں چھوٹا تھا تو دیکھا کرتا تھا کہ ہماری اپنی روایات ہوتی تھیں برائی کو لوگ برائی سمجھتے تھے۔ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا دونوں کے درمیان ایک واضح لائن ہوا کرتی تھی۔ اگر کسی رشوت لینے والے ادر سیئر یا کسی افسر کے بچے ہمارے اسکول میں ہوتے تو سارے بچے اور اساتذہ بھی ان بچوں کو دبے دبے الفاظ میں طعنے مارا کرتے تھے کہ ان کا باپ رشوت لیتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا خودکار نظام تھا جو خود احتسابی سے شروع ہوتا ہے۔ محلے کی کوئی لڑکی سب کی سانجھی عزت ہوا کرتی تھی۔ اس کی عزت کی خاطر بچے تک کسی سے بھی ٹکرا جاتے تھے۔ دولت سے زیادہ عزت کا پاس ہوتا تھا۔ اپنی بیٹیوں کے رشتے کے لیے ماں باپ شرافت اور عزت کو بھی بہت دان دیتے تھے۔ ان کو یہ کبھی گوارا نہ ہوتا تھا کہ ان کی بچیاں در بدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ اسی لیے وہ خاندانی ساکھ کا بہت خیال کرتے تھے مگر اب بہت سی برائیوں کی طرح یہ برائی بھی عام ہوگئی ہے کہ معاشرے کی ترجیحات بدل گئی ہیں یا تیزی سے بدل رہی ہیں۔ اس خرابی کی ایک مثال دیتا ہوں۔

میں ہولڈنگ سینٹر گیا تو کل کی ہی طرح آج بھی بیدی ہیڈ گارڈ تھا۔ اسلام بٹ مجھے دکھانے کے لیے اپنے آرٹ کے نمونے لیے میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور گرنام سنگھ ایسا لگتا تھا کہ اس سے کل والا اخبار ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ تمام قیدی اپنی میزوں کے گرد ویسے ہی بیٹھے تھے جیسے ہمیشہ بیٹھے ہوتے ہیں۔ شکستہ، کملائے، ٹوٹے پھوٹے اور مرجھائے ہوئے۔ ہر ایک اپنی باری کا انتظار کررہا تھا کہ یا تو کینیڈا میں رہنے کا پرمٹ مل جائے اور یا پھر یہاں سے اپنے ملک کو ڈی پورٹ کردیے جائیں۔

بیدی نے آنکھ دبا کر مجھ سے کہا۔ ’’نیچے بیٹھنا ہے؟‘‘ مطلب یہ تھا کہ نیچے کوئی خوب صورت پری پکڑ کر لائی گئی ہوگی۔ بیدی پہلے بھی مجھے ایک اسٹرپ ڈانسر کے حوالے اسی طرح کرچکا تھا۔ میں نے انکار کردیا تو بولا۔ ’’تمہارے پاکستان کی ہے۔‘‘

پاکستانی لڑکی کا سن کر میں چونک گیا۔ میں نے بیدی سے کہا کہ جب تک میں کہوں نہیں مجھے اوپر مت بلانا۔ اس نے دوبارہ اپنی ایک آنکھ دبائی جس کا مطلب تھا کہ نو پرابلم۔

میں سیڑھیاں اتر کر نیچے برآمدے میں آیا۔ دونوں جانب کمرے تھے۔ مکمل خاموشی تھی۔ نیچے صرف عورتوں کو رکھا جاتا ہے جو غیر قانونی طور پر کینیڈا میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑی جاتی ہیں۔ نیچے صرف وہی ایک پاکستانی لڑکی تھی باقی سب کمرے خالی پڑے تھے۔ میں دروازے کے ساتھ رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میز پر لاگ شیٹ پڑی تھی اور قیدی کا نام لکھا تھا۔

’’پری جمال۔‘‘

میں نام مکمل ٹھیک نہیں لکھ رہا بس ملتا جلتا نام تھا جیسے مغلیہ دور کی کوئی ملکہ ہو۔ میں کمرے میں بند اس پاکستانی لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے اس جنگل میں آ پھنسی ہے۔

مجھے اندازہ تھا کہ کسی نہ کسی کام کے لیے وہ دروازے پر ضرور آئے گی۔ میں بلاوجہ اسے باہر نہیں بلانا چاہتا تھا کیونکہ یہاں بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی۔ مجھے غرض صرف اتنی تھی کہ اگر میں اس سے اس کی کہانی دریافت کرلوں۔

میں بہت دیر انتظار کرتا رہا مگر وہ باہر نہ نکلی۔ میں نے اپنے بیگ سے ایک کتاب نکالی اور میز پر ٹانگیں ٹکائیں اور پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔

میں کتاب میں کھویا ہوا تھا کہ ساتھ والے دروازے کے قریب آہٹ ہوئی۔ میں نے جیسے ہی سر اٹھا کر دیکھا تو ایسا لگا کہ جیسے کسی نے مجھے پتھر کا بنا دیا ہو۔ میں اپنی پلکیں جھپکنا تک بھول گیا۔ بلا ارادہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میری زبان جیسے گنگ ہوگئی تھی۔ ایسا حسین چہرہ اور خدوخال شاید ہی پہلے میں نے کہیں دیکھے ہوں۔ میں حسن تو ہمیشہ قدرت کے نظاروں میں ڈھونڈتا آیا تھا۔ انسانوں میں قدرت کے رنگ میں شاید پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ شہد اور دودھ سے دھلی ایک لڑکی جس نے سرخ لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ حیرت سے مجھے اس لیے دیکھ رہی تھی کہ اس کے سامنے ایک ایسی خدوخال رکھنے والا کھڑا تھا۔ ڈری اور سہمی آنکھوں نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اس کی آنکھیں، ناک، چہرہ اور جسم

واقعی فرصت میں اسے بنایا گیا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور مؤدب کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندازے سے سلام کیا تو بے ساختہ وہاں سے جواب آ گیا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ پاکستانی ہے اور مسلمان بھی ہے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو کھنکھناتی آواز میں بولی۔ ''مجھے میرا بیگ مل سکتا ہے۔ مجھے کپڑے نکالنے ہیں۔''

میں نے بیدی کو فون ملایا اور اس بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔ ''شام سے پہلے اسے بیگ مل جائے گا۔''

میں نے اسے بتایا تو وہ پہلے مجھے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر جھجک کر بولی۔ ''کیا آپ پاکستان سے ہیں؟''

میں نے ہاں کہا تو گہری سانس لے کر بولی۔ ''اللہ کا شکر ہے۔ کوئی پاکستانی تو ملا۔'' اس کے لہجے میں اب کچھ اطمینان آ رہا تھا۔

وہ کشمکش و پیچ میں تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ میں بھی خاموش کھڑا اسے اسی کیفیت میں گھرا دیکھ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود بولے مگر اس نے کچھ نہ کہا اور واپس کمرے میں چلی گئی۔

وہ اندر تو چلی گئی مگر میرا تجسس بڑھا گئی۔ مجھے یہ یقین تو تھا کہ وہ بولے گی ضرور کیونکہ ہر قیدی ہم سیکورٹی گارڈز کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا ہے۔ حالانکہ ہم بالکل بے بس ہوتے ہیں مگر ان کی نظر میں باہر جانے کا راستہ صرف ہم دکھا سکتے ہیں۔ پھر وہ ہم زبان بھی اور لڑکی ذات تھی۔ اسے سہارے اور لفظی تسکیوں کے علاوہ مدد کی بھی ضرورت تھی۔ مجھے صرف اس کی کہانی سننی تھی۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ واقعی کوئی بدقسمت ہے یا پھر اس سے یا اس کے بڑوں سے کوئی غلطی ہوئی ہے اس کا فیصلہ اب امیگریشن اور عدالت کے ہاتھ میں تھا۔

میرے اندازے کے عین مطابق تھوڑی ہی دیر میں وہ دروازے پر پھر سے ملی اس بار میں کرسی پر بیٹھا رہا۔ وہ چند لمحوں کے لیے رکی اور پھر بولی۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟''

میں نے اپنا تعارف کروایا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کہنے لگی۔ ''میں یہاں بالکل بے آسرا ہو گئی ہوں۔ خدا کے لیے میری مدد کریں۔''

میں نے وعدہ کیا کہ اگر مجھے اپنی ساری کہانی سچ سچ بتاؤ تو جو بھی ہو سکا میں ضرور کروں گا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے دروازے کے قریب رکھی اپنی کرسی اسے دے دی کہ وہ آرام سے بیٹھ جائے۔ حالانکہ ہمیں قیدیوں سے زیادہ دیر بات کرنے کی اجازت نہیں تھی مگر مجھے ڈر نہیں تھا کہ کوئی میری شکایت افسران تک پہنچا دے گا کیونکہ آج اتوار کا دن تھا چھٹی کا دن اس لیے نیچے والی منزل ویران تھی بیدی آج کا انچارج تھا اور اس سے مجھے اب کوئی خوف نہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اپنی نیت اور ارادے کو جانتا تھا جس میں کوئی لالچ یا ہوس نہ تھی۔

اس نے اپنی کرسی سنبھالی اور جو بیان کیا وہ مختصر طور پر یہ ہے۔ مگر یہ بھی بتا دوں کہ یہ کہانی اس نے اس ترتیب سے نہیں سنائی تھی، چھ سات گھنٹے میں ٹکڑوں میں سنائی تھی لیکن میں اس روداد کو اختصار کے ساتھ بیان کر رہا ہوں۔

پری جمال لاہور کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور اس کا نمبر چوتھا تھا۔ والد کی فیروز پور میں ایک دکان تھی اور وہ گھر کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی استطاعت سے بڑھ کر محنت کرتے تھے۔ پری جمال کے تایا اور ان کے بچے امریکا میں مقیم تھے اور مالی لحاظ سے ان سے بہت مضبوط بھی تھے۔ وہ مالی طور پر مستحکم ہوئے تو انہوں نے پری کے گھر والوں کو حقیر سمجھنا شروع کر دیا تھا گویا تائی اور ان کے درمیان ایک لا اعلانیہ سی صورتِ حال بن گئی تھی۔ یہ جس گھر میں رہتے تھے وہ گھر بھی تایا کے ساتھ مشترکہ تھا۔ ان لوگوں کے زیر استعمال تھا اور اس وجہ سے تائی وغیرہ طعنے بھی دیا کرتے تھے۔ یعنی کہ دونوں گھرانے میں رسہ کشی جاری تھی۔ اس مقابلہ بازی میں پری جمال کے تین بڑے بھائیوں نے یورپ اور امریکا بسنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اس کے بھائی پاکستان میں ڈگریاں لے کر اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کسی طرح وہ بھی امریکا پہنچ جائیں۔ اس کی ماں مقابلے کے جس اضطراب میں مبتلا تھی اسے اس وقت تک چین نہ آ سکتا تھا جب تک اس کے بیٹے بھی امریکا پہنچ نہ جائیں۔ ان حالات میں گھر کے اندر والد کا زور کمزور پڑتا گیا اور ماں کی خواہشیں زور پکڑتی گئیں۔

(جاری ہے)

افتخار مجاز

شعورِ ذات کی روحِ رواں، حریم دہر میں حق کی زباں، جہادِ زیست کی اک داستاں وہ خود میں معتبر اک جہاں تھا۔ وہ کردار جسے تراشنے والا کس پائے کا ہو گا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں پھر کوئی ایسا مقبول پروگرام بنا ہی نہیں۔

ڈیڑھ دہائی سے زائد عرصے تک جادو جگانے والی محفل کا ذکرِ خاص

7 ستمبر 2004ء صوفی دانشور صاحبِ فکر و فن جناب اشفاق احمد کی رحلت کا دن ہے۔ یوں ہر آنے والے برس 7 ستمبر کا دن ان کی برسی یا یومِ وفات منانے کے حوالے سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے لیکن میری دانست میں اشفاق احمد اور ان جیسے لوگوں کے تذکرہ کے لیے محض ایک دن مخصوص کر دینا قرینِ انصاف نہیں ہے۔

کہتے ہیں استاد امانت علی خان فوت ہوا تو فلمی اداکار اجمل نے اشفاق احمد سے پوچھا۔ ''بھا جی! ایہہ دوسو،

امانت علی مر کیوں گیا اے؟''

پتا ہے جواباً اشفاق احمد نے کیا کہا تھا، انہوں نے کہا تھا۔ ''اجمل صاحب! آرٹسٹ مرتا نہیں ہے روٹھ جاتا ہے، معاشرہ آرٹسٹ سے بڑی محبت کرتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی ضدیں بھی پوری کرتا ہے لیکن معاشرے کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے ''مجھے ایک کوزہ لے دو۔'' کچی مٹی کا کوزہ اور معاشرہ فوراً اسے کوزہ دے دیتا ہے، پھر آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے کہ مجھے ایک ہاتھی لے دو، اور معاشرہ اپنی تمام جمع پونجی لے کر اسے ایک ہاتھی لے دیتا ہے۔ پھر آرٹسٹ معاشرے سے کہتا ہے اس ہاتھی کو کوزے میں ڈال دو، معاشرہ مجبور ہو جاتا ہے اور آرٹسٹ روٹھ جاتا ہے۔''

میرے دوست دانشور اور کالم نگار عرفان صدیقی نے لکھا۔ ''اشفاق احمد سے تو معاشرے نے ٹوٹ کر پیار کیا۔ وہ کہتا تو اس سے عشق کرنے والے لوگ ہاتھی کو کوزے میں ڈالنے کی بھی کوئی صورت نکال لیتے ہیں لیکن وہ تو کچھ بولا ہی نہیں، کوئی ضد ہی نہیں کی بلا وجہ روٹھ گیا اور بھریا میلہ چھوڑ کر اتنی دور چلا گیا کہ ہم اسے آواز بھی نہیں دے سکتے۔

عرفان صدیقی کی یہ بات یقیناً درست ہے مگر یہ بھی تو سچ ہے کہ ہم انہیں بلا نہیں سکتے مگر سن تو سکتے ہیں بلکہ میری صورت تو یہ ہے کہ ان کے کہے ہوئے الفاظ اور سنائی ہوئی باتیں ہمیشہ میرے دل و دماغ کو مسحور رکھتی ہیں۔ میرے ساتھ تو یوں بھی ہوتا ہے کہ جب میں انہیں یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی اپنے دلپذیر انداز میں گفتگو کرنے کے بعد داستان سرائے لوٹ گئے ہیں اور میں ان کی سنائی ہوئی باتوں کے سحر میں ہوں۔ ایسی ہی باتوں کی بازگشت اب بھی میری سماعتوں میں محفوظ ہے۔

یہ عہد صدر ضیاء الحق کا قصہ ہے۔ اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی کہ کسی تقریب میں صدر ضیاء الحق اور ڈراما نگار اشفاق احمد کا آمنا سامنا ہو گیا۔ جہاں اشفاق احمد نے صدر صاحب کو ایک لطیفہ سنایا، جس کا لب لباب اور مفہوم یہ تھا کہ اس ملک کو تمام تر نقصان پڑھے لکھوں نے پہنچایا ہے، میں ان دنوں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے صحافت کا طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مقامی روزنامے سے بھی وابستہ تھا اور ادارتی صفحہ مرتب کرنے کے علاوہ ہفتہ وار ادبی صفحہ بھی ترتیب دیا کرتا تھا۔ اسی صفحے پر میں نے اشفاق احمد کے صدر ضیاء الحق کو لطیفہ سنانے کی خبر اور مذکورہ لطیفہ ''اشفاق احمد لطیفے سنا رہے ہیں'' کے زیر عنوان سے شائع کر دیا۔ ان دنوں ابھی اشفاق احمد صاحب سے میری براہ راست ملاقات اور رسمی تعارف نہ تھا۔ متذکرہ خبر کی اشاعت سے کچھ روز بعد ایک ادبی تقریب میں میرا اشفاق صاحب سے آمنا سامنا ہو گیا۔ تعارف ہوا تو خبر مذکور کا حوالہ بلکہ اس کی سرخی تک ان کے ذہن میں تازہ تھی میرا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ ''آج اشفاق احمد آپ کو لطیفہ نہیں ایک دلچسپ واقعہ سنائے گا۔''

میں ان کا یہ جملہ سن کر جھینپ سا گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ میری مذکورہ بالا حرکت پر مجھ سے شدید ناراضی کا اظہار کریں گے مگر ان کے لہجے میں ناراضی کی بجائے وضاحت اور اپنے نقطہ نظر کی تشریح کا تاثر نمایاں تھا۔ کہنے لگے یہ 1970ء کے انتخابات کا ذکر ہے، میں ماڈل ٹاؤن لاہور میں ہی ایک جگہ پریزائیڈنگ افسر تعینات تھا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ ٹانگوں سے معذور ایک شخص چھوٹی سی ریڑھی (جسے وہ خود ہی زمین کو ہاتھوں سے پیچھے دھکیل کر چلا رہا تھا) پر ووٹ ڈالنے کے لیے آیا، اسے دیکھ کر میرے دل پر اس بات کا بہت اثر ہوا کہ یہ معذور اور اپاہج ہونے کے باوجود کس قدر باشعور ہے اور ووٹ کی اہمیت کو کتنا سمجھتا ہے، میرا جی چاہا کہ میں اسے سراہوں، چنانچہ جونہی وہ ووٹ ڈال کر باہر جانے لگا میں نے راستے میں روک لیا اور اس سے اِدھر اُدھر کی گفتگو شروع کر دی۔ رسمی تعارف کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ آپ نے یہ ریڑھی کہاں سے بنوائی یا حاصل کی ہے؟

جواباً اس شخص نے کہا۔ ''جناب اس کا قصہ بہت دلچسپ ہے، پہلے پہل جب میں نے یہ ریڑھی بنائی تو اسے لکڑی کے پہیے لگائے جیسے پرانے وقتوں میں بیل گاڑیوں میں ہوتے تھے مگر میرا یہ تجربہ کچھ زیادہ کامیاب نہ رہا۔ کیونکہ لکڑی کے پہیے کچی جگہ اور راستوں پر تو خوب چلتے تھے مگر پکے فرش، سڑک یا راستے پر زیادہ رواں نہیں ہوتے تھے اور پھنس پھنس کر چلتے تھے۔ پھر چلتے وقت ان کا شور بھی بہت زیادہ ہوتا تھا، چنانچہ لکڑی کے پہیوں کو فیل قرار دے کر میں نے ان کی جگہ لوہے کے چکے اور پہیے لگا لیے مگر مسئلہ ابھی بھی حل نہ ہوا۔ یہ پہیے پکے فرش اور سڑک پر تو خوب چلتے تھے مگر کچی جگہ پر ان کے چلنے میں بہت دشواری آتی تھی۔ یوں یہ لوہے کے پہیے بھی میری ضرورت پوری کرنے میں ناکام ہو گئے۔ اسی پریشانی میں وہ کئی دن گھر میں بیٹھ کر سوچتا رہا کہ اب کیا کروں؟ باؤ جی! پڑھا لکھا تو میں ہوں نہیں کہ کسی

کتاب سے مدد لے لیتا۔ اَن پڑھ آدمی ہوں چنانچہ اپنے دماغ سے سوچا اور اسی سے کام لیا۔ اگلے روز انار کلی بازار کے پاس نیلے گنبد چلا گیا جہاں سائیکلوں کی دکانیں ہیں۔ ایک دکان سے بچوں کی سائیکلوں کے پہیے خریدے، ریڑھی کو لگائے اور آج انہی پر بھاگا پھرتا ہوں۔ نہ کوئی مسئلہ نہ کوئی مسائل اشفاق صاحب کہنے لگے، یہاں تک اپنی کہانی سنانے کے بعد وہ اَن پڑھ معذور شخص بولا۔ ''بابو صاحب اَن پڑھوں کا یہی تو مسئلہ ہوتا ہے کہ انہیں ہر چیز اور مسئلے کا حل اپنے دماغ سے نکالنا پڑتا ہے اگر میں پڑھا لکھا ہوتا تو آج ابھی تک اِدھر اُدھر سے یہی پوچھتا پھر رہا ہوتا کہ اب میں کیا کروں؟

متذکرہ بالا قصہ بیان کرنے کے بعد اشفاق صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ ''بابے مجاز! اس قوم کو جو مسائل درپیش ہیں کبھی ہمارے پڑھے لکھے دانشور ماہرین نے ان سے نجات کے لیے کیوں سوچا اور اتنا تردد کیا ہے؟ جیسے اس معذور واپاہج اور اَن پڑھ شخص نے کیا تھا۔

اشفاق صاحب کے یہ زریں خیالات مجھے رفتہ رفتہ ان کے قریب لے آئے اور پھر میں ایک روز واقعتاً اشفاق صاحب کے مریدوں میں شامل ہوگیا اور یہی میرا وہ ٹرننگ پوائنٹ تھا جب مجھے ان کے ایک مختلف آدمی ہونے کا احساس ہونے لگا۔

یہ آٹھ نو سال پہلے کا واقعہ ہے اس روز عیدالفطر تھی۔ میں نے اشفاق صاحب کو عید کی مبارک کہنے کی غرض سے فون کیا، بانو آپا نے فون سنا۔ ''کہنے لگیں ابھی تک نماز پڑھ کر لوٹے نہیں، ویسے انہیں اب تک آجانا چاہیے تھا، نماز کو تو دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔''

میں نے بانو آپا کو عید مبارک کہی اور فون بند کردیا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد اشفاق صاحب کا جوابی فون آگیا۔ میں نے پوچھا۔ آپ نماز پڑھ کر کہاں رک گئے تھے، کہنے لگے یار نماز کے بعد اہل محلہ سے عید ملتے ہوئے مجھے خیال آیا کیوں نہ علاقے کے پولیس والوں سے جاکر عید ملی جائے چنانچہ میں مقامی پولیس اسٹیشن چلا گیا۔ وہاں پہنچا تو کوئی مجھے گھاس ڈالنے پر آمادہ نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی سائل ہوں اور ان کی عید خراب کرنے آگیا ہوں۔

جب میں تھانیدار کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے حقارت آمیز نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''باباجی! کدھر آئے ہو، کیا مسئلہ ہے؟''

میں نے بڑے تپاک سے سلام کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کوئی کام نہیں میں اشفاق احمد ہوں۔ تلقین شاہ، آپ کو عید ملنے آیا ہوں۔''

اشفاق صاحب کہنے لگے۔ میرا یہ جملہ سن کر تھانیدار باقاعدہ ہکا بکا ہوگیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا تو وہ میرے سینے سے چمٹ گیا۔ کہنے لگا میری زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی (بڑا آدمی) بغیر کسی کام کے پولیس والوں کو عید مبارک کہنے اور عید ملنے آیا ہے۔ اشفاق صاحب نے بتایا کہ اس تھانیدار نے کہا۔ ''میرے بیوی بچے اور والدین صادق آباد میں ہیں مگر میں یہاں لاہور میں ان کے بغیر بڑے بوجھل دل سے عید کا دن گزار رہا تھا آپ نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو عید مبارک کہہ کر واقعی ہماری عید مبارک بنادی ہے اب ہم بھی سب مل کر عید کا باقی دن خوشی سے منائیں گے۔''

اشفاق احمد کا یہ طرزِ عمل اور طرزِ زندگی مجھے ہمیشہ گھائل کرتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، (آمین)۔ ان کی باتوں کی مہک ہمیشہ ہمارے مشام جان کو معطر رکھتی ہے مگر اب دیکھنے کو ان کی آنکھیں ترستیاں ہیں۔

ابو جابر بن افلح

ایک مشہور ہیئت دان۔ وہ اشبیلہ کا رہنے والا تھا۔ اس کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ قرون وسطیٰ میں تو اسے اکثر غلطی سے کیمیا دان جابر بن حیان سے خلط ملط کردیا جاتا تھا۔ اس کا بیٹا یہودی فلسفی ابن میمون کو (وفات 1204ء) ذاتی طور پر جانتا تھا جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جابر بن افلح نے بارہویں صدی عیسوی کے نصف کے قریب قرطبہ میں وفات پائی ہوگی۔ جابر نے فلکیات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، جو آج بھی دو مختلف ناموں سے ''کتاب الھئیۃ'' اور ''اصلاح المجسطی'' محفوظ ہے۔ اس کتاب میں جابر نے بطلیموس کے بعض نظریوں پر سخت تنقید کی ہے۔ خاص طور پر بطلیموس کے اس دعوے پر نکتہ چینی کی ہے کہ سیارگان اسفل یعنی عطارد اور زہرہ کا کوئی مری اختلاف موجود نہیں۔ یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے فلکی حصے سے پہلے مثلثیات پر بھی ایک باب موجود ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں بھی کیا گیا ہے جو پطرس اپیانوس نے نورمبرگ سے 1534ء میں شائع کیا تھا۔

مرسلہ: زید حامد، لاہور

قسط:9

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہوگئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسج آ گیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹو مل گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سنے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آ گئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنر بیں پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں ستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ عارف مچھندر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آ گیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلاور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہو اٹھا۔ فہیم کے تھپڑ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیر نظر آ گیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا۔ رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلوخلاصی کرا دی جس کے ٹرک نے زنیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملنے آ گیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی اغواء کا سن کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آ جائے۔ تبھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گلشن حدید میں نہیں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا سچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا۔ ساتھیوں سے نمٹ کر میں نے سیٹھ سے اگلوا لیا کہ عاصمہ کو کہاں رکھا ہے اسے باحفاظت نکال لایا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی سہیلی کا فلیٹ تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

اب آگے پڑھیں

”کون؟“ روزی نے قدرے تیز آواز میں پوچھا۔

”کیبل والا فیس؟“ باہر سے ایک مردانہ آواز ابھری۔

”بھائی! فلیٹ کے مالکان کہیں گئے ہوئے ہیں، آپ پھر کبھی آ جانا۔“ روزی نے جواب میں کہا۔ اس دوران میری نظریں بند دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس پر نصب ”میجک آئی“ دیکھ کر میں نے روزی کو ”مکالمہ“ جاری رکھنے کا اشارہ کیا اور خود تیزی سے دروازے کے پاس آیا اور میجک آئی سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی۔

”باجی! کوئی بڑی رقم تو ہے نہیں، صرف پانچ سو روپے ہی دینے ہیں، آپ ہی دے دیجیے۔ میں آپ کو رسید کاٹ دیتا ہوں، ورنہ مجھے دوبارہ چکر لگانا پڑے گا۔“ باہر سے آواز ابھری۔ میں تب تک میجک آئی سے باہر دیکھ چکا تھا اور قدرے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے میں نے روزی کو آنکھ کا اشارہ کر دیا۔

باہر مجھے ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکا ہی کھڑا ملا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رسید بک بھی مجھے نظر آ گئی تھی۔

”جی اچھا بھائی! ابھی دیتی ہوں۔“ روزی نے کہا۔ میں پلٹا۔ میرے عقب میں چند ہی قدموں کے فاصلے پر کالیا ہاتھ میں ٹی ٹی تھامے محتاط کھڑا تھا۔

”بڑی مہربانی باجی! میں تب تک رسید لکھے دیتا ہوں۔“ باہر سے اس کیبل والے لڑکے کی آواز ابھری۔

روزی پیسے لینے کمرے کی طرف جانے لگی تو میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور اپنی جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔

”بھائی! رسید بنا لی؟“ روزی نے میری ہدایت کے مطابق چند سیکنڈوں بعد اس کیبل والے لڑکے سے پوچھا۔

''جی باجی! رسید لے لیں۔'' لڑکے نے کہا اور روزی نے دروازہ ذرا سا کھول کر پیسے آگے بڑھائے۔ میں اور کالیا ایک طرف کو ہوگئے تھے۔ لڑکے نے رسید بڑھائی اور روزی نے پیسے۔

ٹھیک اسی وقت میں نے لڑکے کے حلق سے ایک عجیب سی آواز دبی دبی آواز ابھرتے سنی اور جب تک میں کچھ سمجھتا، روزی بھی بری طرح چیخی تھی، کیونکہ اسی وقت دروازہ دھڑ سے کھلا تھا اور وہ کیبل والا لڑکا روزی کے ساتھ بری طرح ٹکرایا تھا۔ دونوں ہی اندر گرے تھے۔ شاید باہر سے کسی نے لڑکے کی پشت پر لات رسید کر ڈالی تھی۔

''ابے لے!'' مجھے کالیا کی متحیرانہ آواز سنائی دی تھی۔ میں خود ایک لمحہ کو بوکھلا گیا تھا۔ تب ہی میں نے انہی دونوں، موٹی ناک والے، کریہہ صورت اور اس کے ساتھی کو پستول تھامے اندر داخل ہوتے دیکھا۔

''خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا، ورنہ گولیوں سے سب کو بھون دیا جائے گا۔'' اسی کریہہ صورت والے شخص نے اپنا پستول تانتے ہی غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا اور میرا پورا وجود جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ دونوں میری سوچ سے زیادہ چالاک ثابت ہوئے تھے جبکہ کیبل والا لڑکا واقعی فیس لینے آیا تھا اور ان دونوں حملہ آوروں نے خاموشی سے اسے ''چارے'' کے طور پر آزما ڈالا تھا۔

روزی کے حلق سے خوف زدہ سی چیخ خارج ہوئی تھی جبکہ کیبل والا لڑکا بھی پریشان اور حواس باختہ نظر آرہا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب مجھے اپنے ٹھٹکے ہوئے وجود میں ایک عجیب سی سنسنی کا احساس ہوا۔ کالیا اس پورے ''منظرنامے'' سے پہلے ہی جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ اس نے عین وقت پر پھرتی اور چالاکی کا مظاہرہ کیا تھا، شاید یہ وہی وقت تھا جب کیبل والے لڑکے کے حلق سے ابھرتی آواز اس نے سنی تھی اور پل کے پل خطرہ بھانپتے ہی اس نے گھات لگائی تھی۔

''ذرا بھی کسی نے آواز نکالی تو اسے گولی چاٹ جائے گی۔''

ہم دم بہ خود سے کھڑے تھے۔

''تمہارا دوسرا ساتھی کدھر ہے؟'' کریہہ صورت آدمی نے میری جانب خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ساتھ ہی اس نے لاؤنج سے آگے کمروں میں ایک نظر بھی ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

''مم...... میرا تو کوئی اور ساتھی نہیں تھا؟ مم...... میں تو اپنی دوست سے ملنے آیا تھا۔'' میں نے چالاکی چلنا چاہی تو اس کے بدہیئت ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ ابھری۔ وہ شاید سب کچھ اچھی طرح جان اور پہچان رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ پستول ہاتھ میں لیے نہایت محتاط انداز میں اندر کی طرف کمروں کی تلاشی لینے کے لیے لپکا۔

''مم...... مجھے تو جانے دو...... میں تو...... میں تو......''

کیبل والا لڑکا گھگھیایا۔

''چپ!'' کریہہ صورت نے اسے جھڑکا اور اس کی پیشانی سے پستول کی نال لگادی تو وہ وہیں خاموش اور گھٹ کر رہ گیا۔ اس وقت تو وہ ضرور خود کو بری طرح کوس ہی رہا ہو گا کہ کاش! آج کے دن کیبل کی فیس پر لعنت ہی بھیج دیتا اور دوسرا چکر بچانے کے چکر میں ایک لمبے چکر میں پھنس کر رہ گیا۔

میرا دل تیزی سے دھڑ دھڑا رہا تھا۔ کریہہ صورت کا ایک ساتھی کالیا کی تلاش میں اندر جا چکا تھا اور مجھے خوب اندازہ تھا کہ اس کے ساتھ اندر کیا ہونے والا تھا۔ لہٰذا میں نے اس موٹی ناک والے کریہہ صورت کو باتوں میں لگانا ضروری سمجھتے ہوئے اس سے کہا۔

''کون ہو تم؟ اگر چوری کی نیت سے آئے ہو تو یہاں ایسا کچھ خاص مال نہیں ملے گا تم لوگوں کو۔''

''اپنا منہ بند رکھو!'' وہ اندر کی طرف سے نظریں ہٹا کر میری طرف گھور کر زہرخند لہجے میں بولا۔

مجھے اندازہ تو ہو رہا تھا کہ یہ دونوں یقینی طور پر سیٹھ ستار کے بھیجے ہوئے ہی کرگے ہوں گے جو ہمارے ہی تعاقب میں یہاں تک غالباً روزی کی تلاش میں آئے تھے۔ ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ ہم دونوں کو یہ گولیوں کا نشانہ بنا کر رفو چکر بھی ہو سکتے تھے۔ یہی دھڑکا میرے دل کو متوحش کر رہا تھا۔

''اوئے...... راجے! کدھر مر گیا؟''

''راجے'' کی آواز تو نہ آئی البتہ ایک پلیٹ سی فریس بی (frisbee) کی طرح ایک کمرے سے اڑتی ہوئی آئی اور بڑے زور سے اس کریہہ صورت شخص کی موٹی سی ناک پر لگی۔ ضرب اس قدر شدید تھی کہ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر بند دروازے سے پشت کے بل جا لگا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور یہ سمجھتے ہی کہ یہ کارستانی کس کی ہو سکتی تھی، میں نے پھر ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس شخص پر جا پڑا۔ میں نے اپنی ایک ٹانگ سکیڑ کر اس کے گھٹنے کی ضرب اس کے پیٹ پر

رسید کر ڈالی تھی۔ وہ ابھی ناک کی ضرب سے ہی سنبھل نہ پایا تھا کہ میرے گھٹنے والی چوٹ نے اسے درد سے دوہرا کر دیا۔ وہ رکوع کے بل جھکا تو میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ کر اسے پیچھے دھکیلا تو وہ سیدھا کسی کے قدموں کے قریب جا گرا۔ یہ کالیا تھا۔ وہ اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے اور سینے پر ہاتھ باندھے اطمینان سے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اس نے اپنے ایک پیر کا بوٹ کریہہ صورت کی گردن پر رکھ دیا۔ اس کی ناک سے بھل بھل خون بہے جا رہا تھا۔

"اپنے اس کانے سیٹھ ستار کو جا کر بتا دینا، جس کے تم لوگ زر خرید کتے ہو کہ اب تیرے اور تیری بدمعاشیوں کے دن گنے جا چکے ہیں۔" کالیا نے گویا خم ٹھونک کر کہا۔ "اس طرح کی حرکتیں کرتا رہے گا تو بہت جلد دوسری آنکھ بھی گنوا بیٹھے گا کیونکہ ہم دشمنوں کو ہلاک نہیں انہیں اپاہج کر دینے میں زیادہ لطف محسوس کرتے ہیں۔"

اسی وقت رنگ ٹون کی آواز ابھری۔ میرا دھیان اپنے سیل کی طرف گیا تھا کہ کالیا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جگری! اس کی جیب سے سیل نکال کر کال مجھے دے۔"

رنگ اسی سیل کی تھی، جسے کالیا نے فوراً تاڑ لیا تھا۔ میں اس کی تلاشی لینے کے لیے جھکا تو کریہہ صورت بے چینی سے کسمسانے لگا مگر کالیا نے اپنے بوٹ کا دباؤ اس کی گردن پر بڑھائے رکھا۔ میں نے پھرتی سے اس کی جیب سے موبائل نکال لیا اور ایک نگاہ یوں ہی اس کی اسکرین پر ڈالی تو اس پر "سیٹھ صاحب" لکھا ڈسپلے ہو رہا تھا۔ میں نے وہ کالیا کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرا کر اسے آنکھ ماری۔ کالیا نے وہ لے کر ایک نظر اس کی اسکرین پر ڈالی اور مجھے بھی جوابی آنکھ مار کر موبائل کان سے لگا لیا۔

"ہیلو سیٹھ صاحب! آپ کی آنکھ کا کیا حال ہے؟"

"کک......کون ہو تم؟" دوسری جانب سے سیٹھ ستار کی چونکتی ہوئی آواز ابھری۔ کالیا نے موبائل کا وائیڈ اسپیکر آن کر دیا تھا شاید......

"ابے لے......سیٹھ! ہمیں نہیں پہچانا......ٹھیک، تو سن لے کان کھول کر تیرے بھیجے ہوئے دونوں کتے اس وقت ہمارے سامنے خاک چاٹ رہے ہیں۔ بول اسے پولیس کے حوالے کر دیں یا پھر خود ہی دھڑن تختہ کر دیں؟ کیا کہتا ہے؟"

دوسری جانب ایکا ایکی سناٹا چھا گیا، جس کا دورانیہ چند سیکنڈ تو رہا ہوگا۔ پھر اس کی سانپ جیسی پھنکارتی آواز ابھری۔

"تم دونوں شیطان بہت جلد اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچنے والے ہو اور یاد رکھنا، تم نے میری ایک آنکھ ضائع کی ہے نا...... میں تم دونوں کو لنگڑا اور اپاہج بنا دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی ...... دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

"انسپکٹر کامران کا نمبر ملا جگری!" کالیا نے سیل فون اپنی جیب میں رکھتے ہوئے مجھ سے کہا تو کیبل والا لڑکا خوف زدہ لہجے میں کالیا سے بولا۔

"مم...... مجھے تو جانے دو...... میرا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔"

"ابے چپ تو!" کالیا نے اسے جھڑکا۔ روزی کچھ سنبھل گئی تھی۔ میں نے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے کالیا سے پوچھا۔

"اس کا دوسرا ساتھی کدھر ہے؟"

"اندر ہے، میں نے اسے اناغفیل کر ڈالا ہے۔" کالیا نے جواب دیا پھر قریب کھڑی روزی سے بولا۔

"تم اندر جا کر اس پر نگاہ رکھو، تھوڑا بھی ہلے جلے تو مجھے بتانا۔ ویسے دو ایک گھنٹے کہیں بھی نہیں گئے۔ وہ اتنی جلدی اب نہیں ہوش میں آنے والا۔"

"لل......لیکن، پلیز پولیس کو فون مت کرنا۔ پولیس یہاں آئے گی تو میری سہیلی پریشان ہو جائے گی اور پتا نہیں پولیس کے چکروں میں نہ وہ پڑ جائے۔" روزی نے ہماری منت کی۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ کر کالیا کی طرف دیکھا تو وہ روزی کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

"اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے بھلا؟ آپ نے کوئی جرم تو نہیں کیا، دو درانداز وں کو پولیس کے حوالے کر دیا، کہانی ختم......لیکن اس طرح آپ کو......"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے کالیا!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے روزی کی تائید میں کہا۔ "یہ خود یہاں ایک سہیلی کے ساتھ رہ رہی ہے اور بعد میں اپنی اس سہیلی کو یہ جواب دہ ہوگی کہ یہاں ہوا کیا تھا اور وہ سہیلی اس سے ہمارے بارے میں پوچھ سکتی ہے کہ ہم کون تھے اور یہاں کیسے اور کیوں آئے تھے؟ یوں اس کے اپنی سہیلی سے تعلقات خراب ہونے کے امکانات ہوں گے۔"

کالیا میری بات پر ہنسا پھر اسی انداز میں بولا۔ "میرے نزدیک یہ بھی کوئی اہم باتیں نہیں ہیں جگری!" پھر وہ ذرا سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے ... روزی سے بولا۔ "روزی صاحبہ! جہاں تک میں سوچ رہا ہوں، وہیں تک

آپ اپنا بھی دماغ استعمال کرنے کی کوشش کریں۔ جب اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے تو مسلوں سے کیوں ڈرنا۔ پہلی بات تو یہ کہ تم.... اس واقعے کے بعد یہاں زیادہ دیر اب رہ بھی نہیں سکتیں۔ دشمن تمہاری کمین گاہ سے واقف ہو چکے ہیں۔ انہیں اگر چھوڑ دیں گے تو بھی وہی بات ہوگی۔ پولیس کے حوالے تو ان دونوں کو یوں بھی کرنا ہی ہوگا تاکہ سیٹھ ستار کے گرد قانونی گھیرا تنگ ہوتا رہے۔ جانتا تو ہوں میں یہ کڑوی حقیقت کہ وہ انہیں رہا کروا لے گا لیکن ایک بات سیٹھ ستار کے خلاف قانونی طور پر تو ریکارڈ میں آ ہی جائے گی ناں جو ہمیں مستقبل میں فائدہ پہنچا سکتی ہے۔''

کالیا کی اس صراحت پر میں نے بلا دیر انسپکٹر کامران سے رابطہ کر لیا۔ اس روز ٹرک والے واقعات کے بعد سے میری انسپکٹر کامران سے اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی تھی۔ سر دست میں نے اسے مختصراً حالات کے بارے میں بتایا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

''آ رہا ہے وہ؟'' کالیا نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ ''وہ کسی اور آپریشن میں مصروف ہے، وہ سب انسپکٹر نعیم شاہ کو پولیس نفری کے ساتھ بھیج رہا ہے، میں نے اسے یہاں کا ایڈریس سمجھا دیا ہے۔''

اس کے بعد روزی نے ہمیں رسی تلاش کر کے دی جس سے ہم نے کریہہ صورت شخص کے ہاتھ پیر باندھ دیئے اور گھسیٹتے ہوئے اسی کمرے میں لے آئے جدھر کالیا نے اس کے دوسرے ساتھی کو بھی رسن بستہ حالت میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی کنپٹی سے خون کی لکیر بہہ بہہ کر جم گئی تھی اور وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ پھر اپنے ساتھی کو بھی اسی حال میں دیکھ کر وہ پریشان سا نظر آنے لگا۔

کیبل والے لڑکے نے ایک بار پھر ہم سے التجا کی کہ اسے جانے دیا جائے مگر کالیا نے اسے بری طرح جھڑکتے ہوئے دھمکی دے کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اگر دوبارہ بولا تو اسے بھی باندھ کر ایک طرف کونے میں ڈال دیا جائے گا۔ ہم سب دوسرے کمرے میں آ گئے۔ کیبل والے لڑکے کو ہم نے اسی کمرے میں بیٹھے رہنے کا حکم دیا تھا جہاں ان دونوں حملہ آوروں کو رکھا گیا تھا، اس کا دروازہ باہر سے بند کرنے کے بعد ہم تینوں دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔

دونوں حملہ آوروں کی جامہ تلاشی لینے کے بعد ان کے پستول ہم نے اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔

ہمیں سب انسپکٹر نعیم شاہ کی آمد کا انتظار تھا۔ انسپکٹر کامران نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ اپنے اسسٹنٹ کو جلد ہی چند پولیس اہلکاروں کے ساتھ یہاں روانہ کرنے کی ہدایات دے رہا ہے۔ ہمیں تسلی ہو گئی تھی۔

''مجھے اب یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑے گی۔'' چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد روزی نے کہا۔ اب اس کے لہجے اور آواز میں کسی ڈر یا خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ البتہ ایک ذمہ دارانہ سی پریشانی ضرور موجود تھی۔

''اب تم کہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہو؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کو دیکھا۔

کالیا خاموش تھا۔ روزی جواباً ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''وہی سوچ رہی ہوں۔ کہاں جاؤں اب؟''

اس کی بات نے مجھے بھی کچھ پریشان سا کر دیا تھا۔

''اس فلیٹ میں تمہاری سہیلی کے ساتھ اور کون رہتا ہے؟ میرا مطلب ہے کوئی فیملی، ماں باپ، شوہر وغیرہ؟'' مجھے متفکر دیکھ کر کالیا نے پوچھا۔

''زرینہ لاہور کی رہنے والی ہے۔ یہاں کراچی یونیورسٹی میں کوئی کورس کر رہی ہے۔ ایک کلاس فیلو بھی اس کے ساتھ رہتی تھی۔'' روزی بتانے لگی۔ ''دونوں مل کے اس فلیٹ کا کرایہ دیتی تھیں۔ پھر کسی وجہ سے اس کی کلاس فیلو نے یہ فلیٹ چھوڑ دیا اور ہوسٹل میں رہنے لگی۔ ایسے میں، میں نے زرینہ کے ساتھ شیئر کر لیا تھا۔''

''زرینہ لاہور میں رہتی ہے اور تم کراچی میں۔ دونوں کی دوستی کیسے ہو گئی؟'' کالیا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''یہ میری بچپن کی سہیلی ہے اور پہلے یہ لوگ کراچی میں ہی رہتے تھے۔ پھر یہاں کے حالات خراب ہوئے تو یہ لوگ لاہور جا بسے، ہمیں بھی بچھڑنے کا دکھ ہوا تھا مگر ہم نے رابطہ اور بچپن کی دوستی کو قائم رکھنے کا عہد تو کر رکھا تھا۔'' روزی نے بتایا۔

''تب پھر تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں، تم ادھر ہی رہو۔'' کالیا نے بالآخر اسے اپنا مشورہ دے ڈالا۔

''میں بھی یہی سوچ رہی تھی لیکن اس تازہ ناخوشگوار واقعے کے بعد مجھے ڈر ہے وہ گھبرا نہ جائے کیونکہ وہ یہاں کراچی میں صرف اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے عارضی طور پر آئی ہوئی ہے، کوئی ریسرچ کا کام ہے، پھر واپس چلی جائے گی۔''

"تمہیں اسے پوری بات بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" کالیا نے کہا۔ "اس ناخوشگوار واقعے کو عام سی ڈکیتی کی واردات کا کہہ دینا اور بس! اس میں بھلا تمہارا کیا قصور؟"

"ہاں! یہی سوچا ہے میں نے کہ اسے اصل حقیقت بتانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔" وہ بھی کالیا کے مشورے پر صاد کرتے ہوئے گومگو سے لہجے میں بولی۔

"ابھی زرینہ کہاں گئی ہوئی ہے اور کب تک یہاں آجائے گی؟" میں نے کسی خیال کے تحت روزی سے پوچھا۔

"کیونکہ حملہ آوروں کے ساتھ ہم دو اجنبیوں کو بھی وہ یہاں دیکھ کر اسے دل میں کسی لمبے چکر کا شبہ تو ضرور ابھرے گا۔"

"میں یہی سوچ رہی تھی کہ اس کے آنے سے پہلے پہلے ہی ایک تو یہ معاملہ نمٹ جائے اور تم دونوں بھی اسے یہاں موجود نہ ملو تو میں اسے سنبھال لوں گی۔"

"میں نے پوچھا تھا کہ اس کے کب تک لوٹنے کے امکانات ہیں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"میرا خیال ہے ابھی تو اس کے آنے میں چند گھنٹے ہیں۔" روزی نے وال کلاک پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ انسپکٹر نعیم شاہ ابھی تک نہیں پہنچا؟" کالیا نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے خودکلامیہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"آتا ہوگا، ابھی میرا خیال ہے بہ مشکل نصف گھنٹا ہی گزرا ہے۔" میں نے کہا تو کالیا طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ "آدھے گھنٹے میں تو ایسی وارداتوں میں آدھے درجن لوگ مرکھپ جائیں۔ ہماری پولیس چائے پانی پینے کے بعد ہی آرام سے آتی ہے۔"

"ایسی بات نہیں یار!" میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ "انہیں تسلی ہوگی کہ وارداتیوں کو ہم نے اپنی گرفت میں تو لے ہی رکھا ہے۔"

"ہاں ضرور اگرچہ یہ پولیس کے کرنے کا کام تھا۔" کالیا کی تلخی جوں کی توں تھی۔

"ہم شہریوں کے بھی تو کچھ فرائض ہوتے ہیں میرے جگری یار! پولیس کے پاس بھی تو کوئی الہ دین کا چراغ نہیں ہوتا۔" میں ہنسا۔ روزی بھی ہماری باتوں سے محظوظ ہو کے مسکرا رہی تھی۔ اسی انداز میں بولی۔

"لگتا ہے تم دونوں خاصے پرانے اور گہرے دوست ہو۔"

اچانک ہی ایک کھٹکے پر ہم چونکے۔

"میں دیکھتی ہوں۔" کہتے ہوئے روزی اٹھنے لگی تو کالیا نے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور ایک دم اس نے پستول نکال لیا اور تیر کی طرح کمرے سے نکلا۔

یہ کمرا کچھ ایسے رخ پر تھا کہ اس کے کھلے دروازے سے صرف لاؤنج ہی نظر آتا تھا۔ بیرونی دروازہ نہیں۔ کالیے کے پیچھے میں بھی پھرتی کے ساتھ لپکا تھا۔ لاؤنج میں قدم رکھتے ہی میں نے سب سے پہلے فلیٹ کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ اسے بند پا کر میں نے ساتھ والے کمرے پر نگاہ ڈالی۔

دروازہ کھلا پڑا تھا۔ یقیناً کالیا اندر گیا ہوگا۔ میں نے بھی اسی جانب قدم بڑھائے اور ابھی کمرے کے دروازے کے پاس ہی پہنچا تھا کہ اندر سے دوڑتا آتا ہوا کالیا مجھ سے ٹکرایا۔

"ابے لے..... وہ بھاگ گئے..... جگری!"

وہ مجھ سے ٹکرا کے فوراً سنبھل کر بولا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ مجھے ایک شاک سا لگا۔ پہلے تو کالیا کی بات پر یقین ہی نہ آیا۔ آتا بھی کیسے؟ سارے دروازے بند تھے، حملہ آور بھی بندھے ہوئے تھے تو پھر وہ نکلے کیسے؟ اپنے "مشکل" سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے لیے میں مذکورہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ بھائیں بھائیں کررہا تھا۔ اسی کمرے کا ایک دروازہ باہر مختصر سی بالکونی میں کھلتا تھا اور جس رسیوں سے دونوں حملہ آوروں کو باندھا گیا تھا اسی رسی کو انہوں نے بروئے کار لاتے ہوئے بالکونی سے نیچے چھلانگیں لگائی تھیں، ذہن میں ابھرنے والے ایک اور لاینحل سوال کا جواب مجھے ازخود سوچنا پڑا جو اتنا زیادہ مشکل نہ تھا۔

غلطی ہماری ہی تھی۔ ہم نے کیبل والے لڑکے کے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے تھے اور دوسری غلطی یہ ہوئی تھی کہ اسے بھی انہی خطرناک حملہ آوروں کے ساتھ ہی کمرے میں چھوڑ دیا تھا۔ دونوں حملہ آوروں نے یقیناً اس لڑکے کو پٹیاں پڑھائی ہوں گی کہ پولیس کے چکروں میں ان کے ساتھ وہ بھی پھنس جائے گا، مفت کی "قلم" گلے پڑنے سے بہتر ہے کہ وہ سب یہاں سے فرار ہو جائیں اور لڑکے نے ان کے جکڑ بند کھول ڈالے ہوں گے۔ اس کے بعد دونوں اسی رسی کو استعمال کرکے بالکونی سے نیچے کود کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

یہ سب پل کے پل سوچنے کے بعد میں نے بھی باہر

دوڑ لگا دی تھی لیکن باہر گیٹ پر پہنچتے ہی میں نے کالیا کو ہاتھ ملتے ہوئے واپس آتے دیکھا۔

''چونا لگا لیا کم بختوں نے۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''اس کیبل والے لڑکے نے یہ کام خراب کیا ہے۔'' میں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''یہی تو ہم نے بھنڈ مارا تھا جگری!'' وہ بولا۔ ''اب پتا نہیں وہ اس لڑکے کو بھی قربانی کا بکرا بنا کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں یا پھر......'' وہ بولتے بولتے رک گیا، کیونکہ اسی وقت پولیس سائرن کی آواز سنائی دی۔

''دھت تیری کے اب یہ کیا کرنے آئے ہیں؟'' کالیا نے جھلا کر بولا۔

''یہ اسی وقت ہی آتے ہیں، جب مجرم اپنا کام کر کے رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ چلو ان سے بات کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم گیٹ کی طرف بڑھے اور لوگ بھی جمع ہونے لگ گئے۔ پولیس کی لمبی سی موبائل گاڑی تھی، جس کے ڈرائیور کیبن سے ایک چھریرے جسم کا دراز قامت شخص نکلا تھا۔ باقی پولیس اہلکار بھی کدکڑے مار کے نیچے اتر آئے تھے۔ میں نے اس چھریرے جسم والے شخص سے ہاتھ ملایا اور پھر انسپکٹر کامران کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا تعارف کالیا سے بھی ''شیراز'' کی حیثیت سے کروایا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اس کے بعد ضروری کارروائی نمٹائی، بیان لیا اور چلتا بنا۔

میں اور کالیا بھی اوپر آ گئے۔ روزی پریشان اور متوحش سی نظر آ رہی تھی۔

''سب کچھ غارت چلا گیا۔ میرا خیال ہے اب ہمیں بھی چلنا چاہیے۔'' کالیا بولا۔

''روزی کا کیا کریں؟ کیا یہ ادھر ہی رہے گی؟'' میں نے کالیا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تم انسپکٹر کامران کو فون کر کے پہلے تازہ صورتِ حال سے آگاہ کر دو!'' اس نے کہا۔ ''اور یہ بھی کہہ دینا کہ ممکن ہو سکے تو روزی کی حفاظت کے لیے دو سادہ اہلکار پولیس والوں کو بھی یہاں مستقل طور پر تعینات کرنے کا بندوبست کرے۔''

مشہور شاعر مرزا تقی بیگ مائل کا اصل وطن دہلی تھا لیکن ملازمت کی وجہ سے جے پور میں جا بسے تھے۔ دہلی تشریف لاتے تو دہلی کے ممتاز لوگوں سے ملاقات فرماتے۔ ایک روز حکیم اجمل خاں کے ہاں بیٹھے تھے۔ حکیم صاحب نے فرمائش کی۔ ''حضرت کچھ سنائیے۔'' مائل صاحب نے غزل شروع کی، مطلع تھا:

اس شوخ کا جو نام نہ آتا زبان پر
مسجد میں لوگ آ ہی تو جاتے اذان پر

مائل صاحب حکیم صاحب سے قریباً اٹھارہ برس بڑے تھے، حکیم صاحب نے بزرگی کا لحاظ نہیں کیا اور اس مطلع کی داد نہیں دی۔ مائل صاحب نے دوسرا مطلع پڑھا:

حیرت ہو کیوں نہ آدم خاکی کی شان پر
ایک مشت خاک چھا گئی دونوں جہان پر

اس مطلع کی حکیم صاحب نے دل کھول کر داد دی اور پھر جتنے شعر پڑھے۔ ایک ایک شعر پر حکیم صاحب کی زبان سے سبحان اللہ اور صل علیٰ نکلا۔ حکیم صاحب خود بلند پایہ شاعر تھے اور نہایت سخن سنج تھے۔

غزل ختم ہوئی تو مائل صاحب نے پوچھا۔ ''پہلا مطلع آپ نے کیوں ناپسند کیا۔'' حکیم صاحب نے کہا: نعتیہ شعر میں شوخ کا لفظ مجھے کھٹکتا ہے۔ شوخ اور شریر ہم معنی ہیں۔ مائل صاحب نے فوراً شوخ کی جگہ پاک کر دیا:

اس کا جو نام پاک بھی آتا زبان پر
مسجد میں لوگ آ ہی تو جاتے اذان پر

حکیم صاحب نے پاس ادب کا مظاہرہ مجمع عام کو دکھانے کے لیے نہیں کیا تھا۔ اس وقت وہاں حکیم صاحب اور مائل صاحب کے سوا تیسرا فقط اللہ تھا۔

مرسلہ: نعیم شاہ۔ شیخوپورہ

ہم اندر کمرے میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے سیل فون پر انسپکٹر کامران سے رابطہ کرنا چاہا مگر وہ شاید مصروف

ہونے کی وجہ سے اٹینڈ نہیں کر پار ہا تھا۔
''تم دونوں میری فکر نہ کرو۔'' روزی ہمیں الجھن آمیز تفکر میں پا کر بولی۔ ''اتنی جلدی دشمن دوسرا وار کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ تب تک تم انسپکٹر کامران سے رابطہ کر کے اسے سب بتا دینا۔''
میں نے اور کالیا نے آپس میں مختصراً مشورہ کیا اور پھر وہاں سے رخصت ہوئے۔
کالیا بائیک چلا رہا تھا اور میرا ذہن تیزی سے سوچنے میں محو تھا۔ مجھے بیک وقت کئی کام نمٹانا تھے۔ عاصمہ کی واپسی کی تسلی ہوتے ہی میرا اسیروں خون بڑھ گیا تھا۔ دشمنوں کے خلاف کافی کچھ کرنے کا موقع ہنوز میرے ہاتھوں میں تھا اور میں نے عزیر خان کے خلاف بھی قانونی کارروائی نمٹاتے ہوئے اے ایس پی خادم حسین سے رابطہ کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ ثوبیہ کا ذکر اس سے کرنے کے بعد میں اس سے بچنے کی راہ تلاشنے نہیں دینا چاہتا تھا۔
''کدھر چلنا ہے جگری؟'' کالیا نے مین روڈ پر آتے ہی مجھ سے پوچھا۔
''اے ایس پی خادم حسین کے ہاں!'' میں نے کہا اور وہ چونک کر بولا۔
''ابے لے..... جگری! ہمیں عاصمہ بہن کے سلسلے میں انہیں اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔''
''ابھی چل کر لے لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''وہ پولیس افسر ہے جگری! کوئی عام آدمی نہیں۔ اسے کیا بتاؤ گے کہ ہم نے ذاتی طور پر یہ کارروائی کر کے عاصمہ بہن کو اغوا کاروں سے چھڑا لیا ہے؟''
''مگر وہ تمہارے استاد بھابھا سے اس کے دوستانہ تعلقات ہیں۔'' میں نے کہا اور پھر ایک فوری خیال کے تحت اس سے بولا۔ ''ایک کام کر کالیا!''
''ابے لے..... دس کام بول۔''
''پہلے تیرے اڈے پر چلتے ہیں، استاد بھابھا سے ملتے ہیں۔ دیکھیں وہ کیا مشورہ دیتا ہے۔''
''ایک دم برابر بولا۔'' کالیا موڈ میں تھا۔ ایسے وقت میں فلمی ڈائیلاگ مارتا تھا۔
ہم اڈے پر پہنچے۔ استاد بھابھا سے اے ایس پی خادم حسین سے ایک نئے مسئلے کے سلسلے میں بات کرنے کا کہا تو اس نے بھی پہلا سوال ہم سے یہی پوچھا۔
''وہ چھوٹتے ہی تم دونوں سے پہلا سوال مغویہ (عاصمہ) کے بارے میں ہی پوچھے گا۔''
''استاد! یہی مشورہ تو ہم آپ سے کرنے آئے ہیں، کیا کیا جائے پھر؟ انہیں صاف صاف بتا دیا جائے کہ ہم نے خود ہی.....'' کالیا نے استاد بھابھا سے یہ کہتے ہوئے خود ہی دانستہ معنی خیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو استاد بھابھا ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔
''وہ برا تو مانے گا لیکن..... تم اس سے جا کر پہلے بات کر کے دیکھو۔''
''آپ کے اس کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''تعلقات تو اچھے ہی ہیں لیکن بہرحال وہ اپنی ناک اونچی ہی رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پولیس افسر جو ہوا۔''
''اسے چھوڑ و استاد پھر!'' کالیا نے کہا۔ ''لیکن معاف کرنا استاد! میں سمجھتا ہوں کہ اس کے زیادہ اچھے تعلقات ضمیر شاہ سے ہیں اور ضمیر شاہ کو میں نہیں پسند کرتا نہ ہی وہ مجھے.....''
کالیا نے آخر میں صاف گوئی سے کہا تو میں نے دزدیدہ سی نظروں سے استاد بھابھا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کالیا کی بات کا برا منائے بغیر مسکرا کر بولا۔
''جانتا ہوں میں تم دونوں کے دلوں میں پلنے والی سرد جنگ کے بارے میں۔ گروہ میں تم دونوں کی کہاں بنتی تھی؟''
''وہ غدار تھا۔'' کالیا نے کہا۔
''وہ تمہاری وجہ سے گروہ سے نکلا تھا۔'' استاد بھابھا نے صاف لہجے میں کالیا سے کہا۔
''اور استاد! تم ہمیشہ اسی کی ہی طرف داری کیا کرتے تھے۔'' کالیا بھی آج اپنے اندر کا غبار نکالنے پر تلا ہوا تھا۔
''اس لیے کہ ہمیشہ تم ہی غلطی پر ہوتے تھے۔''
''اس کے مشوروں نے کب ہمیں فائدہ پہنچایا تھا استاد! آخر کار معاملہ سلجھانے کے لیے آپ مجھے ہی بھیجتے تھے۔''
''کیا بات ہے کالیا! آج بہت تلخ ہو رہے ہو؟'' استاد بھابھا سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو اس نے موضوع دوسری جانب موڑنے کی کوشش چاہی۔
میں اندر ہی اندر بے چین ہو رہا تھا۔ مجھے بہت سے کام ترنت نمٹانے تھے اور یہ دونوں آپس کی بحث میں الجھ گئے تھے۔ تب ہی میں نے ہولے سے کھنکھار کر مداخلت کی اور کہا۔
''میرا خیال ہے ہم کچھ اور سوچ لیتے ہیں، ہمیں ضمیر

شاہ اور اے ایس پی خادم حسین کا چیپٹر ہی کلوز کر دینا چاہیے۔“
”اجازت دو استاد! پھر ملتے ہیں۔“ کالیا میری بے چینی بھانپ کر اٹھ کھڑا ہوا تو شاید استاد بھابھا کو بھی ہماری پریشانی کا احساس ہو گیا۔ دوستانہ تحکم سے بولا۔
”بیٹھ جاؤ آرام سے تم دونوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل نکالا اور کسی سے رابطہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کالیا نے مجھے آنکھ ماری تھی۔
”ہیلو! بھابھا بول رہا ہوں۔ ضمیر! ایک کام کرو یار! میں نے جس کام کے لیے کالیا اور اس کے دوست نعمان کو تمہاری طرف بھیجا تھا نا...... اسی سلسلے میں اے ایس پی صاحب سے دوبارہ ملنا تھا۔ آج ہو سکتی ہے ان سے ملاقات؟“
میں نے کن انکھیوں سے کالیا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بیزار سا نظر آ رہا تھا۔
”کیا کہا؟ نہیں ہو سکتی، کیوں؟ کہاں ہیں وہ؟ اچھا! چلو کوئی بات نہیں اور تو سب ٹھیک ہے ناں؟ آؤ یار! کبھی اڈے پر، بڑے دن ہوئے ملاقات کو...... چلو...... ٹھیک ہے۔“
استاد بھابھا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر ایک اور نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ہوتے ہی بولا۔ ”ہاں، شکور! یار وہ ایک کام تھا تم سے...... کوئی پولیس افسر ہے جان پہچان کا...... ایماندار اور ذمہ دار قسم کا...... ہاہاہا...... صحیح کہا یار! ایماندار ہو گا تو بھلا ہم جیسوں سے رابطے میں رہے گا، یہ بھی تم نے خوب کہی...... ڈی ایس پی ریحان؟ ارے...... اسے تو شاید میں جانتا ہوں کہیں یہ وہی تو نہیں۔“
استاد بھابھا اپنی بات کرتا رہا اور کالیا نے مجھے آنکھ کا اشارہ کیا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔
”اپنا استاد بھابھا! اب پہلے جیسا ٹھکے والا نہیں رہا ہے۔“ کالیا نے اپنی بائیک سنبھالتے ہوئے مجھ سے کہا۔
”کہاں تو پہلے خود ہی سارے کام کیا کرتا تھا۔ بڑے دھڑلے سے جس سے چاہے ملنے پہنچ جاتا تھا مگر اب صرف فون پر ہی کام چلانے کی کوشش کرتا ہے۔“
”اب ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔ مجھے اس کے استاد بھابھا سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔
”اب ایک ہی ہمارا دوست ہے وہی انسپکٹر کامران! اسی سے ہی چل کر کچھ مدد لیتے ہیں۔“ کالیا نے جواب دیا۔
”تیری تو اس کے ساتھ اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔“

میں نے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس کی بات پر صاد کیا اور ابھی ہم روانہ ہونا ہی چاہتے تھے کہ میرا سیل گنگنایا۔ یہ انسپکٹر کامران کی کال تھی۔
”جناب! السلام علیکم!“ میں نے فوراً ادب سے سلام کیا۔ اس نوجوان پولیس افسر کا میں احترام کرنے لگا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ ایک ایماندار اور دلیر افسر تھا۔ میرا سلام اس کی فرض شناسی کو تھا۔
”تم اور تمہارا ساتھی شیراز اس وقت آ سکتے ہو؟ میں آفس میں ہوں۔“ اس نے کہا۔
”جناب! ہم آپ ہی کی طرف آ رہے تھے۔“ میں نے چھوٹتے ہی کہا۔
”بس! پھر بلا دیر چلے آؤ۔ باقی باتیں ملاقات پر۔“ اس نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔
”ابے لے...... جگری! اسے کہتے ہیں بیٹھے بٹھائے کام ہونا۔“ کالیا خوش ہو کر بولا۔
ہم دونوں روانہ ہو گئے۔ ملیر پہنچ کر ہم نے انسپکٹر کامران سے ملاقات کی وہ ہمارا ہی بے چینی سے منتظر تھا۔
”میں اسی ثاقب نامی شخص کو گرفتار کرنے نکلا تھا۔“ اس نے بتایا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ”مگر اس کے لیے مجھے ایف سی ایم سے خصوصی وارنٹ درکار تھے، میں اسی تگ و دو میں تھا اور موسمیات والی واردات تک بروقت نہ پہنچ سکا نہ ہی نعیم شاہ۔“
وہ ایک لمحے توقف کے بعد ہم دونوں کے بشروں میں نظر ڈال کے مستفسر ہوا۔
”وہ دونوں حملہ آور بھاگے کس طرح؟“
میں نے کامران کو ساری کتھا سنا ڈالی، جسے سن کر وہ پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ میں نے فوراً کہا۔
”تو پھر آپ نے ثاقب نامی اس آدمی کو گرفتار کر لیا؟“
”ہاں!“ اس نے کہا اور پھر بیل بجا کر کسی کو بلایا اور اسے ثاقب کو لانے کا کہا۔
اس کے ذرا ہی دیر بعد دو اہلکار ثاقب کو لے کر کمرے میں داخل ہوئے۔
”یہ تھا وہ شخص؟“ انسپکٹر کامران نے ہم سے پوچھا۔ میں نے گھوم کر اس شخص کی طرف دیکھا جس سے میں نے ڈاکٹر کی حیثیت اور گاہک بن کر بلیو مون کے دفتر میں ملاقات کی تھی، فوراً اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

"جی ہاں، جناب! میرا خیال ہے اب رحیم بخش کو بلا کر اس کی شناخت کروا دیں تو یہ معاملہ ادھر ہی نمٹ جائے اور کارروائی آگے بڑھ سکے۔" میں ایک دم جوش میں آ گیا۔

ثاقب حیران و پریشان نظروں سے کبھی میری طرف اور کبھی انسپکٹر کامران کی طرف تکے جا رہا تھا آخر احتجاجاً بولا۔ "انسپکٹر صاحب! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟ اور میں تو ان دونوں کو جانتا تک نہیں ہوں۔"

"ہو سکتا ہے۔" انسپکٹر کامران نے میز سے سیاہ رنگ کا رول اٹھا کر کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم شاید اس آدمی کو تو ضرور ہی پہچان لو گے جسے ابھی تمہارے سامنے پیش کیا جانے والا ہے۔" بڑے ڈرامائی انداز میں یہ کہتے ہوئے انسپکٹر کامران نے ایک اہلکار کو مخصوص اشارہ کیا۔ میں اور کالیا بھی چند ثانیوں کے لیے حیران ہوئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں چونکے اور میں تو بے اختیار اس نوجوان انسپکٹر کامران کی چابکدستی اور زیرک دماغی کا دلی طرح معترف ہو گیا تھا۔ کیونکہ ثاقب کے سامنے جن دو افراد کو پیش کیا گیا تھا وہ احسان جمالی گڈز کا منشی نواز اور ملوک کا سالا رحیم بخش تھے۔ تب ہی میں نے انسپکٹر کامران سمیت ثاقب کے چہرے کو تیز اور بھانپتی ہوئی نظروں سے گھورا۔ ان دونوں مذکورہ اشخاص کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزرے تھے اور ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ بھی ست کر رہ گیا تھا۔

"ان دونوں کو تو تم اچھی طرح پہچان رہے ہو ناں!" انسپکٹر کامران نے اس کی طرف گھور کر پوچھا۔

"آں..... نن..... نہیں تو....." ثاقب بوکھلا کر بولا۔ "تمہارا انکار بتا رہا ہے کہ تم انہیں جانتے ہو۔" انسپکٹر کامران اس کی طرف تیز سی نظروں سے گھورتے ہوئے طنزیہ بولا۔ "مگر..... یہ دونوں تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔" کہتے ہوئے وہ منشی نواز اور رحیم بخش کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"جی جناب! اچھی طرح جانتا ہوں میں۔" رحیم بخش نے فوراً جواب دیا البتہ منشی نواز خاموش رہا۔ میں اس کی خاموشی کی وجہ جانتا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے لیے بھی اب انکار کی کوئی گنجائش انسپکٹر کامران نے نہیں چھوڑی ہوگی۔ لہٰذا وہ اسی کی طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

"اور..... منشی نواز! تم کیوں خاموش ہو؟"

"ج جی..... جناب! میں بھی اسے جانتا ہوں۔"

"کمال ہے ثاقب صاحب! تم ان دونوں کو نہیں جانتے اور یہ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔" انسپکٹر کامران دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا، پھر اسے تہدید کرتے ہوئے بولا۔ "یاد رکھو ثاقب! دو گواہان کے سامنے تم جھوٹ نہیں بول سکتے۔ یہ معاملہ کسی عام آدمی کے ایکسیڈنٹ کا بھی نہیں ہے۔ ہائی کورٹ کی ایک وکیلہ ہے وہ۔ عدالت میں تمہیں مجرم ثابت کرنے کے لیے یہ دو گواہ کافی ہوں گے اور پھر تم نہیں بچ سکو گے۔ جھوٹ بولنے کا جرم الگ تمہارے گلے پڑے گا۔"

ثاقب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مسلسل تذبذب سی پریشانی کا شکار نظر آ رہا تھا۔ انسپکٹر کامران نے رحیم گل اور منشی نواز کو جانے کا اشارہ کیا اور پھر سیاہ رول کو اپنی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتا ہوا اپنی کرسی پر جا کے براجمان ہو گیا۔ پھر ثاقب کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تم اب بچ نہیں سکتے۔ سیٹھ ستار کتنا ہی بڑا دولت مند اور اثر و رسوخ والا آدمی ہو، وہ بھی تمہیں اس مقدمے سے نہیں بچا سکتا۔ کتنی تنخواہ دیتا ہے وہ تمہیں؟"

"پچاس ہزار۔" اس نے بہ مشکل جواب دیا۔

"پچاس ہزار کی تنخواہ کے لیے تم ایک جھوٹ بول کر خود کو لاکھوں کے جرمانے کی سزا میں بھی پھنسوانے والے ہو اور جو جسمانی سزا تمہیں ہوگی، وہ الگ بھگتنا پڑے گی تمہیں۔ اب بھی تم نہیں مانتے تو میں تمہارا چالان تیار کرنے لگا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں صرف استعمال کیا گیا ہے اور قربانی کا بکرا بھی بنانے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ تم ایک پروفیشنل آدمی ہو اور تمہارا ایسے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

انسپکٹر کامران نے آخر میں اس پر ایک نفسیاتی داؤ آزمایا تھا۔ اس کی عقابی نظروں نے شاید بہت کچھ بھانپ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ثاقب فوراً بول پڑا۔

"ج..... جناب! انسپکٹر صاحب! میں واقعی ایک شریف آدمی ہوں، لل..... لیکن میں اپنے باس کا حکم ماننے پر مجبور تھا۔ آپ مجھے ایک سمجھدار اور بھلے مانس آدمی دکھتے ہیں۔ میرا قصور صرف اسی قدر ہے کہ میں نے باس کے حکم پر عمل کیا اور یاسر نامی ایک شخص کو احسان جمالی گڈز میں نوکری پر رکھوایا۔ وہاں اس نے کیا کرنا تھا، اس کا مجھے بالکل بھی علم نہ تھا۔ یہ تو بعد میں اخبارات میں اس ایکسیڈنٹ کی خبر پڑھی تو میں ٹھٹکا تھا اور باس سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں

نے مجھے یہ سب بھول جانے کا حکم دیا۔ تب سے میں خود بھی کھٹک گیا تھا کہ ایسے خطرناک آدمی کی نوکری چھوڑ دوں گا۔''

''باس سے مطلب بلیومون بلڈرز کا سیٹھ ستار ہی ہے ناں؟''

''بالکل جناب! وہی ہے۔'' ثاقب نے گردن کو اثبات میں جنبش دی۔

''یہ سب بیان تم عدالت میں دو گے۔''

''مجھے کوئی اعتراض تو نہیں جناب! لیکن ڈر ہے کہ باس میرے خلاف ہو جائے گا اور مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔''

''تمہارے بیان اور اس اہم کیس کے بعد وہ قانون کے شکنجے میں آجائے گا۔ پھر وہ نہیں بچے گا۔ باقی اس سے تحفظ کی میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں۔ تم اگر میری ہدایات پر عمل کرو تو خطرے سے بچے رہو گے۔''

''مجھے منظور ہے جناب!'' وہ جھٹ سے بولا۔ اس کے بعد انسپکٹر کامران نے یاسر کے متعلق پوچھا، جس پر اس نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے یہی بتایا کہ وہ اسے نہیں جانتا تھا، وہ یقیناً سیٹھ ستار کا ہی آدمی تھا۔ اس کی تلاش جاری تھی۔ تاہم انسپکٹر نے ثاقب کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اس نے کیا کرنا تھا۔ وہ اسے چھوڑ رہا تھا، اس شرط کے ساتھ وہ اپنے آفس جا کر یہی بتائے کہ اسے غلط فہمی میں پولیس لے گئی تھی اور بعد میں اسے چھوڑ دیا گیا تھا۔

''اب یہ ہمارے لیے ایک مخبر کی حیثیت رکھے گا۔'' ثاقب کے جاتے ہی انسپکٹر کامران ہم سے مسکرا کر بولا۔ ''اور اسی کے ذریعے سے ہم یاسر کو بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ یقیناً سیٹھ ستار کے رابطے میں اب بھی ہوگا اور یہ یعنی ثاقب، سیٹھ ستار کی بغل میں رہتے ہوئے اس کی لنکا ڈھائے گا۔''

انسپکٹر کامران کی پلاننگ پر میں مطمئن تھا مگر جانے کیا بات تھی کہ مجھے کالیا کچھ خاص مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔ تاہم وہ خاموش ہی تھا۔ میں نے انسپکٹر کامران سے عزیر خاں کے سلسلے میں بات چھیڑ دی۔ اس کے لیے اس نے مجھ سے یہی کہا کہ جہاں مقتولہ ثوبیہ کا کیس داخل ہے، بہتر ہوگا کہ اسی تھانے کے انچارج سے رابطہ کیا جائے۔

''محلہ کریمی کی حدود کے تھانہ انچارج سے اگر آپ کی کوئی دعا سلام ہو جاتی تو کام ہمارا آسان ہو جاتا۔''

''مجھے افسوس ہے کہ وہاں میرا کوئی جان پہچان کا آدمی نہیں۔'' انسپکٹر کامران بولا۔ ''لیکن تم فکر کیوں کرتے ہو؟ کیس مضبوط ہے، تم نے عزیر خاں کے خلاف مؤثر ''ہوم ورک'' کر رکھا ہے تو کیا پریشانی ہے؟''

''پریشانی یہ ہے انسپکٹر صاحب کہ عزیر خاں بھی کسی معمولی آدمی کا بیٹا نہیں ہے، ملیر کے ایک گوٹھ کے بڑے جاگیردار کا لاڈلہ چشم و چراغ ہے۔'' اس بار کالیا نے کامران سے کہا۔

''بات سمجھ رہا ہوں میں تمہاری۔'' کامران بولا۔ ''تھانہ انچارج یا پولیس افسر کوئی بھی ہو لیکن ساری بات کا انحصار فریادی کی طرف سے کیے گئے وکیل کا ہوتا ہے۔ آپ اچھے سے وکیل کا بندوبست کر لیں۔ یہی صورت ہے۔''

''ہم.....'' میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ لیے۔ اس کے بعد میں نے کالیا کی طرف دیکھا۔ ''چلیں؟''

ہم دونوں انسپکٹر کامران سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے اور تھانے کے احاطے میں کھڑی اپنی بائیک کے قریب آ گئے۔

''کیا بات ہے کالیا! تم ثاقب والے معاملے میں کچھ غیر مطمئن سے نظر آرہے تھے، کوئی خاص وجہ؟''

اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ہونٹوں میں داب کے لائٹر سے سگریٹ سلگایا۔ پھر ایک کش لیتے ہوئے بولا۔

''پتا نہیں کیا بات ہے جگری! میرا دل اس ثاقب پر اعتماد کو مائل نہیں ہو رہا۔''

''وہ تو مجھ سمیت انسپکٹر کامران کو بھی اس پر ابھی کامل بھروسا نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''یہ بات نہیں۔'' وہ فوراً ہی دوسرا کش لیتے ہوئے بولا۔ ''میرا نہیں خیال کہ وہ، وہی کچھ عدالت میں کہے گا جس کے بارے میں انسپکٹر کامران نے اسے کہا ہے اور جو سچ بھی ہے۔''

''ابھی تو اسے عدالت میں پیش کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے انسپکٹر کا!''

''یاسر کے سراغ ملنے میں اگر ناکامی ہوتی ہے تو کامران عدالت میں چالان پیش کر دے گا اور ثاقب کو بھی۔ تب ہی پتا چلے گا اس کی نیت کے بارے میں۔''

''چلو چھوڑو ابھی پھر اس بات کو۔ مجھے گھر پہنچنا ہے۔'' میں نے کہا۔ کالیا نے جلدی جلدی سگریٹ کے مزید دو تین گہرے گہرے کش لیے اور پھر اس کا ادھ جلا ٹوٹا انگلیوں میں دبا کر پھینکا اور بائیک پر سوار ہو گیا۔

ہم گھر پہنچے۔ عاصمہ خیریت سے تھی۔ اس نے بتایا کہ اسلم موکا اس کی خیریت پوچھتا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے کہا تھا

کہ میں جب گھر آجاؤں تو قاضی صاحب کی بیٹھک پر آجاؤں جبکہ فہیم کا ابھی تک کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں تھا۔ عاصمہ کو بھی میں نے اس کے لیے پریشان دیکھا۔

''بھائی جان! فہیم آخر کہاں چلے گئے ہیں؟ نہ گھر آتے ہیں نہ ہی اپنی خیریت کی اطلاع دے رہے ہیں؟ آپ ہی ان کے سیل نمبر پر رابطہ کر کے دیکھ لیں۔''

میں نے مغموم سے لہجے میں کہا۔ ''بہنا! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے اسے ایک بار بھی فون نہیں کیا ہوگا؟ پگلی! میں اسے ہر روز دن میں کئی بار فون کر چکا ہوں، وہ کال ہی ریسیو نہیں کرتا، آخرکار میں نے اسے ایس ایم ایس کے ذریعے تمہارے خیریت سے گھر آجانے کی بھی اطلاع کر ڈالی تھی۔ مجھے پوری اُمید تھی کہ وہ یہ میسیج پڑھ کر ضرور فون ریسیو کرلے گا مگر افسوس پتا نہیں وہ بے وقوف کیا سمجھ بیٹھا ہے مجھے۔''

''پھر بھی بھائی جان! آخر کچھ تو پتا چلے ان کے بارے میں۔ کچھ تو کریں؟'' عاصمہ گہری تفکر سے بولی۔

''مجھے نمبر بتاؤ...... میرا اس کے لیے ان نون نمبر ہوگا، وہ اٹھالے گا تو میں تمہیں سیل دے دوں گا، اس طرح کم از کم اس کی خیریت کے بارے میں تو پتا چل جائے گا۔'' کالیا نے مجھ سے کہا اور مجھے اس کی یہ تجویز معقول لگی۔ میں نے... اسے فہیم کا نمبر دیا جسے وہ اپنے سیل فون سے ملانے لگا۔ اس کے بعد سیل اس نے اپنے کانوں سے لگالیا۔

''ہیلو! کون؟'' کالیا نے کہا۔ شاید فہیم نے کال اٹینڈ کرلی تھی۔ میری اور عاصمہ کی دھڑکتی نظریں کالیا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''ارے بھائی! تم فہیم ہی بات کر رہے ہو ناں؟ نعمان احمد کے چھوٹے بھائی؟ میں اس کا دوست کا......'' کالیا اچانک یہ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔ اس کے چہرے کا رنگ یک لخت متغیر سا ہوگیا۔ پھر شاید دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا تھا کیونکہ اس نے سیل فون اپنے کان سے ہٹالیا تھا۔ اس کے چہرے پر سخت الجھن کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔

''کک...... کیا ہوا یار کالیا؟ خیریت تو ہے؟ یہ تیرا چہرہ...... ایک دم فکرمند سا کیوں ہوگیا؟ کیا کہا فہیم نے؟'' میں نے پریشان کن بے چینی سے پوچھا تو وہ بولا۔

''ابے لے...... جگری! وہ کوئی اور تھا۔'' وہ گومگو سے لہجے میں بولا۔

''آخر کون تھا وہ شیری بھائی؟ اور کیا کہہ رہا تھا وہ؟'' عاصمہ نے بھی متوحش سے لہجے میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ وہ کالیا کو ''شیری بھائی'' ہی کہتی تھی۔

''کوئی اجنبی تھا مگر...... وہ فہیم کو جانتا تھا۔'' کالیا نے کہا۔ ''کہہ رہا تھا کہ فہیم کو اب بھول جاؤ۔''

''کیا؟'' بیک وقت عاصمہ اور میرے منہ سے ایک تھراتی ہوئی چیخ کی صورت میں یہ برآمد ہوا تھا۔

''کک...... کیا مطلب ہے اس بات کا؟ آخر بھائی کے سیل پر کون بات کررہا تھا؟''

عاصمہ تشویش زدہ ہوگئی خود میں بھی پریشان ہوگیا تھا۔

''تمہیں یقین ہے کالیا وہ کوئی اور شخص تھا؟ مم...... میرا مطلب ہے بولنے والا فہیم نہیں تھا؟''

''نہیں، فہیم تو وہ بالکل ہی نہیں تھا اور نہ ہی ہمارا شناسا۔'' کالیا نے جواب دیا۔ ''وہ کوئی اور ہی آدمی تھا جس کی آواز اور لہجے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ اچھے قماش کا آدمی نہیں تھا۔''

''مم...... میں نہ کہتی تھی بھائی جان کہ فہیم بھیا کسی مصیبت کا شکار نہ ہوگئے ہوں۔ پلیز، بھائی جان! انہیں ڈھونڈیں میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' عاصمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نئی تشویش ناک صورت حال پر سب سے پہلے میں نے سنبھالا لیا، اس کے بعد عاصمہ بہن کے کاندھے پر اپنا ہاتھ دھرا اور جب اس سے تسلی بھرے الفاظ کہنے چاہے تو خود میری آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

''بہنا! حوصلہ رکھو، میں اور کالیا ہے ناں! فہیم بھائی کو ہم ڈھونڈ نکالیں گے۔''

میں اس سے زیادہ عاصمہ سے کچھ نہیں کہہ سکا اور فوراً ہی کالیا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کالیا! وہ کہہ کیا رہا تھا فہیم کے بارے میں؟''

''رابطے پر اسی نے ہی پوچھا تھا، کون۔ میں نے فہیم کا نام لیا تو وہ بولا کہ اسے اب بھول جاؤ۔ میں خود یہ سن کر چند لمحوں کے لیے سوچتا رہ گیا تھا۔ جب دوبارہ کہنا چاہا تو اس نے دوسری جانب سے رابطہ ہی منقطع کردیا۔''

''تم نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کوئی خطرناک شخص معلوم ہوتا تھا۔''

''ہاں! اس کی آواز میں ایک خطرناک غراہٹ اور لہجے میں سفاکانہ قطعیت تھی۔'' کالیا نے جواب دیا۔

میں نے کچھ سوچ کر فوراً اپنے سیل فون سے فہیم کے نمبر پر رابطہ کیا مگر رابطہ نہ ہوسکا۔ میرا نمبر اس نمبر کے لیے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

''بلاک'' کردیا گیا تھا۔ یہ بات میں نے کالیا کو بتائی اور اس کا سیٹ لے کر میں نے دوبارہ فہیم کا نمبر ملایا تو یہی رسپانس ملا۔ یعنی، رابطہ ممکن نہیں۔

''تمہارا نمبر بھی بلاک کردیا گیا ہے۔''

''اوہو!'' کالیا کے منہ سے نکلا۔ میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''یار، کالیا! یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ، میں انسان ہوں۔ کالیا! مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ اتنی پریشانیوں کو سہہ سکوں، یار! مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرا نروس بریک ڈاؤن ہی نہ ہوجائے۔ اس تقدیر نے ہمارا ہی گھر کیوں دیکھ لیا ہے یار! اور یہ ساری پریشانیاں مڈل کلاس طبقے کے لوگوں کے ہی حصے میں کیوں آتی ہیں۔ باپ کو بے گناہ پھانسی چڑھنے کا غم میرے دل کا ناسور بن گیا ہے۔ باپ کا وہ چہرہ، وہ الفاظ ابھی تک میری سماعتوں میں گونجتے ہیں، جب انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ مجھے ان کے خاندان کی پیشانی سے ایک ''قاتل'' کا داغ دھونا ہے۔ وہ خاندان جن کی انہوں نے ہمیشہ حق وحلال کی کمائی سے پرورش کی تھی۔ وہ کنبہ جسے انہوں نے اپنی نجابت داری اور خون سے سینچا تھا۔ کالیا! میں تو ابھی تک اپنے اس اہم مقصد سے بھی خود کو کوسوں دور سمجھے ہوئے ہوں کہ سیٹھ ستار اور مہران خان جیسے ناسور فطرت ''ڈون'' میرا راستہ روکے کھڑے ہوگئے اور وہ ''پردہ نشیں'' ناسور جو میرا اصل ٹارگٹ تھا، ہنوز در پردہ رہتے ہوئے میرے لیے طرح طرح کی مشکلات کھڑی کیے ہوئے تھا۔

میں کس کس سے نمٹوں یار! میں ایک شریف آدمی ہوں، جتنی مجھ میں سکت اور جس قدر میری اوقات ہے میں وہ کرنے کی کوشش میں جتا ہوا ہوں کہ اب یہ فہیم بھائی کا نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ یار کالیا! میں پاگل ہی نہ ہوجاؤں۔ تقدیر نے یہ ایک کے بعد ایک پریشانیاں میرے ہی حصے میں کیوں ڈال دی ہیں۔''

میں قنوطی ہونے لگا تھا، مایوسی کی انتہاء کو چھوتا میرا دل و دماغ اپنی ڈگر چھوڑ رہا تھا۔ میں اندر سے گھٹ رہا تھا اور اندر میرے باغیانہ اور سرکشی جیسے جذبات پروان چڑھ رہے تھے۔ ایک غبار تھا میرے اندر جو آپوں آپ ابلنے اور اگلنے کے لیے بے تاب ہوا جارہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے محسوس کیا تھا جب عاصمہ مجھ سے کچھ کہنے والی تھی تو قریب کھڑے کالیا نے اس کی طرف دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

''میرے دشمن کس قدر طاقت والے ہیں اور میں کیا ہوں ان کے مقابلے میں؟ محض ایک پھونک جسے یہ لوگ جب چاہتے ہیں، اپنی دولت اور اثر ورسوخ سے اڑا ڈالتے ہیں۔ یار کالیا! ہمارے سماج میں ایک شریف اور غریب آدمی اتنا ناقدرا کیوں ہے؟ تو نے ٹھیک راستہ چنا کالیا! جب تک تو ایک غریب اور شریف آدمی رہا، سماجی ناسور نما دشمن تجھے لتاڑتے رہے، پھر تو نے مجبور ہوکر جیسے ہی شرافت کا لباس اتار پھینکا اور اپنے دشمنوں کو اسی زبان میں جواب دیا تو وہ سب کے سب ایک ایک کرکے قصر فنا میں گرتے چلے گئے۔ ہاں کالیا! میرے یار! میرے بھائی! میں بھی شرافت کا لبادہ اتار پھینکوں گا۔ اپنے دشمنوں کو انہی کے انداز میں، انہی کی بولی میں پھونک کی طرح اڑا دوں گا۔ تجھے یاد ہے ناں کالیا! ایک دن تو نے مجھے بھی یہی درس دیا تھا لیکن میں نے انکار کردیا تھا کیونکہ میری سرشت میں ایک شریف باپ کا خون گردش کررہا تھا۔ رگوں میں تو تیرے بھی ایک شریف خاندان کا ہی لہو دوڑ رہا ہے، اسی لیے تو تو نے مجھے شرافت کا لبادہ اتارنے نہیں دیا تھا اور مجھ سے ایک فقید المثال جملہ کہا تھا۔ یاد ہے ناں کیا کہا تھا کالیا تو نے......''

''نہیں جگری! میں تجھے ایک اور ''کالیا'' ہرگز بننے نہیں دوں گا۔''

''مگر یار! اب میں کالیا بن کے رہوں گا۔''

''بس میرے جگری! اب چپ ہوجا، جتنا غبار اپنے دل کا تو نے نکالنا تھا نکال لیا۔''

ایک دم کالیا نے کہا۔ اسی لمحے مجھے عاصمہ کی سسکی سنائی دی تھی۔ کالیا آگے بڑھ کر میرے قریب ہی بستر پر بیٹھ گیا تھا اور اس نے مجھے اپنے گلے لگایا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نام کی کوئی شے نہیں اتری تھی مگر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

''تجھے کالیا بننے کی ضرورت نہیں ہے جگری! میں ہوں ناں تیرا یار کالیا، بس، ایک ہی کالیا کافی ہے، پھر کیوں تو فکر کرتا ہے جگری!'' کالیا خم ٹھونکنے والے جوش تلے لہجے میں بولا۔

''معاشرے کے ان ناسوروں سے نمٹنے کے لیے ایک کالیا، ایک نعمان عرف نومی۔ ایک بدمعاش ایک شریف کافی ہوگا۔''

وہ میرا دل رکھنے اور شاید ماحول کے بوجھل پن کو کم کرنے کے لیے مسکرا کر بولا اور بے اختیار میں بھی ہولے سے مسکرا دیا۔ وہ آگے بولا۔ ''خود کو کیوں کمزور سمجھنے لگا ہے جگری؟

تو کمزور کہاں ہے جگری! اگر ایسا ہوتا تو تو خود سوچ ذرا، اتنے بڑے تیس مار خاں جیسے مافیائی چیفس کی نیندیں حرام ہوتیں؟''

پھر عاصمہ بھی کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں بولی۔ ''بھائی جان! آپ بہت بہادر اور باہمت ہیں۔ مجھے ہمیشہ آپ پر فخر رہے گا۔ آپ کی شرافت، ثابت قدمی، آپ کا آدرشانہ اندازِ زندگی اور چٹانوں جیسا حوصلہ۔ ایسے بھائی کی بہن ہونے پر بھلا کس بہن کو فخر نہ ہوگا۔ اباجی نے بھی تو کبھی ... حالات کے سامنے سپر ڈالی تھی بھائی جان! انہوں نے سارا بار اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا مگر اف تک نہ کی تھی لیکن بھائی جان! یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ آج ان سے کئی گنا زیادہ نامساعد حالات سے دوچار ہیں۔ ایک کے بعد ایک مصیبت اور ایک نئی پریشانی منہ پھاڑے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ میری پریشانی ختم ہوئی تھی کہ اب فہیم بھائی بھی!'' کہتے ہوئے عاصمہ کا لہجہ رندھ گیا۔

عاصمہ کو آزردہ خاطر ہوتے دیکھ کر میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا، جانتا تھا کہ میرے سوا اس کا دنیا میں اور کون ہے۔ میں ہی اگر ڈھنے لگتا تو اس کا کیا بنتا۔ تب ہی میں نے اپنا درد دباتے ہوئے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور کہا۔ ''مجھے معاف کر دینا عاصمہ! میں شاید واقعی ایسے پے در پے پڑنے والے دگرگوں حالات کے شکنجے میں خود کو جکڑے دیکھ کر خوامخواہ ہی اپنا دل چھوٹا کر بیٹھا تھا مگر تم تو مجھے اچھی طرح جانتی ہونا۔ قنوطیت اور مایوسی کا یہ دورہ عارضی ہوتا ہے میرے لیے اور پھر جب کالیا جیسا جگری یار کا ساتھ ہے تو کس مائی کے لعل کی جرأت ہے وہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔''

''ابے لے...... جگری! تو نے تو ہماری بہنا کو بھی دکھی کر دیا۔'' کالیا فوراً بولا۔ پھر وہ بھی عاصمہ کے سر پر از راہ شفقت اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ صحیح ہے کہ اپنا نومی بھی تو ایک عام انسان ہی ہے۔ مایوسی کا غلبہ تو میرے جیسے پر آن پڑتا ہے، پر اپنا نومی ایسے حالات سے نمٹنا بھی اچھی طرح جانتا ہے اور بہن عاصمہ تم کبھی یہ مت سمجھنا کہ تمہارے صرف دو ہی بھائی ہیں، یہ شیراز بھی تمہارا بھائی ہے۔ چلو اب یہ آنسو پونچھو اور ہمارے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ تب تک ہم فہیم بھائی کے بارے میں سوچتے ہیں۔''

کالیا کی باتوں پر عاصمہ بھی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بے اختیار مسکرا دی اور کالیا کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے یہ کہہ کر اٹھی۔ ''بہت اچھے پیارے بھائی'' اور دوپٹا درست کرتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''کالیا! یہ حرکت کم از کم اس کانے سیٹھ ستار کی نہیں ہوسکتی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

میری بات پر وہ تھوڑا چونک کر مجھے حیرت سے تکتے ہوئے بولا۔ ''ابے لے...... جگری! تو نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ خود میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔ مگر......'' کہتے ہوئے اس نے شاید دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

''مگر کیا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''حاجی مہران خان کو تو تم نہیں بھول رہے ہو؟'' اس نے کسی خیال سے میری جانب تکتے ہوئے استفسار کیا۔

''اس کا خیال بھی میں اسی لیے رد کروں گا کہ ابھی میرا اس سے براہ راست کوئی خاص ٹاکرا نہیں ہوا ہے۔'' میں نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''ٹاکرا اس کے خاص کارپردازوں سے ہو چکا ہے۔'' کالیا بولا۔ ''دشمن اس کے کاندھے پر بھی تو بندوق رکھ کر چلا سکتے ہیں۔ لاڈلہ سائیں بھی تو ہے۔''

''میرا پھر بھی نہیں خیال کہ حاجی مہران کی یہ حرکت ہوسکتی ہے جبکہ لاڈلہ سائیں کی تو ابھی بات ہی چھوڑو۔'' میں نے کچھ غور کرنے والے لہجے میں کہا تو کالیا بدک کر بولا۔

''ابے لے...... جگری! فی زمانہ اس سرزمین میں ہمارے یہ دو ہی تو اہم دشمن ہیں۔''

''حیرت ہے میرے یار، کالیا! تو اس پردہ نشین دشمن کو کیوں فراموش کر بیٹھا ہے، جس کے ساتھ میری اصل جنگ ہے۔'' میری مراد اسی پردہ نشین دشمن سے تھی جس نے میرے بدنصیب باپ کے خلاف سازش تیار کی تھی۔

''اوہ، سمجھا!'' وہ ایک دم بولا۔ ''پر جگری!'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا اور چپ ہوگیا۔ شاید اس تیسرے دشمن کو وہ جھٹلانے کی کوشش نہیں کر پا رہا تھا۔ میں اس سلسلے میں مزید آگے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بول پڑا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو پھر وہ ہم سے کسی قسم کی معاملہ داری طے کرنے کے لیے رابطہ کیوں نہیں کر رہا ہے۔''

''ہوسکتا ہے اب کرے۔'' میں نے کہا۔

اسی اثناء میں عاصمہ چائے بنا لائی ہم چائے پینے لگے۔

میں نے چائے ختم کی ہی تھی کہ میرے موبائل کی میسج ٹون ابھری۔

"کہاں ہو؟ کیسے ہو؟" فوزیہ کی طرف سے میسج آیا تھا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ حالات کی کشاکشی کے باعث میں اس سے کوئی رابطہ نہیں کرسکا تھا۔ میں نے اسے جواب سینڈ کردیا اور یہ بھی بتادیا کہ میں ان چند دنوں میں کیا کیسے اور کہاں مصروف رہا۔ نیز میں نے اسے عاصمہ کی بازیابی کے بارے میں بھی مختصراً بتادیا۔

"بات ہوسکتی ہے؟" اس نے پھر پیغام کیا۔

"ابھی نہیں۔ بعد میں خود ایس ایم ایس کے ذریعے پوچھ کے تمہیں کال کرلوں گا۔" میں نے لکھ کر "کس" کے ٹیمبل کے ساتھ سینڈ کردیا۔ جواب میں مجھے بھی "اوکے" کے ساتھ ایسا ہی میسج آیا۔

اسی وقت کالیا کے سیل فون پر ایک کال آئی۔

"ہیلو!" اس نے سیل کان سے لگا کر سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں! وہ گھر آگئی ہے۔" اس نے شاید دوسری طرف کی بات سن کر جواب دیا تھا۔

"میں نے استاد بھابھا کو بتانا ہی ضروری سمجھا تھا۔ چلو، ایک ہی بات ہے انہوں نے تمہیں بتادیا ناں......کیا؟ بس! اپنے طور پر معاملہ سیٹ ہوگیا تھا۔ ہاں! استاد بھابھا نے ہی مسئلہ حل کردیا تھا۔ چلو......پھر تم خود ہی استاد سے بات کرکے اپنے سوال کا جواب حاصل کرلو۔ خدا حافظ!" یہ کہتے ہوئے اس نے برا سا منہ بنا کر رابطہ منقطع کردیا۔

"کون تھا؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ضمیر شاہ!" وہ جواباً بولا۔ "اپنا رعب جھاڑنے کی کوشش کررہا تھا کہ ہمیں اسے بتانا چاہیے تھا۔ اس طرح اے ایس پی خادم حسین نے بھی برا منایا ہے۔"

"ہنہ......برا منایا ہے، خود تو وہ کچھ کرنہ سکے تھے، اب کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"چھوڑ یار! یہ بتا! اب کیا پروگرام ہے؟" کالیا نے سر جھٹک کر کہا۔

"عزیر خاں کی گرفتاری کے سلسلے میں حاجی کریم بخش سے ملنا چاہوں گا میں۔"

"ٹھیک ہے جگری!" کہتے ہوئے کالیا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اپنا خیال رکھنا، میں اب چلتا ہوں۔ کوئی بات ہو تو مجھے فون کرلینا۔"

میں نے ہاتھ ملا کر رخصت کیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد جب اس کی بائیک کی اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری تو میں نے عاصمہ سے کہا کہ میں ابھی حاجی صاحب سے مل کر آتا ہوں۔"

کالیا جاچکا تھا۔ میں گھر سے نکلا اور حاجی صاحب کی بیٹھک پر پہنچا۔ وہ وہیں موجود تھے دو ایک اور لوگ بھی تھے۔ صاحب سلامت کے بعد حاجی صاحب نے اپنی ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "بھئی برخوردار! یہ اپنے منے میاں والے معاملے کا کیا بنا؟ وہ تو بے چارہ چپ ہوکے بیٹھ گیا ہے مگر اس غریب کو انصاف تو دلانا ہی ہوگا ناں۔ آخر کار مجرم کو قرار واقعی سزا تو ملنی ہی چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے جناب!" میں ان کی تائید میں بولا۔ "میں اسی سلسلے میں مصروف تھا اور میرا خیال ہے میں نے مجرم تلاش کرلیا ہے، اب بس اس کے خلاف قانونی کارروائی کی دیر ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں ساری بات بتادی۔

وہ ایک دم جوش میں آگئے۔ انہوں نے اسی وقت اسلم مموکا کو خورشید خاں المعروف منے میاں کو بلوانے کے لیے اس کے گھر کی طرف روانہ کردیا اور پھر مجھ سے بولے۔ "نعمان میاں! ہم ابھی متعلقہ تھانے جاکر عزیر خاں کے خلاف ایف آئی آر تو کٹوا دیں گے مگر میرا خیال ہے اس کے خلاف ہمارے پاس بھی شبہ کرنے کا کوئی ٹھوس ثبوت ہونا چاہیے۔"

میں نے انہیں عزیر خاں کی تصویر اور چند ایسے ثبوت پیش کردیئے جس سے مقتولہ ثوبیہ اور اس کے بیچ یونیورسٹی فیلوز جیسے تعلقات ظاہر ہوتے تھے۔

"اس کے علاوہ منے میاں کا بیٹا اختر بھی ثوبیہ کی زبانی عزیر خاں کا نام سن چکا تھا۔ میں بھی عزیر خاں کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہوں۔"

تھوڑی دیر میں منے میاں اپنے بیٹے اختر کے ساتھ وہاں حیران و پریشان سا آن وارد ہوئے۔ جب انہیں پتا چلا کہ متوقع مجرم کا کھوج لگالیا گیا ہے اور اب بس پولیس کو مطلع کرنے کی دیر ہے تو منے میاں فوراً مستفسر ہوا۔ "آخر پتا تو چلے وہ ظالم ہے کون اور کس کی اولاد ہے؟"

میں نے جب انہیں بتایا کہ وہ ملیر گوٹھ کے ایک جاگیردار کا بیٹا ہے جن کا آبائی شہر ٹھٹھہ ہے تو وہ کچھ گم صم سا ہوگئے۔

"کیا ہوا منے میاں؟ تم چپ کیوں ہوگئے؟" حاجی صاحب نے اس کی طرف دیکھ کر قدرے حیرت سے کہا تو منے میاں ایک نگاہ اپنے قریب بیٹھے جوان اکلوتے بیٹے اختر کی

طرف ڈالنے کے بعد بولے۔ ”حاجی صاحب! میں ایک غریب آدمی ہوں اور ایک جوان اکلوتے بیٹے کا باپ بھی۔ عزیر خاں نامی اس شخص کو میں نہیں جانتا جس نے میری معصوم بچی پر یہ گھناؤنا ظلم کیا مگر کیا ایسا ممکن ہوگا کہ ایک جاگیردار کے بیٹے کو قانون کی طرف سے کوئی سزا بھی ملے؟“

اس کی بات پر وہاں موجود ہم سب چونکے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

”یہ......کیا کہہ رہے ہو، منے میاں؟ ہوش میں تو ہو ناں تم!“ حاجی صاحب نے اس سے کہا۔ ”ارے بھئی! قانون تو قانون ہے، سب کے لیے برابر، جرم خواہ کسی نے بھی کیا ہو اور چاہے وہ کتنے ہی بڑے باپ کی اولاد ہو، اسے سزا تو ملنی ہی چاہیے۔“

”معاف کرنا حاجی صاحب! آپ پرانے خیالات کے آدمی ہیں، شاید زمانے کے چلن اور ہمارے سماج کے ان ناسوروں سے واقف نہیں ہیں جو اپنے اثر و رسوخ اور دولت کے بل بوتے پر بڑے سے بڑا جرم کر کے بھی نہ صرف آزادانہ گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر اپنی طاقت اور زور کے بل بوتے پر سچ اور حق کی آواز کو بھی دبانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ جاگیردار کبھی بھی نہیں چاہے گا کہ اس کے بیٹے کو سزا ہو، یا وہ پھانسی کے تختے پر چڑھے۔“

”ارے بھئی یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ حاجی صاحب ایک دم بولے۔ ”حق کی آواز کا گلا تو تم خود ہی گھونٹ رہے ہو۔ میاں! کیا تمہیں اللہ پر بھروسا نہیں ہے؟ صرف اسی ذات پاک سے ڈرو منے میاں! جس کے قبضے میں ہم سب کی جان ہے۔ چلو اٹھو، اسی وقت ہمارے ساتھ تھانے چلو، اپنے نعمان میاں نے کتنی محنت اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اصل مجرم کا سراغ لگایا ہے، باقی ہم سب بھی تمہارے ساتھ ہیں۔“

منے میاں مشکلوں سے راضی ہوا تھا۔ بیٹا بھی ساتھ تھا۔ میں نے اپنی کار نکالی اور ہم متعلقہ تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایس ایچ او تیمور ملک وہاں موجود تھا اور وہی بدنصیب ثوبیہ کے اغوا اور بعد قتل کی تفتیش کر رہا تھا۔ ہم نے تھانے پہنچ کر اسے ساری بات بتائی اور عزیر خاں کے خلاف ایف آئی آر کاٹنے کا کہا تو وہ بولا۔

”جناب! ایف آئی آر تو کاٹی جا چکی ہے۔“

”کیا؟“ اس کی بات پر میں چونکا۔

”کس کے خلاف کاٹی گئی اور کب؟“

”آپ ہی لوگوں نے کٹوائی تھی، نامعلوم افراد کے خلاف!“ ایس ایچ او تیمور ملک بولا۔

”وہ تو ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب! لیکن اس وقت ہمیں کب پتا تھا کہ اصل مجرم کون ہے؟“ حاجی صاحب نے جواب دیا۔

”تو اب کیسے پتا چل گیا آپ لوگوں کو، اصل مجرم کا؟“ تیمور ملک نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ میں نے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! کمال ہے، جو کام آپ کو انجام دینا تھا وہ ہم نے کیا ہے، پھر بھی آپ!“

”آپ نے کیسے یہ کام انجام دیا؟ آپ پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتے ہو؟“ انسپکٹر نے میری جانب گھور کر پوچھا۔ مجھے اس کا انداز تخاطب برا لگا مگر ضبط سے کام لیتے ہوئے میں نے قدرے سکون سے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! میں شواہد کی بات کر رہا ہوں جو کسی کے ہاتھ بھی لگ سکتے ہیں اور وہ پولیس سے ہی رابطہ کرتا ہے، جیسا کہ ہم سب آپ کو یہاں نظر آ رہے ہیں، آپ شاید بھول رہے ہیں، ذرا ثوبیہ مرڈر کیس کی ایف آئی آر کی کاپی نکال کر ملاحظہ فرمائیں، مقتولہ کے بھائی نے اپنے بیان میں کسی عزیر خاں کے بارے میں ذکر کیا تھا جو ثوبیہ کا کلاس فیلو تھا اور وہ اس سے باتیں بھی کرتی رہی تھی اور ہم اسی عزیر خاں کے شواہد لے کر آئے ہیں۔“

میرا خیال تھا انسپکٹر لاجواب ہو کر بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو جائے گا مگر اس کے برعکس وہ اسی طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ ”میں دیکھ لیتا ہوں اور آپ ذرا وہ شواہد بھی بتا دیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ریکارڈ روم کے ایک کلرک کو بلوایا اور ساتھ ہی ہیڈ محرر کو بھی حکم دیا کہ اس روز کی ایف آئی آر اور بیانات کی فائل لے آئے۔

تھوڑی دیر میں دونوں حاضر کر دی گئیں۔ شواہد کا تذکرہ میں نے کر دیا اور جب انسپکٹر تیمور کو یہ پتا چلا کہ عزیر خاں ہمارے ہاں کام کرتا ہے تو وہ بولا۔ ”لگتا ہے آپ کے عزیر خاں سے کچھ کاروباری اَن بن ہو گئی ہے۔“

میں اس کی معنی خیز بات کا مطلب سمجھ گیا۔ غصہ تو مجھے بہت آیا، سمجھ میں تو آ رہا تھا کہ یہ حاجی مہران خان جیسے جاگیردار کا راتب خوار بننے کی تیاری پکڑے ہوئے تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ ہمارے جانے کے بعد وہ اپنی ”ٹور“ کے علاوہ اور بھی کچھ بنانے کے چکر میں ہے۔ حاجی مہران خان سے کم از کم ٹیلی فونک کال کے ذریعے تو رابطہ کر کے اسے اس ساری صورتِ حال سے آگاہی دینے کی کوشش کرے گا، اگر ایسا

تھا تو اس کا واضح مطلب ہوتا کہ میرا اگلا اور براہ راست ٹکراؤ حاجی مہران خان کے ساتھ ممکن ہوتا۔ لہٰذا پھر میں نے بھی اسی کے انداز و لہجے میں جواب دیا۔ ”میری تو کاروباری ان بن نہیں ہے البتہ آپ ضرور ایک بڑے آدمی کے ساتھ اپنی راہ و رسم بڑھانے کی کوشش میں ہیں۔“

وہ بھی زیرک تھا، میری ذومعنی بات میں چھپے کاٹ دار طنز کو فوراً سمجھ گیا اور اس بار ذرا کرخت لہجے میں بولا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ تم شہر کے کسی بھی بڑے اور شریف عزت دار آدمی پر تہمت لگا کر اس کے خلاف، مجھ سے ایف آئی آر کٹواتے رہو گے۔ تم لوگ جاؤ اب میں اپنا کام بخوبی کرنا جانتا ہوں۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی انسپکٹر صاحب!“ اس بار منے میاں کو غصہ آگیا۔ ”میری بیٹی اغوا ہوئی، آپ لوگ اسے بازیاب کرانے میں بری طرح ناکام رہے، پھر اس معصوم کو بیدردی سے قتل کر دیا گیا اور اب جب اس کے قاتل کے خلاف شواہد ہاتھ لگے ہیں تو آپ ایک جاگیردار کا نام سن کر اس کے بیٹے کے خلاف ایف آئی آر نہیں کاٹ رہے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ پہلے سے درج شدہ ایف آئی آر کو بھی نامعلوم ملزموں کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں جبکہ ہم عزیر خان کا نام درج کروا چکے تھے۔“

انسپکٹر تیمور بولا۔ ”تم لوگوں نے شواہد پولیس کو دے دیئے ہیں، لہٰذا میں پہلے خود اس کے بارے میں تفتیش کروں گا اس کے بعد ہی کوئی کارروائی کروں گا۔“

”میرے خیال میں ہمیں چلنا چاہیے حاجی صاحب!“ میں نے اس کی بات کاٹ کر حاجی کریم بخش سے کہا۔

”ہمیں پولیس کمشنر سے خود ہی ملنا پڑے گا اور اسی وقت ملنا پڑے گا، بصورت دیگر ہم پریس کلب جا کر بھوک ہڑتال پر بیٹھ جائیں گے۔ میڈیا والے خود ہی ہمارا سچ اور پولیس کی بددیانتی کو عوام کے سامنے لے آئیں گے۔“

ہم سب تھانے سے واپس لوٹنے لگے۔

”اس طرح معاملہ سلجھنے کی بجائے اور الجھ جائے گا۔ سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھانا، ایسا نہ ہو کہ تم لوگوں کو دوبارہ میرے پاس ہی آنا پڑے۔“ بدطینیت انسپکٹر تیمور نے آخری اور روایتی حربہ استعمال کرنا چاہا جبکہ میرا اپنا یہ خیال تھا کہ اب ہمارا پولیس کمشنر سے ملے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے لیے ہم پہلے محلے میں آئے۔ کچھ اور لوگوں کو اکٹھا کیا اور جلوس کی صورت میں پولیس انتظامیہ کے آفس پہنچے اور اس کے احاطے میں کھڑے ہو کر متعلقہ تھانے کے خلاف نعرے بازی شروع کر دی۔ جلد ہی ہماری شنوائی ہو گئی اور صرف چار افراد کو کمشنر نے اپنے آفس روم میں بلایا۔ میں، حاجی صاحب، منے میاں اور اختر آفس میں داخل ہوئے۔ وہاں ہم نے چوہدری انصاری صاحب کو ساری حقیقت اور کیس سے متعلق شروع سے آخر تک بات بتا دی۔ انہوں نے بڑے غور سے ہماری بات سنی اور ذمے داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی وقت متعلقہ تھانے کے انچارج تیمور ملک کو فون کھڑکا کر سختی سے ہدایت جاری کر دی کہ عزیر خان کے خلاف فوراً ایکشن لیا جائے۔

ہم کمشنر صاحب کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے لوٹ گئے۔

میں گھر آگیا۔ عاصمہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ وہ سہیل کی وجہ سے ابھی تک پریشان تھی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”بہنا! فکر نہ کرو اور دعا کرو فہیم بھائی کے لیے، تم ذرا احتیاط ہو کر گھر پر رہنا اور کسی کے دستک دینے پر بالکل بھی دروازہ مت کھولنا۔ میں ذرا فہیم کے آفس جا کر اس کے دفتری ساتھیوں سے مل کر کچھ پتا لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”بھائی جان! میرا خیال ہے آپ پولیس کو تو مطلع کر ہی دیں۔“ عاصمہ نے مشورہ دیا تو میری نظروں کے سامنے انسپکٹر تیمور ملک کا چہرہ گھومنے لگا۔

”بہنا! تمہیں پتا ہے ناں ہماری پولیس کیا کرتی ہے۔ بس! تم اپنے بھائی جان پر بھروسا رکھو اور اس کی کامیابی کی دعا کرو، میں چلتا ہوں۔“

میں اپنی مہران کار میں سوار ہو کے فہیم کے دفتر جا پہنچا جو شارع فیصل پر ہی واقع تھا۔ وہاں میں نے فہیم کے سب سے قریبی ساتھی سے بات کی اور اسے فہیم کی گمشدگی کے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد اس نے مجھے وہیں مزید ساتھیوں سے ملوایا اور سب کا ایک ہی جواب تھا کہ فہیم نے ان میں سے کسی سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ فہیم جب مجھ سے ناراض ہو کے گھر چھوڑ گیا تھا تو یقیناً اغوا ہونے سے پہلے اپنے کسی قریبی دوست وغیرہ سے ضرور ملا ہوگا اور اسی سے مجھے کچھ نہ کچھ پتا چل جاتا کہ وہاں سے وہ کدھر گیا؟

میں نے لاری اڈے پر جانے کا قصد کیا مگر پھر کچھ سوچ کر ایڈووکیٹ زنیرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس نئی صورتِ حال سے میرا دل و دماغ بوجھل ہو رہا

تھا۔ مجھے اس بات کا تو امکان کم کم ہی لگ رہا تھا کہ نعیم کے اغوا میں سیٹھ ستار گروپ کا ہاتھ ہو سکتا تھا جبکہ رفعت خانم مرڈر کیس سے متعلق میری مہم جوئی نے جس پردہ نشیں ''بگ باس'' کو ظاہر ہونے پر (ٹیلی فونک رابطے کی حد تک) مجبور کر دیا تھا، درحقیقت میرا اصل اور ٹارگٹڈ مجرم یہی تھا، مجھے نعیم کے اغوا یا گمشدگی میں اسی کا ہاتھ لگتا تھا۔

میں زنیرہ کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر گلاب کے اس پھول کی طرح کھل اٹھی تھی جسے سورج کی تازہ کرنوں کے ساتھ آب شیریں مل جاتا ہے تو وہ ایک دم کھل اٹھتا ہے۔ حالانکہ میں اسے فوزیہ سے متعلق دوستانہ اور بے تکلفانہ ماحول میں اپنی پرسنل انیج منٹ کی حقیقت بھی بتا چکا تھا۔ باوجود اس کے وہ مجھے اب بھی دیکھ کر ہمیشہ کی طرح مسکرا دیتی تھی۔

''لگتا ہے بڑی بھاگ دوڑ کر کے آرہے ہو۔'' اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنے نرم لبوں کو دل نشیں انداز میں ایک دل فریب سی مسکراہٹ کے ساتھ وا کیا تھا۔ جواب میں، میں بھی اپنا سر جھٹک کے مسکرا دیا تھا۔ وہ آج بیڈ پر نہیں تھی۔ صوفے پر بیٹھی کسی فائل کا مطالعہ کر رہی تھی جواب اس کے پاس رکھی تپائی پر نظر آرہی تھی۔

''ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے جواب دیا اور اس کے سامنے والے ایک صوفے میں دھنس گیا۔ ''ویسے تمہیں آج بیڈ کی بجائے یہاں بیٹھے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ جس کا مطلب ہے تم تیزی کے ساتھ روبہ صحت ہو۔''

اسی وقت خالہ نجو بھی وہاں آگئیں۔

''سلام خالہ!'' میں نے فوراً انہیں سلام کیا۔

''جیتے رہو بیٹے!'' انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے مجھ سے دعائیہ کہا۔

''نومی بیٹے! تمہارے لیے کچھ ٹھنڈا لاتی ہوں۔''

''خالہ! بس، ٹھنڈا پانی ہی لائیے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے بعد اچھی سی چائے پیوں گا۔''

''ضرور بیٹا! ابھی لائی!'' خالہ نجو پُرشفیق محبت سے بولیں اور چلی گئیں۔

میں نے ایک گہری مگر تھکی تھکی سی ہمکاری خارج کرتے ہوئے اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔

پتا نہیں کیا بات تھی۔ مجھے یہاں زنیرہ کے پاس آکر ایک عجیب سا ہلکا پھلکا پن اور سکون سا ملتا تھا۔ میں جس کی توجیہہ پیش کرنے سے قاصر ہی رہا تھا کیونکہ میں نے بارہا اس کے بارے میں سوچنے کی بھی کوشش کی تھی اور تب ہی مجھے دو اہم لفظوں کے معنیٰ سمجھ میں آسکے تھے۔ ایک دوستی اور دوسرا تعلق۔

میری دوستی کی نہج زنیرہ کے ساتھ خاصی مضبوط تھی، اس میں سب ہی کچھ تھا۔ بے تکلفی، برے وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ، دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی سبیل اور اس دوستانہ سنگت میں بیٹھنے کا ایک الگ سا یک گونہ احساس، قلبی سکون جو ہمت و حوصلہ کی ڈھتی دیواروں کے لیے مضبوط ستون کی طرح لگتا تھا جبکہ تعلق ایک اندریں جذبہ خاطر کی صورت میرا فوزیہ سے کب کا استوار ہو چکا تھا۔ جس کے لوازم کچھ اور تھے۔ وہ بس محبت تھی۔ کسی کو پالینے کی، اپنا بنا لینے کی چاہت۔

''کیا کچھ خاص ہوا ہے آج؟'' معاً زنیرہ کی نرم آواز ابھری اور میں اپنے مختصر سے خیالات کے بھنور سے ابھرا۔

''ہاں!'' میں نے ہولے سے کہا۔

''لیکن پہلے مجھے تم سچ سچ یہ بتاؤ کہ تم اس وقت کیا سوچ رہے تھے؟'' وہ بولی تو میں چونک گیا۔ وہ شاید اتنی سی دیر میں میرا چہرہ پڑھتی رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنا پہلا سوال خود ہی اچک لیا تھا اور جلدی سے دوسرا پوچھ لیا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور صاف دلی سے بولا۔

''زنیرہ! پتا نہیں کیا بات ہے، جب میرا دماغ بوجھ اور دل بوجھل پن محسوس کرنے لگتا ہے تو اسے اتارنے کے لیے مجھے تمہارے ہاں کے سوا اور کوئی جگہ سوٹیبل لگتی ہی نہیں، میں یہاں آکر تم سے اپنی پریشانیاں اور دیگر معاملات شیئر کر کے ایک گونہ سکون سا محسوس کرنے لگتا ہوں اور تب ہی میرا دل و دماغ ایک دم ہلکا سا ہونے لگتا ہے۔ میرا تمہارا تعلق ایک مؤکل اور وکیل کا تو رہا ہی ہے لیکن جب سے یہ تعلق از خود ہی دوستی میں بدل گیا ہے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تمہاری سنگت میں کوئی ایسی بات تو ہے، جس کے حصار میں خود کو بہت مطمئن اور آسودہ سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ بس! یہی میں سوچ رہا تھا۔''

یہ کہہ کر میں اس کی کھلی کھلی رنگت، صورت پر اپنی نظریں جمائے رہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس نے میری بات بڑے غیر معمولی دھیان اور توجہ سے سنی تھی اور جسے سننے کے بعد اس کی سیاہ آنکھوں میں کچھ اپنے پن کے گلابی رنگ تاروں کی طرح جھلملائے تھے، اس کے شفق رنگ گالوں کی پھیکی پھیکی سی قوس قزاح جیسے یک دم ہی چمکی تھی۔ اس کے نرم لبوں کی گداز یت میں جیسے کوئی ملائمت آمیز جذبہ اپنی تمام تر حلاوتوں سے ایکا ایکی ہی دہکا تھا اور تب ہی وہ جیسے ایک چور

سے جذبے تلے بولی۔

''یہی تو دوستی کی اصل حقیقت ہے نومی کہ وہ اپنی سچائی لفظوں کے اظہار سے نہیں، احساسات سے باور کراتی ہے۔ ایسا احساس جس کا جزو، عمل کے تابع ہوتا ہے۔ میں تمہارے احساسات اور تمہارے اندر کو سمجھتی رہی ہوں۔ اس وقت سے جب تم اپنے باپ کا کیس لڑنے کے لیے ایڈووکیٹ راجا رحیم صاحب کے ہاں آیا کرتے تھے۔ میں تمہیں محسوس کرتی تھی، تمہارے جوش کو اور اس جذبے کو جس نے تمہیں ثابت قدم اور حوصلہ مند رکھا ہوا تھا۔ تم نے اپنے بے گناہ باپ کو پھانسی کے پھندے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر افسوس کہ تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تب ہی میں نے بھی اپنے دل میں ایک عہد کرلیا تھا نومی کہ اگر تم نے ہمت نہ ہاری اور بعد میں بھی تم اسی عزم و حوصلے سے اصل مجرم کو سزا دلوانے کے لیے ثابت قدم اور کوشاں رہے تو میں بھی تمہاری مدد کو پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ کیونکہ یہ سیاہ گاؤن میں نے صرف فیس ہی کھری کرنے کے لیے نہیں پہن رکھا ہے، بلکہ حق کو باطل پر سرخرو کرنے اور باطل کو ذلت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پہن رکھا ہے، تمہیں یہاں اسی لیے سکون ملتا ہے کہ اس سلسلے میں میرے اور تمہارے جذبات میں کوئی فرق نہیں ہے۔'' وہ میری بات کی تشریح پر اتنی صراحت کرنے کے بعد خاموش ہوگئی۔ بات مدلل تھی اور میرے دل کو بھی لگی تھی۔

تبھی خالہ نجو ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ اس پر پانی اور چائے کے برتنوں کی ہلکی کھنک گونج رہی تھی۔ کچھ پلیٹوں میں بسکٹ اور کیک پیس بھی رکھے تھے۔

میں نے پانی پیا اور چائے کا کپ سنبھال لیا۔ خالہ نجو ذرا دیر بعد چلی گئیں۔

میں نے اس دوران زنیرہ کو دیگر مختصر تفصیلات کے بعد اول، فہیم کی ناراضگی اور بعد اس کی گمشدگی اور اغوا کے بارے میں گوش گزار کردیا۔ چائے پیتے ہوئے زنیرہ پورے دھیان سے گوش برآواز رہی تھی۔

کمرے میں چند ثانیے کے لیے پُرسوچ سی خاموشی کا راج رہا تھا۔ اس کے بعد وہ بڑے متفکر سے لہجے میں بولی۔ ''تمہارے بھائی کی گمشدگی میں کوئی بعید نہیں کہ اسی پردہ نشین کا ہاتھ ہو جو ہمیں رفعت خانم مرڈر کیس میں مطلوب ہے۔ لگتا ایسا ہی ہے کہ وہ تمہاری اس مہم جوئی سے بخوبی واقف ہے کہ تم آہستہ آہستہ ہی سہی اس بھیانک جرم سے پردہ اٹھانے والے ہو۔ ورنہ وہ کبھی خود کو اس طرح ظاہر نہ کرتا۔''

''لیکن ایک بات پر میری الجھن ختم نہیں ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ایسا ہے بھی تو پھر اسے مجھ سے دوبارہ ٹیلی فونک رابطہ کرنے میں کیا قباحت تھی؟ وہ میری اس مہم جوئی کو دبانے کے لیے ترپ کا یہ پتا کیوں نہیں کھیل رہا؟ تاکہ کچھ پتا تو چل سکے کہ.....'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور اپنی پیشانی کو ایک ہاتھ سے مسلتے ہوئے سخت تشویش زدہ لہجے میں دوبارہ بولا۔

''مم...... مجھے تو ڈر ہے کہیں خدانخواستہ وہ فہیم کو کوئی جانی نقصان نہ پہنچادے۔''

''ابھی ایسا وہ نہیں کرسکتا۔'' زنیرہ پُرغور سے لہجے میں بولی۔ ''تم نے بتایا تھا کہ اس نے تمہارے سیل نمبر پر بات کی تھی؟''

''ہاں!''

''وہ نمبر تم نے ٹریس کرنے کی کوشش تو کی ہوگی؟''

''کی تھی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔'' میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''ہمم، ایسے لوگ ہر طرح سے محتاط رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔''

''مسئلہ یہ ہے کہ مجھے کوئی ایسا راستہ یا کلیو نہیں مل رہا ہے کہ میں فہیم کی تلاش کے سلسلے میں کوئی موثر قدم اٹھا سکوں۔'' میں نے پریشانی سے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''حالانکہ میں اس کے دفتری ساتھیوں سے بھی مل چکا ہوں مگر ان سے بھی کچھ معلوم نہ ہوسکا تھا اور پھر میں یہاں آگیا تاکہ تم سے کچھ مشورہ کرسکوں۔''

اسی وقت میرے سیل فون کی بیل گنگنائی۔ دیکھا تو چاچا انور شاہ کی کال تھی۔

''ایک منٹ!'' میں نے موبائل کان سے لگا کر زنیرہ سے کہا پھر ''ہیلو'' کہا۔

دوسری جانب سے چاچا انور شاہ کی گھبرائی ہوئی سی آواز ابھری۔ ''نومی بیٹے! وہ...... وہ پولیس آئی تھی ابھی تھوڑی دیر پہلے، عزیر خان کو گرفتار کرکے لے گئی ہے۔''

''اس کے باقی دو دوست کہاں ہیں؟ شاہنواز اور بشیر خاں؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''اس وقت عزیر خان کے ساتھ صرف شاہنواز موجود تھا۔'' چاچا انور شاہ نے بتایا۔ اسی وقت مجھے باتوں کے دوران ہلکی ہلکی بپ کی آواز بھی سنائی دینے لگی جس کا مطلب تھا کہ کوئی اور کال بھی آرہی تھی۔ میں نے چاچا انور شاہ کو کال

ہولڈ کروائی اور آنے والی دوسری کال اٹینڈ کی تو دوسری جانب سے غصیلی آواز ابھری۔

”مسٹر نعمان! تم نے یہ سب اچھا نہیں کیا ہے؟ نہیں جانتے تم کہ عزیر خان کس کا بیٹا ہے؟“

یہ شاہنواز خان تھا۔ میں نے بھی جواب میں اسی ناگواری سے کہا۔ ”وہ جس کسی کا بیٹا ہو، مجھے اس کی پروا نہیں ہے لیکن جو جرم اس نے کیا ہے اس کی سزا کا وہ حق دار ضرور ہے۔“

”سزا......ہا......“ شاہنواز نے میری بات کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کس چڑیا کا نام ہے مسٹر نعمان! مگر ایسا نہ ہو کہ یہ الزام تمہارے لیے سزا بن جائے۔“ اس کی ڈھٹائی، غرور اور تمسخر اڑانے کے انداز اور تہدید نے میرا دماغ الٹ دیا۔

”تم جیسے لوگ جب تک پہاڑ تلے نہیں آتے ہو، ایسی گیدڑ بھبکیاں دینا تم لوگوں کا ہی وتیرہ بن جاتی ہیں، مسٹر شاہ نواز! اب میں تم جیسے کرمنلو کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی پراپرٹی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لیے فوراً سے پیشتر اپنا بوریا بستر سمیٹنے کی کوشش کرو، ایسا نہ ہو کہ مجھے عزیر خان کی طرح تمہاری مٹی پلید کرنا پڑ جائے۔“

میں نے بھی اس کا گھمنڈ توڑنے کے لیے اسی کے لہجے میں جواب دیا تو وہ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ہم چوری چھپے نہیں آئے ہیں تمہارے اڈے میں۔ باقاعدہ تمہارے ساتھ ایک معاہدے کے تحت آئے ہیں جس کے باعث ہم نے یہاں اپنا کروڑوں کا سرمایہ لگا رکھا ہے اور تمہیں کرائے اور کمیشن کی مد میں پیسا مل رہا ہے۔“

”میں تھوک پھینکتا ہوں اب اس معاہدے پر اور تم لوگوں پر بھی۔“ کوشش ضبط کے باوجود میرا اندر لاوے کی مثل کھولنے لگا تھا۔

”منہ سنبھال کر بات کرو مسٹر نعمان!“ وہ غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”خوب سمجھ رہا ہوں میں تمہاری اس چالاکی کو، جب تم نے دیکھا کہ ہمارا کام منافع بخش جا رہا ہے تو تم اب کرایہ اور کمیشن کے چکر میں پڑے رہنے کی بجائے، خود ہی اس سارے کام پر اپنا قبضہ جمانا چاہتے ہو۔ اس کے لیے تم نے ہمارے ساتھی عزیر خان پر جھوٹا الزام لگوا کے اسے گرفتار بھی کروا دیا مگر ہم تمہاری اس سازش کو ناکام بنا دیں گے۔ لہٰذا اب کورٹ کے تھرو ہی مجھ سے بات کرنا۔“ یہ کہتے ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کی ہٹ دھرمی اور قبضے کی نیت جان کر مجھے طیش کے احساس تلے ایک نامعلوم سی بے بسی کا احساس بھی ہوا مگر ساتھ ہی یہ سوچ کر کہ وہ میرے کرائے دار تھے ناکہ میں ان کا؟ یہ اس زمین کے مالک نہیں تھے کہ اپنا قبضہ جمانے کا اختیار رکھتے۔ میں غصے سے بھنایا ہوا اسی وقت لاری اڈے پہنچا۔ مالک میں تھا اور ان کی کیا جرأت تھی کہ میری ہی زمین پر مجھ سے اس طرح کی ڈھٹائی کرتے۔

”دوسو!“ میں نے اپنے کمرے میں آتے ہی اپنے چپڑاسی کو آواز دی۔

”کدھر مر گیا ہے ڑے تو؟“ اس کی آواز نہ پا کر میں غصے سے چیخا۔

”حاضر سائیں ...... حاضر سائیں......“ جلد ہی وہ نمودار ہو کر مؤدبانہ بولا۔

”اسی وقت اڈے کے تمام آدمیوں کو احاطے میں اکٹھا ہونے کی اطلاع دے، اس کام میں ذرا بھی دیر ہوئی تو میں تیری اسی وقت کھڑے کھڑے چھٹی کر دوں گا۔“

دوسو بے چارہ یہ سنتے ہی الٹے پیروں پلٹ گیا۔

ذرا ہی دیر میں بہت سے لوگ میرے کمرے کے باہر وسیع احاطے میں اکٹھے ہو چکے تھے۔

”اسی وقت مہران گڈز کا آفس سیل کر دو اور جو بھی وہاں موجود ملے اسے بے دخل کر ڈالو۔“ میں نے چلّا کر حکم صادر کر دیا۔ لوگوں کو میرے اس فیصلے پر حیرانی تو ہوئی مگر انکار یا تساہل کی کسی کو جرأت نہ تھی۔ حکم سنتے ہی وہ فوراً حرکت میں آ گئے۔

مہران ٹرانسپورٹ گڈز کی عمارت اڈے کی جنوبی سمت میں واقع تھی۔ یہ ہمارا ایک وقت اسٹور اور گودام ہوا کرتا تھا۔ معاہدے کے بعد یہی عمارت خالی کر کے ہم نے عزیر خان کے حوالے کی تھی تو ان تینوں دوستوں یعنی عزیر خان، شاہنواز اور بشیر خان نے انہیں پر اپر طریقے سے سیٹ کر لیا تھا۔ اب میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت وہاں ان تینوں (بلکہ دونوں) میں سے کون کون وہاں موجود تھا۔ نہ ہی مجھے اس کی پروا تھی۔

میں ابھی احاطے میں کھڑا تھا۔ لوگ اس عمارت کی طرف بڑھ چکے تھے۔ چاچا انور شاہ کہیں گیا ہوا تھا۔ میں واپس اپنے کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اس وقت سخت اعصاب زدگی کا شکار تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ گولی چلنے کی آواز ابھری۔

”ٹھائیں......ٹھائیں......“ تلے اوپر دو فائر کرنے کی

آواز ابھری اور میں گولی کی طرح اپنے کمرے سے نکل کر باہر آگیا، اس بات کی بھی پروا کیے بغیر کہ اڈے کے اندر ہی فائرنگ ہوئی تھی۔

باہر نکل کر میری جلتی سلگتی نظریں اسی مذکورہ عمارت کی طرف جم گئیں۔ وہاں میرے ملازمین کا ہجوم اکٹھا نظر آرہا تھا۔ مجمع کائی کی طرح پھٹنے لگا تھا اور عمارت کے باہر میں نے شاہنواز خان اور بشیر خان کو دیکھا۔ وہ سخت جارحانہ موڈ میں نظر آرہے تھے۔ شاہنواز خان کے ایک ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا۔ اپنی پراپرٹی کی حدود میں اسے اس طرح کی اسلحہ بدست بدمعاشی کرتے دیکھ کر میں بھی آپے سے باہر ہوگیا اور کسی بھی خطرے یا بلوے کی پروا کیے بغیر میں تقریباً دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ مجھے قریب دیکھ کر ملازمین ایک طرف کو ہوگئے۔

"اس مجرمانہ اور غیر قانونی حرکت کا مطلب سمجھتے ہو تم شاہنواز؟" میں نے غصے سے حلق پھاڑ کر اسے للکارا۔

"مجرمانہ حرکت میں نے نہیں تمہارے ان آدمیوں نے کی ہے۔" شاہنواز میری طرف دیکھ کر تیز لہجے میں بولا۔ "ہم نے یہاں کوئی سستا سا ٹھیلا یا چھپر ہوٹل نہیں کھول رکھا ہے مسٹر نعمان! کروڑوں کی سرمایہ کاری کی ہے ہم نے۔ لہٰذا ہم سے کسی نے بھی یہاں ذرا سی بھی بدمعاشی کی تو انہیں اسی زبان میں جواب دیا جائے گا۔"

اس کا ساتھی بشیر خان بھی میری طرف گھورتے ہوئے غصے سے بولا۔ "مت بھولو کہ ہمارے پاس بھی غنڈے ہیں۔ ہمارے ایک اشارے پر وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔" میں طیش ناک انداز میں بولا۔ "تم لوگ خود ایک قاتل اور خونی شخص کے ساتھی ہو، جسے پولیس گرفتار کر کے لے جاچکی ہے۔ اب لگتا ہے شاید تم دونوں کی باری ہے۔"

"تم لوگ یہاں سے بالکل نہیں ہٹنا۔ کوئی مائی کا لال تم پر گولی نہیں چلائے گا۔" میں نے آخر میں اپنے آدمیوں سے تحکمانہ کہا اور وہیں کھڑے کھڑے ون فائیو پر پولیس کو کال کر ڈالی۔ یہ پولیس چوکی قریب ہی واقع تھی۔ کال کرنے کے بعد میں بری طرح تلملاتا ہوا اپنے کمرے میں آکر بے چینی سے ٹہلنے لگا اور ساتھ ہی گاہے بگاہے میں کھڑکی سے احاطے کے باہر اس عمارت کی طرف بھی دیکھتا جاتا تھا جس کے سامنے مجمع کی صورت میں میرے آدمی موجود تھے جبکہ شاہنواز اور بشیر خان بھی اب تک اسی طرح دروازے پر تنے کھڑے تھے۔ شاہنواز کے ہاتھ میں ہنوز پستول دبا ہوا تھا لیکن اب اس

کے دوسرے ہاتھ میں سیل فون بھی نظر آنے لگا تھا جو اس نے اپنے کان سے لگا رکھا تھا اور شاید کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

دو سو کمرے کے باہر دروازے کے اسٹول پر سہا ہوا سا بیٹھا تھا۔

مجھے ایک لمحہ کے لیے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ کہیں میں نے طیش میں آکر کوئی غلط قدم قبل از وقت تو نہیں اٹھا لیا تھا۔ کیونکہ عموماً غصے اور جوش کی حالت میں اٹھائے گئے اقدام پر انسان کو زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوا کرتی تھی۔ البتہ اس کا فائدہ ضرور مخالف کے حصے میں چلا جاتا تھا۔ بہرطور اب جو کچھ بھی ہو چکا تھا یا میں کر چکا تھا اس سے پیچھے ہٹنے والا میں بھی نہ تھا۔

مجھے پولیس کا انتظار تھا کہ اچانک میرے سیل فون کی بیل گنگنائی میں نے دیکھا یہ کال عطا محمد کی تھی۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنی بھنویں سکیڑلیں اور سیل فون کان سے لگا کر "ہیلو" کہا۔

"اڈے پر یہ کیا مسئلہ ہوا ہے نعمان؟" دوسری جانب سے عطا محمد کی سنجیدہ اور بردبارانہ سی آواز ابھری۔ مجھے حیرت تھی کہ انہیں کس نے اس واقعے کی اطلاع کردی؟

میں نے انہیں پہلے عزیز خان کے سنگین جرم کے ارتکاب اور اس کی گرفتاری کے بارے میں آگاہ کیا اور پھر شاہنواز کے فائر کرنے کے بارے میں مطلع کیا تو وہ بولے۔ "مجھے ابھی ابھی ان کے ایک ساتھی شاہنواز نے کال کر کے یہ بتایا ہے کہ تم ان لوگوں کو اڈے سے بیدخل کررہے ہو؟"

"جی ہاں جناب!" میں نے اثبات میں جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ یہ دونوں عزیز خان کے ساتھی ہیں اور کرمنل بھی۔"

"شاہنواز بتا رہا تھا کہ ان کے ساتھی عزیز خان کو بھی تم نے ہی ایک سازش کے تحت گرفتار کروایا ہے؟"

"جی ہاں!" میں نے جواب دیا۔ عطا محمد مجھ سے بظاہر عام اور سیدھے سادے انداز میں جان کاری حاصل کررہا تھا۔ ان کے لہجے میں کسی تنبیہہ یا درشتگی کا عنصر محسوس نہیں ہوتا تھا۔

"کیا جرم کیا تھا اس نے؟"

میں نے انہیں ثوبیہ کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی کہ وہ میرے ہی محلے سے تعلق رکھتی تھی۔ پولیس کو اس کے خلاف

ٹھوس شواہد بھی میں نے ہی تلاش کر دیئے تھے۔"

"ہمم......" دوسری جانب سے عطا محمد نے پُرسوچ سی ہمکاری لی۔ پھر بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے، تم ابھی عزیر خان پر قانونی جرم ثابت ہونے سے پہلے ان کے دو ساتھیوں کو اڈے سے بیدخل نہیں کرسکتے۔ زبردستی اور جوش میں اٹھایا ہوا قدم ہمارے خلاف بھی جاسکتا ہے۔ یہ لوگ کورٹ سے اسٹے آرڈر حاصل کرلیں گے تو پھر ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ پھر نہ ہمیں کرایہ ملے گا نہ کمیشن، سب کورٹ میں جمع ہوتا رہے گا۔ ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ کمال ہے نعمان! تم تو بہت سوچ سمجھ کر اور نہایت بردباری سے اس قسم کے مسائل اور معاملات حل کیا کرتے تھے۔ اب کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ اتنی جلد بازی کیوں کرنے لگے ہو؟"

میں ان کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ آگے بولے۔

"اپنے آدمیوں کو واپس بلا کر کام پر لگا دو اور شاہنواز وغیرہ کو اپنا کام کرنے دو۔ مالک مکان کے زعم میں اگر تم کرائے دار کے ساتھ زبردستی کروگے تو اس کے حقوق قانونی طور پر پاور فل ہوجائیں گے۔ اسی لیے صبر سے پہلے عزیر خان پر کوئی قرارواقعی جرم یا فرد جرم ثابت ہونے کا انتظار کرو، ابھی اس معاملے کو چھوڑ دو۔" یہ کہہ کر انہوں نے رابطہ منقطع کردیا۔

میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد میں نے مجبوراً وہی کیا جس کا ہدایت نما مشورہ مجھے عطا صاحب نے دیا تھا۔

میں نے آدمیوں کو واپس بلا لیا اور انہیں اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوجانے کی ہدایت کردی۔ میرا کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ عطا محمد کی یہ بات میرے ذہن میں چپک کر رہ گئی تھی اور وہ ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہے تھے کہ میں اب پہلے کی طرح ہوش کی بجائے جوش سے کام لینے لگا تھا۔ میں نے اس پر بہت غور کیا کہ کیا واقعی ایسا تھا؟ یا پھر یہ سب دھیرے دھیرے اثر پذیر ہونے والے واقعات سے اس کا تعلق تھا کہ کہیں ہوش سے اور کہیں جوش سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ کیا مجھے دونوں ہی روش کو متوازن خطوط پر استوار رکھتے ہوئے یہی راہ اختیار کرنا پڑے گی؟

"ہاں!" میرے دل نے ہی نہیں دماغ نے بھی یہی کہا تھا۔

میں نے تازہ صورتِ حال پر تھوڑا غور کیا اور فوراً اسدو بھائی کو فون کھڑکا دیا۔

"جی جناب!" دوسری جانب سے اس کی سپاٹ سی آواز ابھری۔ میں نے پہلے اس سے کسی نئی بات کا کھوج لگنے کا پوچھا جس کا مجھے بھی اندازہ تو تھا کہ ایسا ابھی کچھ نہیں تھا کیونکہ اگر ہوتا تو مجھے اسے فون نہیں کرنا پڑتا۔

"تم کو ایک کام دے رہا ہوں۔" چند ثانیے بعد میں نے اس سے کہا۔

"جی جناب؟" اس نے استفساریہ کہا۔

"کسی بہانے سے یا بھیس میں مجھ سے پہلے لاری اڈے پر ملنے آؤ۔ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کیونکہ میں تمہیں جو اہم کام سونپنے والا ہوں اس کا تمہارے لیے پہلے تھوڑا سا مشاہدہ ہونا ضروری ہے۔"

"میں ابھی پہنچ جاتا ہوں۔" اس نے فوراً کہا اور میں نے رابطہ منقطع کردیا۔

تھوڑی دیر بعد پولیس کی ایک گاڑی اندر داخل ہوئی۔ میں نے دو تین آدمیوں سے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ پولیس کی کوئی بھی گاڑی اندر داخل ہو انہیں سب سے پہلے میرے کمرے میں لایا جائے۔ لہٰذا وہ ادھر ہی آگئے۔ ان کے ہمراہ ایک ہیڈ کانسٹیبل آیا تھا، باقی اہلکار پانچ چھ کی تعداد میں تھے۔ میں نے ان کے لیے کولڈ ڈرنک منگوائی اور پھر ان سے یہی کہا کہ لاریوں سے اترنے والے کچھ مسافروں کے درمیان جھگڑا ہوگیا تھا، وہ خود ہی نمٹ گیا تھا اور وہ پولیس کی دھمکی پر چلے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ کولڈ ڈرنکس اور کیک بسکٹ وغیرہ کھا کر چلے گئے۔ میں نے حلق سے ایک تھکی تھکی سی سانس خارج کرکے اپنا سر کرسی کی پشت گاہ سے ٹکا دیا۔

کچھ سوچ کر میں نے سائیں داد کو فون کیا۔ اس نے میری کال ریسیو کرتے ہی ہیلو کہا تو میں نے پہلے مختصراً الفاظ میں اس کی خیر خیریت پوچھی اس کے بعد بولا۔ "سائیں داد! ایک کام کرسکتے ہو؟"

"حکم کرو میرے یار!" اس نے کہا۔

"بتا سکتے ہو کہ اس وقت حاجی مہران خان کہاں ہوگا؟"

"بتا سکتا ہوں۔ چند منٹ دے سکتے ہو؟"

"آدھا گھنٹا کافی ہوگا؟"

"بہت ہے۔"

"گڈ! میں منتظر ہوں تمہاری کال کا۔" میں نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

بیس منٹ بعد ہی اس کا فون آگیا۔ "وہ اپنی آبائی زمینوں پر گیا ہوا ہے۔"

''کب تک لوٹے گا؟''
''کچھ نہیں پتا۔''
''اور کوئی خاص خبر؟''
''کوئی نہیں۔''
''شکریہ دوست!'' کہتے ہوئے میں رابطہ منقطع کرنے ہی والا تھا کہ اس نے پوچھا۔
''شش......شہزادی نے تم سے کوئی رابطہ کیا؟''
''ابھی تو نہیں کیا اور تم جانتے ہو کہ اس بے چاری کے لیے ابھی یہ کام بے حد مشکل ہوگا اس لیے جب کوئی خاص بات ہوگی تب ہی وہ جان کا رسک لے کر بھی مجھے بتائے گی۔''
''ٹھیک ہے۔ میرے آنے کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔'' سائیں داد آخر میں بولا۔
''ابھی نہیں، ضرورت پڑی تو بتا دوں گا۔ تم بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھنا اور جیسے ہی کوئی غیر معمولی بات نوٹ کرو تو مجھے فوراً مطلع کرنا، چاہے رات کے تین بجے کا ہی وقت کیوں نہ ہو۔''

اس کے اثباتی جواب کے بعد میں نے سیل فون میز پر رکھ دیا اور اس کے بعد تین افراد کو میں نے اسی وقت شاہنواز خان کی ریکی پر لگا دیا۔ ویسے تو میں ان پر کڑی نگاہ پہلے سے ہی رکھے ہوئے تھا مگر اب معاملہ اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا اسی لیے میں نے اس سلسلے میں مزید اپنی تگ و دو تیز کر دی تھی۔

اس وقت سائیں داد کو فون کر کے مہران خان کے بارے میں دریافت کرنے کا میرا مقصد یہی تھا کہ اسے اب تک اپنے بیٹے کی گرفتاری کا علم ہوا تھا یا نہیں جبکہ وہ ٹھٹھہ گیا ہوا تھا۔

ابھی میں نے اس معاملے کو ادھر ہی رکھا اور فرحانہ کو فون کر کے اس کے ساتھ میٹنگ رکھی۔
''آپ آج شام کو آجائیں۔ پاپا بھی جلد ہی گھر آنے کا مجھے کہہ گئے تھے۔'' اس نے بتایا۔
''اچھی بات ہے۔ میں آج شام پانچ بجے تک آجاؤں گا۔''

''اچھا یہ بتائیں نعمان صاحب! زنیرہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' اس نے پورے خلوص سے اس کی خیریت پوچھی تھی۔

''اللہ کا شکر ہے وہ اب پہلے سے کافی بہتر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا انہیں بھی آپ اپنے ساتھ لائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔
''ہوسکتا ہے لیکن آپ کے ہاں آنے سے پہلے میں ان سے پوچھ لوں گا۔''
''گڈ! وہ ساتھ آجائیں تو اچھا رہے گا۔''
''اوکے!'' کہنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔
میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا اس کے بعد چند ضروری کام نمٹائے اور زنیرہ کو فون کر کے فرحانہ کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی اس سے چلنے کو بھی پوچھ لیا۔
''ارے بھئی میں تو تیار بیٹھی ہوں آجاؤ، ساتھ ہی نکل چلتے ہیں۔''
''مگر......تمہاری طبیعت؟''
''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ایسے ضروری موقع پر میرا تمہارے ساتھ جانا غیر اہم نہیں ہوگا۔''
اسی وقت دوسو اندر داخل ہوا، اس کے ہمراہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔ چہرے پر سفید داڑھی تھی اور مونچھوں کا رنگ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ عام سی شلوار قمیص میں ملفوف تھا۔ کمر بھی قدرے خمیدہ تھی۔
''کیا بات ہے؟ کون ہے یہ؟'' میں نے ایک نظر اس بوڑھے پر ڈالنے کے بعد دوسو سے پوچھا۔
''سائیں! یہ آپ سے ملنا چاہتا ہے، کہہ رہا تھا برات کے لیے دو عدد لاریاں بک کروانی ہیں۔''
''اس سے تم نے کہا نہیں کہ انور شاہ سے بات کر لے۔'' میں نے دوسو کی طرف گھورا۔
''کہا تھا سائیں! مگر یہ آپ سے ہی بات کرنا چاہتا تھا۔'' دوسو نے فوراً جواب دیا۔
''سائیں! آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں کہ میں کون ہوں؟'' اسی وقت میرے کانوں میں سدو بھائی کی آواز گونجی اور میں چونک پڑا۔ تب میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس بوڑھے کو دیکھا اور ایک جھماکا سا میرے اندر ہوا۔
''تم جاؤ!'' میں نے فوراً ہی دوسو سے کہا اور وہ حیران و پریشان سا کمرے سے باہر چلا گیا۔
''ارے یار! بتا تو دیا کرو پہلے سے کہ تم کس گیٹ اپ میں آ رہے ہو؟ بیٹھو!'' میں مسکرا کر بولا اور ساتھ ہی اسے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ بھی کیا۔ وہ کرسی سنبھالتا ہوا بیٹھا اور بولا۔
''میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی تھی لیکن آئندہ آپ

کو بتا دیا کروں گا جناب!‘‘

’’اوکے!‘‘ میں نے کہا اور پھر میز کی سطح پر رکھی ہوئی چابیوں کا گچھا اٹھایا، ایک چابی منتخب کر کے میز کی درمیان والی دراز کھولی۔ اس کے اندر سے ایک لفافہ نکالا اور میز پر اسے الٹ دیا۔ اندر سے تین عدد پوسٹ کارڈ سائز کی تصاویر نکل کر میز پر گریں۔ یہ تصویریں رانا بشیر کی تھیں، جو میں نے اپنے ’’اسپائی کیم‘‘ سے رانا بشیر کے ساتھ ہونے والی مختلف ملاقاتوں کے دوران کھینچی تھیں۔ ایک تصویر میں وہ اپنی لاڈلی بیٹی فرحانہ کے ساتھ بھی موجود تھا۔

’’یہ لو!‘‘ میں نے تینوں تصاویر اس کی جانب بڑھائیں اور کچھ سوچ کر پہلے یونہی اس سے پوچھ لیا۔ ’’اس آدمی کو کہیں دیکھا ہے تم نے؟‘‘

وہ تینوں تصاویر کو اپنے ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھتا رہا، اس کے بعد ایک ایک تصویر کو چہرے کے قریب کر کے دیکھنے لگا۔ میری نظریں اس کے بشرے پر جمی رہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ باقی دو تصویریں اس نے میز پر رکھ دیں اور ایک تصویر کو آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھنے لگا۔ یہ وہ تصویر تھی جس میں رانا بشیر اکیلا نہیں بلکہ اپنی بیٹی فرحانہ کے ساتھ تھا۔ اس تصویر کو اسے غور سے دیکھتا پا کر میں بھی ایک لحہ کو اندر سے کھٹکا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ اس تصویر میں کسی کو پہچان رہا تھا حالانکہ میں نے تو یونہی اسے تصویریں تھماتے ہوئے اس سے یہ کہا تھا کہ وہ اسے پہچان رہا ہے یا نہیں تا کہ میں آگے اس سے بات کر سکوں۔

’’میں اس لڑکی کو پہچان رہا ہوں۔‘‘

معاً ہی اس نے دھماکا کیا اور وہ تصویر میری طرف بڑھا کر بولا۔ اس کا انکشاف میرے لیے غیر متوقع ہی تھا۔

’’تت...... تم اس لڑکی کو پہچانتے ہو؟ واقعی؟‘‘ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غیر یقینی لہجے میں کہا۔

’’جی ہاں جناب!‘‘ اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن جناب! آپ کیوں اس قدر حیران ہو رہے ہیں؟ یہ کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں۔‘‘

’’لیکن میرے لیے ہے سدو بھائی!‘‘ میں نے فوراً کہا۔ ’’اس لیے کہ میں نے تمہیں یہ تصاویر پہچاننے کے لیے نہیں دی تھی اصل مقصد میرا یہ تھا کہ اس میں جو پختہ العمر شخص نظر آ رہا ہے، میں نے اس کی تم سے ریکی کروانی تھی، تو لگے ہاتھوں میں نے ایسے ہی روا روی میں کہہ ڈالا تھا کہ تم انہیں پہچانتے تو نہیں؟‘‘

وہ مسکرا دیا۔

’’میرے لیے یہ واقعی ایک حیرت ناک انکشاف ہوگا اگر تم مجھے ذرا تفصیل کے ساتھ اس لڑکی (فرحانہ) کے بارے میں بتاؤ گے، مگر ٹھہرو سب سے پہلے مجھے اس کا نام بتاؤ۔‘‘

’’فرفری...... فریحہ یاد آیا...... فرحانہ!‘‘

’’اومائی گاڈ!‘‘ بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا اور سدو بھائی اس بار تو جیسے مجھے ہونقوں کی طرح دیکھتا چلا گیا تھا۔

’’جناب! آپ ان تصویروں کے متعلق مجھے کچھ بتانا چاہتے تھے؟‘‘ مجھے حیرت میں ڈوبا دیکھ کر شاید اسے بیزاری سی ہونے لگی تھی اور اسی لیے اس نے فوراً مقصد کی بات کر دی۔

میں نے کہا۔ ’’ٹھہرو پہلے مجھے فرحانہ کے متعلق بتاؤ تم اسے کیسے جانتے ہو اور اسے کہاں اور کس کے ساتھ دیکھا ہے؟‘‘

’’کوئی زیادہ طویل عرصہ نہیں ہوا۔‘‘ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ’’یہی کوئی تین چار سال پہلے کی بات ہے۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں کسی نوجوان لڑکے کے ساتھ آئی تھی۔ میں اس وقت وہیں تھا۔‘‘

’’کس سلسلے میں آئی تھی؟‘‘

’’یہ مجھے نہیں پتا۔‘‘

’’تم نے ایک بار ہی اسے وہاں دیکھا تھا یا......‘‘ میں نے استفساریہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔

’’دو تین بار دیکھا تھا اور ہر بار اس کے ہمراہ وہی نوجوان تھا۔‘‘

’’اس نوجوان کا ناک نقشہ بتا سکتے ہو؟‘‘

سدو نے اس نوجوان کا جو حلیہ بتایا تھا وہ میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اصل بات چھیڑ دی۔

’’سنو!‘‘ کہتے ہوئے میں نے میز پر سے صرف وہی دو تصویریں اٹھائیں جس میں صرف رانا بشیر موجود تھا۔ وہ اسے ایک بار پھر دکھاتے ہوئے بولا۔ ’’اس شخص کی ریکی کروانی ہے۔ گھر سے دفتر اور اس کے بعد یہ کہاں جاتا ہے کس سے ملتا ہے۔ نیز اس کے ساتھ کون زیادہ قریب رہتا ہے۔ میں تمہیں اس کی رہائش گاہ اور دفتر کا پتا سمجھائے دیتا ہوں۔‘‘

میں نے اسے دونوں پتے ازبر کروا دیئے اور آخر میں بولا۔ ’’یہ لڑکی فرحانہ اس کی بیٹی ہے۔ ممکن ہو سکے تو اس کی بھی نگرانی کر کے مجھے مطلع کر دینا۔‘‘

''ٹھیک ہے جناب! اور کچھ؟'' سدو بھائی بولا۔ میں کچھ دیر تک پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے بیٹھا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آخری بات جس نوجوان کو تم نے فرحانہ کے ساتھ دیکھا تھا، وہ اب دوبارہ تمہیں دکھائی دے تو مجھے مطلع ضرور کرنا۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے اپنے جیبی پرس سے کچھ بڑے نوٹ نکال کر اسے تھما دیئے۔ ''یہ تمہارا بونس ہے مگر کام جتنی جلدی ہوسکے اتنا ہی اچھا ہوگا۔''

''میں پوری کوشش کروں گا جناب!'' وہ نوٹ لے کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا اور چلا گیا۔

لگ بھگ شام ساڑھے پانچ بجے میں اور زنیرہ، رانا بشیر کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ دونوں باپ بیٹی لان میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ میں نے اور زنیرہ نے بھی ایک ایک کپ لیا اس کے بعد ہم چاروں اٹھ کر اندر نشست گاہ میں آگئے۔

اس بار میں اور زنیرہ یہ تہیہ کر کے آئے تھے کہ وہ دونوں مذکورہ ڈائریاں لے کر ہی جائیں گے اور وہ تصویر بھی جس میں رانا بشیر کے سابقہ پارٹنر تمیز الدین اور اس کی بیوی، بیٹے تھے۔

ایک صوفے پر براجمان ہوتے ہی میں نے رانا بشیر کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ ''میں نے آپ سے ایک سوال پوچھا تھا مگر اس وقت آپ کو دفتر کی ایک اہم میٹنگ میں جانے کی جلدی تھی اور وہ رہ گیا تھا۔'' میں نے یاد دلایا۔

''سوری! میں شاید بھول رہا ہوں۔ تم دوبارہ دہرا سکتے ہو وہ سوال؟'' اس نے کہا۔

اس کے چہرے سے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اب ان سارے معاملات سے بیزار سا ہونے لگا تھا یا پھر کوئی اور بات تھی۔ وہ شاید یہی سمجھے ہوئے تھا کہ میں اپنا وہ اہم سوال بھول چکا ہوں گا مگر میں نے بھی گویا چھوٹتے ہی اسی سوال سے ابتدا کی۔

''شیور!'' میں نے ہولے سے کہا اور پوچھا۔

''آپ کے وہ سابقہ پارٹنر تمیز الدین اور ان کی فیملی، بقول آپ کے جرمنی شفٹ ہو چکے ہیں اور میرا سوال آپ سے یہ تھا کہ کیا وہ آپ کی اہلیہ کے مقتول ہونے سے پہلے جرمنی شفٹ ہو چکے تھے یا بعد میں؟''

کمرے میں ایکا ایکی پُرسوچ خاموشی طاری ہوگئی تھی۔

رانا بشیر کا چہرہ سوچتا ہوا سا بن گیا تھا اور ہم تینوں کی نظریں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن اسی دوران میں نے جب کن انکھیوں سے فرحانہ کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں مجھے عجیب سی الجھن کے آثار لرزتے محسوس ہوئے۔

''اس کا جواب مجھے سوچ کے دینا پڑے گا۔'' بالآخر رانا بشیر نے کہا۔ ''کیونکہ مجھے ٹھیک طرح اندازہ نہیں اس بات کا، دفتر جا کر ہی مجھے کچھ ریکارڈ کھنگالنا پڑے گا۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ آپ پہلے یہ دیکھنا چاہیں گے کہ آپ کے اور تمیز الدین کے درمیان کاروباری شراکت داری کب اور کون سی تاریخ کو منقطع ہوئی تھی؟'' میں نے کسی خیال کے تحت اپنی طرف سے ایک گرہ لگائی۔

''بالکل یہی بات ہے۔''

''لیکن...... اس تاریخ سے یہ بات کس طرح ثابت ہوگی کہ وہ پاکستان سے کب اور کون سی تاریخ کو ہجرت پذیر ہوئے؟''

''پہلے ایک بات معلوم ہوجانے دو، بعد میں وہ بھی میں معلوم کرلوں گا۔'' رانا بشیر نے جواب دیا۔

''کس طرح معلوم کریں گے آپ؟ کیا ان کی روانگی کا کوئی ڈیٹا آپ کے پاس موجود ہے یا ان کے کسی عزیز رشتے دار سے دریافت کرنے کی کوشش کریں گے؟'' میں نے پوچھا۔ میں نے ایک بار پھر یہ سوال کرنے کے بعد فرحانہ کے چہرے پر دزدیدہ سی نظر ڈالی تھی اور اب وہاں مجھے الجھن کے ساتھ ایک عجیب سی حیرت کے آثار بھی اُمڈتے محسوس ہونے لگے تھے۔ اگرچہ وہ اپنے اندر کی کیفیات کو چھپانے کی کوشش کررہی تھی لیکن...... میری بھانپتی ہوئی نظروں نے تاڑ لیا تھا کہ دونوں باپ بیٹی کے درمیان دال میں کچھ کالا ضرور تھا۔

''ارے بھئی تم بھی ایک وقت کئی سوال پوچھ لیتے ہو شاید یہ ایڈووکیٹ زنیرہ کی صحبت کا اثر ہے۔'' رانا بشیر تلخ سی ہنسی کے ساتھ گول مول سی بات کر گیا۔

''ظاہر ہے جب تک پہلے سوال کا جواب تسلی بخش نہیں ہوگا تو اس سے مربوط و متصل سوالات خود بہ خود ہی پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔'' میں نے بھی اس کے چہرے پر اپنی نظریں جمائے رکھتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑا کسمسایا اور اسی وقت فرحانہ نے جو اپنے باپ کے بالکل قریب ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ تھوڑا جھک کر سرگوشی میں باپ کے کان میں کچھ کہا تھا جس پر رانا بشیر نے نفی میں سر ہلایا تھا مگر منہ سے بولا کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے ان دونوں باپ

بیٹی کی یہ "ادا" ناپسند محسوس ہوئی۔

"ایکسکیوز می!" اسی وقت ایڈووکیٹ زنیرہ نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔ "آپ دونوں اگر واضح روش اختیار کرلیں تو معاملہ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے حل کی جانب بڑھ سکتا ہے۔" زنیرہ کی اس ذومعنی بات کا مطلب فرحانہ تو نہ سمجھ سکی، البتہ رانا بشیر جزبز ہوکر کھسیانی ہنسی تلے بولا۔

"ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

تب ہی فرحانہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی اور وہ صاف گوئی سے بولی۔ "اس فیملی نے مرحلہ وار جرمنی ہجرت کی تھی۔"

میں اور زنیرہ خاموشی سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے اس کے آگے بولنے کا انتظار کرتے رہے اور ساتھ ہی میری دزدیدہ نظروں نے رانا بشیر کے چہرے سے کچھ برہمی کے تاثرات اُبلتے محسوس کیے تھے۔ جیسے انہیں بیٹی کا بولنا ناگوار گزرا ہو۔ "سب سے پہلے تمیزالدین جرمنی گئے تھے اور اس کے بعد۔"

"ارے فری بیٹا! میں نے تو ایک اندازے کے تحت تمہیں بتایا تھا۔ اصل اور حتمی تاریخ اور اس خاندان کی ہجرت وغیرہ کے سلسلے میں تو ریکارڈ دیکھ کر ہی پتا چلے گا۔" رانا بشیر نے بیٹی کی بات کاٹ کر کہا اور پھر ہماری طرف متوجہ ہوکر بولا۔ "اندازوں اور مفروضوں کے بجائے میں مناسب سمجھوں گا کہ پہلے دفتر جاکر اس سلسلے میں ریکارڈ چیک کرلوں۔"

"بہت اچھی بات کہی آپ نے......" میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ فوراً اس موضوع کو سردست اِدھر ہی دفن کرنے کا فیصلہ کیا اور فرحانہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ برائے کرم ہمیں وہ دونوں ڈائریاں دے دیں۔ میں ذرا غور سے خود بھی پڑھنا چاہتا ہوں، شاید کوئی کلیو ہاتھ لگ جائے۔" میری بات پر فرحانہ نے جھجکتے ہوئے اپنے باپ کی طرف دیکھا تو وہ مجھ سے سرد لہجے میں بولا۔

"مسٹر نعمان! وہ ڈائریاں آپ کے سامنے آپ کو اور ایڈووکیٹ زنیرہ کو پڑھا دی گئی ہیں۔ اب اس میں بھلا پڑھنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟ یوں بھی وہ میری وائف کا پرسنل اسٹف ہے۔ وہ میں کسی غیر کو دینا پسند نہیں کرتا۔"

اس کی بات سن کر میرے سینے میں طیش کا ایک بگولا سا اٹھا تھا۔ اس کی شخصیت ابتدا ہی سے میرے لیے مشکوک رہی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ دن بہ دن اور زیادہ شک وشبے میں پڑتی جارہی تھی۔ شروع میں بس اس نے اتنا ہی تعاون کیا تھا مگر جیسے جیسے میری مستقل مزاجی اور ثابت قدمی اور ایک عزم کی پختگی کا رانا بشیر کو ادراک ہونے لگا تو وہ بیزار نظر آنے لگا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ میں وقت گزرنے کے ساتھ خود ہی اس "گنجلک" قصے سے بیزار ہوکر چپکا بیٹھ رہوں گا تو معاملہ از خود ہی ختم ہوجائے گا، یہی وجہ تھی اس کی اس روز ہمارے گھر آمد اور شرمندگی کا اظہار بھی منافقت سے کم نہ تھا، کیونکہ دونوں ڈائریاں اس کی بیٹی کے ہاتھ لگ چکی تھیں اور وہ انہیں غائب نہ کرسکا تھا تو یوں اپنی شرمساری ظاہر کرنے چلا آیا تھا، مقصد صرف اپنی بیٹی کی نظروں میں خود کو "بے گناہ" ثابت کرنا ہی تھا۔

میں نے پھر بھی اپنے مزاج کے مطابق ضبط سے کام لیتے ہوئے مگر اندر کا ابال لفظوں میں پروتے ہوئے رانا بشیر سے کہا۔ "میرے نزدیک خواتین کے پرسنل اسٹف میں زیر جامے ہوتے ہیں، میں وہ تو آپ سے نہیں مانگ رہا ہوں!"

"واٹ نان سینس......" رانا بشیر کو میرے کاٹ دار اور ذومعنی طنز نے بلبلا کر رکھ دیا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے؟ میں اپنی مرحومہ بیوی کے لیے ایسا گندہ مذاق بالکل پسند نہیں کرتا۔"

"مقتولہ بیوی!" میں نے اسے مزید زچ کرنے کے لیے تصحیح کی اور آگے بولا۔ "کمال ہے رانا صاحب! آپ اپنی مقتولہ بیوی کے بارے میں بقول آپ کے یہ گندہ مذاق پسند نہیں کرتے جو بہرحال کسی قسم کی گندگی میں نہیں شمار ہوتا ہے لیکن آپ کو اصل قاتل کے سراغ لگانے کی کوئی فکر نہیں ہے؟ آپ ڈائری کی بات کررہے ہیں جبکہ پولیس تو دورانِ تفتیش کسی بھی مقتول کی چھوڑی ہوئی ایک ذرا سی سطر تک کو بھی اہمیت دینے کو نظرانداز نہیں کرتی کہ اس نے کیا لکھا ہے، یہ تو دو عدد ضخیم ڈائریاں ہیں اور وہ بھی ایسی کہ اس میں کوئی ایسا مواد سرے سے شامل ہی نہیں جو کسی اور کو پڑھانے سے بیہودگی میں شمار ہوتا ہو۔ ہاں البتہ اس میں وہی مواد موجود ہے جو تفتیش کے دوران پولیس کو پوری مدد فراہم کرسکتا ہے۔"

میری بات پر رانا بشیر کا چہرہ غصہ اور طیش میں مزید سرخ ہوگیا مگر اس کے غصے میں مجھے ایک طرح کی جھلاہٹ اور بے بسی بھی محسوس ہورہی تھی۔ چلّا کر بولا۔ "مسٹر نعمان! میں بھاڑ میں جھونکتا ہوں ان دونوں ڈائریوں کو اور اس سارے معاملے کو بھی آپ کو اتنی جلد بازی ہورہی ہے تو خود ہی جاکر اپنے باپ کے اصل قاتل کو تلاش کرلیں۔"

میں خود بھی اس کی بات پر اندر سے بری طرح بھر گیا۔ فرحانہ بھی اس بدمزاج صورت حال پر پریشان اور متوحش سی ہوگئی تھی۔ اسی وقت ایڈووکیٹ زنیرہ رانا بشیر سے مخاطب ہوکر بولی۔

''رانا صاحب! آپ کو اس طرح چلاّ کر بولنا زیب نہیں دیتا۔ آپ ماشاءاللہ سے ایک میچورڈ پرسنالٹی کے مالک ہیں۔ پھر یہ ایک گمبھیر معاملہ ہے۔ میرا نہیں خیال کہ یہ آپ کے لیے کسی ایسے غصے کا سبب بنتا ہو۔ خیر، آپ بتا دیں کہ پھر آپ کیا چاہتے ہیں اور کس انداز میں اس معاملے کو آگے لے جایا جائے؟''

میرا خیال تھا کہ زنیرہ نے بڑی چالاکی سے یا تو رانا بشیر کے اندر کا چور ظاہر کرنے کے لیے گیند کو دانستہ اس کے کورٹ میں پھینکی تھی یا پھر وہ سردست اس بدمزگی کو ختم کر کے بعد میں کوئی اور مربوط لائحہ عمل طے کرنا چاہتی تھی۔ میں نے بھی یہی کچھ سوچتے ہوئے اپنے اندر کے ابال کو رفتہ رفتہ مصلحت کوشی کی تھپکیاں دیتے ہوئے ''کول'' کرنا چاہا تھا۔

''اس کے بارے میں اب پھر بھی بات ہوگی، اس وقت میں اب مزید اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا، میرا موڈ سخت خراب ہوگیا ہے لیکن اگر آئندہ بھی ایسا ہوا۔ یعنی مسٹر نعمان نے جلد بازی یا کسی قسم کی بیہودگی کا مظاہرہ کیا تو میں تنگ آ کر اس پورے معاملے کو ہی یہیں پر دفن کر دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے جواب میں بھر کر کچھ کہنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میرے ساتھ بیٹھی زنیرہ نے مجھے اشارے سے منع کر دیا۔

''آپ پلیز! اس وقت تشریف لے جائیں۔ پاپا غصے میں آ گئے ہیں، میں انہیں بعد میں خود ہی سمجھا دوں گی۔'' فرحانہ نے فوراً ہی معذرت خواہانہ انداز میں ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میرے جی میں آئی کہ میں اس سے سدو بھائی کی دی ہوئی معلومات کے مطابق اس سے چند سوال پوچھ لوں لیکن یہ سوچ کر ابھی یہ قبل از وقت ہوگا، پہلے دیکھا جائے کہ سدو بھائی نئی رپورٹ کیا دیتا ہے۔ تاہم میں اور زنیرہ اپنی جگہ سے رخصت ہونے کے لیے کھڑے ہوئے تو فرحانہ ایک بار پھر معذرت خواہانہ انداز میں ہم سے بولی۔

''پاپا کے رویئے کی میں ایک بار پھر آپ سے معافی چاہتی ہوں، وہ درحقیقت آج کل واقعی بہت پریشان ہیں۔ شاید کوئی کاروباری معاملہ ہے۔''

''پریشانی کی وجہ صرف کاروباری ہی نہیں اور بھی ہوسکتی ہے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں قدرے تلخی سے کہا۔ ''لیکن آپ انہیں سمجھا دیجیے گا کہ اگر انہوں نے اسی طرح اپنا عدم تعاون کا رویہ برقرار رکھا تو مجھے مجبوراً کسی ذمے دار پولیس افسر سے رجوع کرنا پڑے گا۔'' فرحانہ کو فکرمند سا پا کر میں نے اس کی طرف مڑ کر تنبیہہ والے انداز میں کہا۔ ''وہ دونوں ڈائریاں سنبھالے رکھنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ وہ اگر کھو گئیں تو آپ جانتی ہیں کہ میرا سب سے پہلا شبہ کس پر جائے گا اور پھر میرے پاس آخری آپشن پولیس سے مدد لینے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔''

رانا بشیر کی رہائش گاہ سے واپسی میں زنیرہ اور میں کار میں روانہ ہوئے تو راستے ہی میں، میں نے اس کے ساتھ سدو بھائی کی معلومات شیئر کر ڈالیں اور یہ بھی بتایا کہ میں نے اسے رانا بشیر کی مستقل نگرانی پر مامور کر دیا۔

''یہ تم نے بہت اچھا کیا، نومی!'' زنیرہ فوراً بولی۔

کار میں ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ میرے برابر والی سیٹ پر براجمان تھی۔ ہم تھوڑی دیر اسی مسئلے کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران میرے سیل فون پر ایک ایس ایم ایس موصول ہونے کی بپ ابھری۔ میں نے اسے نظرانداز کر دیا۔

زنیرہ کی رہائش گاہ نیوٹاؤن کی طرف تھی جس کی حدود میں ہم داخل ہو چکے تھے۔ اس کے ذرا ہی دیر بعد میں نے زنیرہ کو اس کے مکان کے دروازے پر اتارا اور جب وہ مجھے الوداع کے انداز میں اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوگئی تو میں نے کار ریورس کی اور اسٹیئرنگ گھما کر جیسے ہی ایک موڑ کاٹا تو اچانک ہی میری نگاہ ایک یلو کیب پر پڑی اور اسے عام سی ٹیکسی سمجھ کر مجھے اس پر کوئی شبہ نہ ہوسکا اور میں نے دائیں جانب ایک اور موڑ کاٹا، کیونکہ یہ راستہ تھوڑی دور جا کر مین روڈ سے متصل ہوتا تھا۔ پھر بھی غیرارادی طور پر میری دوسری بار نگاہ یلو کیب پر پڑی جو ایک خالی پلاٹ کے پاس ہی دیوار سے لگی کھڑی تھی اور اس میں ڈرائیور موجود تھا۔ میں نے مذکورہ موڑ کاٹا تو پتا نہیں کیوں آخری بار میں نے ونڈ اسکرین پر لگے بیک ویو مرر پر نظر ڈالی تو چونکا۔ ٹیکسی میں ڈرائیور کے ساتھ مجھے ایک اور آدمی کی بھی جھلک دکھائی دی۔ مجھے حیرت تو ہوئی تھی کہ اتنی سی دیر میں اگر کوئی شخص ٹیکسی کی طرف بڑھتا اور سوار ہوتا تو مجھے پہلے ہی نظر آ جاتا تو کیا دوسرے شخص نے خود کو دانستہ نیچے جھکا رکھا تھا اور پھر میری کار کو مڑتے دیکھ کر وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا تھا۔

میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا۔ زنیرہ کے حادثے والے روز سے تو میں اس کے لیے زیادہ ہی محتاط ہوگیا تھا اور وہ جب بھی میرے ساتھ ہوتی میں بہت محتاط ہو کر اورگرد

وپیش پر نگاہ ڈالے ہوئے ہی رکھتا تھا۔ یلو کیب سے میں اس لیے شاید دھوکا کھا گیا تھا کہ اسے میں محض عام سی ٹیکسی سمجھا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میری بیک ویو پر نگاہ پڑ گئی اور اس میں پہلے سے ہی موجود دوسرے شخص کو مشکوک انداز میں ابھرتے ہوئے میں نے دیکھ لیا۔

میں نے یک دم بریک پر اپنا پاؤں رکھ دیا لیکن کار کو بریک اس طرح لگائے کہ اس کے ٹائر "اسکڈ" نہ کریں تاکہ ان کی چرچراہٹ سے وہ مشکوک شخص چوکنا نہ ہو جائے۔

کار ایک طرف روکنے کے بعد میں نیچے اتر آیا۔ شام اپنی زلفیں سمیٹ رہی تھی اور رات کی تیاری میں اس پر شب کا آنچل سرسرانے لگا تھا۔ تاہم رات ابھی اتنی گہری نہیں ہوئی تھی کہ شب گزیدگی ماحول پر اثر پذیر ہونے لگتی۔ لوگ باگ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے، میں بھی انہی میں شامل ہو گیا اور کسی بھی قسم کی عجلت کا مظاہرہ کیے بغیر مڑ گشت کے انداز میں واپسی کی طرف مڑنے کے بجائے ایک ذیلی گلی میں داخل ہو گیا جو مکانوں اور بنگلوں کا عقبی حصہ تھا۔

یہ تنگ گلی تھی اور یہاں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر رکھے نظر آرہے تھے۔ یہ گلی اسی راہ پر ختم ہوتی تھی جدھر دائیں ہاتھ پر سامنے کے رخ پر زنیرہ کا مکان تھا۔ یہاں..... اکثر آنے جانے کے باعث یہاں کی میں ایک ایک گلی اور راستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

میں جلد ہی گلی کے اختتام پر پہنچ گیا اور تھوڑا سا سر ابھار کر دیکھا۔ پیلی ٹیکسی اپنی جگہ جوں کی توں کھڑی تھی اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ابھی تک وہی شخص بیٹھا تھا جسے میں... ڈرائیور کی حیثیت سے دیکھ چکا تھا جبکہ دوسرا مشکوک آدمی ٹیکسی سے اتر چکا تھا اور وہ زنیرہ ہی کی رہائش گاہ کے باہر عین دروازے پر کھڑا تھا۔

وہ دروازے کے اس قدر قریب کھڑا تھا جیسے اس کا ارادہ ہو، دروازہ کھلے اور وہ غڑاپ سے اندر داخل ہو جائے۔

یکلخت میرے پورے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ میری نظریں بہ غور اسی آدمی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ درمیانے قدبت کا مگر صحت مند شخص تھا۔ اس نے دھاری دار ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پتلون بھی اس کی لفافہ ٹائپ تھی، یعنی خاصی کھلی ڈلی۔

ایک ہاتھ اس کا پتلون کی جیب میں تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے شاید کال بیل بجادی تھی اور دروازہ کھلنے کا منتظر تھا۔

"یہ کوئی عام ملاقاتی بھی ہو سکتا تھا؟" ذہن میں ابھرنے والے اپنے اس لغو خیال کو میں نے یکسر جھٹک دیا۔ کیونکہ اس کے مشکوک انداز پر میں پہلے ہی کھٹک چکا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میں اس کے عقب میں جاتا تو ٹیکسی میں بیٹھا ہوا ڈرائیور نما اس کا ساتھی اسے خبردار کر سکتا تھا۔

"کیا کرنا چاہیے مجھے؟" میں شش وپنج میں مبتلا ہو گیا۔

اسی وقت شاید اندر سے کسی نے کچھ پوچھا تھا اور وہ شخص منتظر انداز میں اپنا قدرے جھکا ہوا سر اب اٹھا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ میں یہی دعا کر رہا تھا کہ خالہ نجو اس آدمی کی شناخت پوچھے بغیر دروازہ نہ کھولے اور زنیرہ کو مطلع کر دے تو مجھے بھی یہاں سے سیل فون پر زنیرہ کو اس متوقع خطرے سے آگاہ کرنے کا موقع مل سکے مگر اگلے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ دروازہ ذرا سا کھلا تھا اور کسی نے دیکھا، یہی وہ وقت تھا جب وہ مشکوک آدمی پل کے پل اپنے گردوپیش میں ایک نگاہ ڈالتے ہی جارحانہ انداز میں اندر گھستا چلا گیا تھا۔ میرا دل جیسے تیزی کے ساتھ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ کنپٹیوں پر جیسے حشرات العرض رینگنے لگے۔ میرے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں ٹیکسی ڈرائیور کی نظروں کے سامنے آکر دروازے کا رخ کروں یہی میں نے کیا اور تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف دوڑا۔

اس راستے میں لوگوں کی آمد ورفت کم کم ہی نظر آرہی تھی۔

مجھے دیکھ کر ڈرائیور اپنی سیٹ پر یوں ایک دم اچھلا تھا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

میں اسے نظرانداز کرتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایکا ایکی میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں نے ٹیکسی کے انجن کی غراہٹ سنی۔ اس کا انجن شاید پہلے ہی سے جاگتا ہوا رکھا گیا تھا اور ڈرائیور نے ریس دی تھی...... کیوں؟ اس کا ادراک بھی مجھے فوراً ہی ہوا تھا کیونکہ اسی لمحہ میں نے دیکھا ٹیکسی کسی طوفانی بگولے کی طرح حرکت میں آئی تھی اور گولی کی طرح میری جانب بڑھی۔ ایک لمحہ کو تو میرے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کروں؟ لیکن جیسے ہی ٹیکسی اندھا دھند دوڑتی ہوئی میرے سر پہ پہنچی میں اپنی جگہ سے پوری قوت کے ساتھ اچھلا۔

ٹیکسی ایک خیبر کار تھی جس کا بونٹ آگے سے قدرے سلوپی اور نیچے ہوتا ہے، ورنہ میری چھلانگ اتنی زیادہ اونچی نہیں ہو سکی تھی۔ تاہم میں فوری طور پر اس کی طوفانی ٹکر سے بچ تو گیا تھا اور بونٹ پر میرے پاؤں پڑے تھے۔ خود کو بچانے کے لیے میری اس حرکت کا شمار غیر ارادی بھی ہو سکتا تھا۔

کار کے بونٹ پر پاؤں پڑے مگر میرے جسم کا توازن

قائم نہ رکھ سکے اور نہ ہی ٹیکسی رکی تھی، نتیجے میں یہ ہوا کہ میں بونٹ پر آتے ہی اس کی ونڈ اسکرین سے ٹکرایا اور میرے ڈھتے ہوئے وجود کو ایک جھٹکا لگا، شکر تھا کہ میں سائڈ میں سڑک پر گرا اور کار تلے کچلنے سے محفوظ رہا تھا، کچھ خراشیں ضرور آئی تھیں مگر بڑی چوٹ اور بڑے حادثے سے تو کافی حد تک بچ گیا تھا۔

میرے پاس یوں بھی اسلحے نام کی کوئی شے کبھی نہیں رہی تھی۔ کار آگے نکل گئی مگر تھوڑی دور جا کے اس کے ٹائروں کی چرچراہٹ ابھری تھی۔ میں گرنے کے بعد سنبھلا۔ نظریں میری ٹیکسی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ رک کر اسی تیزی کے ساتھ پھر ریورس ہوئی جب تک میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کچھ بحال ہوگئی تھی۔ میں نے گھر کے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا مگر وہ اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔ وہ مشکوک شخص اندر جانے اب تک کیا گل کھلا چکا تھا مجھے اس کا صرف ہولناک اندازہ ہی ہو سکتا تھا جبکہ باہر موجود اس کے ٹیکسی ڈرائیور ساتھی نے مجھے کوئی ایسا موقع دیئے بغیر اپنے ساتھ ''مصروف'' کر دیا تھا۔ دروازے پر ہاتھ مارنے کا ایک مقصد میرا یہ بھی تھا کہ اندر درانا وار گھسنے والا وہ شخص بھی بدک جائے کہ کوئی باہر تھا۔

دشمن ..... عام کار کی بجائے ٹیکسی کو بروئے کار لائے تھے تا کہ کسی قسم کا شک پیدا نہ ہو اور ہوا بھی ایسا ہی تھا، ابتدا میں، زنیرہ کی رہائش گاہ کے قریب کھڑی ایک ٹیکسی کو دیکھ کر میں یہی سمجھا تھا کہ کوئی سواری وغیرہ اٹھانا ہوگی اور میں دھوکا بھی کھا گیا تھا، یہ تو غیر ارادی طور پر میری بیک ویو پر نگاہ پڑ گئی تھی اور میں نے ڈرائیور کے ساتھ ایک اور شخص کو اچانک ابھرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ میری کار آگے نکل چکی تھی۔

بہر طور، ٹیکسی ڈرائیور اپنے ساتھی کی راہ ہموار کرنے میں بڑی تندہی کے ساتھ کوشاں نظر آرہا تھا۔ اس نے ٹیکسی ریورس کی اور ایک بار پھر مجھے ٹکر مارنے کی کوشش چاہی۔ یہ اس کی دم توڑتی آخری حرکت کہی جا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ زیادہ دیر عام پبلک پلیس میں یہ نیم فلمی ایکشن افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

''اے...... ے...... ے، کون ہو تم ...... خبردار!'' میں دانستہ حلق کے بل زور سے چلایا۔ ریورس ہوتی ٹیکسی کا یہ وار بھی خالی گیا تو وہی ہوا جس کا مجھے اندازہ ہو چلا تھا۔ یعنی ٹیکسی ڈرائیور کا فرار کیونکہ یہ وار بھی خالی جاتے ہی کار رک کر آگے بڑھی ایک موڑ کاٹ کر غائب ہوگئی۔ زنیرہ کو خطرے میں گھرا ہوا محسوس کر کے میں غیظ میں دوڑتا ہوا آیا اور پوری قوت سے اپنے کاندھے کی ٹکر دروازے کو رسید کر دی۔ میں کچھ زیادہ بھاری بھر کم ڈیل ڈول کا مالک نہ تھا مگر اتنا گیا گزرا بھی نہ تھا، جسم ذرا چھریرا مگر دراز قامت تو تھا لیکن دروازہ ہلا تھا کھلا نہیں۔ مقصد میرا بھی یہی تھا کہ اندر داخل ہونے والا وہ مشکوک آدمی پریشانی کے ساتھ بوکھلا جائے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے ساتھی نے اسے سیل فون کے ذریعے رابطہ کر کے خطرے سے آگاہ کر دیا ہو۔

اسی وقت میں نے برابر والے مکان کا دروازہ کھلتے دیکھا۔ ایک پختہ العمر شخص برآمد ہوا تھا۔ وہ شاید اس ساری کھڑبڑاہٹ سن کر ہی باہر نکلا تھا۔

''ارے بھئی کیا ہو رہا ہے یہاں؟ یہ شور کیسا ہے؟'' وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے شک کے سائے لرزاں تھے۔

''جناب! یہ میری ایک عزیزہ ایڈووکیٹ زنیرہ کا گھر ہے۔ اندر ایک چور کو گھستے دیکھا ہے میں نے آپ پلیز مجھے اپنے گھر سے ان کی چھت پر جانے دیں، ان کی زندگی سخت خطرے......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ پختہ العمر شخص نے کھڑ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے الٹے پاؤں دوبارہ اپنے گھر کے دروازے سے اندر گھسنے کی کوشش چاہی تھی اور میں سمجھ چکا تھا کہ وہ بھی عام انسانوں کی طرح کسی پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانا پسند کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے سر پر اس وقت زنیرہ کو خطرے سے بچانے کی دھن سوار تھی۔

چنانچہ جیسے ہی میں نے اس آدمی کو اندر فرار ہوتے دیکھا تو اس کی جانب لپکا۔ وہ بے چارہ مزید خوف زدہ ہوگیا، تب تک میں کسی بھی قسم کے نتائج کی پرواہ کیے بغیر اسے اپنے ہی گھر کے اندر دھکیلتا ہوا لے گیا اور میری متلاشی نظروں نے فوراً چھت کی جانب جاتی ہوئی سیڑھیوں کو دیکھا اور اسی طرف کو میں دوڑا۔

اس کی چھت سے زنیرہ کے مکان کی چھت ملی ہوئی تھی اور دونوں گھروں کی دیواروں کے بیچ خلا اتنا زیادہ کشادہ نہ تھا کہ میں ان کی منڈیروں کو چھلانگ لگا کر پار نہ کر سکتا۔

زنیرہ کے مکان کی چھت پر پاؤں ٹکتے ہی میرے پورے وجود میں جیسے بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ میں نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف لپکا۔

ٹھیک اسی وقت نیچے اندر کہیں گولی چلنے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی نسوانی چیخ ابھری، میرا دل دھک سے رہ گیا۔

(جاری ہے)

(منشی عزیز مے لڈن کا جواب)

عباس علی سید.........لاہور

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

ریحان علی.........اسلام آباد

یار نہیں غم خوار نہیں ہمدرد ظفر اب کوئی نہیں
کنجِ غم میں آپ ہی کیسے دل کو مرے بہلائے کون

(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)

آفتاب احمد نصیر اشرفی.........کراچی

یہ طلوعِ روزِ ملال ہے سو گلہ بھی کس سے کریں گے ہم
کوئی دل ربا کوئی دل شکن کوئی دل فگار کہاں رہا

(اختر علی لاہور کا جواب)

ڈاکٹر عبدالغنی شکیل.........ملتان

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

ناعمہ تحریم.........کراچی

کچھ اس ادا سے میرے ساتھ بے وفائی کر
کہ تیرے بعد مجھے کوئی بے وفا نہ لگے

شبیر شاہ.........کشمور

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

(مہوش صدیقی بھمبر کشمیر کا جواب)

عبدالجبار رومی.........لاہور

وہ انسان فقط تبھی لگتے ہو
جو بچی سوچ کا حامل ہے

(ہادیہ ایمان، ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

عشنا عباس.........جہلم

اندھیری راتوں میں اُمید کے جلا کے چراغ
یقیں کی روشنی آنکھوں میں وہ سجاتے ہیں

نیلوفر شاہین.........اسلام آباد

اب آپ ملتفت ہیں تو دنیا ہے غمگسار
غم کیا ملا کہ آپ ملے اک جہاں ملا

نزاہت افشاں.........فتح جنگ

اک ذرا سی بات پہ دامن چھڑا لیا ہم سے
تمام عمر کی وابستگی کو بھول گئے

نزہت پروین.........کراچی

یہ ستارہ جو گرا ٹوٹ کے اونچائی سے
کسی ذرے کی ہنسی اس نے اڑائی ہو گی

(ادریس مسیح کراچی کا جواب)

عبدالحکیم ثمر.........کراچی

یہی چاند تھا اس کو گواہ ٹھہرا کر
ذرا سا یاد کرو تم نے کیا کہا تھا مجھے

(رفیق احمد ناز ڈی جی خان کا جواب)

احمد یار خان.........پشاور

نہ جب کوئی تمہارے پاس ہو گا
بہت پچھتاؤ گے میری کمی سے

(عبدالجبار رومی انصاری لاہور کا جواب)

نوازش علی.........لاہور

ہم تجھے منزل سمجھ کر آئے تھے
تو ہزاروں راستے میں بٹ گیا

انوار حسین.........سرگودھا

ہزار شاہد رعنا ملے مگر ہم کو
اسی ستارہ جبیں کی عبادتیں کرنی

انوشہ نوید.........گجرات

ہے بڑھاپے کے لیے تو سرد سا اک سلسلہ
اور جوانی کے لیے ہے آگ برساتی گھٹا

اقراء بانو ناگوری.........کراچی

ہم وفا کر کے رکھتے ہیں امید وفاؤں کی
دوستی میں یہ سوداگری بھی جرم ہے

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

نگار فاروقی.........راولپنڈی
یاد آتی ہیں وہ شامیں جب رسم و راہ کسی سے تھی
ہم بے چین سے ہونے لگتے جوں جوں یہ دن ڈھلتا تھا

عارفہ جہانگیر.........پاک پتن
یہ تسلیاں مجھے بعد میں رلائیں گی
مجھ کو آسرا نہ دو آج میں اداس ہوں

رفیق احمد ناز.........ڈیرہ غازی خان
یہ کھلا کھلا سا چہرہ یہ حسین مسکراہٹ
تیری خم بہ خم زلفیں میری زیست کا سہارا

(ناعمہ تحریم کراچی کا جواب)

انیس ملکانی.........حیدر آباد
حیات و موت کی آئینہ دار ہے آتش
یہی جلی ہوئی سگریٹ بجھی ہوئی سگریٹ

نرگس فاروق.........کوٹ دادن
حسیں اور بھی ہیں جواں اور بھی ہیں
غزالانِ ابرو کہاں اور بھی ہیں

(انیس پراچہ کراچی کا جواب)

عبدالستار.........ساہیوال
رہبروں کی بھول تھی یا رہبری کا مدعا
قافلوں کو منزلوں کے پاس بھٹکاتے رہے

(ہما اختر مظفر گڑھ کا جواب)

مرحوم سعید احمد چاند کا آخری شعر
ایک لمحے کو گوارہ نہیں فرقت جن کو
کتنی جلدی انسان انہیں بھلا دیتا ہے

(اظہر علی کراچی کا جواب)

فلک بنت ندیم.........حیدر آباد
رنج و غم درد و الم پاس تمنا حسرت
اک تری یاد کے ہونے سے ہے کیا کیا دل میں

(سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)

ابوبکر قریشی.........لاہور
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت [illegible]

عنایت حسین قزلباش.........ملتان
آجا آجا ذرا صورت تو دکھا جا اپنی
نخلِ امید کے سب پات ہیں جھڑنے والے

نور عین کوثر.........دینہ جہلم
اتر کے عرش سے چلتے ہی جا رہے ہیں مدام
کہ دوسری کوئی حالت نہیں بجائے سحر

نوازش احمد.........کوٹ ادو
آہٹ آہٹ دستک دستک لمحہ لمحہ ہلچل ہلچل
چلمن چلمن شعلہ شعلہ نظریں نظریں شبنم شبنم

(رضا احمد اعوان دریا خان کا جواب)

نوشین طلعت.........فیصل آباد
وہ کیسا شخص ہے اس کی نگاہیں بات کرتی ہیں
میں اپنے ہونٹ بھی کھولوں مجھے قدرت نہیں ملتی

احمد جاوید.........ڈیرہ غازی خان
وہ جس کے نقش قدم سے چراغ جلتے تھے
جلے چراغ تو خود بن گیا دھواں وہ شخص

اسد عباس.........شیخوپورہ
اس یاد کے تپتے شعلوں سے پھر دل کی تڑپ کو بہلائیں
اس یاد کے ظالم خنجر سے زخموں کی کہانی دہرائیں

سید امتیاز حسین بخاری.........سرگودھا
وہ کون سی شے ہے جو بھلائی نہیں جاتی
اک تیرا تصور ہے بھلایا نہیں جاتا

(شگفتہ یاسمین کراچی کا جواب)

اختر شاہ عارف.........جہلم
اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

نیاز ملکانی.........سکھر
کیل پر ٹوپی کے بدلے ٹائیاں ٹنگ جائیں گی
باپ کے کمرے میں جب بیٹے کا نمبر آئے گا

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر دیتے ہیں [illegible]

علمی آزمائش۔ 142

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 نومبر 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1928ء کو ہانگ کانگ میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد وطن لوٹ آئے اور کھاریاں گجرات میں رہائش اختیار کی۔ 1948ء میں پاک فوج میں شامل ہوئے اور 1950ء میں پنجاب رجمنٹ میں کیمشنڈ پائی۔

علمی آزمائش 140 کا جواب

مرزا ادیب کا نام تو مرزا دلاور تھا لیکن قلمی نام سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ پیدائش لاہور کی ہے۔ 4 اپریل 1914ء میں پیدا ہوئے اور 31 جولائی 1999ء کو اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گئے۔

انعام یافتگان

1۔ نرگس قائم خانی، کراچی 2۔ نصیر اختر، ساہیوال 3۔ امتیاز شیخ، چنیوٹ

4۔ احسن علی، لاہور 5۔ زاہد خان، پشاور حیات آباد

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نسرین عزیز، پروین بیگم، عبدالحکیم ثمر، رضیہ مسعود، خادم حسین، مقدس جہاں، شمیم احمد، سائرہ بلقیس، نواب احمد، امتیاز علی سید، ریحان جعفری، شاہد علی شاہد، فاطمہ امتیاز، میمونہ صدیقی، علی اصغر، آصف احمد، رضا علی عابدی، انعم توقیر، کمال حسن، نوشابہ ادریس، گلزار جہاں، نعیم اختر، محسن علی، نعمان حسن، عمران الحق، افسر خان، تنویر شیروانی، شاہینہ۔ مہتاب خان، کلثوم عثمانی، نوخیز خان، عظیم اختر، جنید احمد، ملک ممتاز، شاہد علی، عاطف حسن، ظہیر صدیقی، انیلا عثمان، رشید شیال، زرین فاطمہ، قدرت خان، نسیم نیازی، شہباز اکرم، مظہر۔ حیدرآباد سے انیقہ صدف، ماہ رخ، بلال اختر، ماہین علی، حریم ظفر، ملائکہ ادریس، اشفاق حسن، شاہین علی، داؤد پراچہ، لبنیٰ علی، اختر رانا، جاوید اختر، اطہر علی، توفیق بچہ، سعدیہ نورالعین، ارم، شاہینہ، تنویر عباس، ظفر

منی، سحر علی، عارفہ عباس، عاصم علی، کمال مظفر، ظفر صدیقی، مدثر حسین، عین الحق۔ اسلام آباد سے فرمان حسن، خالد عثمانی، ماہ جبین، قاسمہ، عزیز الحق، محمد ذیشان، نشاط بانو، نعیم اختر، نیلوفر شاہین، غضنفر عباس مرزا، انوار یوسف زئی۔ راولپنڈی سے طیبہ نوید، ...ئر، سخاوت علی خان، طارق ظفر، مسعود اظہر، افتخار حسن خان، حضور خان، تقی عباس تقی، توصیف حسین، معین انور، کاظم زیدی، عتیق الرحمن، ذکی سید، علی قادری، نوید حسن، سلیم اختر، نوید احسن، نگریز خان، نوشاد صدیقی، محمد یامین۔ واہ کینٹ سے محمد فیض، یاسین احمد، ابرار احمد، عتیق احمد، نشاط فاطمہ۔ ملتان سے سرفراز محمد مغل، ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل، محمد انوار الحسن، تحسین اختر، نیاز گیلانی، وقار الحسن، عنایت اللہ خان، محمد یحییٰ معین، فرحین گل، عباس علی سید، نوازش علی نوازش، کائنات اختر، عباس مہکری، نعمت گل، سید شاہ علی، رزمی، مظہر عباس، امتیاز کھوسو، انوار مجتبیٰ، مصطفی ہمدانی، قیصر حسین زیدی، اصغر ندیم، ممتاز گل، سحرش، اکبر علی زیدی، نواز گل، فرحین فاطمہ، انیس علی سید، عزیز الدین، کلب اصغر کاظمی، نیہا رضوی، رحمن گل، خان بابا، بشیر فاروقی، مولانا بخش چانڈیو۔ لاہور سے حنیف ادیب، مسرت اسلم، ڈوگر اسلم، فہیم الدین، یاسمین بانو، صبیحہ شاہ، گل نوخیز، رضا عباس، اقبال خان، اصغر بٹ، عبدالخالق، سید محمد رضا کاظمی، ممنون الحسن، کاظم حسین، فہد کاظمی، مصباح الرضا، نوید اختر، علی نواز کارلی، آل پنجتن نقوی، نواز کبیر، فرحت فاطمہ، صابر علی خان، تاسیر احسن۔ بہاولپور سے مہناز اکرم ملک۔ ایاز امام ملک، کلیم بخاری، علی علی اوسط زیدی، ہارون محمد، توصیف خان، ملک اختر عباس، الیاس حسن، عباس حیدر، نبیل خان، زاہد علی، طہٰ حسن، الیاس اختر بٹ، صدیق حسن صدیقی، ظفر احمد ظفر۔ پشاور سے سردار سوہن سنگھ، ارباب محمد، فتح الحق، زریاب اچکزئی، نادر خان، امیر حسن، ساجد فرحت، نادر حسن زئی، باقر رضی طوری بنگش، ناہید سلطانہ، انور حسن خان، انعم ممتاز، ذیشان فرحت اللہ، داروغہ خان۔ ساہیوال سے توصیف خان، حسن اختر، کمال الدین، ضیاء الاسلام۔ میرپور سے اے کے کاظم علی بھٹو۔ قصور سے صدیق بھٹی، اشرف بٹ، عبدالخالق، نیاز حسین سید۔ خان بیلہ سے عنایت علی، یاسین فراز۔ سید محمد عرفان جعفری، شگفتہ، مشتاق، حبیب الرحمن عبدالرشید۔ سرگودھا سے اکبر خان، مصطفی کاشمیری، اکبر خان، ممتاز مصطفی، اشرف علی، نصیر الحسن، بابر علی، انتظام الحسن، فہد علی سید، حسن شاہ، تاثیر الحسن سید، عظمیٰ اکمل ٹوانہ، علی رئیسانی۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، بابر قیوم۔ خانیوال سے سید ابشام اشرف، ندیم اللہ اچکزئی، فہیم قیصر، احمد انصاری، فہمیدہ سلطان، ناصر علی، زریاب خان، نزہت شاہ، محمد احتشام، نایاب علی، بابر خان، اصغر حسن انصاری، رؤف صدیقی، سرفراز حسن، فصیح الدین، انیس ارشد، ماہ نور انصاری، نعیم حسن۔ کوہاٹ سے فدا حسین طوری، نعمت علی شاہ، نظیر نیازی۔ شیخوپورہ سے ثریا فاطمہ، عرفان قاسمی، ہدایت شاہ، احمد لغاری، عباس فدا حسین۔ سکھر سے نجم الدین ثاقب، راحیل رحیم، اقبال انصاری۔ گڈو بیراج، کشمور سے شبیر شاہ۔ بورے والا سے رانا محمد شاہد۔ بھکر سے محمد عارف قریشی۔ ڈیرہ غازی خان سے رفیق احمد ناز۔ میرپور خاص سے مرزا طاہر الدین، مظفر گڑھ سے ڈاکٹر نادیہ اظہر۔ گھوٹکی سے مقبول احمد خان ٹیچر۔ ملک وال سے سیف اللہ۔ پاک پتن سے علی محمد۔ زہیب احمد، نسیم احمد، منظر محمد ریحان، خادم حسین، ناعمہ تحریم، محمد برہان علی، سید عزیز الدین، ندیم افضل، ارشاد حسین، ناصر حسین ناصر، مخمور رند، زہیب کمال، انیس بھٹائی، کاشف اختر، آغا قزلباش، نوشین کاظمی، عباس خان، منظر علی خان، آغا ظہیر، مرزا امداد حسین، قاسم جان، زنوبیہ خان، فرحت فاطمہ، عاقل حسین، کلیم اللہ حسن زئی، عطا محمد، زہیب خان، کاشان قریشی، نعمان قریشی، فرحت ندیم، یاسین جوکھیو، شاہد اسلام، شاہین ربانی، مرزا اختر بیگ، محمد سلیم، نادر نیازی، غیاث احمد، قیام احمد، احمد علی، فیضان اختر، ارشد علی۔ حیدرآباد سے تفسیر حسین، ثناء اللہ، اقبال جاوید، توقیر حسن زیدی، نوشین فاطمہ، حیات فاطمہ، رخسانہ حیات، نرگس علی سید، مریم کاشف۔ خانیوال سے سید حسان اسلم مشہدی۔ سکھر سے محمد اسلام بھٹو، عماد حسن، عباس علی، منور سلیم، ناصرہ جاہ، شفقت خاقان ٹالپر، حبیب الرحمن، کریم خان۔ شکارپور ذیشان اکبر، درخشاں اقبال۔ آصفہ ہوتی، شگفتہ تحریم۔ میرپور خاص سے محمد فرقان، ضیا احمد، ناصر حسین، افتخار حسین، نوشین مَن۔ بھکر سے خوش بخت، نیاز ملتانی، فدا محمد، صاحب شاہ، نگار قریشی۔ ڈی آئی خان سے قمر الحسن، نازش سلطان، محمد وحید خان، نوازش علی۔ ڈی جی خان سے عبدالرحمن، اشفاق احمد، آفتاب علی نیازی۔ ملتان سے آصف علی قریشی، انیس امام، تبسم فرقان، اذان قریشی، سندس احمد، عرفانہ امام، ناصر اسلم، نصیر حسن، جمیل خان، انیس اقبال، نظیر حسین گیلانی، سندس احمد، صباحت عابدی، رانا کلیم، نسیم ضیائی، جاوید الحسن، مہتاب مرزا،

ممالک غیر سے اشتیاق قمر، العین (یو اے ای)۔ زرغون خان، صاحب جان، اسلم قریشی (دبئی)۔ فہیم احمد (ٹورنٹو)، زیارت فاطمہ (جرمنی)، سہیل احمد (مانچسٹر)، علی ناز (بیڈفورڈ)، کاشف اقبال کاشف (ٹوکیو، جاپان)۔

محترم مدیر
السلام علیکم
یہ سچ بیانی غور سے پڑھیں کیونکہ زیب کی یہ داستان ہماری بے حسی کو عیاں کر رہی ہے۔ گو کہ قیام پاکستان کو 70 سال ہو چکے ہیں پھر بھی زخم کلی طور پر مندمل نہیں ہو پائے ہیں۔ نہ جانے کتنی زیب آج بھی مشرقی پنجاب کے مختلف علاقوں میں سسکتی زندگی گزار رہی ہیں۔

زویا اعجاز
(لاہور)

مزار میں آج معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔

گلابی پھولدار شلوار قمیص میں ملبوس ایک عورت پژمردگی سے چلتی ہوئی مرکزی دروازے تک پہنچی اور ویران نظروں سے زائرین کی نقل و حرکت دیکھنے لگی۔ صحن میں موجود پیڑ بھی اسے اپنی مانند تنہا اور افسردہ محسوس ہو رہے تھے۔ اپنے دل میں اٹھتی وحشت پر قابو پاتے ہوئے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی صحن کے مغربی کونے میں نصب نل کے پاس پہنچی اور وہاں موجود چوکی پر بیٹھ گئی۔

چند لمحے یونہی خالی الذہنی میں بیت گئے۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے دائیں ہاتھ میں موجود مخصوص 'کڑا' اتار کے ایک جانب رکھا اور لرزتے وجود سے وضو کرنے لگی۔ آس پاس چند خواتین اس کڑے اور وضو کے عجیب و غریب ملاپ پر بہت حیران تھیں لیکن وہ ان کی اس کیفیت سے دانستہ بے نیازی ظاہر کرتی سر جھکائے صحن کے شمالی جانب کمرے میں چلی گئی۔

اس کمرے میں صاف ستھری دریاں اور چٹائیاں موجود تھیں۔ وہ قدموں کی لرزش پر قابو پاتے ایک چٹائی پر کھڑی ہوئی اور تکبیر کہتے ہوئے نماز کے لیے ہاتھ بلند کر دیئے۔ اس کا وجود اشکوں اور ہچکیوں کی زد میں تھا۔ نماز عصر کے مختصر ارکان کی ادائیگی بھی نصف گھنٹا پر محیط ہو گئی۔ نماز مکمل ہوئی تو وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی اٹھی اور ایک جانب طاق میں رکھے قرآن پاک کو تھام کر دلسوزی سے تلاوت کرنے لگی۔ آنکھوں کی نمی بار بار الفاظ پر دھندلاہٹ طاری کر رہی تھی۔

اس کی نظروں کے سامنے کچھ چہرے اپنی جھلک دکھاتے تو وہ اذیت سے سر جھٹک دیتی۔ یہ آنکھ مچولی اسے مزید بے چینی میں مبتلا کر رہی تھی۔ شام ڈھلنے لگی تھی مگر وہ وہیں ساکت بیٹھی تلاوت کرتی رہی۔ نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد تو اس عمل میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی تھی۔

فلک پر تاریکی پھیلنے لگی تو ہجوم واپس لوٹنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہاں مکمل خاموشی چھا گئی۔ اس سناٹے میں اس کی نمناک دھیمی آواز کے سوا کہیں کوئی آہٹ نہ تھی۔ چند لمحوں کے بعد اسے اپنے سامنے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

”محترم خاتون! انتظامیہ اس وقت کسی کو یہاں رکنے کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ کل آجایئے گا۔“ ایک شفقت بھری آواز نے اسے چونکا دیا۔

”کل کس نے دیکھا ہے؟“ وہ اپنے ہونٹ کچلتے ہوئے بولی۔

”جی! آپ نے بجا فرمایا۔ زندگی میں اگلے پل کی کوئی ضمانت نہیں۔“ مزار کے مجاور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن مجھے علم ہے میں اتنی خوش قسمت نہیں کہ موت مجھے اپنی آغوش میں لے لیکن آپ کے اصول و ضوابط سر آنکھوں پر۔“ اس نے قرآن پاک طاق میں رکھا اور ایک جانب دھرا اپنا مخصوص کڑا پہن لیا۔

مجاور کی حیران نظریں اس کڑے سے پھسلتی دائیں ٹخنے پر موجود زنجیر کے ایک گہرے نشان کو دیکھ کر ساکت ہو گئیں۔ وہ اس عورت کی شخصیت کے یہ تضادات سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس سے قبل وہ اپنی الجھن کو الفاظ کا پیراہن عطا کرتا، وہ خاموشی سے صحن عبور کر کے مزار سے باہر چلی گئی۔

لڑکھڑاتے قدموں سے اپنا وجود سنبھالتے ہوئے وہ

پیدل ہی ایک جانب بڑھ گئی۔ پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد ایک کشادہ گلی کے اختتام پر واقع گھر میں داخل ہوئی تو حسب توقع ایک کرخت اور سماعت میں چبھتی آواز نے اس کا استقبال کیا۔ ''روآئی ہو اپنے رشتہ داروں کو؟''

''ہاں! روآئی ہوں ۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنے چہرے پر بے نیازی کے تاثرات طاری کرلیے تھے۔

''ہر وقت نحوست پھیلائے رکھتی ہو۔ تمہارا یہی رونا دھونا اس گھر کے مردوں کی روزی روٹی اور سکھ چین حرام بنانے لگا ہے۔'' اس کی ہم عمر بھاری بھرکم جسامت اور تنفر زدہ تاثرات والی اس عورت نے ایک بار پھر کچوکا لگایا۔

''میرا اس گھر سے اور ان مردوں سے کوئی تعلق کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے میری نحوست اثر نہیں کرے گی ۔ ہاں، البتہ تمہارا شوہر اور بیٹے کہیں تمہاری نحوست کے اثر میں تو نہیں آنے لگے؟'' اس نے بھرپور جوابی وار کیا۔

بھاری بھرکم عورت نے اپنے ہاتھ میں موجود پیتل کا گلاس یکدم اس کی طرف اچھال دیا جو اچٹتا ہوا اس کی پیشانی پر زخم چھوڑ گیا۔ لہو کے چند قطرے اس کے چہرے پر بہہ نکلے۔ وہ خاموشی سے زخم کو دبائے اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی جہاں ایک مدقوق روشنی والا بلب روشن تھا۔ فضاء میں شدید حبس اور گرمی تھی لیکن اس کوٹھڑی میں پنکھا ندارد تھا۔ اس نے تنکوں سے بنی ایک چھابی اٹھائی اور اسے جھلاتی اپنا پسینا خشک کرنے لگی۔ ویران نظریں سامنے دیوار پر آویزاں ایک سالخوردہ کیلنڈر پر پڑیں اور لبوں سے بے اختیار ایک سسکی برآمد ہوئی۔

13 اگست کے جلی حروف آنسوؤں کی نمی سے دھندلانے لگے۔

''الٰہی! میری اس سزا میں کمی فرما دے...... میرے صبر کا دامن اب تار تار ہونے لگا ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

☆......☆

اسکول کی مختصر سی عمارت میں معمول کی سرگرمیاں

جاری تھیں۔

چودہ سالہ زیب النسا اپنی دو سال بڑی بہن مہر اور بچپن کی سہیلی گلابو کے ہمراہ میدان میں موجود تھی۔ انتظامیہ کی جانب سے آج مختلف جماعتوں کو میدان میں طلب کیا گیا تھا۔ اس غیر معمولی طلبی پر وہ سبھی خاصے حیران تھے لیکن اساتذہ کا ادب انہیں کسی بھی استفسار سے روکے ہوئے تھا۔ مہر النساء عمر میں ان سے بڑی ہونے کے باوجود اسی جماعت کی طالبہ تھی۔ زیب کے برعکس اسے پڑھائی لکھائی کا کبھی بھی شوق نہیں تھا۔ وہ محض والدین کے دباؤ کی وجہ سے مارے باندھے اسکول آیا کرتی تھی۔ پڑھائی میں عدم دلچسپی سالانہ نتیجہ پر بھی اثر انداز ہوا کرتی۔

وہ تینوں بھی اس وقت اپنی طلبی پر متجسس تھیں۔ اگلے ہی لمحہ یہ تجسس غم وغصہ میں ڈھل گیا۔ ان کے سامنے شفاف سر منحنی وجود والے ایک شخص کی تصویر رکھ دی گئی۔ ہلکی سوتی ساڑی پہنے ایک عمر رسیدہ استانی کی آواز ان کی سماعت کے لیے مزید امتحان ثابت ہوئی۔

''باپو کی مہانتا سے کون واقف نہیں بھلا؟ ہماری آزادی کے لیے باپو نے فرنگیوں سے ٹکر لی ہے۔ وہ جلد ہی ہندوستان سے انہیں واپس بھیج دیں گے۔ ہم سب پر باپو کا بہت اُپکار ہے۔ اس اُپکار کے بدلہ سبھی بچے ان کے سامنے سر جھکاؤ۔ ہم ان کی جتنی بھی پوجا کریں' کم ہے۔''

زیب اور مہر وہ یہ الفاظ اور مطالبہ سن کر دہل گئی تھیں۔

''ہرگز نہیں! میں ایسا بالکل بھی نہیں کروں گی۔'' زیب النسا کی دھیمی آواز میں چٹانوں کی سختی تھی۔

''میں بھی اس تصویر کے سامنے نہیں جھک سکتی...... کبھی بھی نہیں۔'' مہر و نے کہا۔

''ارے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ باپو ہیں وہ ہمارے...... ہم ان کے سمان کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔'' گلاب کور نے منہ بناتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

''پہلی بات تو یہ کہ باپ وہی ہوتا ہے جو ہماری پیدائش کا سبب بنے۔ اور دوسری بات یہ کہ ایک مسلمان کا سر صرف اللہ کے آگے جھکتا ہے میرا سر کٹ تو سکتا ہے لیکن اس تصویر کے سامنے ہرگز نہیں جھکے گا۔'' زیب نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔

''ایک تو تم ہر بات میں اللہ' بھگوان کا فرق اور دھرم کی باتیں بہت لے آتی ہو۔ مجھے تو اس سمان میں کوئی حرج نظر نہیں آرہا۔''

''فرق تو ازل سے موجود ہے گلابو اور ہمیشہ رہے گا...... یہ سارا کھیل سمان نہیں ہے کچھ اور ہی ہے۔'' مہر و نے پریشان نظروں سے اپنے سامنے قطار میں کھڑی لڑکیوں کو موہن داس گاندھی کی تصویر کے سامنے سجدہ ریز ہوتے دیکھ کر کہا۔

''بہت بے وقوف ہو تم لوگ!'' اس نے سر جھٹکا اور اپنی باری آنے پر آگے بڑھ گئی۔

اگلے چند لمحوں میں اس میدان میں صورت حال تبدیل ہو چکی تھی۔ زیب اور مہر و نے اس پریڈ کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ عمر رسیدہ استانی کی آنکھوں سے شرارے لپکنے لگے۔ اس نے اپنی بید کی چھڑی منگوائی اور ان دونوں کو کئی بار زوردار ضرب لگائی۔ اذیت اور درد سے ان کے ہونٹوں سے کراہیں نکلنے لگیں لیکن انکار کسی صورت اقرار میں تبدیل نہ ہو سکا۔ اس ہٹ دھرمی کی سزا میں انہیں میدان کے اس کونے میں کھڑا کر دیا گیا جہاں کسی بھی درخت کا سایہ نہ تھا۔

چلچلاتی دھوپ میں اپنے ہاتھ سر کی پشت پر باندھے زیب کے دل میں اطمینان وسکون کی لہریں ہلکورے لے رہی تھیں۔ اسے دھوپ کی یہ تپش کسی بھی نخلستان سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ ہونٹوں پر سرشار مسکراہٹ لیے وہ بالکل بے خبر تھی کہ بہت جلد یہ دھوپ اور تپش اس کی زندگی پر محیط ہو جائے گی۔

☆......☆

سہ پہر کے وقت اس وسیع وعریض گھر کے دالان میں ہمیشہ بہت رونق ہوا کرتی تھی۔

زیب اور مہر و اپنی والدہ نور بیگم کے ہمراہ سینے پرونے کا کام سیکھا کرتی تھیں لیکن اس روز دن بھر کڑی دھوپ میں کھڑے رہنے کے باعث زیب کو سخت بخار نے آلیا۔ مہر و کی طبیعت بھی بہت پژمردہ تھی۔ کچھ دیر بعد گلابو اپنے ہاتھ میں ایک کتاب تھامے ان کے پاس چلی آئی۔ اسے حسبِ معمول ریاضی کے چند سوال سمجھنے کے لیے مدد درکار تھی۔

''میرا سر بہت چکرا رہا ہے گلابو! آج میں تمہیں ریاضی کا کام نہیں کروا سکتی۔ تم مہر و آپی سے پوچھ لو۔'' اس کی آواز بخار کی شدت سے بوجھل تھی۔

''غلطی تمہاری اپنی ہے زیبو! خوامخواہ اتنی سزا بھگتی...... مان لی ہوتی ان کی بات۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''تم کبھی نہیں سمجھ سکو گے ہم صرف ایک ہی ہستی کے آگے سر جھکاتے ہیں اور توحید کا یہ عمل ہمیں جو خودداری و

سکون عطا کرتا ہے اس کی لذت تم کبھی جان ہی نہیں سکتیں۔'' زیب نے سرشاری سے کہا۔''اب جاؤ اور مہرو آپی سے سیکھ لو سوال۔ وہ اپنے کمرے میں گئی ہیں ابھی۔''

''نہیں! مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی...... تم رہنے دو۔ میں خود ہی کچھ اُپائے کرلوں گی۔'' وہ غصہ سے پیر پٹختی چلی گئی۔

زیب آنکھیں مُوندے لیٹی رہی۔ اسی پل اسے اپنی دائیں سمت کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

''کیا بات ہے بٹیارانی؟'' گلاب کور بہت آزردہ نظر آرہی تھیں۔'' ایک شفیق آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

''وہ بس یونہی بلا وجہ ہم سے بحث کر رہی تھی بابا جان!'' زیب نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور مؤدب ہوکر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے؟ نصیب دشمناں طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟'' رحیم خان کو اپنی لاڈلی بیٹی کی حالت دیکھ کر تشویش نے گھیرلیا۔

زیب نے بلاکم وکاست انہیں سارا قصہ سنا دیا۔

''آپ نے بہت اچھا کیا۔ مجھے آپ کے اس جذبہ اور عمل پر بے حد فخر ہے۔'' رحیم کی آواز شدت جذبات سے لرزنے لگی۔

''لیکن اگر یہی معمول رہا تو پڑھائی کا یہ سلسلہ کیونکر چل سکے گا؟'' نور بیگم نے کہا۔

''اس کا بھی حل نکل آئے گا...... ہم تو پہلے بھی بچیوں کے اس اسکول میں پڑھائی کے حق میں نہ تھے۔ لیکن آپ ہی بضد تھیں کہ یہی قریبی ادارہ ہے اور بچیوں کو زیادہ دور نہیں بھیجنا۔'' رحیم خان نے نرمی سے کہا۔''اب وقت آچکا ہے کہ غیر معمولی فیصلوں میں تاخیر نہ کی جائے۔ ہم کل ہی کسی دوسرے اسکول میں داخلہ کروا دیں گے اور آمدورفت کی ذمہ داری دین محمد کوچوان کے سپرد کردیں گے۔''

زیب کی نظروں میں اپنے والد کے لیے بہت والہانہ محبت جھلک رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں رحیم خان ہی کی پیروی کیا کرتی۔ وہ علی گڑھ سے فارغ التحصیل تھے اور کپڑے کے بیوپاری تھے۔ اطاعت گذار بیوی' فرمانبردار بیٹیوں نے زندگی مکمل کردی تھی۔ اولاد نرینہ سے محرومی کے دکھ سے قطع نظر بیٹیوں کی بہترین تعلیم وتربیت کی جارہی تھی۔ وہ لاہور کے علاقہ قلعہ گھمن سنگھ میں پشتوں سے آباد تھے۔ اپنے آباؤ اجداد سے غلامی کی تلخ سچائیاں سنتے بالآخر ان کی زندگی ایسے موڑ پر آن پہنچی تھی جہاں بظاہر ناممکن دکھائی دینے والی 'آزادی' اب زیادہ دور دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ہندوستان کی آزادی کی صورت میں لاہور اور پنجاب کی مسلم آبادی پر مشتمل پاکستان میں یقینی شمولیت نے سابقہ رنج وغم ختم کردیئے تھے۔ اب انتظار تھا تو اس وقت کا جب غلامی کی زنجیریں پاش پاش ہوجاتیں۔

قرائن بتاتے تھے کہ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے۔

☆......☆

مہر النساء نے اپنی پڑھائی مزید جاری رکھنے سے معذرت کرلی تھی۔ اس کے برعکس زیب کو پڑھائی کا بہت شوق تھا۔ وہ فطری طور پر ہی بہت صاف گو اور کھری طبیعت کی مالک تھی۔ سچائی اور بے باکی اس کا خاصہ تھیں۔

نئے اسکول میں داخلہ کے بعد گلاب کور سے دوستی محدود تو ہوئی لیکن ختم نہ ہوسکی۔ وہ اب بھی دوپہر ڈھلے اس سے ریاضی اور انگریزی سمجھنے آجایا کرتی۔ مہرو ان دنوں اپنے جہیز کے لیے غلاف اور چادریں کاڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ اس کی شادی پشاور میں رحیم خان کے چچازاد کے بیٹے وحید سے طے تھی اور اب رخصتی کی تیاریاں زوروشور سے جاری تھیں۔

مہرو کی شادی کے بعد زیب کو فطری طور پر تنہائی اور اداسی محسوس ہونے لگی لیکن اس نے پڑھائی میں مزید سنجیدگی اختیار کرلی۔ اس کے میٹرک کے امتحان نزدیک تھے۔ شب و روز کی محنت سے وہ ایک بار پھر سخت بخار میں مبتلا ہوگئی۔ نور بیگم کو اس کی بیماری ہمیشہ ہی بوکھلا دیا کرتی تھی۔ پندرہ روز شدید علالت کے بعد وہ صحت یاب ہوئی تو وہ اسے ہمراہ لیے علی ہجویری کے مزار پر روانہ ہوگئیں۔

مزار کے احاطے میں داخل ہوتے ہی اس کے ناتواں وجود کو سکون و فرحت کی لہروں نے ڈھانپ لیا۔ طمانیت اور کیف وسرور نے ذہن پر طاری بوجھل کیفیت پل بھر میں دور کردی اور وہ ایک ستون سے کمر ٹکائے تلاوت قرآن میں مصروف ہوگئی۔ اس تاریخی مزار میں آمد زیب النساء کے لیے ہمیشہ ایک یادگار تجربہ ہوا کرتی تھی۔ رحیم خان کی ذاتی لائبریری میں موجود 'کشف المحجوب' سمیت ان گنت کتابیں موجود تھیں اور زیب وقتاً فوقتاً ان کتب کے مطالعہ سے اپنے درخشاں ماضی میں سفر کرتی رہتی تھی۔

یہ سفر اسے مختلف راہوں پر بھٹکاتا اس دور میں لے جاتا تھا جب برصغیر کے اس خطہ میں مسلم جاہ وجلال اپنے

عروج پر تھا۔ اس پہ مستزاد اسی علاقہ میں شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد جیسی عمارات کی موجودگی اسے مزید بے خود کرنے لگتیں۔ وہ کئی بار رحیم کے ساتھ وہاں جا چکی تھی اور ہر بار اس کی ایک ازلی خواہش پوری شدت سے لوٹ آتی۔

''کیا وہ وقت پھر سے لوٹ کر نہیں آسکتا بابا جان؟'' وہ خوابناک لہجہ میں دریافت کرتی۔

''کیسا وقت؟'' رحیم کا اشتیاق بھی بڑھ جاتا۔

''مسلم قوم کے عروج اور بلند بختی کا وقت۔''

''ایک طویل مدت درکار ہوگی۔ گمشدہ میراث کا حصول کبھی بھی آسان نہیں ہوتا۔''

''میرا دل چاہتا ہے میں کسی طرح اس وقت میں واپس لوٹ جاؤں جب ان روشوں پر بادشاہوں کی شاہی سواری گذرتی ہوگی۔ ان دریچوں میں شہزادے اور شہزادیاں جلوہ افروز ہوتے ہوں گے۔ شاہی سواری کی دھمک سے درودیوار لرزتے ہوں گے۔ بزرگان دین کے کلام کی نرمی سے سخت دل بھی بدلتے ہوں گے...... میں وہ شاہانہ وقت اپنی نظروں کے سامنے مجسم دیکھنا چاہتی ہوں۔''

رحیم خان کو اس کی خواہش پر بے ساختہ ہنسی آجاتی۔

''گذرا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا زیبو! بحیثیت قوم ہم اس وقت بہت نازک موڑ سے گذر رہے ہیں اگر یہ سفر کامیاب رہا تو شاید عروج ایک بار پھر مقدر بن جائے۔''

ستون کے ساتھ دوزانو بیٹھی زیب النساء کے ذہن میں یہی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ فضاء میں بہت تپش تھی۔ جون کا آخری عشرہ رواں تھا۔ اس نے تلاوت مکمل کرتے ہی اپنے چہرے پر موجود چادر ذرا سی سرکا دی۔ اس مزار کا تقدس اور خاموشی اسے بے حد بھاتی تھی۔ نور بیگم اندرونی جانب نوافل کی ادائیگی میں مصروف تھیں۔ اس نے مٹیالے آسمان پر ایک نگاہ دوڑائی اور ایک بار پھر اپنے مخصوص مشغلہ میں مگن ہوگئی۔ مزار کے درودیوار پر ماضی کے نقوش تلاش کرتی وہ بھاری قدموں کی دھمک سے بری طرح چونکی۔

اس کے سامنے ایک دراز قد، بھاری بھرکم جسامت اور متورم آنکھوں والا ایک شخص موجود تھا۔ مخصوص پگڑی میں بندھے سر کے بے ترتیب بال اور جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اس کی شخصیت کا تاثر مزید ہولناک بنا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بوتل بھی موجود تھی جس میں بدبودار سا محلول جھلک دکھا رہا تھا۔ مزار کے صاف ستھرے فرش پر اس کے جوتوں کے نشانات دیکھ کر زیب کی بے باکی اور غصہ شدت سے عود آیا۔

اسے دین محمد کو جوان کے ساتھ اسکول آتے جاتے بھی سکھ برادری کے بہت سے لوگ نظر آیا کرتے تھے۔ زیب بچپن ہی سے ان افراد کے مابین رہتی آئی تھی۔ قلعہ لچھمن سنگھ میں بھی اسی برادری کی بہتات تھی۔ ماضی قریب میں رحیم خان اور دیگر اِکا دُکا مسلم خاندانوں سے سکھ برادری کے تعلقات بہت دوستانہ اور برادرانہ تھے لیکن پچھلے کچھ عرصہ میں ان کے انداز و اطوار میں واضح تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں۔ لبوں سے مسکراہٹ تو گویا ناپید ہو چکی تھی۔ بھینچے ہوئے ہونٹ، سرد مہر آنکھیں اور روکھا لہجہ ہمہ وقت تناؤ کی کیفیت پیدا کیے رکھتا۔

زیب کے مقابل کھڑے اس نوجوان سکھ کے چہرے پر بھی وہی درشت تاثرات طاری تھے۔

''اپنے جوتے باہر پائیدان پر اتار کر آئیے۔ مزار میں یوں جوتوں سمیت آمد بہت غیر مناسب حرکت ہے۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''مجھے سکھانے یا پڑھانے کی ضرورت نہیں...... ہم اپنے من کے بادشاہ ہیں جو جی میں آئے گا وہی کریں گے۔''

''اگر کوئی مسلمان جوتوں سمیت آپ کے گوردوارے میں چلا جائے تو یقیناً آپ کو بھی اچھا نہیں لگے گا اور آپ بھی اسے اس نامناسب فعل سے روکنے کی کوشش کریں گے۔''

''کوشش...... میں کوشش نہیں کروں گا...... میں اپنی کرپان سے اس مُسلے کی ٹانگیں توڑ دوں گا تا کہ وہ آئندہ کہیں بھی آنے جانے کے قابل ہی نہ رہے۔'' اس نے زہریلا قہقہہ لگایا۔

''ہم بھی اپنے مقدس مقامات کے لیے ایسے ہی جذبات رکھتے ہیں اور یہ تصور مت کیجیے کہ ہمارے بازوؤں میں دم نہیں۔ آپ لوگ یہاں چند روز کے مہمان ہیں اس لیے مہمانوں کی طرح تہذیب سے رہیں۔'' زیب نے دوبدو جواب دیا۔

''مہمان وہمان نہیں تھے ہم یہاں...... یہ ہماری دھرتی تھی۔ صدیوں سے رہتے آئے ہیں، ہمارے گھر ہیں یہاں۔ تم لوگوں کی ہٹ دھرمی اور کم عقلی نے اس گھر کا بٹوارہ کر دیا ہے...... ہم اپنے ہی گھر میں اجنبی اور مہمان بنا دیئے گئے ہیں بٹوارے کا فیصلہ اور یہ مہمان نوازی تم لوگوں کو بہت مہنگی پڑے گی۔ اس بن باس کی پوری قیمت وصول کریں گے تم لوگوں سے۔'' اس نے نفرت سے بائیں جانب چہرہ موڑ کر فرش پر تھوکا۔

''یہ تو وقت ہی بتائے گا سردار جی کہ ہمارا یہ فیصلہ کس حد تک درست تھا اور آپ کی یہ بدتہذیبی کس قدر غیر اخلاقی حرکت ہے۔'' زیب کے جذبات بری طرح مجروح ہوئے تھے۔

''بارود کے ڈھیر پر بیٹھ کر دیا سلائی نہیں جلاتے نادان چھوکری! لیکن یہ غلطی تو تم سمیت سبھی مُسلے کر چکے ہیں اب اس غلطی کا بھگتان بھی بھگتو گے بہت جلد بھگتو گے۔'' وہ اسے سرخ آنکھوں سے گھورتا آگے بڑھ گیا۔

زیب اپنا غصہ ضبط کرتی پلٹی اور زائرین کے وضو کے لیے ایک جانب موجود پانی سے تھوک دھونے لگی۔

☆......☆

رمضان کے بابرکت مہینے کا آغاز ہو چکا تھا۔

مسلم برادری حسب سابق انتہائی عقیدت سے اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں مگن تھی۔ رحیم خان کے گھر میں بھی معمول کی سرگرمیاں جاری تھیں لیکن اس بار فضاؤں میں موجود انہونیوں کے اندیشے ہر ذی نفس کو مضطرب کیے ہوئے تھے۔ رحیم کی پیشانی بھی ہمہ وقت شکن آلود اور آنکھیں گہری سوچ میں کھوئی رہتیں۔

''اس قدر بے چینی کی کیا وجہ ہے؟ پروردگار پر بھروسا کیجیے۔'' نور بیگم نے ان کی پریشانی دیکھتے ہوئے کہا۔

''توکل اور قناعت پروردگار کی پسندیدہ صفات ہیں لیکن خطرات کی موجودگی میں اپنی حفاظت سے بے نیاز ہو جانا توکل نہیں کم عقلی ہوتی ہے۔''

''کیسے خطرات؟ ہم اس شہر میں' اس گھر میں سالہا سال سے رہائش پذیر ہیں۔ ہمسائیوں سے تعلقات مثالی ہیں۔ انگریز حکومت کے اعلان کردہ منصوبے کے مطابق ہم پاکستان ہی کا حصہ ہیں تو پھر یہ اندیشے کیوں؟ اور آس پاس کے سبھی غیر مسلم گھرانے جانتے ہیں کہ اگر وہ یہاں سے منتقلی کا فیصلہ کریں تو ہم انہیں محفوظ رستہ فراہم کریں گے۔''

''آج سے صدیوں پہلے عرب کے صحرا میں جب اسلامی ریاست کی صدا بلند ہوئی تھی تو سب سے پہلے انہی لوگوں نے مخالفت کی تھی جو ازل سے ان کے ساتھ رہتے آئے تھے۔ تبدیلی مذہب' تبدیلی ریاست ان کے لیے ناقابلِ قبول تھی۔ پھر چشم فلک نے دیکھا کہ سالہا سال سے اکٹھے رہنے والے افراد ہی نے تلوار اٹھالی۔ ہم اس انقلاب کے داعی افراد کے قدموں کی دھول بھی نہیں ہیں لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ایسے وقت میں لمحاتی غفلت کی سزا عمر بھر بھگتنی پڑتی ہے۔'' رحیم خان نے پیشانی مسلی۔

''آپ خوامخواہ وہم میں مبتلا ہیں۔'' نور بیگم نے کہا۔

''ہماری دکان پر سارا دن بھانت بھانت کے لوگ آتے ہیں۔ ان کی پریشانیاں' مسائل اور جذبات دیکھ کر دل کٹنے لگتا ہے۔ مشرقی پنجاب میں اس وقت خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ یہاں بھی کئی علاقوں میں ہندو اور سکھ قتل وغارت پر اتر آئے ہیں۔''

''لیکن ہمارے ہمسائے بہت اچھے ہیں۔ مجھے یقین ہے ہمیں ایسی کسی بھی صورتِ حال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

''میں ان کی اچھائی پر کوئی سوال نہیں اُٹھا رہا۔ وہ یقیناً بہت اچھے پڑوسی ثابت ہوتے آئے ہیں۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بشر میں 'شر' سمایا ہوا ہے اور اک ذرا موقع ملتے ہی یہ شر اس پر حاوی ہو جاتا ہے اور پھر سبھی اقدار' اخلاقیات اور بھرم و لحاظ بھسم ہو جاتے ہیں۔ میں نے گھر کے مرکزی دروازہ پر خصوصی پہریدار متعین کر دیئے ہیں تاہم اندرونی معاملات پر نظر رکھنا آپ کی ذمہ داری ہے۔'' رحیم خان نے دوٹوک انداز میں کہا تو نور بیگم ان کا مزاج بھانپ کر خاموش ہو گئیں۔

☆......☆

اگلے دو ہفتے خاموشی سے بیت گئے۔

علاقہ کے غیر مسلم مکین بوجھل دل اور مجروح جذبات لیے اپنے گھر بار خالی کرنے لگے۔ محلہ میں ایک سوگ اور تناؤ کی کیفیت چھا گئی تھی۔ رخصتی سے قبل کئی خواتین ایک دوسرے کے گھر الوداعی ملاقات کے لیے جاتیں اور پھر رقت آمیز باتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا۔ خط و کتابت کے ذریعے روابط قائم رکھنے کے وعدے وعید لیے جاتے اور اپنی اولاد کے شادی بیاہ میں مدعو کرنے کی یقین دہانی کے بعد نقل مکانی کا کربناک مرحلہ شروع ہو جاتا۔ زیب کی کئی ایک سہیلیاں بھی امرتسر چلی گئی تھیں۔ رُکمنی' کویتا اور رادھا سے اس کے تعلقات بچپن ہی سے بہت مثالی تھے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آمدورفت بھی رہتی تھی۔ اس طویل رفاقت کا یہ موڑ اس کی حساس طبیعت کے لیے بہت کربناک تھا۔

رمضان کے تیسرے عشرے کا آغاز ہو گیا۔

رحیم خان کی مصروفیات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ملکی حالات کے پیشِ نظر اس نے کافی عرصہ سے دکان کے لیے مال نہیں خریدا تھا لیکن اب خریداری ناگزیر ہو چکی تھی۔ مہرو کے سسرال میں' تہوار' پہنچانے کا مرحلہ بھی درپیش

تھا۔ چاروناچار اس نے رختِ سفر باندھ لیا۔ پشاور سے ریشمی تھان خریدنے کے بعد مہرو سے ملاقات بھی نمٹ جاتی۔ وقت رخصت نور بیگم کو ضروری ہدایات دینے کے بعد روانہ ہوگیا۔

گھریلو نظام اپنے معمول کے مطابق چلتا رہا۔ رحیم خان کی روانگی کو تین روز بیت چکے تھے۔ اگست کی اس پُرحبس دوپہر میں گلابو کی اچانک آمد زیب کے لیے بہت خوشگوار تھی۔

"تم کدھر سے رستہ بھول گئیں؟ تم نے تو مجھے بھلا ہی دیا ہے۔" زیب نے محبت سے شکوہ کیا۔

"بھلایا تو تم نے ہے زیبو! اسکول تبدیل ہوتے ہی تمہاری مصروفیات بھی بڑھ گئیں اور پرانی سکھیوں کے لیے سمے ہی نہ رہا تمہارے پاس۔" گلابو کے انداز میں تھکاوٹ نمایاں تھی۔

"کیا بات ہے اتنی اداس کیوں ہو؟"

"میں اداس نہیں نراش ہوں۔"

"لیکن کیوں گلابو؟ ہماری محبت میں کہیں کوئی کمی رہ گئی کیا؟" نور بیگم نے بھی شفقت سے دریافت کیا۔

"ہم چند روز بعد لدھیانہ چلے جائیں گے چاچی! پھر کون جانے کب ملاقات ہوسکے؟ میں نے اپنی سبھی سکھیوں کو آج اپنے گھر اکٹھا کیا ہے۔ کچھ سمے ساتھ..... بتائیں گے۔ یہی یادیں اپنے ساتھ سمیٹ کر لے جاؤں گی۔" اس کے لہجے نے ان دونوں کو بھی ساکت کردیا۔

"ایسا کیوں سوچتی ہو پگلی؟ رب نے چاہا تو ہم یونہی میل ملاپ رکھیں گے۔" نور نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کون جانے چاچی؟ جندگی کا کیا بھروسا ہے؟ آپ زیبو کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ بڑا اُپکار ہوگا۔"

"مائیں اپنی بیٹیوں پر اُپکار نہیں کرتیں گلابو! میرے لیے تم زیب النساء جیسی ہی تو ہو۔"

"یہ آپ کا بڑاپن ہے ورنہ اس سمے لوگوں کی سوچ میں اتنا پریورتن آچکا ہے کہ دل چاہتا ہے آتما ہتھیا کر لوں۔" وہ تلخی سے بولی۔

نور بیگم اور زیبو کا دل اس کی حالت دیکھ کر کٹنے لگا۔ وہ بھلے ہی بٹوارے کے اس عمل میں اپنے گھر بار سے محروم نہیں ہوئی تھیں لیکن اگر ایک پل کے لیے وہ ان کی جگہ اپنی ذات کو تصور کرتیں تو دل کی دھڑکنیں تھمنے لگتی تھیں۔ اپنی جڑوں سے دوری آسان تو ہرگز نہیں ہوا کرتی۔ زیب اپنی والدہ کی رضا مندی سے اسی وقت گلابو کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ ان کا گھر دو گلیوں کے فاصلہ پر تھا۔

زیب کے علاوہ وہاں محلہ اور اسکول کی اور بھی کئی لڑکیاں موجود تھیں۔ سورج کی تپش اور گرمی حد سے سوا تھی لیکن باتوں اور قصوں میں وقت بیتنے کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ متوقع جدائی اور آبائی علاقوں سے کوچ نے سبھی کے دل گداز کردیئے تھے۔ سہ پہر ڈھلنے کے بعد لاجونتی، نیتو اور ریکھا اپنے گھروں کو لوٹ گئیں لیکن زیب کے اصرار کے باوجود گلاب کور نے اسے روک لیا۔

سورج مغربی افق پر جھکنے لگا۔ افطاری میں اب چند ہی منٹ باقی تھے۔ زیب اس صورتِ حال پر قدرے فکرمندسی ہونے لگی۔

"میں نے روزہ افطار کرنا ہے گلابو! امی جان منتظر ہوں گی۔"

"باتوں باتوں میں سمے کا اندازہ ہی نہ ہوسکا۔ تم ایک گلاس دودھ پی لو ورنہ گھر پہنچنے سے قبل ہی اذان نہ ہو جائے۔ انکار مت کرنا...... تمہاری افطاری سے مجھے خوشی ہوگی۔" وہ ملتجی انداز میں بولی۔

"جیسے تیری خوشی! دودھ لے آؤ فوراً......" زیب نے خوشدلی سے کہا۔

گلاب کور عجلت میں رسوئی کی طرف بڑھی اور چند ہی لمحوں میں پیتل کا ایک جہازی سائز گلاس دودھ سے لبالب بھرلائی۔ زیب نے مسکراتے ہوئے گلاس تھاما اور ہونٹوں سے لگا کر تین سانسوں میں دودھ ختم کردیا۔ گلابو سے بغلگیر ہوتی وہ واپسی کے لیے روانہ ہوگئی لیکن کمرا عبور کرنے سے قبل ہی اسے ایک زوردار چکر آیا اور زمین و آسمان اس کی نظروں میں گھومنے لگے۔ پلکوں پر شدید بوجھ دھر آیا تھا۔

ہوش کے آخری لمحات میں اس کی نظر شمالی جانب دیوار پر ایک کیلنڈر پر جمی تھی جہاں جلی حروف میں ایک تاریخ لکھی تھی۔

13 اگست 1947ء

حروف میں دھندلاہٹ پیدا ہونے لگی اور اگلے ہی لمحہ زیب النساء اپنے ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی۔

☆......☆

آنسوؤں اور سسکیوں نے اس کوٹھڑی کی فضاء مزید بوجھل بنادی۔

حبس، بے چینی اور اندرونی گھٹن اس قدر شدید تھی کہ

اسے سانس لینا بھی دشوار ہونے لگا۔ صحن میں چند مخصوص آوازوں کی گونج سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مرد حضرات کام کاج سے لوٹ آئے ہیں۔ وہ کرب سے آنکھیں موندے بھاری قدموں کی کوٹھڑی میں آمد اور جسمانی تشدد کی ایک نئی لہر کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئی۔

وقت تیزی سے بیتتا چلا گیا لیکن خلاف معمول کسی نے وہاں قدم نہ دھرے۔ سالہا سال سے جاری اس معمول میں رکاوٹ نے اسے اچنبھے میں مبتلا کر دیا۔ مسلسل گریہ زاری اور ذہنی دباؤ نے اس کی طبیعت بوجھل کر دی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر مغربی جانب ایک تپائی پر موجود پیتل کی میلی کچیلی پلیٹ تھامی اور اس میں موجود باسی چاول حلق سے نیچے اتار لیے۔ اپنا پیوند زدہ تکیہ اٹھائے وہ جھلنگا چارپائی کی جانب بڑھی ہی تھی کہ دروازے پر ایک آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ بلدیو سنگھ کی آنکھیں کثرت مے نوشی سے متورم تھیں اور چہرے پر وحشت کا ایک سمندر دکھائی دیتا تھا۔

''تم آج پھر مزار پہ گئی تھیں۔'' اس نے تیوریاں چڑھائیں۔

''ہاں گئی تھی اور آیندہ بھی جاتی رہوں گی۔'' وہ بے خوفی سے بولی۔

''رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔''

''کسی کے روکنے سے ہوائیں کبھی نہیں رکتیں بلدیو سنگھ!''

''لگتا ہے تمہیں ایک بار پھر زنجیروں میں قید کرنا پڑے گا۔'' وہ غرایا۔

''اگر مزید کوئی حسرت باقی رہ گئی ہے تو وہ بھی پوری کر لو۔''

''مجھے کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور مت کر..... تمہاری عمر اور بڑھاپے کا لحاظ کر کے زنجیریں کھولی ہیں۔ میری پریشانیوں میں اضافہ نہ کرو۔'' وہ خلاف توقع الجھ کر کہنے لگا۔

''بلدیو سنگھ کی آگ برساتی زبان سے پریشانی کا لفظ سن کر گمان ہوتا ہے کہ تمہارے آقاؤں نے اپنے غلاموں کی پشت پناہی چھوڑ دی ہے۔'' وہ زہر خند ہوئی۔

بلدیو طیش کے عالم میں اس کی جانب بڑھا لیکن پھر اپنے قدم روک لیے۔ منحنی وجود اور کمزور جسامت کی حامل یہ عورت گزشتہ سینتیس سال سے مسلسل اس کے عتاب کا نشانہ بن رہی تھی لیکن اس کی ہٹ دھرمی اور بے خوفی میں رتی بھر فرق نہ آیا تھا۔ بلدیو کے اعصاب پر تھکاوٹ طاری ہو چکی تھی لیکن اس کا چٹانی عزم اب بھی برقرار تھا۔ وہ ایک بے بس نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے سر جھٹکتا کوٹھڑی سے باہر چلا گیا۔

☆......☆

نور بیگم کی پریشانی حد سے سوا تھی۔

نماز تراویح کا وقت ہو چکا تھا لیکن زیب ابھی تک واپس نہیں لوٹی تھی۔ وہ افطاری کے وقت بھی ایک ملازم کو گلابو کے گھر روانہ کرنا چاہتی تھیں لیکن پھر اس کے آنسو اور سسکیاں یاد آئیں تو اپنا ارادہ مؤخر کر دیا۔

''میں اپنی بے بے کے ساتھ زیبو کو خود چھوڑنے آؤں گی چاچی! تم پریشان مت ہونا۔'' اس نے روانگی کے وقت یقین دہانی کروائی تھی۔

اندھیرے نے ہر سو اپنے پنکھ پھیلا لیے تو جانے کیوں ان کا دل بیٹھنے لگا۔ انہوں نے ایک قابل بھروسا ملازم کو فوری طور پر گلابو کے گھر روانہ کیا لیکن اس کی آمد اور خبر نے ان کے وجود کی بنیادیں ہلا دیں۔

گلاب کور کا خاندان آج شام ہی اپنے مکمل سازوسامان کے ساتھ لاہور سے روانہ ہو گیا تھا۔ نور بیگم کے قدموں تلے زمین کھسک گئی۔ پریشانی کے عالم میں انہوں نے اپنا برقع تھاما اور ایک ادھیڑ عمر ملازمہ کے ہمراہ گلابو کے گھر چل دیں لیکن وہاں سناٹا طاری تھا۔ وحشت و اضطراب میں وہ محلہ کی سبھی لڑکیوں کے گھر استفسار کرنے گئیں لیکن ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملتا۔ ''ہم شام سے پہلے ہی گھر لوٹ آئے تھے۔ گلاب کور نے آج شام کی ٹرین سے امرتسر روانہ ہو جانا تھا۔''

''لیکن اس نے تو دو روز بعد لدھیانہ جانے کا بتایا تھا۔'' نور نے پریشان لہجے میں کہا۔

گلاب کور نے محلہ کے ہر گھر میں مختلف بیان دیا تھا۔ امرتسر، جالندھر، پٹنہ، بہار، لدھیانہ کا نام لیتی خدا جانے وہ کہاں گئی تھی اور زیب النساء کو بھی جانے زمین نگل گئی تھی کہ آسمان کھا گیا تھا۔

''اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہو گی تمہاری بیٹی! تھوڑا انتظار کر لو..... آ ہی جائے گی۔'' کویتا کی ماں کے الفاظ انہیں نیزے کی انی کی مانند گھائل کر گئے۔

''میری بیٹی ایسی نہیں ہے سرسوتی! تم تو بچپن سے جانتی ہو اسے۔ وہ ضرور کسی حادثہ کا شکار ہوئی ہے۔'' ان کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

”بھئی ہم کیا جانیں کون کیسا ہے؟ ہم تو کیول اتنا جانتے ہیں کہ جوانی بڑی دیوانی ہوتی ہے۔“ سرسوتی نے نخوت سے جواب دیا تو نور بیگم ساکت رہ گئیں۔ بشر میں سمائے شر کی جھلک کا یہ تجربہ ان کے لیے بے حد بھیانک تھا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے گھر لوٹ آئیں۔ جوان بیٹی کے اس غیاب نے ان کے دل کی رگیں بری طرح مسل ڈالی تھیں۔ علاقہ میں زیب کی گمشدگی زبان زدِ عام تھی۔ اس بدنامی اور اپنی کوتاہی کے احساس جرم سے شوہر سے نظریں ملانے کی بھی تاب نہ تھی۔ دوسری رات وہ اپنے دل میں اٹھتی ٹیسیں دباتی سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئیں۔ اگلے روز رحیم خان کی واپسی پر آفات ناگہانی ان کی منتظر تھیں۔

اہلیہ کی فوری تدفین کے بعد رحیم نے ایک نئے سرے سے زیب کی تلاش کا آغاز کیا لیکن بے سود۔ اگلے کئی ماہ تک وہ مختلف شہروں کی خاک چھانتے رہے لیکن ناکامی ان پر سایہ فگن ہو چکی تھی۔ انہیں اپنے وجود کی پروا تھی نہ دن بہ دن زوال پذیر صحت کی۔ زیب النساء کا تصور اور اس کی تلاش کا جنون دل و دماغ پر حاوی تھا۔ اور پھر ایک روز موہالی کے گمنام قصبہ میں گلیوں کی خاک چھانتے رحیم خان کے دل نے بھی دھڑکنوں کا ساتھ نبھانے سے انکار کر دیا۔

وقتِ آخر بھی ان کے پپڑی زدہ ہونٹوں پر زیب النساء ہی کی پکار تھی۔

☆......☆

زیب کی پلکوں پر شدید بوجھ تھا۔

اعصاب کی مکمل قوت سے وہ اپنی آنکھیں کھولنا چاہتی تھی لیکن نقاہت کے باعث ہانپ کر رہ جاتی۔ بازو پر جابجا سوئی چبھنے کے نشان تھے۔ شاید اسے لگا تار انجکشن لگتے رہے تھے شاید اسی وجہ سے وہ زمان و مکان کی تصور سے مبرا ہو چکی تھی۔ اسے اپنا وجود خلاء میں معلق محسوس ہوتا۔ کبھی کبھی بے ہوشی اور نیم مدہوشی کی کیفیت میں اپنے جسم پر ایک کریہہ اور متعفن بوجھ بھی محسوس ہونے لگتا لیکن وہ بے بسی سے مچل کر رہ جاتی تھی۔ اسی مدہوشی میں اسے دو مضبوط ہاتھ چاول اور روٹی کھلا دیتے۔ وہ اپنا سر پٹخ کر اس کیفیت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن قویٰ پر طاری کمزوری اور زنجیر میں جکڑے ہاتھ پاؤں اسے مزید بے بس کر دیتے۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن آواز کسی سیٹی کی مانند حلق میں دب کر رہ جاتی۔ ذہن پر چھائی رہنے والی دھند، جسمانی نقاہت اور لاشعور میں خلش کی طرح کسی قیمتی متاع سے محرومی کا احساس اسے ہر پل میں ہزار ہا دفعہ موت سے ہمکنار کرتا۔ اپنوں کے گم گشتہ چہرے اس کی آنکھوں میں مزید جلن پیدا کرنے لگتے۔

اس سوئی جاگی کیفیت میں جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ قدموں تلے سنگی فرش اور آس پاس چھائے اندھیرے کے سوا اگر کوئی تیسرا عنصر اسے محسوس ہوا تھا تو وہ موسم میں خنکی تھی۔ حبس زدہ اور تپش لٹاتی فضاء میں ٹھنڈک کا احساس اس کے ناتواں وجود میں پھریری دوڑا دیتا۔ اس روز جب اس کے دماغ سے خوابیدگی کا اثر کم ہوا تو پہلی بار وہ اپنے گرد ملگجی روشنی دیکھ کر حیران ہونا بھی بھول گئی۔ اس کے معدے میں تیز، نوکیلی شے کی چبھن کا احساس ادھموا کرنے لگا۔ ذہن پر زور دینے سے اسے یاد آیا کہ دو دن سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ اپنے ہاتھ ٹھنڈے فرش پر جماتے ہوئے وہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور اس کوٹھڑی کا جائزہ لینے لگی۔

سادہ اینٹوں سے بنی دیواریں خستگی کا شکار تھیں۔ کمرے کی مغربی جانب ایک مختصر سلاخ دار کھڑکی سے ڈوبتے سورج کی روشنی چھن کر اندر آرہی تھی۔ مشرقی سمت ایک مقفل چوبی دروازہ تھا جس کی نچلی جانب ایک درز موجود تھی۔ فضاء میں خنکی کا تاثر آج مزید گہرا تھا۔ ذہن میں ادھم مچاتے سوالوں نے اسے بے حال کر دیا۔

”ایسا کوئی بھی کمرا گلابو کے گھر میں نہیں تھا اور اگر یہ گلابو کا گھر نہیں تو پھر میں کہاں موجود ہوں؟“ اس نے خود کلامی کی۔

اسی پل دروازے کی درز سے کسی نے ایک اخبار میں لپٹی روٹی اور پالک کا سالن اندر دھکیل دیا۔ اناج دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ اپنے ہاتھوں کے بل گھسٹتے ہوئے اس نے بدقت تمام کھانا تھاما اور دیوانہ وار اسے دانتوں سے کترنے لگی۔ معدے کی تپش کم ہوئی تو دماغ میں سوچ اور ارادوں کو بھی تقویت ملنے لگی۔ وہ اخباری تراشہ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ خبروں کا متن نامانوس تھا اور اخبار کا نام بھی چکناہٹ کے باعث ناقابل فہم تھا لیکن اگلے ہی لمحہ چند الفاظ نے اس کی بصارت پتھرا دی۔ اخبار کے نام تلے واضح انگریزی حروف میں لکھا تھا

دہلی۔ نومبر 1947ء

زیب النساء کے وجود پر لرزہ طاری ہوگیا۔

اضطراب اور خوف کی لہریں پورے جسم میں سرایت کر

رہی تھیں۔اس کا دماغ مفلوج ہونے لگا تھا۔کھڑکی سے آنے والی روشنی نے بھی اپنے پر سمیٹ لیے تھے۔تاریکی میں اندیشوں کے بھوت اس کے اردگرد بے ہنگم رقص کرنے لگے۔اسی پل ساعت میں دروازہ پر ایک آہٹ محسوس ہوئی۔ لالٹین بردار ایک بھاری بھرکم شخص نہایت اطمینان سے اندر داخل ہوا اور ایک جانب رکھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''کیسی ہو زیب النساء؟ ہماری مہمان نوازی میں کوئی کمی تو محسوس نہیں ہوئی؟''

''کک......کون ہو تم؟ مم......میں یہاں کک......کیسے؟''اس کی آنکھوں کی تپش نے زیب کو ہکلا دیا۔

''کمال ہے......مجھے نہیں پہچانا تم نے؟ بلدیو سنگھ نام ہے میرا......وہی بلدیو سنگھ جسے تم اپنے بازوؤں کے دم کی چتاؤنی دے رہی تھیں۔''

زیب کو ذہن پر ذرا زور ڈالتے ہی مزار میں ہونے والی ملاقات اور یہ شخص یاد آگیا۔

''میں تو گلابو کے گھر میں تھی۔پھر یہاں کیسے؟''اس کے آنسو چھلک اٹھے۔

''گلابو کے گھر سے تمہیں بے ہوشی کی حالت میں ایک بستر میں باندھ کر ٹرین کے ذریعہ اسی رات ہم یہاں لے آئے تھے۔اور کیول تم ہی نہیں تمہارے پاکستان کی بہت سی پاک صاف ناریاں ہم اپنے مخصوص طریقہ سے بٹوارے کے وقت دہلی، بمبئی، لکھنو اور کلکتہ کے بالا خانوں میں پہنچا چکے ہیں۔''وہ اطمینان سے بولا۔

''لیکن کیوں......کیا بگاڑا تھا ہم لوگوں نے تمہارا؟''

''ہمیں اپنے گھروں سے نکالنے کا پاپ کیا ہے تیرے بڑوں نے......کیول فرنگیوں کو وہاں سے نکال دیتے تو کیا حرج تھا؟ لیکن انہیں تو اپنے لیے علیحدہ ملک لینے کا جنون تھا۔جس دیش کو انہوں نے ملیچھ اور ناپاک سمجھتے ہوئے بٹوارہ کیا، آج اسی دیش میں ان کی لڑکیاں جسم فروشی کا دھندا کر رہی ہیں اور مرتے دم تک کرتی رہیں گی۔تیرے شریر سے میں اپنے اپمان کا پورا بدلہ وصول چکا ہوں اور اب تو بھی مرتے دم تک اسی کوٹھڑی میں اپنے پرکھوں کی غلطی کا تاوان ادا کرے گی۔''اس کے زہریلے الفاظ نے زیب کو ششدر کر دیا۔

''رحم کرو مجھ پر بلدیو سنگھ! تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔'' وہ بے اختیار بلکنے لگی۔

''چہ چہ چہ......یہ آنسو کیوں؟ تمہاری قوم کے بازوؤں میں تو بہت شکتی ہے ناں......انہیں آواج دینا کہ تمہیں یہاں سے نکال لیں۔''بلدیو نے آگے بڑھ کر اس کے بال نوچ لیے۔

''خدا کے قہر کو دعوت مت دو بلدیو! یہ بٹوارا وقت کی ضرورت تھا۔تمہیں کسی نے وہاں سے نکلنے کے لیے تو نہیں کہا ہوگا۔تم اپنے گھر میں محفوظ تھے۔ہمارے مذہب میں غیر مسلم عوام کے لیے بھی یکساں حقوق متعین ہیں۔''

''ہمیں مُسلوں کی بھیک اور ہمدردی کی جرورت نہیں اس لیے وہاں رہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ہندو برادری سے بڑھ کر ہمارا کوئی سجن نہیں۔اور آنے والا وقت بتائے گا کہ اس بٹوارے کے ذمہ داروں کے بعد تمہارے دیش کی جڑیں بھی ہم کھوکھلی کر دیں گے۔جندگی میں ایک بار تجھے وہاں جرور لے کر جاؤں گا۔یہ بلدیو سنگھ کا وچن ہے۔''وہ اس کے بالوں کو جھٹکے دیتا اپنے نفس کی تسکین میں مگن ہو گیا۔

وہ رات زیب النساء کے لیے بہت بھاری تھی۔بلدیو کے انکشافات کی روشنی میں اسے اپنے مستقبل کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی۔لاشعور میں چھپتی خلش مجسم وجود اختیار کر چکی تھی۔اس کی زندگی ایک بھیانک طوفان کی زد میں آ گئی تھی۔

اس کی منت سماجت، آہیں، سسکیاں اور آنسو رائیگاں ثابت ہوئے۔بلدیو ہر دوسرے تیسرے روز اپنے ہمراہ کسی نفس پرست کو لے آتا۔نو وارد اس کے مذہب اور پس منظر سے پہلے ہی آگاہ ہوتے تھے اس لیے بٹوارے کی ہزیمت کا بدلہ بھرپور انداز میں اس کے وجود سے چکایا جاتا۔

اس قید خانہ میں شب ماہ و سال کا تصور ایک بار پھر ختم ہو گیا۔شب و روز کی نشاندہی اس کوٹھڑی کی اکلوتی کھڑکی سے مشروط ہو کر رہ گئی۔زیب کے ہاتھ اور پاؤں ایک بھاری زنجیر میں اس طرح جکڑے رہتے تھے کہ کھانے کے سوا وہ انہیں کسی بھی صورت جنبش نہ دے پاتی۔دن میں ایک مرتبہ بلدیو اسے اپنی نگرانی میں کوٹھڑی کی بیرونی جانب واقع بیت الخلاء میں لے جاتا اور پھر سے جکڑ دیتا۔

زندگی کسی درویش کی بددعا بن گئی تھی۔

☆......☆

جبر اور جسمانی استحصال کی اس چکی میں پستے جانے کتنے موسم بیت گئے۔بیرونی دنیا سے رابطہ موقوف تھا۔زیب کا دل شدت سے چاہتا تھا کہ وہ کسی بھی طرح اپنی زندگی کا

خاتمہ کرے لیکن صیاد بہت شاطر تھا۔ اس نے قفس میں کوئی بھی ایسا روزن نہیں چھوڑا تھا جس کی مدد لیے وہ اپنے وجود کو اس ان چاہی غلاظت سے بچا سکتی۔ بلدیو سنگھ اس کی جسم فروشی سے خوب پیسے کما رہا تھا۔ زیب النساء کی جسمانی اور ذہنی حالت مخدوش ہونے لگی تھی۔

کچھ عرصہ بعد بلدیو نے اس کوٹھڑی اور بیرونی سمت تعمیری ردوبدل کروایا اور ایک عورت کے ہمراہ اسی گھر میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ اس روز اپنی کوٹھڑی میں ایک ستّ الوجود حلقہ زدہ آنکھوں اور چہرے پر تنفر و حقارت کے تاثرات لیے اس عورت کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئی۔

''کیا حال ہے زیب النساء؟ ہماری خاطر داری میں کوئی کمی تو نہیں؟'' اس کا لب ولہجہ زیب کو کچھ مانوس محسوس ہوا۔

''پہچانا نہیں مجھے؟'' وہ اس کے چہرے پر الجھن دیکھ کر محظوظ ہوئی۔

زیب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کمال ہے۔ تمہاری ذہانت کے ڈنکے تو پورے اسکول میں بجتے تھے اور تم اپنے بچپن کی سکھی کو بھول گئی۔ میں گلاب کور ہوں۔''

زیب کے دل و دماغ میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ وہ اسے جھنجوڑتے ہوئے اپنا قصور دریافت کرنا چاہتی تھی لیکن اپنے ضبط کی توہین بھی اسے گوارا نہ تھی۔ وہ دلی طور پر اپنی ذات سے وابستہ ہر معاملہ پروردگار کی عدالت میں پیش کر چکی تھی۔

''کیسی ہو گلابو؟ اتنی افسردہ کیوں ہو؟'' زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''رسی جل گئی لیکن بل نہ گیا۔ مجھے افسردہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ واہگرو کی کرپا سے میں اور بلدیو شادی کے بعد بہت خوش ہیں۔'' اس نے تکبر سے جواب دیا۔

''ماشاء اللہ! پروردگار تمہاری خوشیاں سلامت رکھے۔ کتنے سال ہو گئے اس شادی کو؟''

''دس سال ہو چکے ہیں۔ بلدیو سنگھ آج بھی مجھے اتنی ہی محبت کرتا ہے۔''

''دس سال اتنا عرصہ بیت گیا مجھے اس قفس میں؟'' اس نے زیرِ لب کہا۔

''تمہارے بچے کتنے ہیں گلابو؟ تمہیں بچے بہت پسند ہوا کرتے تھے ناں؟'' زیب اس کے رویئے میں کسی گہرے کرب کی موجودگی بھانپ گئی۔

''واہگرو نے ابھی ہمیں سنتان نہیں دی۔'' گلابو کے چہرے پر دکھ کی جھلک واضح تھی۔

''فکر نہ کرو۔ اللہ پاک بلدیو سنگھ کو اولاد ضرور دے گا۔ میں نے بہت دعائیں کی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میری یہ دعائیں رد نہیں ہوں گی۔''

''تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور یہی دعائیں تم اپنی قوم کے لیے کیا کرو کہ واہگرو انہیں عقل دے۔ تمہاری قوم سے بڑھ کر جذباتی اور بے وقوف میں نے کبھی کہیں نہیں دیکھا۔ یاد نہیں چاچی نور نے میرے دو آنسوؤں کو دیکھ کر اپنی بیٹی کو ہمارے گھر بھیج دیا تھا اور پلٹ کر شام تک خبر بھی نہ لی۔'' گلاب کور پھنکاری۔

''ہم بے وقوف نہیں تھے گلابو! انسان دوست تھے۔ ہمسائیوں کے حقوق کا خیال تھا ہمیں۔'' زیب اپنی والدہ کے ذکر پر آبدیدہ ہو گئی۔

''تم لوگوں کی بالک ہٹ نے ہمیں دربدر کر دیا۔ اس کی سزا تو بھگتنی ہو گی۔''

''ٹھیک ہے! ہم نے سزا بھگت لی۔ لیکن اگر ایسی ہی سزا تم لوگوں پر مسلط ہو گئی تو کیا کرو گے؟''

''ہم بے وقوف ہیں نہ جذباتی..... ہمیں اپنے دوستوں پر وشواس ہے۔'' وہ زہریلے انداز میں کہتی لوٹ گئی۔

زیب النساء کے زخم ایک بار پھر ہرے ہو گئے۔ والدین اور بڑی بہن کا تصور اس کی آنکھوں میں آتشیں آنسو پیدا کرنے لگا۔ صبح کاذب تک وہ مثل ماہی بے آب تڑپتی رہی۔ فجر کا وقت ہوا تو اس نے معمول کے مطابق تیمم کیا اور اشاروں سے نماز ادا کرنے لگی۔ بہتے آنسوؤں میں دعا مانگنے کے بعد اس کے دل میں سکون کی لہریں موجزن ہوئیں تو نیند نے کسی مہربان دیوی کی طرح اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆......☆

گلابو اور بلدیو سنگھ کی تلخ آوازیں اس کی سماعت زخمی کر رہی تھیں۔

''میرا گھر مسجد یا مزار نہیں ہے بلدیو! وہ یہاں نماز پڑھتی ہے اور تم نے کبھی روکا ہی نہیں۔'' گلاب نے چلّا کر کہا۔

''جاہل عورت! میں یہاں رہتا ہی کب تھا جو مجھے

انداز ہ ہو پاتا۔اب بھی تمہاری ہی ضد پر یہاں منتقل ہوا ہوں۔'' بلدیو نے بھی دوبدو جواب دیا۔

''میں خوب سمجھتی ہوں تیری بے ایمانیاں! تو نے جان بوجھ کر اسے کسی کوٹھے پر نہیں بھیجا۔اپنے گاہکوں کے ساتھ خود بھی اس کے شریر سے کھیلتے ہو۔میں تمہیں سنتان نہیں دے پائی تو تم اس سے ناجائز اولاد پیدا کرلو گے۔''

''تو چڑ یا گئی ہے گلابو...... میں ایسے جھوٹے برتن سے اپنی اولاد کبھی پیدا نہیں کروں گا۔تجھے پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس چھوکری نے مزار میں میرا اپمان کیا تھا اور اس کی سزا میں یہ ساری جندگی یہیں رہے گی۔باقی آج ایک اور سچ بھی جان لے۔میں حکیم تیج سنگھ کی دی ہوئی دوائیاں اسے کھلا چکا ہوں۔یہ کبھی بھی اولاد پیدا نہیں کرسکتی۔بنجر زمین بن چکی ہے اور کیول ہماری ہندو،سکھ برادری کی رکھیل بن کر رہے گی۔''

''تو نے میرا جی خوش کر دیا بلدیو! تیری ذہانت کا بھی جواب نہیں ویسے۔'' گلاب کے لہجے میں خوشی کی کھنک تھی۔''لیکن اس کی نماز کا سلسلہ بھی ختم کرو کسی طرح۔''

''وہ بھی ختم ہو جائے گا۔میں آج ہی واہگرو کی مورتیاں اور تصویریں اس کی کوٹھڑی میں لگادوں گا۔پھر دیکھتا ہوں کیسے نماز پڑھ پائے گی یہ۔'' وہ بیوی کو پچکارتے ہوئے بولا۔

اور پھر زیب النساء کے لیے ایک نئی آزمائش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

کوٹھڑی میں ہر طرف تصویروں کی موجودگی نے نماز کی ادائیگی محال کر دی۔یہ اذیت سابقہ سبھی تکالیف سے سوا تھی۔اس کی تڑپ اور کرب ناقابل بیان تھا۔جسمانی استحصال کا کریہہ عمل بھی تواتر سے جاری تھا۔دن رات یونہی ایک دوسرے کے پیچھے لپکتے رہے اور تبھی ایک روز گلاب کور کے پاؤں بھاری ہونے کی خبر ملی۔ان دونوں میاں بیوی کے قدم زمین پر ٹک ہی نہیں رہے تھے۔بلدیو نے اسے گھریلو کام کاج سے منع کر دیا۔

''تیرے پاؤں بستر سے نیچے نہ اتریں۔کام کاج کرنے کی بھی کوئی جرورت نہیں۔''

''تو گھر کون سنبھالے گا؟'' وہ شوہر کی اس محبت پر نہال تھی۔

''میں کسی نوکرانی کا بندوبست کر دوں گا۔تو چنتا نہ کر۔''

''نوکرانی رکھنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ وہ تو پہلے

مسلمان وہ پہلے لوگ تھے،جنہوں نے سائنس پر کماحقہ،توجہ دی۔بقول رابرٹ بریفالٹ سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح،تفتیش کے نئے طریقے،پیمائش ومشاہدہ کے نئے اسلوب ہیں۔جن سے یونانی بے خبر تھے۔یورپ میں اس روح اور اسالیب کو رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔یوں تو مسلمانوں کے طبعی کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔مگر بقول ڈاکٹر غلام جیلانی برق مختصراً یہ کہ انہوں نے روشنی،نظر، کسوف،خسوف،بادوباراں،حیوانیات،نباتات،خواص اشیاء وغیرہ پر لاتعداد کتب لکھیں۔گندھک اور شورے کا تیزاب بنایا۔الکحل سے کام لیا۔جرثقیل کے قوانین پہ روشنی ڈالی۔مالعات معاون اور سیماب وغیرہ کا وزن معلوم کیا۔نیز پہاڑوں اور سمندروں کے ذخائر پر بحث کی۔

طب میں اسلام نے ہزار ہا علما پیدا کیے۔جبریل بن بختیشوع یوحنا بن ماسویہ، الکندی رازی، ابن سینا، ابوالقاسم،ابن زہر،ابن خطیب اور ابن رشد جیسے سیکڑوں طبیبوں نے علم طب کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ڈاکٹر ڈریپر لکھتا ہے کہ چیچک کا ٹیکہ اور آپریشن کے کئی طریقے مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔

فلسفہ اور دیگر علوم مابعد الطبیعیات میں مسلمانوں نے بیش قیمت اضافے کیے۔یورپ میں صدیوں تک الکندی، ابن رشد،جاحفظ،ابن طفیل،امام غزالی اور ایسے کئی مسلمان مفکرین کا فلسفہ پڑھایا جاتا رہا۔ ریاضی میں عمر خیام، الخوارزمی ،ابوالوفا،ابن الہیثم اور موسیٰ بن شاکر جیسے علما کا کوئی جواب نہ تھا۔الجبرا،مثلثات اور دیگر کئی علوم ریاضی مسلمانوں ہی نے ایجاد کیے۔علم ہیت میں مسلمانوں کی اہم ایجاد اطرلاب تھی،جس سے ستاروں کا فاصلہ ناپا جاتا تھا۔علم تاریخ پہلی بار مسلمانوں ہی نے صحیح اور سائنسی بنیادوں پر مدون کیا۔واقدی ابن سعد بلاذری،ابن اثیر،طبری،ابن خلکان،ابن حجر،ابن عساکر اور ابن خلدون جیسے سیکڑوں مورخین نے وہ کام کیے جو آج بھی سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔علم لغت،ادب،شاعری،تصوف،موسیقی،حدیث،فقہ، علم الکلام اور ایسے سیکڑوں علوم میں مسلمان بڑی دسترس رکھتے تھے۔قرون وسطیٰ کی ثقافت میں علم کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ لوگ تحصیل علم کو فرض اولین اور کسب معاش کو فرض دوم سمجھتے تھے۔خصوصاً علم دین اور تصوف میں مسلمانوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ آج تک دیگر علوم کے ارباب بست وکشاد اس مقام تک نہیں پہنچ سکے۔

مرسلہ: یعقوب عثمانی، کراچی

سے ہی گھر میں موجود ہے۔'' گلابو تنفر سے بولی۔ ''اس کے لیے نئی زنجیر بنوا دو تا کہ گھر بھر میں گھوم پھر کر کام کرنے میں بھی کوئی اڑچن نہ آئے۔''

اس روز کے بعد رحیم خان اور نور بیگم کی نازوں پلی بیٹی بلدیو سنگھ اور گلاب کور کی ذاتی خادمہ بھی بن گئی۔ ایک طویل مدت کے بعد سورج کی روشنی اپنے وجود پر محسوس کر کے اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو بھر آئے۔ اسے پروردگار کی ذات سے انصاف کی کامل اُمید تھی۔ وہ بھاری زنجیر گھسیٹتے ہوئے دن بھر گلابو کی نگرانی میں گھر کے کام نمٹاتی اور رات کو بلدیو سنگھ کی وحشت و حیوانیت برداشت کیا کرتی۔

پہلے بیٹے کی پیدائش نے ان کے کروفر اور فرعونیت میں مزید اضافہ کر دیا۔ بچے کے 'نام کرن' کی تقریب زیب کے لیے ناقابل فراموش تھی۔ اس روز پانی کی طرح شراب کے بے تحاشا جام لنڈھانے کے بعد بلدیو اس کے رشتہ دار اور احباب نے اسے نوچنے کھسوٹنے کی انتہا کر دی۔ بے بسی اور اذیت سے وہ اس رات بلدیو کے پاؤں پڑ گئی۔

''مجھ پر رحم کرو۔ میری یہ سزا ختم کر دو۔ اب تو تمہیں اولاد کی محبت اور تڑپ کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ میں بھی کسی کی اولاد ہوں بلدیو سنگھ! مجھ سے یہ اذیت مزید برداشت نہیں ہوتی۔ رحم کرو خدا کے لیے۔''

''اب کیوں روتی ہے مورکھ! ہماری یہ خدمت تو تجھے مرتے دم تک کرنی ہوگی۔'' بلدیو اس کی حالت اور آنسو دیکھ کر قہقہے لگانے لگا اور زیب نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

☆......☆

اگلے پانچ سال میں گلاب کور نے تین بیٹوں اور ایک بیٹی کو جنم دیا۔

ان بچوں کے کام کاج کی تمام تر ذمہ داری بھی زیب ہی نبھا رہی تھی۔ چار صحت مند بچوں کی پیدائش نے ان دونوں کی زندگی میں بے حد خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ تکبر و نخوت اپنے اصل سے کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ ان چاروں بچوں کی پرورش خالصہ رنگ ڈھنگ اور مخصوص افکار کے تحت کی جا رہی تھی۔

زیب النساء کی زندگی اسی دائرہ میں مقید تھی۔ جنسی استحصال نے اس کے وجود میں ناتوانی پیدا کر دی تھی۔ اسے گمان تھا کہ بیٹی کی پیدائش کے بعد گلابو اور بلدیو کا دل پگھل جائے گا لیکن یہ بھی اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بے رحمی اور اذیت پسندی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ زیب کا بیرونی دنیا سے کوئی بھی رابطہ تھا نہ تعلق۔ گھر میں ہونے والی گفتگو سے اسے تہواروں کی آمد اور دنیاوی ہلچل کا اندازہ ہوتا تھا۔

بلدیو سنگھ کی ذاتی، معاشرتی اور قومی زندگی میں ہونے والی کوئی بھی مثبت یا منفی تبدیلی کا براہ راست نشانہ زیب کا وجود بنتا۔ خوشی، غمی کے مواقع پر بھی وہ اپنی افسردگی اور خوشی کا تاوان اسی کے جسم و جاں سے وصول کیا کرتے۔ بھارت کی پاکستان پر ناکام حملہ کی ہزیمت اس کے لیے بہت مہنگی ثابت ہوئی۔ زیب کے استخوانی وجود نے کئی روز دن رات ان گنت ہندو اور سکھ مردوں کی درندگی جھیلی اور نتیجتاً وہ اس قدر بیمار ہو گئی کہ بالآخر بلدیو کو ڈاکٹر کو گھر لا کر دکھانا پڑا۔

اس بیماری کے دوران زیب نے دل کی گہرائیوں سے اپنے لیے موت کی بے شمار دعائیں کیں لیکن زندگی اسے ابھی رہائی دینے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ ایک ماہ کے علاج اور ادویات کے استعمال سے وہ ایک بار پھر اسی دائرہ میں مقید ہو گئی۔

زیب النساء نے موت کی اس بے رخی پر ایک مکمل خاموشی اختیار کر کے اپنا وجود حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ بلدیو اور اس کے احباب کی آسودہ روانگی کے بعد اس کی آنکھوں سے اشکوں کی ایک جھڑی لگ جاتی اور وہ گہری سانس لیے آسمان کی جانب دیکھ کر پھر سے سر جھکا لیتی۔ اسے اب کسی بھی معجزہ کا انتظار نہ تھا۔

☆......☆

سردی، گرمی، بہار، خزاں، پت جھڑ تبدیل ہوتے رہے لیکن زیب کی زندگی پر ہنوز ایک ہی موسم طاری تھا۔ جبر و استبداد کا موسم۔

اس کی حالت اُس فصل کی سی تھی جسے اجاڑنے کے لیے جنگلی درندوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی لیکن وہ خاموش اور ساکت رہنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ اذیت کے اس سفر میں ایک کربناک لمحہ اس وقت آیا جب ایک یخ بستہ شب میں شراب کے نشے میں دھت بلدیو اس کی کوٹھڑی میں گھس آیا۔

''آج میں بہت خوش ہوں۔ ایسی خوشی تو میں نے تب بھی محسوس نہ کی تھی جب تجھے ایک ٹرافی کی طرح جیت کر یہاں لے آیا تھا۔'' وہ سرشاری سے بولا

''لگتا ہے آج پھر کسی ماں کی گود اجاڑ آئے ہو۔'' وہ تلخ ہوئی۔

''ایک نہیں ہزاروں ماؤں کی گود اجڑی ہے آج تیرے دیش میں۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''الٰہی خیر! کیا ہوا ہے وہاں؟'' زیب دہل گئی۔

''تیرے طاقتور بازوؤں والے سپاہیوں نے ہماری سینا کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔''

''نن... نہیں...... یہ ناممکن ہے...... تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہ بے یقین تھی۔

''میں نے کہا تھا ناں تجھے...... ہم اس دیش کو کھوکھلا کر دیں گے۔ آج بٹوارہ کرنے والوں کے دیش کا ہم نے بٹوارہ کر ڈالا۔ تمہارا پاکستان دو ٹکڑے ہو چکا ہے۔ اس کامیابی کا جشن ہم سب تیرے ساتھ منائیں گے۔'' اس کے ارادے جان کر زیب کے ہاتھ پاؤں بے جان ہونے لگے۔

اپنی قوم اور مذہب کا یہ دکھ زیب کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اسے زندگی میں آزادی کا ایک لمحہ بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ برسوں سے آنکھوں میں سجے خواب کی تعبیر جس وقت ممکن ہوئی تھی، اسے یرغمال بنا کر قید کر لیا گیا۔ اپنے وطن اور اپنے ہم مذہب افراد پر پڑنے والی اس افتاد نے اس کے رگ و پے میں حشر برپا کر دیا تھا لیکن اس قفس سے رہائی کی کوئی بھی صورت نظر ہی نہیں آتی تھی۔

جنون کے عالم میں وہ اپنا سر دیواروں سے پٹخ کر رہ جاتی۔ بہتے لہو سے چہرہ رنگین ہو جاتا لیکن موت پھر بھی مہربان نہیں ہوتی تھی۔

☆......☆

بلدیو سنگھ نے گھر میں ایک بار پھر تعمیراتی کام کا آغاز کروا دیا۔

زیب کی جسمانی نقدی ہوس کے بازار میں اپنی قدر و قیمت اب کھونے لگی تھی۔ اس نقدی سے مزید فائدہ اٹھانے کے لیے بلدیو نے بھارت کی نچلی آبادی سے اس کے دام کھرے شروع کر دیئے تھے۔ کچلے، مسلے اور جنسی آسودگی کے لیے ترساں افراد اس کارِ خیر میں بہت خوش و خرم رہتے۔ نشے کے عادی افراد کی آمد کے باعث وہ اپنی بیٹی اور بیوی کی موجودگی پر کچھ تحفظات میں مبتلا تھا۔ اس نے اپنے اہلخانہ کے لیے گھر میں ایک اور منزل تعمیر کروا کے انہیں وہاں منتقل کر دیا۔ نچلی منزل کی کوٹھڑی میں شیطانیت کا رقص اب بلاخوف و جھجک ہونے لگا۔

ہر گزرتا دن زیب کے لیے ایک نیا زخم اور تکلیف لیے طلوع ہوتا اور ہر رات کے اختتام پر وہ ایک ہی بات سوچتی؛

''آج ملنے والی اذیت سے بڑھ کر اور بھلا کیا ہوگا میرے لیے؟''

لیکن ہر بار اس کا یہ گمان غلط ثابت ہوتا۔ رحیم خان کی اس لاڈوں پلی اولاد کے لیے سب سے قیامت خیز گھڑی اس وقت آئی جب بلدیو کا سولہ سالہ بیٹا مہیش سنگھ ایک رات شراب کے نشے میں دھت اس کی کوٹھڑی میں در آیا اور اپنے باپ کی اس مفتوحہ ٹرافی کو اپنی درندگی کے نوکیلے پنجوں سے ادھیڑ دیا۔

پھر یہ ایک معمول بن گیا۔ مہیش کے ہم عمر دوستوں کی آمد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا تو آنے والے سالوں میں رام سنگھ اور راجیت سنگھ نے بھی اپنے علاوہ نوجوانی کے خمار میں مبتلا دوستوں کو اس کوٹھڑی کا مستقل راہی بنا دیا۔ یہ کم عمر خالصہ نوجوان بھی نفرت و وحشت میں اپنے بڑوں سے کم نہیں تھے۔ اس صورتِ حال کے بعد زیب ہذیان میں مبتلا ہو گئی۔

''اللہ کے قہر سے ڈرو بلدیو سنگھ! مجھ پر اب تو رحم کرو۔'' وہ بلک اٹھتی۔

''بس چند سال اور ہماری خدمت کر لے پھر تجھے ریٹائرمنٹ دے دوں گا...... اور تجھے ایک بار تیرے دیش کی یاترا کروانے کا وچن بھی پورا کرنا ہے مجھے۔'' وہ ہنس کر کہتا۔

''اپنی اولاد کے لیے اس حرام کمائی سے کیوں جہنم کا ایندھن اکٹھا کر رہے ہو؟ انہیں ابھی سے ایسی حرام کاری میں مبتلا کر کے اپنی نئی نسل کو تباہی کی طرف دھکیل رہے ہو۔'' اس کی تلخ گفتگو نے حسبِ سابق بلدیو کی برداشت کا پیمانہ لبریز کر دیا اور اس نے اپنے معمول کے مطابق زیب کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

وقت کے تھال میں لمحوں کے سکے اپنی مخصوص کھنکھناہٹ سے رقص کرتے رہے۔ بلدیو سنگھ، گلاب کور اور زیب النساء بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ اسی کی دہائی اپنے جلو میں بہت سے تغیرات لیے طلوع ہو گئی۔

بلدیو کے تینوں بیٹے پڑھائی لکھائی میں نکمل کورے تھے۔ وہ خالصہ تنظیموں سے وابستگی کے بعد مار دھاڑ اور لاقانونیت کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ گلاب کور کے لیے بیٹوں کی یہ دہشت اور غنڈہ گردی باعثِ فخر تھی۔ ہاں، البتہ ان کی بیٹی اپنے بھائیوں کے برعکس تھی۔ انیس سالہ مدھو ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ تعلیم اس کا جنون تھی اور اخلاقیات اس کا زیور۔ وہ بلدیو کے خاندان سے منفرد تھی۔

بیٹی کے میڈیکل کالج میں داخلہ کی خوشی اس سے

سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ وہ اپنی سبھی اولاد میں مدھو ہی سے سب سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ کالج آمدورفت کی ذمہ داری بھی اس نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ اس خوشی و سرشاری میں زیب کی قید میں آسانیاں پیدا کر دی گئیں۔ اس کی کوٹھڑی میں ایک برقی بلب لگانے کے بعد دیوار پر کیلنڈر آویزاں ہوا تو اس کے ساتھ ہی گلاب کور کے دل میں برسوں سے موجود ایک خلش عود آئی۔

''اس کے ہاتھ میں ایک کڑا بنوا کے پہنا دے بلدیو!''

''اس کی کیا جرورت ہے گلابو؟ اس کی اصل شناخت ہی برقرار رہنی چاہیے۔''

''ضرورت ہے...... بالکل ضرورت ہے...... تو چاہے تو اس کی زنجیریں کھول دے۔ اس عمر میں یہ بھاگ کر جائے گی بھی کہاں؟ لیکن اسے خالصہ کڑا پہنا دے۔ ان دونوں بہنوں کو اپنے دھارمک سمان کا بہت مان ہوتا تھا۔ مجھے کہتی تھیں کہ ہمارا سر کسی کے بھی آگے نہیں جھک سکتا۔ اسے کڑا پہنے دیکھوں گی تو دل کو بہت سکون ملے گا۔''

بلدیو نے اس کی بات تسلیم کر لی۔ زیب کی زنجیروں کے قفل کھلے تو وہ اپنے جسم پر موجود ان بیڑیوں کے نشان دیکھ کر کتنی ہی دیر بے آواز آنسوؤں سے روتی رہی۔

دھیرے دھیرے وہ گھر کے باہر چہل قدمی کے لیے بھی نکل جاتی۔ اپنے اردگرد خوش باش' چمکتے چہروں کو ویران نظروں سے دیکھتی تو اپنے پیاروں کے گم گشتہ وجود ذہن کے کواڑوں پر زوروشور سے دستک دینے لگتے۔ اسی دوران اسے مرکزی سڑک پر واقع ایک مزار نے اپنے سحر میں گرفتار کر لیا۔ وہ موقع ملتے ہی اس مزار میں پہنچ جاتی اور اپنا کڑا اتار کر عبادت کی لذت میں مگن ہو جاتی۔

وقت گذرتا رہا۔ بلدیو سنگھ کے تشدد کے باوجود وہ اپنا یہ نیا معمول ترک نہ کر سکی۔ اس کی قید سینتیس پڑاؤ عبور کر چکی تھی۔ ماہ ستمبر کا آغاز ہوتے ہی بلدیو کی کچھ پُراسرار سرگرمیوں پر گلاب کور ٹھٹک گئی۔

''یہ کن جھمیلوں میں پڑا ہے تو آج کل؟ مہیش بتا رہا تھا پاسپورٹ دفتر کے بہت چکر لگ رہے ہیں۔''

''ہاں! میں اپنا اور زیبو کا پاسپورٹ بنوا رہا ہوں۔ پاکستان کی یاترا کروانی ہے اسے۔'' بلدیو نے اطمینان سے کہا۔

''میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ کبھی کبھی بہت دل چاہتا ہے کہ اپنی جنم بھومی' قلعہ کے مینار' بڈھا دریا ایک بار پھر دیکھوں۔'' اس کی آنکھوں میں بے چینی اور لہجہ میں کسک عیاں تھی۔

''تجھے پھر کبھی لے جاؤں گا۔ ابھی تیرا یہاں رہنا جروری ہے۔ مدھو کے پرچے شروع ہونے والے ہیں اور دہلی کے حالات بھی آجکل اچھے نہیں۔ میں واپسی کے بعد یہاں سے سب کچھ سمیٹ کر امرتسر سیٹ ہونے کا سوچ رہا ہوں۔''

''رہنے دے باپو! ہم اپنا گھر بار کیوں چھوڑیں بھلا؟'' اجیت سنگھ نے تیوریاں چڑھائیں۔

''تو نہیں سمجھے گا اجیتے! میری نظریں بہت کچھ دیکھ رہی ہیں۔ نئی پردھان منتری نے خالصہ برادری کے خلاف بہت سے آدیش دے رکھے ہیں۔ خالصتان تحریک کے جرم میں ہر خالصے کو دیش دروہی سمجھا جا رہا ہے۔'' اس نے پیشانی مسلی۔ ''گھر کے اندرونی معاملے تیرے سپرد ہیں گلابو! اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔ اس مُسلی کی طرف کیول یہی ایک قرض باقی رہ گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے تو بے فکر ہو جا۔ ہم یہاں اتنے سالوں سے رہ رہے ہیں۔ سب اپنے ہی تو ہیں۔ ڈر کاہے کا بھلا؟'' وہ بے پروائی سے بولی۔

دو روز بعد بلدیو زیب النساء کو لکشمی کور کے جعلی پاسپورٹ کی مدد سے پاکستان لے آیا۔ زیب کے لیے اس تصوراتی وطن میں آمد ایک انوکھا تجربہ تھی۔ لاہور آمد اس کے لیے بہت دردناک مرحلہ تھی۔ ۳۷ سال قبل وہ اسی دھرتی میں آزاد پنچھی کی طرح والدین کے شفیق سائے میں رہتی تھی۔ یہاں ہر ایک چپہ اس کے وجود اور شناخت کا گواہ تھا لیکن آج اردگرد نظر آتے لوگوں کے ساتھ ساتھ فضائیں' شجر' بیل بوٹے' راہیں بھی اسے اجنبیوں ہی کی طرح تک رہی تھیں۔

اسی شام بلدیو اسے قلعہ لچھمن سنگھ کے اسی محلہ میں لے گیا جہاں اس نے اپنی زندگی کا خوبصورت ترین دور گذارا تھا۔ علاقہ کے لوگوں نے بہت خوشدلی سے ان کا استقبال کیا۔ نمبردار کی بیٹھک میں انہیں بادام ملا دودھ پیش کیا گیا۔

''خیر سے آنا ہوا سردار جی!'' نمبردار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی جناب! بٹوارے کے وقت ہم دونوں یہیں اسی محلّہ میں رہتے تھے۔ تقدیر کی گھمن گھیری ہمیں اپنے ساتھ

اڑائے ہندوستان لے گئی لیکن جنم بھومی کی کشش کبھی بھی ختم نہ ہو سکی۔ اپنے ماضی کو ایک بار محسوس کرنے کے لیے چلے آئے ہیں۔'' وہ اپنے چہرے پر غمگین تاثرات سجائے بولا۔

''ست بسم اللہ پتر! جم جم آؤ یہاں۔ میں تو خود یہاں پرکھوں کے وقت سے رہ رہا ہوں۔ اس علاقہ میں دو نسلیں میرے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوئی ہیں۔ بٹوارے کے وقت میری عمر بھی یہی کوئی تیس سال ہو گی۔'' اس کے انکشاف پر زیب چونک گئی۔

''بلراج سنگھ سے آپ واقف ہی ہوں گے یقیناً۔'' بلدیو نے دانستہ استفسار کیا۔

''بالکل واقف ہوں۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی شاید۔'' حشمت علی ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''جی ہاں! گلاب کور...... اور بلراج سنگھ میرے سگے چچا تھے۔''

''بہت خوب! بہت خوب! ان سے ہماری بہت اچھی یاد اللہ تھی۔ اس نسبت سے آپ سے قلبی تعلق بنتا ہے ہمارا۔''

''رحیم خان اور نور بیگم سے بھی آشنا ہوں گے آپ؟'' زیب نے دھیرے سے پوچھا۔

''کہیں آپ اس رحیم خان کی بابت تو نہیں پوچھ رہیں جو کپڑے کے بیوپاری تھے اور ان کی دو بیٹیاں تھیں'' حشمت نے ایک بار پھر ذہن کریدا۔

''جی ہاں! بالکل وہی۔'' زیب کی دھڑکن منتشر ہو گئی۔

''آہ بڑا بدقسمت گھرانا تھا وہ بھی۔ دولت کی ریل پیل تھی ان کے یہاں۔ لیکن چھوٹی بیٹی کی گمشدگی نے سب کچھ تباہ و برباد کر دیا۔'' وہ آزردہ ہوا۔

''کک...... کیا ہوا انہیں؟''

''شنید یہی تھا کہ ان کی بیٹی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ روپوش ہو گئی تھی۔ اسی صدمہ نے پہلے نور بیگم کی جان لی۔ رحیم خان بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور بیٹی کی تلاش میں ہندوستان تک جا پہنچے لیکن وہ گمشدہ ہوتی تو انہیں مل بھی جاتی...... وہ یقیناً کسی آشنا کے ساتھ اپنی مرضی سے فرار ہوئی تھی۔ رحیم کے ساتھ ان کا ایک ملازم بھی گیا تھا۔ اسی نے واپس آ کر بتایا کہ موہالی میں ان کی وفات کے بعد وہیں تدفین کر دی گئی تھی۔'' حشمت کے انکشافات نے زیب کے وجود کو یکلخت پارہ پارہ کر دیا۔

''اور ان کا گھر، دکان وغیرہ؟''

''بڑی بیٹی کے شوہر نے سب کچھ فروخت کر دیا تھا۔ اس کے بعد انہیں بھی کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔''

زیب النساء کا وجود سناٹوں کی زد میں تھا۔ بلدیو سنگھ کی استہزائیہ مسکراہٹ بھی اس سے اوجھل نہ تھی۔ حشمت علی انہیں اپنے ہمراہ لیے علاقے کے سبھی پرانے گھرانوں سے متعارف کرواتا رہا اور ایک پُرخلوص شاندار ضیافت اڑانے کے بعد بلدیو اس کے ساتھ لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر و تفریح میں مگن ہو گیا۔

رحیم خان کے ساتھ بچپن میں وہ بارہا ان سبھی جگہوں پر آ چکی تھی لیکن آج یہ جانے پہچانے مقام بھی اسے لکشمی کور کی گردان کر اجنبی نگاہوں سے تک رہے تھے۔ قلعہ کے در و دیوار، بادشاہی مسجد کے عظیم الشان مینار، راوی کا بہتا پانی، علی ہجویری کے مزار کی رونقیں اور چوبرجی کے چاروں مینار اس کے دل میں کرب بڑھانے لگے۔ وہ لمحات اس کے لیے بہت بھاری تھے۔ اس رات ہوٹل کے کمرے میں وہ ایک بار پھر بلدیو کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی ہو گئی۔

''مجھے واپس لے چلو بلدیو! میں ساری زندگی تمہاری دی ہوئی اذیتیں سہتی آئی ہوں لیکن اس درد کا کوئی درماں نہیں ہے۔ مجھے اسی قفس میں واپس لے چلو۔''

''اتنی جلدی بھی کیا۔ ہے زیب النساء؟ ابھی تو تمہاری قوم کے اور بھی بہت سے روپ دکھانے ہیں تمہیں۔'' وہ اپنے مخصوص زہریلے لہجے میں بولا۔

''مجھے کچھ نہیں دیکھنا اب اور کچھ نہیں دیکھنا۔'' وہ اپنا سر دائیں بائیں جھٹکنے لگی۔

☆......☆

اگلی صبح بہت ہنگامہ خیز تھی۔

اخبار اور ریڈیو میں بھارتی پردھان منتری کی اپنے سکھ باڈی گارڈ کے ہاتھوں ہلاکت کی خبر نے بلدیو سنگھ کا چہرہ فق کر دیا۔

''بہت غلط ہوا ہے یہ...... سامان وغیرہ سمیٹ لو زیبو! میں ٹکٹوں کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔ واہگرو! میرے بیوی بچوں کی حفاظت کرنا۔'' وہ عجلت میں کہتا روانہ ہو گیا۔

ٹکٹوں کا انتظام ہوتے ہی وہ دہلی لوٹ گئے جہاں ایک قیامت بلدیو کی منتظر تھی۔

مدھو دو روز سے لاپتا تھی۔ گلاب کور سے اپنی ایک سہیلی نیہا کی سالگرہ میں شرکت کی اجازت لیے وہ سہ پہر کے وقت گھر سے روانہ ہوئی تو رام سنگھ اسے خود اپنی معیت میں نیہا کے گھر

چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ اپنی کچھ مصروفیت کے سبب اس کے دیئے گئے وقت سے ایک گھنٹا تاخیر سے پہنچا تو مدھو وہاں موجود نہ تھی۔ نیہا بھی اس کی روانگی کی بابت کچھ نہیں جانتی تھی۔

''میں کچھ مہمانوں میں مصروف تھی رام! مجھے علم نہیں ہوا کہ وہ کب اور کس کے ساتھ روانہ ہوئی۔'' اس کے دوٹوک جواب نے اسے بوکھلا دیا۔

گلاب کور کے حواس بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ دیوانہ وار آس پاس کے سبھی علاقوں اور کالج تک جا پہنچی لیکن مدھو کو جانے زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ وہ سینہ کوبی کرتی بیٹی کو یاد کرتے ہوئے بین ڈالتی لیکن بے سود۔ مہیش، رام اور اجیت نے بھی اس دوران اپنے تعلقات کی ڈوریاں ہلائیں مگر ناکامی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

بلدیو سنگھ یہ صورتِ حال جان کر اپنے ذہن پر قابو نہ رکھ سکا اور مغلظات بکتا ہوا گلابو پر پل پڑا۔

''تجھے کہہ کر گیا تھا کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ بیٹی کی حفاظت تیرے ذمہ لگائی تھی میں نے۔ تو ہی ذمہ دار ہے اس حادثہ کی...... میں تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ اسے ٹھوکروں کی زد میں رکھتے ہوئے چلایا۔

''میرا کوئی دوش نہیں...... نیہا خود میرے پاس آ گیا لینے آئی تھی...... میں کیسے انکار کر دیتی...... وہ مدھو کے بچپن کی سکھی ہے...... اس کے ماتا پتا سے بھی میل جول ہے ہمارا۔'' وہ کراہتے ہوئے بولی لیکن بلدیو کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔

''فکر نہ کر گلابو! مدھو مل جائے گی...... ضرور مل جائے گی۔'' زیب نے سپاٹ لہجہ میں کہا اور اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔

بلدیو سنگھ نے بیٹی کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دیئے۔ دہلی کے سیاسی حالات اس کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ خالصہ برادری سیاسی اور معاشرتی عتاب کی زد میں تھی۔ ہندو اپنی پردھان منتری کی موت پر خون آشام درندے بن چکے تھے۔ دہلی کے گلی کوچوں میں سکھوں کا قتلِ عام جاری تھا۔ ان کے گھر، کاروباری مراکز نذرِ آتش کیے جانے لگے۔ ان کی آمد کے اگلے ہی روز پولیس اچانک وارد ہو گئی۔

''اجیت سنگھ اور مہیش سنگھ کہاں ہیں؟'' ایک افسر نے درشتی سے پوچھا۔

''مجھے علم نہیں۔'' بلدیو نے جواب دیا۔

''تو پھر کسے علم ہے سردار جی؟ خاموشی سے انہیں تھانہ میں حاضر کر دو ورنہ تیرے پورے گھر کو بھسم کر دوں گا۔''

''انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم تو خود ان کی تلاش میں ہیں۔'' بلدیو کے سبھی کس بل نکل چکے تھے۔

''ہمیں پکی خبر ملی ہے کہ پردھان منتری کے باڈی گارڈ کا تمہارے تینوں بیٹوں کے ساتھ گہرا یارانہ تھا۔ وہ اب قانون کی گرفت سے کبھی نہیں بچ سکتے۔ آج نہیں تو کل، میں انہیں ڈھونڈ ہی نکالوں گا۔'' رمیش نامی اس افسر کا لہجہ بہت خونخوار تھا۔ بلدیو اور گلابو کے جسم میں پھریری دوڑ گئی۔

''میری بیٹی کا کچھ پتا چلا صاحب؟ ہم نے دو روز پہلے رپورٹ درج کروائی تھی۔'' گلاب کور نے روتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اپنے کسی عاشق کے ساتھ بھاگ ہو گی شریمتی جی! چنتا نہ کرو دو چار روز میں جب اس عاشق کا دل بھر جائے گا تو لوٹ آئے گی ورنہ کسی کوٹھے پر پہنچ جائے گی۔ ایسی لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔'' وہ بے رخی سے بولا۔

رمیش اپنے دو سپاہی وہیں تعینات کر کے روانہ ہو گیا۔

رات ہوتے ہی بلدیو کا ایک دیرینہ دوست موہن سنگھ ایک بڑی خبر لیے اس سے ملنے چلا آیا۔

''مجھے رام سنگھ نے تیرے پاس بھیجا ہے بلو۔ مدھو مل گئی ہے۔'' اس کا لہجہ گھمبیر تھا۔

''کہاں ہے میری بیٹی؟ اور رام خود کیوں نہیں آیا؟'' وہ بیتابی سے بولا۔

''چھپ گیا ہے کیا؟ باہر پولیس ان کے سواگت کے لیے کھڑی ہے۔ وہ تینوں کیسے آسکتے ہیں بھلا؟ اور مدھو کے بارے میں بھی کوئی اچھی خبر نہیں ہے میرے پاس۔'' موہن نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ''وہ نیہا کے بھائیوں کے چنگل میں تھی۔ مہیش، رام اور اجیت کا تعلق خالصتان کے کچھ حمایتیوں سے تھا۔ وہ بہت سے لوگوں کی نظر میں کھٹکتے تھے۔ اسی لیے نیہا کے بھائیوں نے مدھو کو اغواء کے بعد قید کر لیا اور پھر'' وہ اپنے ہاتھ بے چینی سے مسلنے لگا۔

''پھر کیا موہن؟'' بلدیو کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

''وہ اپنے کئی دوستوں کے ساتھ اس کی عزت سے کھلواڑ کرتے رہے...... وہ کومل لڑکی یہ درندگی سہہ نہیں پائی اور موت کو گلے لگا لیا۔ نیہا کے بھائی اس کی لاش ٹھکانے لگانے کے دوران ہی رام کی نظر میں آئے تھے۔'' موہن کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی چمک تھی۔

بلدیو سنگھ کا وجود ساکت اور بصارت پتھرا گئی۔ اسے

اپنی سماعت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ موہن تعزیت کرتا روانہ ہوگیا لیکن اس کے وجود میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ گلاب کور بھی دیوانہ وار اپنا سر دیواروں سے ٹکرانے لگی۔ اس کا ماتم اور تڑپ پتھروں کا کلیجہ بھی شق کررہا تھا۔ زیب دھیرے دھیرے چلتی کمرے کی دہلیز پر آئی اور نم آواز میں بولی۔

''میں کہتی تھی ناں بلدیو! اپنی اولاد کے لیے آگ اکٹھی نہ کرو۔ لیکن تم نہ مانے۔ شکر کرو گلابو کہ وہ مرگئی...... شکر کرو تمہاری بیٹی پر موت مہربان ہوگئی۔ مجھے اس کی خوش قسمتی سے جلن ہونے لگی ہے۔ اگر وہ زندہ رہتی تو ہر روز ایک نئی موت مرتی...... مجھے تو سمجھ ہی نہیں آرہی کہ رب کے اس انصاف پر خوشی محسوس کروں یا ایک اور عورت کی تذلیل کا ماتم۔'' وہ بے ربط انداز میں کہتی چلی گئی۔ بلدیو اور گلاب کور کی حالت مردوں سے بھی بدتر تھی۔

وہ بوجھل دل لیے اپنا وجود گھسیٹتی اس قفس سے باہر نکل گئی۔

☆......☆

مزار کے در و دیوار پر شام کا سرمئی پنچھی سایہ فگن تھا۔ زائرین میں لنگر تقسیم کرنے کے بعد اس نے صفائی ستھرائی کا آغاز کردیا۔ ملکی حالات کے پیشِ نظر شام ڈھلتے ہی لوگ اپنے گھروں میں محبوس ہونے کو ترجیح دیتے تھے۔ فرش کی دھلائی کے بعد اس نے وضو کیا اور نمازِ عشاء کی ادائیگی میں مشغول ہوگئی۔

نماز مکمل ہونے کے بعد وہ کتنی ہی دیر وہیں بیٹھی بے آواز آنسوؤں سے روتی رہی۔ یہ آنسو اس کے بہت وفادار ساتھی تھے۔ کسی بھی لمحہ اسے تنہا چھوڑتے ہی نہ تھے۔ دفعتاً اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے گہری سانس لیتے جائے نماز لپیٹی اور ایک ستون کے ساتھ سر جھکائے بیٹھ گئی۔

''کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے اپنے مستقبل کے متعلق زیب؟'' مجاور کی شفیق آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

زیب النساء اپنے قفس سے رہائی کے بعد یہاں آگئی تھی۔ بارعب شخصیت، نرم خو اور دھیمے مزاج کے مالک اسد اللہ اسے پہلے بھی کئی بار یہاں آتے جاتے دیکھ چکے تھے۔ اس کی ظاہری شخصیت کا تضاد ان کے لیے بہت حیران کن تھا۔ زیب نے انہیں اپنی داستانِ حیات سنانے کے بعد مزار کے کام کاج سنبھالنے کی درخواست کی تھی جسے انہوں نے وقتی طور پر تو تسلیم کرلیا لیکن اس کے محفوظ مستقبل کے لیے وہ بہت فکرمند رہتے۔

''میرے دل و دماغ پر اب بھی ایک دھند چھائی ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ میں بچی کھچی زندگی یہیں بسر کرلوں؟''

''اس میں بھی بہت سی مشکلات ہیں۔ آپ اپنے وطن واپس لوٹ جایئے۔'' انہوں نے مخلصانہ تجویز دی۔

''وطن...... میرا تو کوئی بھی وطن نہیں۔ میری یہاں منتقلی کے وقت میں برٹش راج کے زیر تسلط ہندوستان کی شہری تھی۔ لیکن پھر میری کوئی شناخت ہی نہ رہی۔ میں ملک و قوم کے معاملہ میں یتیم ہوں۔ میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔''

''آپ بلدیو سنگھ کے ساتھ اپنے شہر سے واپس کیوں آگئیں؟ ذرا سی ہمت آپ کو اصل شناخت لوٹا دیتی۔''

''میں بہت خوفزدہ تھی...... وہ لوگ میرے ہم مذہب ہم قوم تھے لیکن کوئی بھی مجھے پہچان ہی نہ سکا۔ میں ان کے انداز سے خوفزدہ تھی۔ وہ اپنے گھروں میں بھارتی فلمیں دیکھتے، بھارتی گانے بجاتے ہیں۔ ان کی لڑکیاں اور لڑکے بھارتی اداکاروں کی نقالی کرتے ہیں۔ وہ بلدیو سنگھ کو اپنا بیٹا، بھائی کہہ کر گلے لگاتے رہے۔ ان کی شاندار زندگیوں کے پیچھے مجھ جیسی جانے کتنی حرماں نصیب عورتوں کی آہیں اور سسکیاں ہیں لیکن ایک بار بھی میرے وجود کا کرب نہ پہچان سکے۔ میری ذات سے منسوب خرافات سن کر میں نے سوچا کہ میں انہیں کبھی اپنی پارسائی کا یقین نہیں دلاسکوں گی۔ وہ لوگ بھی میری ہی طرح ایک قیدی تھے۔ جھوٹے بھرم، نفس اور شان و شوکت کے قیدی۔ وہاں مستقل رہائش کے بعد میں ایک اور اذیت میں مبتلا ہوجاتی۔ مجھے ماضی تلاشنے کا بہت شوق ہوا کرتا تھا اور وہاں ایسی تلاش میرے بچے کھچے وجود کو مزید ریزہ ریزہ کردیتی...... میں اپنے قفس میں لوٹ آئی اور اب بھی شب و روز میری ایک ہی دعا ہے کہ میری اس لاعلم قوم کو عقل و شعور اور بصیرت عطا ہو ورنہ انہیں علم ہی نہیں کہ قوموں کی کوتاہیاں ان کی بے قصور بیٹیوں کو ایسے زندان میں قید کردیتی ہیں جہاں سے رہائی ممکن ہی نہیں ہوتی۔'' زیب نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے طاق میں رکھا قرآن پاک تھاما اور تلاوت کا آغاز کردیا۔

مجاور اپنے کمرے میں بیٹھا بندیو کے پتے پر پاکستان سے آئے مہرالنساء کے خط کا جواب لکھ رہا تھا۔ پندرہ صفحے میں اس پر گزرے واقعات لکھنے کے بعد اس نے لکھا۔ ''قید میں اسے موت نہ آئی مگر جب قفس سے آزادی ملی تو وہ ابدی نیند سوگئی۔''

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

سرگزشت کافی عرصہ سے زیر مطالعہ ہے۔ پہلی بار میں نے اس کے لیے کچھ بھیجا ہے۔ یہ میرے لیے ایک ناقابلِ فراموش واقعہ اس لیے ہے کہ اس واقعے کو کہانی کے انداز میں لکھا ہے۔ امید ہے کہ پسند آئے گا۔

اشعر جمال

(کراچی)

اس نے اپنے ہونٹوں پر سرخی جمائی اور پلٹ کر بولی۔

''میری جان صرف پانچ منٹ دے دو، میں ابھی آئی۔''

میں اس کی طرف دکھ سے دیکھتا رہ گیا۔

خدا نے کیا حسن دیا تھا اسے۔ پتلے ہونٹ، بہترین قامت، چھریرا جسم، نازک نقش ونگار۔ سب کچھ مکمل تھا لیکن میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ پانچ منٹ بعد وہ کمرے میں آگیا تھا۔

اس نے ایک پھولدار فراک پہن لی تھی۔ اسی کلر کی

شلوار تھی۔ اس کے خوب صورت بال کھلے ہوئے تھے۔
"کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"بہت خوب صورت۔" میں نے کہا۔
"یار! پوری دنیا میں ایک تم ہی ہو جو مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔" اس نے کہا۔ "ورنہ یہاں تو...... خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ آج کہاں چلیں، میرا دل تو پزا کھانے کو چاہ رہا ہے۔"
"لیکن میں تمہارے اس حلیے میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔"
"ارے ظالم۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "یہی تو میرا اصل ہے۔ خیر تم کو اچھا نہیں لگتا تو میں چینج کر کے آتی ہوں۔"
وہ پھر دوسرے کمرے میں چلا گیا (چلی گئی)
میں اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کو اچھی پینٹنگ جمع کرنے کا شوق تھا اور خود بھی کئی کامیاب ریپلیکا بنا چکا تھا۔ میری اس سے دوستی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھ سے بہت قریب ہو گیا تھا۔
وہ دن مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے جب میں انٹرویو کے لیے اسٹار وارنر میں گیا تھا۔ وہ دواؤں کے سب سے بڑے امپورٹر تھے۔ میں اخبار میں ویکنسی دیکھ کر گیا تھا۔
کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے مجھ سے پوچھا۔ "جمال صاحب! کیا آپ نے مسٹر روشن سے ملاقات کا وقت لیا ہے؟"
"نہیں جناب۔ میں نے کسی سے وقت نہیں لیا۔ ویسے یہ روشن صاحب کون ہیں؟"
"یہ اس فرم کے منیجر ہیں۔" ریسپشنسٹ نے بتایا۔
"ان کی عادت ہے کہ بغیر اپائنٹمنٹ کے کسی سے نہیں ملتے۔"
"بھائی میں بہت دور سے آیا ہوں اور اخبار میں اشتہار دیکھ کر آیا ہوں۔"
"شاید آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ اس میں لکھا ہے کہ بغیر فون کیے انٹرویو کے لیے نہیں آئیں۔"
"ہاں یہ غلطی ہو گئی۔ میں نے دیکھا تھا......" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن پلیز کسی طرح ان سے بات کرا دیں۔ میں بہت دور سے آیا ہوں۔"
اس کو شاید مجھ پر رحم آ گیا۔ اس نے انٹرکام پر کچھ بات کی اور دوسری طرف سے اجازت ملنے پر ایک کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ "وہ سامنے والا کمرا روشن صاحب کا ہے۔ سیدھے چلے جائیں۔"
میں اس کا شکریہ ادا کر کے اس کمرے تک چلا گیا۔

دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک نرم سی آواز آئی۔ "کم ان۔"
میں کمرے میں داخل ہوا تو سامنے میز کے پیچھے کرسی پر جو بیٹھا تھا، وہ نرم و نازک سا چہرہ مجھے پہلی نظر میں بہت اچھا لگا تھا۔ مرد ہونے کے باوجود اس میں ایک خاص قسم کی کشش تھی۔
میں اس کی شاندار میز سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔
"تشریف رکھیں۔" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔
اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "نام کیا ہے آپ کا؟"
"جی میرا نام اشعر ہے۔" میں نے بتایا۔ "آپ کے پاس میری فائل رکھی ہو گی۔"
"جی ہاں، آپ کی فائل ہے میرے پاس۔" اس نے میز پر سے میری فائل اٹھالی۔ اس میں ننھی سی وی دیکھنے لگا۔ "اوہ مائی گاڈ۔" وہ ایک خاص ادا سے بولا۔ "آپ تو بہت پڑھے لکھے انسان ہیں۔"
"جی سر۔ اس کے باوجود آج تک ڈھنگ کی جاب نہیں ملی ہے۔"
"کوئی بات نہیں اب مل جائے گی۔" اس نے کہا۔
وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ کچھ کہنا چاہا تھا کہ فون کی گھنٹی بول اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر گفتگو شروع کر دی۔
اس دوران میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس میں ایک خاص قسم کی نسوانیت تھی۔ ایسی نسوانیت جس میں مردانہ پن بھی شامل ہو۔ یا ایسا زنانہ پن جس میں کسی حد تک مردانہ پن کا شبہ ہو۔
وہ لچک لچک کر باتیں کر رہا تھا۔ ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب انسان دونوں کے بیچ میں ہوتا ہے۔
بعد میں میرا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ وہ فون پر باتیں کرتا رہا اور میں اس کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ وہ ایک کمال کا آدمی تھا۔ اس نے اپنے کمرے کو بھی خوب صورت پینٹنگ سے سجا رکھا تھا جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک باذوق انسان ہے۔
فون پر باتیں ختم کر کے اس نے میری طرف دیکھا۔
"میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ کمرے میں لگی تصویروں کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔" اس نے کہا۔
"یس سر، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ یہ تصویریں ریپلیکا ہیں۔ اس کے باوجود جس نے بھی بنائی ہیں، بہت اچھی بنائی

تھے۔“

”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ریپلیکا ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ اوریجنل بھی تو ہوسکتی ہیں۔“

”نو سر! یہ اصلی ہو نہیں سکتیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے بھی پینٹنگ سے بہت دلچسپی ہے۔ میں مشہور لوگوں کے کاموں سے واقف ہوں۔“

”چلیں مان لیا کہ یہ ریپلیکا ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ یہ بتائیں یہ ہیں کیسی؟“

”بہت زبردست۔“ میں نے تعریف کی۔ ”جس نے بھی بنائی ہیں، حق ادا کر دیا ہے۔“

”مسٹر اشعر! یہ سب میری پینٹنگز ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”بہت زبردست......“ میں نے تعریف کی۔ ”کمال کر دیا ہے آپ نے......“

تو یہ تھی میری اس سے دوستی کی ابتدا۔ حالانکہ میں نے اس کے دفتر میں صرف ایک ہفتے جاب کی تھی۔ کیونکہ مجھے ایک اور جگہ جاب مل گئی تھی۔ اس کے باوجود ہمارے درمیان اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ اس نے اپنا موبائل نمبر دے دیا تھا۔ ہماری روزانہ ہی باتیں ہوا کرتیں۔ وہ زیادہ تر میرے بارے میں سوالات کیا کرتا جبکہ مجھے اس کے بارے میں بہت کم جاننے کا موقع ملا تھا۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ”تم آج میرے فلیٹ آجاؤ۔ میں نے ایک خاص ڈش بنائی ہے۔“

”مجھے تو تمہارا فلیٹ نہیں معلوم۔“

اس نے اپنا ایڈریس سمجھا دیا۔

میں اس کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں جاکر پتا چلا کہ اس کا فلیٹ ایک شاندار بنگلے کی طرح تھا۔ بہت خوب صورتی سے سجا ہوا۔ فرنیچر بھی قیمتی تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہر چیز میں ایک خاص قسم کا ذوق نمایاں ہو رہا تھا۔ دیواروں پر خوب صورت پینٹنگز تھیں جو یقیناً اسی کی بنائی ہوئی ہوں گی۔

جب تک میں اس کے کمرے کا جائزہ لیتا رہا وہ میری طرف دیکھتا رہا تھا۔

”کیوں، کیسا لگا میرا ڈرائنگ روم؟“

”بہت خوب صورت۔“ میں نے تعریف کی۔

”یہ پینٹنگز بھی میری بنائی ہوئی ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”ہاں مجھے اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا تم اس فلیٹ میں اکیلے رہتے ہو؟“

”ہاں بالکل اکیلا۔ کیونکہ میرا کوئی نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟ کوئی تو ہوگا؟“

”نہیں کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں نہ باپ۔ نہ بھائی نہ بہن۔ کوئی نہیں۔ صرف میں ہوں اور میری پھوپی ہیں جو میرا سب کچھ ہیں۔“

”وہ پھوپی بھی ساتھ نہیں رہتیں؟“

وہ ہنس پڑا۔ ”کیا بات ہے۔ کیا میرا انٹرویو لینے آئے ہو؟“

”ایسا ہی سمجھ لو۔ روشن بات یہ ہے کہ تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو لیکن میں کچھ نہیں جانتا۔“

”کیا جاننا چاہتے ہو؟“

”یہی کہ تمہارا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔“

”اگر جاننا ہی چاہتے ہو تو اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ نہیں، پہلے وہ ڈش کھالو جو میں نے تیار کی ہے۔ اس کے بعد اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“ اس نے کہا۔

وہ کچن سے کباب اور چائے لے کر آگیا۔ وہ خاص ڈش شامی کباب ہی تھے اور واقعی بہت لذیذ تھے۔ اتنے شاندار شامی کباب میں نے پہلے کبھی نہیں کھائے ہوں گے۔

اس سے فارغ ہوئے تو اس نے کہا۔ ”اب تم آرام سے بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔“

وہ اندر والے کمرے میں چلا گیا۔ اس دوران میں اس کی بنائی پینٹنگز دیکھتا رہا۔ اس نے کمال کر دیا تھا۔ میں بھی چونکہ اس فن سے کسی حد تک واقف ہوں اسی لیے مجھے باریکیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد اندر سے ایک لڑکی باہر آئی۔ میں اس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ اس نے ساڑی باندھ رکھی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ میرے قریب آئی اور اس نے اچانک میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔ میں بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ہنس پڑی۔ خدا کی پناہ یہ تو وہی تھا روشن۔

”یہی تو میرا اصل ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم میرے بارے میں جاننا چاہتے تھے نا۔ تو جان لو کہ میری اصلیت کیا ہے۔ میں کون ہوں۔“

”روشن! تم......تم لڑکی ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں میں لڑکی بھی نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔

''تو پھر؟''

''تم خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کون ہو سکتی ہوں؟''
اس بار اس کے لہجے میں دکھ تھا۔ ''اشعر! میں خدا کی وہ مخلوق ہوں جس کو پیدا کرنے کے بعد ایک نام دیا گیا ہے۔ میں دونوں کے درمیان ہوں۔ یہ تم جو سڑکوں اور گلیوں میں ہم جیسوں کو ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائے اور ڈھول بجاتے، بھیک مانگتے دیکھا کرتے ہو۔ میں ان ہی میں سے ایک ہوں۔ وہی میری برادری ہے۔ وہی میرا خاندان ہے۔ وہی میرے رشتے دار ہیں۔''

میں حیرت اور دکھ سے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کس بلا کا دکھ تھا اس کی باتوں میں۔ کیسا کرب تھا۔

''روشن! یہ تم نے جو تعلیم حاصل کی ہے اور اتنے اچھے عہدے پر ہو۔ یہ سب کیسے ہوا؟''

''یہ سب میری پھوپی کی وجہ سے ہو سکا ہے۔ اس نے مجھے اس قابل بنایا ہے کہ میں آج اس مقام پر ہوں۔''

''روشن! کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے ماں باپ کون ہیں؟''

''ہاں جانتا ہوں لیکن وہ اب میرے کوئی نہیں ہیں۔'' اس نے یاسیت سے کہا۔

''روشن! میں تو چکرا کر رہ گیا ہوں لیکن میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو اسی وقت مجھے کچھ گڑبڑ کا خیال آیا تھا۔ تمہاری شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی جو نیچرل نہیں لگ رہی تھی۔ خاص طور پر تمہارے باتیں کرنے کا انداز۔ یہ سب مجھے کچھ سمجھا رہا تھا لیکن میں کھل کر کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔''

''ہاں مجھے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید تمہیں مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایک بات بتاؤ، کیا تمہارے دفتر والے اس بات کو جانتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں سب جانتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میرا عہدہ اور میری صلاحیتیں ایسی ہیں کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکتے۔ میں نے اپنے کام سے ثابت کر دیا ہے کہ ہزار مردوں پر بھاری ہوں۔ اس فرم کے ڈائریکٹر تک میرا خیال رکھتے ہیں۔ میرا احترام کرتے ہیں۔''

''روشن! تم تو ایک باکمال آدمی ثابت ہوئے ہو، ورنہ عام طور پر، معاف کرنا میرا مطلب ہے کہ عام طور پر.....''

''ہم جیسے لوگ گلیوں اور سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔'' اس نے میرا جملہ مکمل کر دیا۔

''ہاں، میں یہی کہنا چاہتا تھا۔''

''میں نے اپنی پھوپی کے بارے میں جو بتایا ہے، یہ سب انہی کی مہربانی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہاں، تم سے ایک کام ہے۔''

''ضرور بتاؤ، مجھے تمہارا کام کر کے خوشی ہوگی۔''

''دیکھو، میں یہ چاہتا ہوں کہ میری پھوپی میرے ساتھ رہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں ان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ ہمیشہ انکار کر دیتی ہیں۔ کیا تم میرے لیے انہیں اس بات پر راضی کر سکتے ہو؟''

''میں پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک خوش قسمت عورت ہیں جنہیں تم جیسا بھتیجا ملا ہے۔''

''تو پھر کل دفتر آجاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''ہم کل وہیں سے چلیں گے۔''

میں اپنے گھر واپس آگیا۔ مگر سوچیں پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ حیرت انگیز صورت حال تھی۔ کیا خوب صورت نوجوان تھا (تھی) کیسی زندگی گزاری ہوگی اس نے۔ اعلیٰ تعلیم کیسے حاصل کی ہوگی۔ اتنے اچھے عہدے پر کس طرح پہنچا ہوگا۔ ابھی اس کی زندگی کے بہت سے صفحات میری نگاہوں سے اوجھل تھے۔ بہرحال اس کی پھوپی سے بہت سی باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔

میں دوسری شام اس کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ اس وقت کسی میٹنگ میں مصروف تھا۔ میں اس کے کمرے میں ہی بیٹھ گیا تھا۔ اب سب مجھے پہچاننے لگے تھے کہ میں روشن صاحب کا دوست ہوں۔ چپراسی نے چائے لا کر رکھ دی تھی۔ میں نے ابھی چائے ختم ہی کی تھی کہ وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ آج بھی میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس نے نیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس پر سرخ ٹائی جو اس کے گورے رنگ پر بہت جچ رہی تھی۔

''ہائے، ہائے۔ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو، نظر نہیں لگا دینا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نظر تو لگ ہی چکی ہے۔'' میں نے کہا۔

''چلو، میں نے اپنا کام نمٹا دیا ہے۔'' اس نے کہا۔

میں اس کے ساتھ اس کے دفتر سے نکل کر کار پارکنگ کی طرف آگیا۔ اس کے پاس گاڑی بھی بہت شاندار تھی۔ وہ خود ہی ڈرائیو کیا کرتا تھا۔ اس کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس کی اصل شخصیت کیا ہے۔

''یار! جب سے تم ملے ہو۔ میری زندگی میں تبدیلی آگئی ہے۔'' اس نے کہا۔

''کون سی تبدیلی؟''

''کیا بتاؤں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں جو کچھ بھی ہوں، اس پر مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے کیونکہ اس کی مرضی۔ وہ جس حال میں رکھے۔ تبدیلی یہ آئی ہے کہ میں اب زندگی میں دلچسپی لینے لگا ہوں۔ ورنہ ایک روٹین لائف تھی۔ دفتر، فیکٹری، میٹنگز۔ بس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن اب میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میں بھی انسان ہی ہوں۔ کوئی اور نہیں ہوں۔''

اس کی ڈرائیونگ بھی بہت اچھی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہم بہت دور نکل آئے تھے اور مضافات کی طرف جارہے تھے۔

''کیا تمہاری پھوپی دور رہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بھائی دور ہی رہتی ہیں۔ اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ آجائیں۔ مجھے ہفتے میں دو تین بار ان کے پاس جانا پڑتا ہے۔ ان کی عمر بھی اچھی خاصی ہوچکی ہے۔ دیکھ بھال تو کرنی پڑتی ہے نا۔''

اب چھوٹے چھوٹے خستہ حال مکانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں رہتی تھی۔

کچھ دیر بعد ہم ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں چھوٹے چھوٹے کوارٹر نما مکانات بنے ہوئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ کچے مکانات تھے۔ ایک چھوٹی سی گلی تھی۔ اس میں گاڑی نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے گاڑی گلی کے باہر روک دی۔

''یار یہاں سے پیدل چلنا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''بس تھوڑا سا فاصلہ ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم دونوں گاڑی سے باہر آگئے اور اس وقت کچھ لوگ تالیاں بجاتے ہوئے گاڑی کے پاس آگئے۔

وہ سب تیسری دنیا کے تھے۔ یعنی خسرے۔ تالیاں بجاتے اور شور مچاتے ہوئے انہوں نے روشن کو گھیر لیا تھا۔ روشن بھی ان سے بے تکلفی سے باتیں کررہا تھا شاید یہ بستی ہی ان لوگوں کی تھی۔

میں حیرت سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ کہاں روشن اور کہاں یہ لوگ۔ روشن نے مجھے اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ ہولیا۔ ہیجڑوں کی وہ ٹیم بھی ہمارے ساتھ تھی۔ میرے ساتھ ایسا تجربہ پہلی بار ہورہا تھا۔ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔ راستے میں بھی ایسے لوگ ملتے رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ روشن کو سب جانتے تھے۔

''کیوں بھائی حیران ہورہے ہو؟'' روشن نے پوچھا۔

''بہت زیادہ۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہی میری برادری ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہی میرا خاندان ہے۔ اب چلو، سامنے ہی پھوپی کا گھر ہے۔''

میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ اس کی پھوپی اس محلے میں کیا کررہی ہے لیکن خاموش رہا۔ جو کچھ بھی تھا، سامنے آنے ہی والا تھا۔ ہم ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ یہ مکان بھی دوسرے مکانات کی طرح تھا۔ اس وقت اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

''آجاؤ۔'' روشن نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے اپنے ساتھ ہی اندر لے آیا۔

سامنے ہی ایک تخت تھا۔ اس پر ایک آدمی لیٹا ہوا تھا۔ وہ بھی ان ہی میں سے تھا۔ ہم جب قریب پہنچے تو اندازہ ہوا کہ وہ بہت بوڑھا ہوچکا تھا۔ یا ہوچکی تھی۔ اس کے جسم پر ایک زنانہ لباس تھا۔

ایک ہیجڑا اس کے پاؤں دبا رہا تھا۔ دوسرا اسی صحن میں ایک طرف کھڑا تھا۔ روشن جاکر اس بوڑھے سے لپٹ گیا۔ ''پھوپی میں آگئی۔'' اس نے کہا۔

''اری، آج کیسے آگئی، آج تو تیرا دن نہیں ہے۔''

''محبت کا کوئی دن نہیں ہوتا پھوپی! آج تمہاری یاد آئی تو میں چلی آئی اور ہاں پھوپی یہ میرے دوست ہیں اشعر۔''

''جم جم جیتے رہیں۔'' اس نے دعا دی۔

''پھوپی باہر کی دنیا میں، میں نے صرف ان ہی کو اپنا دوست بنایا ہے۔'' روشن نے کہا۔

''مولا جوڑی کو سلامت رکھے۔'' اس نے پھر دعا دی۔

''مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ یہ سب کچھ میرے لیے بالکل نیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہاں ان ہی جیسے بہت سے آگئے۔

نیا ماحول، نئی طرح کے لوگ۔ روشن سب سے گھل مل کر باتیں کررہا تھا۔ وہ سب اس سے مذاق کررہے تھے۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا طرح دار نوجوان اور پڑھا لکھا۔ ایک بڑی فرم میں اعلیٰ عہدے پر فائز بھی ہوسکتا ہے۔ وہ جب باتیں کررہا تھا تو اس کا وہی انداز تھا جو ان لوگوں کا ہوا کرتا ہے۔ لچک لچک کر تالیاں بجا کر۔ وہی زنانہ پن۔ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی کوئی اور شخصیت بھی ہوسکتی ہے۔

کچھ دیر میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں آ گئیں۔
جب ان سے فارغ ہوئے تو روشن نے اشارہ کیا کہ میں جس کام کے لیے آیا ہوں، وہ کر دوں۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اپنا موڈ بنا کر بولنا شروع کر دیا۔ ''دیکھیں، میں آپ کے پاس ایک خاص کام سے آیا ہوں۔''
''ہاں بیٹا کہو۔'' اس بوڑھے کے لہجے میں بہت شائستگی تھی۔
''یہ روشن آپ کے بغیر رہ نہیں سکتا۔'' میں نے کہا۔
''اس کو آپ کی ضرورت ہے۔ اس کا فلیٹ بہت بڑا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ آپ اس کے ساتھ جا کر رہیں۔''
''بیٹا! یہ تو پاگل ہے۔ خود سوچو۔ اس نے بہت مشکلوں اور بڑی قربانیوں کے بعد تمہاری دنیا میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ لوگ اس کی عزت کرتے ہیں۔ میں چلی گئی تو ساری عزت دو کوڑی کی ہو جائے گی۔''
اس موقع پر روشن بھڑک اٹھا۔ ''بھاڑ میں جائے ایسی عزت۔ پھوپی مجھے تو آپ کی ضرورت ہے۔ کسی کی پروا نہیں مجھے۔''
''نہیں میری جان نہیں۔ مولا سائیں نے تم پر کرم کیا ہے۔ اس کرم کو سنبھال کر رکھو۔ کوئی ایسی بات نہ کرو۔ جس سے تمہاری بنی بنائی عزت پر حرف آ جائے۔ میں جہاں ہوں ٹھیک ہوں۔ ایک بات اور...... تم کیا سمجھتے ہو کہ میں جیتے جی ان لوگوں کو چھوڑ سکتا ہوں، نہیں بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ میری زندگی ہیں۔ میں اگر چھوڑ گئی تو سب کی سب بے آسرا ہو جائیں گی۔ بلبلاتی پھریں گی۔ میں ان کو کیسے چھوڑ دوں۔ پورے پچاس سال ہو گئے ہیں مجھے۔ ان کی پچاس سال کی محبت ایک دو دن کے لیے چھوڑ دینا میرے بس میں نہیں ہے بیٹا...... میں ایک دو دن اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں اب بہت بیمار رہنے لگی ہوں۔ نہ جانے کب مولا سائیں کا بلاوا آ جائے۔ بیٹا! میرا جنازہ یہی لوگ اٹھائیں تو اچھا ہوگا۔''
روشن رونے لگا تھا۔ بوڑھے نے اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ دونوں دیر تک روتے رہے تھے۔ پھر جب چپ ہوئے تو اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ ہمارا دل بہلانے کو ایک ہیجڑا ایک ڈھولک اٹھا لایا تھا۔
دوسرا ایک ہارمونیم لے آیا۔
وہ واقعی فنکار لوگ تھے۔ کمال کی ڈھولک بج رہی تھی اور کمال کا ہارمونیم تھا۔ پھر سب کی فرمائش پر خود روشن نے گانا شروع کر دیا۔ اس کے اس روپ نے بھی مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس نے بے پناہ خوب صورت گلا پایا تھا۔ لگتا تھا اس نے باقاعدہ تربیت لے رکھی ہے۔ اس کی تصدیق اس بوڑھے نے کر دی۔
''میرے بچے نے چار سال گانا سیکھا ہے۔ استاد کو میں ہی لائی تھی۔''
روشن نے کچھ دیر گانا سنایا۔ اس کے بعد اس نے بوڑھے سے کہا۔ ''اچھا پھوپی اب اجازت دو۔''
''ارے ہاں، میں تمہیں ایک بات بتانی تو بھول ہی گئی۔'' اس نے کہا۔ ''تیرا باپ آیا تھا۔''
''کون باپ؟''
''اری وہی، جس کے یہاں تو نے جنم لیا تھا جو تیرا اصل باپ ہے۔''
''نہیں پھوپی، میرا اب کسی سے رشتہ نہیں رہا۔ میرا سارا رشتہ صرف تم سے ہے۔ تم ہی میرے باپ ہو۔ سب کچھ تم ہی ہو۔''
''پھر بھی بیٹا! ایک بار اس سے جا کر مل تو لے۔ تیرے دونوں بھائی تو ناکارہ نکلے ہیں۔ باپ کی پروا نہیں کرتے۔''
''تو مجھے بھی کوئی پروا نہیں ہے۔'' روشن نے کہا۔
''نہیں بیٹا، ایسا نہیں کہتے۔''
''پھوپی! اس باپ نے کیا کیا ہے میرے ساتھ۔ میں پیدا ہوئی تو تمہاری جھولی میں ڈال دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ میں اس کی سگی اولاد ہوں۔ اگر تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں اور تمہارے دل میں میرے لیے ہمدردی نہیں ہوتی تو میرا کیا حال ہوتا۔ میں بھی اپنی دوسری بہنوں کی طرح سڑکوں پر ماری ماری پھرتی نا۔ خود سوچو۔ اگر میں ایسی پیدا ہوئی ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے کیا کیا تھا؟ میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ مرد ہونا کیا ہوتا ہے اور عورت کس کو کہتے ہیں۔ مجھ سے پہلے دونوں بھائیوں کو تو ماں اور باپ نے اپنے سینے سے لگا کر رکھا تھا لیکن مجھے اس طرح الگ کر دیا جیسے گھر میں سانپ پیدا ہو گیا ہو۔''
''میرے بیٹے! اس دنیا کی یہی ریت ہے۔ اس میں تیرے باپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔''
''رہنے دو پھوپی، اگر مجھے تم نہیں ملتیں تو میرا کیا حال ہوتا۔ تم نے مجھے اسکول بھجوایا۔ اسکول والوں سے میرے داخلے کے لیے لڑائی کی۔ پھر مجھے کالج بھیجا۔ اس ماحول میں رکھنے کے باوجود تم نے مجھے اس ماحول سے بچائے رکھا۔ میرا اتنا خیال کیا کہ میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میں اپنے باپ کے گھر نہیں رہی۔ تم نے مجھے اتنی اعلیٰ تعلیم دلوا دی اور مجھے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا حوصلہ دیا۔ کون

ایسا کرتا ہے۔ میرے ہر شوق کو پورا کیا۔ میں نے گانا سیکھنا چاہا تم نے استاد کا بندوبست کر دیا۔ میں نے تصویریں بنانی چاہیں تو تم مہنگے مہنگے رنگ لاتے رہے۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے تم نے مجھے آرٹس کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ پورا خرچ برداشت کیا۔ کون کرتا ایسا؟ کیا وہ باپ جس نے مجھے اس وقت تمہاری جھولی میں ڈالا تھا جب میں صرف ایک سال کی تھی۔''

میں گم سا ہو کر یہ سب سن رہا تھا۔ روشن کی ساری کہانی سامنے آ گئی تھی۔ میں اس بوڑھے کو عقیدت سے دیکھ رہا تھا جس نے ایسی قربانی دی تھی۔ وہ معمولی سا انسان اچانک بہت بڑا ہو گیا تھا۔

''اشعر......'' روشن نے میری طرف دیکھا۔ ''اب تو تم نے میرے بارے میں سب کچھ جان لیا ہے۔''

''ہاں، سب معلوم ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''خود سوچو، کیا میں ایسے باپ کی طرف جا سکتی ہوں؟''

''ایک بات بتاؤ، تمہارے باپ کو کیسے معلوم کہ تم یہاں ہو اور ایسے ماحول میں پرورش پا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بھی ان ہی کی مہربانی ہے۔'' روشن نے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے بیٹا! کیا کرتا میں۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''میں روشن کو اپنے ساتھ لے تو آیا تھا لیکن میرا دل نہیں مانا۔ میں نے سوچا کہ نہ جانے ماں اور باپ کے دلوں پر کیا گزرے گی۔ اسی لیے کبھی کبھی ان کو دکھانے کے لیے روشن کو ان کے پاس لے جاتا تھا۔ اس طرح ان کو میرا ٹھکانا معلوم ہو گیا تھا۔''

''پھوپی ذرا یہ بھی تو بتا دو کہ جب تم لے جاتے تھے تو ان کا کیا رویہ ہوتا تھا؟'' روشن نے کہا۔

''ہاں بیٹا! ان کو بہت برا لگتا تھا۔ وہ کہتے کہ اس کو ہمارے یہاں نہ لایا کرو۔ ہماری عزت خراب ہوتی ہے۔ اس کے باپ کا کہنا تھا کہ اس کے دو بیٹے مکمل مرد ہیں، وہ ان کا خیال رکھیں گے۔ ایسی ادھوری اولاد نہیں چاہیے پھر میں نے بھی ان کے پاس لے جانا چھوڑ دیا۔''

''واہ پھوپی۔ اب تم ہی ان کے پاس جانے کو کہہ رہے ہو؟''

''ارے بیٹا! وہ تو اس کی حالت دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔''

''آئندہ ایسا مت کہنا ورنہ میں یہاں بھی آنا چھوڑ دوں گی۔''

''اچھا بابا، اب نہیں کہوں گی۔'' بوڑھے نے کہا۔

ہم اس مکان سے باہر آ گئے۔ گاڑی کی طرف جاتے ہوئے روشن نے مجھ سے کہا۔ ''اشعر! اب تم کو معلوم ہو گیا نا کہ میں کون ہوں اور میرا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟''

''ہاں معلوم ہو گیا۔'' میں نے کہا۔

''اور اب مجھے کوئی نصیحت مت کرنا۔''

''نہیں مجھے کچھ نہیں کہنا۔ تم جو بہتر سمجھتے ہو، وہ کر رہے ہو۔''

ہم گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس نے مجھے میرے محلے میں ڈراپ کر دیا تھا۔

اس رات میں بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا زندگی تھی اس کی۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ اس کو نہ جانے ایسا کیوں بنایا گیا تھا۔ خدا کی مصلحتیں وہی سمجھ سکتا ہے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک وفادار انسان ہے۔ ورنہ کیا ضرورت تھی کہ وہ دوڑا دوڑا اس بوڑھے کے پاس جاتا۔ اس نے معاشرے میں جو پوزیشن حاصل کر لی تھی، وہ اس کے لیے بہت تھی۔ کیا نہیں تھا اس کے پاس۔ وہ اچھے اچھے مردوں سے زیادہ کامیاب زندگی گزار رہا تھا۔

پھر کئی دنوں تک اس کے پاس جانا نہیں ہوا۔

ایک دن اس کا فون آ گیا...... ''اشعر شام کو میرے پاس آ جانا۔ تم سے ایک ضروری کام ہے۔ آ سکتے ہو نا؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں نہیں تم بلاؤ اور میں نہ آؤں۔'' میں نے کہا۔

''خوش رہو میری جان۔ اسی بات پر تو میں مرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

دوسری شام جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ عورتوں والے لباس میں تھا۔ ''جانتے ہو، میں یہ کیوں پہنتی ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ تم ہی بتاؤ۔''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے فطرت ہی ایسی دی گئی ہے۔ ہم میں زنانہ پن زیادہ ہوتا ہے۔ چونکہ دن بھر دفتر میں اپنے دل پر جبر کیے بیٹھی رہتی ہوں۔ اسی لیے تمہارے سامنے اس حلیے میں آ جاتی ہوں۔ کیونکہ تمہیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے اور تم سے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔''

''مہربانی ہے تمہاری۔ ویسے ایک بات بتاؤں۔ اگر تم

لڑکی ہوتے تو میں تم سے شادی کر لیتا۔ کیونکہ اس روپ میں تم بلا کے خوب صورت لگتے ہو۔‘‘

میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر ذرا سی دیر کے لیے اداسی کے رنگ پھیل گئے تھے۔

آخر وہ بھی ایک انسان ہی تو تھا۔ اس کے بھی جذبات ہوں گے۔ اس کی اپنی سوچ ہوگی۔ اس نے بھی زندگی کے بہت سے رنگ دیکھے ہوں گے۔ اور اب معاشرے کا ایک ایسا فرد تھا کہ جس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ یہ تو اس کی تعلیم نے اس کو باوقار کر دیا تھا۔ ورنہ شاید اس کے ساتھ اور بھی زیادہ برا سلوک ہوتا کیونکہ وہ بہت خوب صورت بھی تھا۔

’’اشعر!‘‘ اس نے میری طرف دیکھا۔ ’’جانتے ہو، میں نے تمہیں کس لیے بلایا ہے؟‘‘

’’نہیں تم بتاؤ۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تمہارے ساتھ چلنا ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’کہاں چلنا ہے؟‘‘

’’اپنے باپ کے محلے میں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’یہ مت سمجھ لینا کہ میں موم ہو کر جا رہا ہوں یا میرے دل میں ان کی محبت جاگ اٹھی ہے، نہیں۔ میں ان کو صرف یہ احساس دلانے جا رہا ہوں کہ کھوٹا سکہ کبھی کبھی اصلی سکے سے زیادہ قیمتی ہو جاتا ہے۔‘‘

’’ہاں، اس میں تو کوئی شک نہیں ہے جس طرح تم قیمتی ہو گئے ہو۔‘‘

’’اچھا اچھا، بس اب چلو۔‘‘

ہم ایک پرانے محلے میں پہنچ گئے۔ اس محلے کا سب سے بڑا مکان اس کے باپ ہی کا تھا۔ ’’اشعر! یہی وہ مکان ہے جس کے در و دیوار میری پیدائش کے بعد لرز کر رہ گئے تھے۔ اس مکان میں رہنے والوں کی عزتیں خاک میں مل گئی تھیں جس کے مکینوں کی طرف برادری اور خاندان والوں کی طنزیہ نگاہیں اٹھنے لگی تھیں۔‘‘ وہ جذباتی ہونے لگا تھا۔

لوگ اس کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے اس کو کون پہچانتا ہوگا۔ لوگ اس کی نئی گاڑی اور اس کی شخصیت سے بھی مرعوب معلوم ہوتے تھے۔ اس نے گاڑی اپنے مکان سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی تھی۔

’’تمہیں اپنا مکان یاد ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں، میں پھوپی کے ساتھ ایک دو بار آچکا ہوں۔‘‘ اس نے بتایا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب وہ گھر سے باہر ہوتا اور مردانہ روپ میں ہوتا تو اس وقت وہ مذکر کا صیغہ استعمال کرتا تھا۔ جیسے میں جا رہا ہوں، وغیرہ۔ اور اپنے گھر میں میرے سامنے مونث کا صیغہ استعمال کرتا تھا۔ نہ جانے اس بے چارے نے اس کے لیے کتنی پریکٹس کی ہوگی۔

ہم اس مکان کے دروازے پر آ گئے جو اس کے باپ کا تھا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔

ایک پڑوسی برابر سے گزرنے لگا تو اس نے روک کر پوچھا۔ ’’جناب! اس گھر میں فرقان صاحب رہتے ہیں نا؟‘‘

’’رہتے تھے۔‘‘ پڑوسی نے بتایا۔ ’’پچھلے ہفتے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ خدا ایسی اولاد کسی کو نہ دے۔ بے چارے خیراتی اسپتال میں رگڑتے ہوئے مر گئے لیکن ان کی اولادوں کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ باپ کی خیریت ہی معلوم کر لیں۔ قیامت کی نشانی ہے۔ ویسے آپ لوگ کون ہیں؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’وہ رشتے میں میرے ماموں لگتے تھے۔‘‘ روشن نے کہا۔ ’’کتنی اولادیں تھیں ان کی؟‘‘

’’تین بیٹے تھے بھائی۔ لیکن ایک ایک سال بعد ہی انتقال کر گیا تھا۔‘‘

’’اوہ۔‘‘ روشن نے ایک گہری سانس لی۔

میں نے روشن کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اس وقت اس کو کتنا دکھ ہوا ہوگا۔ اس کے باپ نے جیتے جی اس کو مردہ قرار دے دیا تھا۔

’’چلو اشعر۔‘‘ روشن نے مجھ سے کہا۔

اور ہم واپس آ گئے۔

کچھ دنوں کے بعد اس کا فون آیا۔ ’’اشعر! مجھے تمہیں دو نیوز دینی ہیں۔‘‘

’’ہاں بتاؤ۔‘‘

’’پہلی نیوز تو یہ ہے کہ پھوپی کا انتقال ہو گیا ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔ اس کی آواز میں بے پناہ دکھ تھا۔ ’’اور دوسری خبر یہ ہے کہ میں اب تم سے شاید کبھی نہ مل سکوں۔ ہاں اگر تمہارا دل چاہے تو مجھے فون کر کے اسی بستی میں آ جانا جہاں پھوپی رہتی تھی۔ میں پھوپی کی گدی سنبھالنے جا رہی ہوں، خدا حافظ۔‘‘

فون بند ہو گیا۔

اس وقت میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں رو رہا تھا۔ اب اس واقعے کو دس برس ہو گئے ہیں۔ میں اس بستی کی طرف نہیں گیا۔ اس کو کسی اور روپ میں دیکھنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔

☆☆☆

حماقت

مدیر محترم

سلامِ شوق

میں نے بہت سوچنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ اپنی ایک بڑی حماقت کو قارئین کے سامنے لے آؤں تاکہ وہ لڑکیاں جو بڑے بڑے خواب دیکھتی ہیں مجھ جیسی غلطی نہ کر بیٹھیں۔ گو کہ اس کہانی کا انجام پڑھ کر آپ بھی کہیں گے کہ میں احمق ترین لڑکی ہوں لیکن ایسا نہیں ہے، اسی کا جواب میری داستان ہے۔

سائرہ

(فیصل آباد)

وہ کم بخت میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

میں بہت جل بھن کر اپنی کہانی سنا رہی ہوں۔ یہ کہانی میری حماقت کی ہے۔ میری ذلت کی ہے اور میری بربادی کی ہے۔

میں ایک خوب صورت لڑکی ہوں۔

خود اپنے لیے یہ کہنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے لیکن آئینہ اس کی گواہی دیتا تھا کہ تم بہت خوب صورت ہو۔ تمہاری ادائیں دل کش ہیں اور تمہارے انداز جان لیوا ہیں۔

کالج میں یہ حال تھا کہ لڑکیاں میرے ارد گرد رہا کرتیں بلکہ یہاں تک ہوتا کہ میری وجہ سے لڑکیوں میں آپس میں جھگڑے ہوجاتے تھے۔

ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی کہ میں اس کی دوست بن جاؤں۔ اس کے قریب رہوں۔ کسی اور کو اپنے پاس نہ آنے دوں۔ اس لیے ان میں ایک طرح کی رقابت ہوجاتی۔

اور مجھے یہ سب دیکھ دیکھ کر مزہ آیا کرتا۔ اپنے آپ پر ناز ہونے لگتا۔ لڑکیاں ہی نہیں بلکہ ٹیچرز بھی میری شخصیت اور میرے حسن سے متاثر تھیں۔ ان کی بھی یہی خواہش ہوتی کہ وہ میری فیورٹ بن جاتیں۔

اور سب سے بڑھ کر عادل، ایک سرپھرا نوجوان جو اس کالج میں تھا اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا تھا۔

عادل خود بھی ایسا تھا کہ لڑکیاں اس پر فدا ہوسکتی تھیں۔

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا تو میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو میرے بلانے پر میرے پاس اسپتال آئی تھی۔ وہ میرے ہی محلے کی ایک لڑکی تھی۔ رضوانہ اس نے لکھنے پڑھنے کا شوق اپنا رکھا تھا۔ کہانیاں لکھا کرتی اس کی کہانیاں شائع ہوا کرتی تھیں۔

میرے پاس اس کا فون نمبر تو نہیں تھا لیکن اس کے ابو کا تھا۔ اس کے ابو میرے ابو کے دوست ہوا کرتے تھے۔ میں نے فون پر انہیں بتایا کہ میں فلاں اسپتال میں ہوں۔ پلیز آپ رضوانہ کو میرے پاس بھیج دیں۔ مجھے اس سے کام ہے۔

رضوانہ اس دن میرے پاس آگئی۔ وہ میرا حال دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ''ارے کیا ہوا باجی آپ کو آپ تو بالکل ہی ڈھلک گئی ہیں۔''

''رضوانہ میں بہت بیمار ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اُمید نہیں ہے کہ میں زندہ رہ سکوں۔''

''ارے نہیں باجی۔ ایسا نہیں کہتے۔ خدا آپ کو زندگی دے۔''

''رضوانہ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم میری کہانی لکھو۔'' میں نے کہا۔ ''اور اسے شائع بھی کروا دینا۔''

''ہاں وہ تو ہو جائے گی۔ لیکن آپ صحت یاب تو ہو جائیں۔''

''نہیں رضوانہ اتنا وقت نہیں ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''پلیز کل تم ڈائری اور قلم لیتی آنا۔ میں بولتی جاؤں گی تم لکھتی جانا۔''

''باجی میرے پاس ایک پروفیشنل ٹیپ ریکارڈر ہے چھوٹا سا، وہ لیتی آؤں گی۔ آپ بولتی رہیے گا وہ ریکارڈ ہوتا رہے گا۔ پھر میں اس کو اطمینان سے لکھ لوں گی۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن کل ضرور آجانا۔''

اس دوران وہ کمرے میں داخل ہوگیا اور میری اور رضوانہ کی گفتگو ادھوری رہ گئی۔ وہ کم بخت رضوانہ کو بھی گہری نگاہوں سے دیکھے جارہا تھا۔ میں نے رضوانہ کو اشارہ کیا تو وہ کمرے سے چلی گئی۔

رضوانہ دوسری شام کو وعدے کے مطابق آگئی تھی۔

اس وقت وہ کمرے میں ہی موجود تھا۔ رضوانہ نے اس کو سلام کیا۔ وہ سلام کا جواب دے کر ہم سے کچھ فاصلے پر جا کر بیٹھ گیا۔

رضوانہ نے اپنے بیگ سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال کر بستر پر رکھ دیا۔ وہ ایک طاقت ور قسم کا ٹیپ ریکارڈر تھا اور اتنا چھوٹا کہ کسی کو احساس بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے اپنی کہانی پھر سے شروع کی۔

میں کل عادل تک پہنچ چکی تھی کہ وہ میرے کالج میں میرے ساتھ ہوا کرتا تھا اور وہ خود بھی ایسا تھا کہ لڑکیاں اس پر فدا ہوا کرتیں۔

اتنی دیر میں وہ کھڑا ہوگیا۔ اس نے وہیں سے پکار کر کہا۔ ''سائرہ! مجھے اس وقت کسی میٹنگ میں جانا ہے۔ دو تین گھنٹے لگ جائیں گے۔ تمہیں کوئی پرابلم تو نہیں ہوگی؟''

''نہیں کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ آپ جائیں۔''

وہ چلا گیا اب ہمارے پاس بہت وقت تھا۔ میں اتنی دیر میں اپنی کہانی مکمل کرسکتی تھی۔

''ہاں باجی آپ عادل کے بارے میں کیا بتا رہی تھیں۔'' رضوانہ نے پوچھا۔

''میں یہ بتا رہی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک خوب صورت اور طرح دار نوجوان تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کے پاس صرف خواب تھے۔ آنے والے اچھے دنوں کے خواب۔ اس کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اور رضوانہ تمہارا تعلق تو خود میرے محلے سے ہے۔ تم کو تو میرے گھر کے حالات معلوم ہیں ناں۔''

''ہاں باجی جانتی ہوں میں۔'' رضوانہ نے کہا۔ ''آپ لوگوں نے بہت پریشانی کی زندگی گزاری ہے۔''

''بہت زیادہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔

"رضوانہ تم ان پریشانیوں کا اندازہ بھی نہیں کرسکتیں۔ کبھی کبھی تو ہمارے یہاں کھانے کو بھی کچھ نہیں ہوتا تھا۔ تم سے کچھ چھپا نہیں کیونکہ تم میری کہانی لکھ رہی ہو۔"

"جی باجی آپ بے جھجک ہو کر بولتی جائیں۔"

"تو جس عادل کے ساتھ ہمیں پرابلم تھی، وہ غریب تھا اور میں ایک غربت سے نکل کر دوسری غربت میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں یہ سچ بتا دوں کہ میں شروع سے اسی مزاج کی تھی۔ میں یہ چاہتی تھی کہ میرے پاس ڈھیروں پیسے ہوں، بینک بیلنس ہو، اپنی گاڑی ہو، اپنا مکان ہو، یہ کیا بات ہوئی کہ ساری زندگی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لیے ترستے رہو اور اس طرح سسکتے ہوئے مرجاؤ۔"

عادل کہا کرتا تھا۔ "سائرہ دیکھ لینا ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تعلیم کے میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرلوں گا۔"

"چلو مان لیا۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔"

"اس کے بعد مجھے اچھی سی نوکری مل جائے گی۔" اس نے کہا۔ "اور ہمارے حالات بدل جائیں گے۔"

"میرے بھولے بادشاہ، حالات بدلیں گے نہیں بلکہ گزارے لائق ہو جائیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ "جیسے ہمارے حالات آج کل بھی گزارے لائق ہی ہیں لیکن یہ کوئی زندگی نہیں ہے۔"

"تو پھر تم کیا چاہتی ہو۔"

"ڈھیروں دولت، ایک شاندار زندگی، تم کو اگر اچھی جاب بھی ملی تو کیا ہوگا، کیا سیلری ہوگی، زیادہ سے زیادہ پچیس تیس ہزار اور اتنے میں شاندار زندگی تو نہیں گزاری جاسکتی۔"

"تو پھر کیا ارادے ہیں تمہارے۔"

"پلاننگ تو تمہیں کرنی ہے۔ کوئی ایسا کام کہ میرے خواب پورے ہو جائیں۔ میں سسکتی ہوئی اور محتاج زندگی گزارنا نہیں چاہتی۔"

"چلو بابا تمہیں حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کروں گا۔"

"لیکن وہ کچھ نہیں کر پایا۔ جب کہ میرے خوابوں کی تکمیل کے لیے ہمیں لاکھ بھی کم تھے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو باجی۔" رضوانہ حیران رہ گئی تھی۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میرے خواب ایسے ہی تھے۔ میرے گھر والے بھی میری اس بات سے بہت پریشان رہا کرتے۔ خدا جانے اس لڑکی کا کیا بنے گا۔ یہ الٹی سیدھی باتیں کرنے لگی ہے۔ اس کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ جس کے پاس قناعت کی دولت ہو اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔" میری اماں کہا کرتیں۔

"نہیں اماں مجھے ایسی قناعت والی زندگی نہیں چاہیے۔ میں نے تمہارا حال دیکھا ہے۔ بلکہ دیکھ رہی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ترستی رہتی ہوں۔ کیا ہے تمہارے پاس۔ ڈھنگ کے جوڑے تک تو نہیں ہیں۔"

اماں ایسے موقعوں پر کچھ بولنا چاہتیں لیکن خاموش رہتیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ سچ ہے۔ ہماری زندگی کچھ ایسی ہی ہے۔

اس دوران عادل کو ایک جاب مل گئی۔

لیکن کیا تھا صرف پندرہ ہزار روپے۔ اس دن وہ بہت خوش تھا۔ اس نے فون کر کے مجھے ایک آئس کریم پارلر پر بلا لیا تھا۔

"سائرہ! مبارک ہو تمہیں کہ مجھے ایک اچھی جاب مل گئی ہے اور اس میں آگے جا کر ترقی کے بہت چانسز ہیں۔"

"چلو یہ تو اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ تمہارے لیے مبارک ہو۔ میرے لیے نہیں۔"

"وہ کیوں!"

"ذرا اپنی سیلری تو دیکھو پندرہ ہزار۔ کیا بنتا ہے اس میں اگر ترقی بھی ہوئی تو کیا ہوگی۔ ایک سال بعد پانچ ہزار بڑھ جائیں گے۔ پھر ایک اور سال کے بعد پانچ ہزار اور بڑھ جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ دس بارہ سال کے بعد تمہاری سیلری پچاس ساٹھ تک پہنچ جائے لیکن اس سے بھی کیا ہوتا ہے اور دوسری بات یہ کہ دس بارہ سال گزر چکے ہوں گے۔ میری خواہشیں دم توڑ چکی ہوں گی۔"

"سائرہ تم شاید پاگل ہو چکی ہو" عادل بھنا کر بولا۔

"پاگل نہیں ہوں عادل۔ امکانات کو سامنے رکھ کر بات کر رہی ہوں۔" میں نے کہا۔

عادل ناراض ہو کر چلا گیا تھا لیکن مجھے اس کے جانے کی کوئی خاص پرواہ نہیں تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اسے کبھی نہیں جانے دیتی لیکن اس وقت تو پیسوں کے حصول کا بھوت مجھ پر سوار تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں سے ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ جب کسی منزل کی دھن سوار ہوتی ہے تو وہ منزل قریب آہی جاتی ہے۔ میری منزل بھی اچانک میرے سامنے آگئی۔

کالج میں میری ایک دوست ہوا کرتی تھی۔ مہوش

اختر۔ اختر اس کے باپ کا نام تھا۔ وہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کی کئی فیکٹریاں تھیں۔ مہوش کالج میں پرنسز کی طرح رہا کرتی۔ پھر ہوا یہ کہ مہوش کی شادی ہوگئی۔

اس کا شوہر کینیڈا میں کاروبار کرتا تھا۔ وہ بھی پیسے والا آدمی تھا۔ اس دن اندازہ ہوا کہ لوگ ٹھیک کہتے ہیں پیسے کو پیسا ہی کھینچتا ہے۔

مہوش نے مجھے اپنی شادی میں بلایا تھا۔ شہر کے ایک شاندار ہوٹل میں شاندار شادی تھی۔ احساس ہو رہا تھا کہ دولت کی کیا طاقت ہوتی ہے۔

اس دن میں نے پہلی بار مہوش کے باپ اختر کو دیکھا تھا۔ وہ ایک بوڑھا انسان تھا۔ بلکہ بہت بوڑھا۔ اس کے بارے میں بعد میں پتا چلا کہ وہ سخت بیمار بھی ہے۔ شوگر، کولیسٹرول، ایک بار بائی پاس بھی ہو چکا ہے۔ اس نے اس لیے مہوش کی شادی میں جلدی کی تھی کہ زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں۔

مہوش نے جب اپنے باپ سے میرا تعارف کروایا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہیں جیسے مجھ پر جم کر رہ گئی ہیں۔ اس کا اس انداز سے دیکھنا مجھے بڑا ہی کھٹکا تھا۔

اس شادی میں میری اور مہوش کی ایک مشترکہ دوست بھی تھی۔ انجم، وہ ایک بولڈ قسم کی لڑکی تھی۔ جو محسوس کرتی وہ بول دیا کرتی۔ یعنی اس میں منافقت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

کھانے کے دوران وہ مجھے اپنے ساتھ ایک طرف لے آئی۔ ”سائرہ اس بڈھے سے بچ کر رہنا ایک نمبر کا ٹھرکی ہے۔ تم نے محسوس نہیں کیا کہ وہ تمہیں کس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے کھا جائے گا۔“

”ہاں یار! یہ تو میں نے بھی محسوس کرلیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس کی کئی داستانیں مشہور ہیں۔“ مہوش کی امی کی موت کے بعد اس نے کئی گل کھلائے ہیں لیکن چونکہ بہت دولت مند ہے، اس لیے منہ بند کرا دیا کرتا ہے۔“

”چلو اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ میں اس کا خیال رکھوں گی۔“

شادی کے بعد انجم اپنے پروگرام کے مطابق باہر چلی گئی۔ میں شاید اس کے باپ کو بھول ہی چکی تھی کہ ایک دن اچانک میرے موبائل پر کسی کا فون آ گیا۔

یہ ایک نیا نمبر تھا۔ اس لیے میں نے ریسیو نہیں کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد اسی نمبر سے پھر کال آ گئی۔ اس بار میں نے فون سن لیا تھا۔

دوسری طرف جو آواز تھی اس کو میں فوری طور پر پہچان نہیں سکی تھی۔

”تم سائرہ بول رہی ہوناں؟“ اس نے کہا۔

”جی ہاں میں سائرہ بول رہی ہوں اور آپ؟“

”میں اختر ہوں۔ تمہاری دوست مہوش کا فادر۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے تمہارا موبائل نمبر مہوش سے لیا تھا۔“

”جی انکل فرمائیں۔“

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ ”کیا تم میرے پاس آسکتی ہو۔ مہوش نے تمہارے لیے کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔“

”اوہ۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے انکل میں آجاؤں گی۔“

”تم ایسا کرنا اگر میرے گھر آنے میں کچھ الجھن ہو تو میرے دفتر آجانا۔ میں ایڈریس سمجھا دیتا ہوں۔“

اس نے مجھے ایڈریس سمجھا دیا۔ دوسرے دن میں اس کے دفتر پہنچ گئی۔ کیا شاندار دفتر تھا اور کیا شاندار بلڈنگ تھی۔ یہ پوری بلڈنگ اس کی تھی۔

اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ ”معاف کرنا میں نے کل تم سے غلط بیانی کی تھی۔“

”میں نہیں سمجھی کیسی غلط بیانی۔“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”مہوش نے تمہارے لیے کچھ نہیں بھیجا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”البتہ اس نے فون پر مجھے ہدایت کی ہے کہ میں تمہیں مارکیٹ سے کچھ دلا دوں۔“

”کیا!“ مجھے یہ سن کر کچھ عجیب سا لگا تھا۔ ”آپ کیوں دلائیں گے؟“

”اس کی شادی کی خوشی میں۔“ اس نے کہا۔ ”پلیز میری بات مان لو ورنہ وہ میری جان کھا جائے گی کہ میں نے اس کی دوست کا خیال نہیں رکھا۔“

اس نے کچھ اس انداز میں بات کی کہ مجھے اس کی بات ماننی پڑ گئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ مارکیٹ لے آیا اور تم اندازہ کر سکتی ہو کہ اس نے کتنے کی شاپنگ کرائی ہوگی۔

”چار پانچ ہزار کی تو ہوگی۔“ رضوانہ نے کہا۔

”نہیں، پورے پچاس ہزار کی۔“ میں نے کہا۔

”پچاس ہزار!“ رضوانہ یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔

”ہاں پورے پچاس ہزار اور یہ میری زندگی کی پہلی بڑی شاپنگ تھی۔ کیسے کیسے برانڈز کے سوٹ دلوائے تھے اور

میچنگ شوز، جیولری اور نہ جانے کیا کیا۔"
میں نے گھر والوں کو یہ نہیں بتایا کہ یہ ساری شاپنگ مہوش کے باپ نے کرائی ہے۔ بلکہ میں یہی کہتی رہی کہ مہوش نے میرے لیے باہر سے بھجوائی ہے۔
بہرحال اختر صاحب کی مہربانیاں جاری رہیں۔ اب مجھے پیسوں کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔
ایک دن انجم کا فون آگیا۔ وہ انجم جو میری اور مہوش کی مشترکہ دوست تھی۔ اس نے کسی جگہ ملنے کے لیے بلایا تھا۔"
"باجی اس نوجوان کا کیا ہوا جس کا نام آپ نے عادل بتایا تھا۔" رضوانہ نے پوچھا۔
"وہ بے چارہ مجھ سے مایوس ہوکر میری زندگی سے نکل گیا۔" میں نے کہا۔ "بہرحال میں دوسرے دن جب انجم سے ملی تو اس نے ایک عجیب بات بتائی۔" اس نے کہا۔
"سائرہ وہ بڑے میاں تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"
"کون بڑے میاں۔" میں۔۔۔ اس کی بات نہیں سمجھی تھی۔
"ارے وہی مہوش کے ابا۔" اس نے بتایا۔ "انہوں نے میرے ذریعے تمہیں پیغام بھیجا ہے۔"
"کیا اس بڈھے کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔"
"دماغ تو خراب ہوگیا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ تمہاری زندگی کا گولڈن چانس ہے۔ تم تو میری عادت جانتی ہو میں لگی لپٹی رکھنے کی عادی نہیں ہوں اگر وہ بڑے میاں مجھے آفر دیتے تو میں فوراً قبول کرلیتی۔"
"اور زندگی بھر روتی رہتی۔"
"ارے نہیں بے وقوف، زندگی بھر نہیں صرف تین چار سال۔" انجم نے کہا۔ "تم کو نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ کیسے کیسے امراض ہیں۔ ڈاکٹروں کے اندازے کے مطابق وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتے۔"
"اور اس کے بعد مجھے بیوہ ہوجانا ہے۔"
"ہاں لیکن ایک کروڑ پتی بیوہ۔" انجم نے کہا۔ "جانتی ہو کروڑ پتی بیوہ کی ڈیمانڈ کنواری لڑکی سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا یہ کنفرم ہے کہ وہ تین چار سال کا مہمان ہے۔" میں نے پوچھا۔
"ہاں یہ کنفرم ہے۔" انجم نے بتایا۔ "ڈاکٹرز کی رپورٹ یہی بتا رہی ہے اور ویسے بھی تمہارے لیے اہم تو یہی ہے دولت اور صرف دولت۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ میں سسکتی ہوئی زندگی نہیں گزار سکتی۔"
"بہرحال قصہ مختصر یہ کہ میں نے اپنے گھر والوں کو یہ بتا دیا کہ میں مہوش کے باپ سے شادی کر رہی ہوں۔ بہرحال تم خود سمجھ سکتی ہو کہ گھر والوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔"
"ظاہر ہے ایک ہنگامہ مچ گیا ہوگا۔"
"ہاں لیکن جب میں نے زمانے کی تلخیاں ان کے سامنے رکھیں، انہیں بتایا کہ ہم نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی خوشی حاصل نہیں کی لیکن اب اختر کی دولت سب کے لیے خوشیاں لے کر آئے گی۔"
"میں نے اپنے گھر والوں کو یہ نہیں بتایا کہ اختر بس دو تین برسوں کا مہمان ہے۔ ورنہ وہ اصول پرست لوگ میری راہ میں رکاوٹ بن جاتے۔"
"قصہ مختصر یہ کہ اختر سے میری شادی ہوگئی اور اب اس شادی کو نو سال ہوچکے ہیں۔"
"نو سال!" رضوانہ نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں نو سال!" میں نے بڑی تلخی سے کہا۔ "کچھ بھی نہیں ہوا۔ شادی کے بعد وہ صحت مند ہوتا چلا گیا۔ ابھی تم نے جس آدمی کو اس کمرے میں دیکھا ہے یہ وہی ہے میرا شوہر اختر۔ ایک بوڑھا انسان۔ جو مجھ سے شادی کے بعد خود جوان اور صحت مند ہوتا چلا گیا۔ جب کہ میں بیمار ہوکر بستر پر آگئی ہوں۔ میرے دونوں گردے خراب ہوچکے ہیں۔ میں خود تھوڑے دنوں کی مہمان ہوں اور اس کا یہ حال ہے کہ اس کے نزدیک اب کوئی بیماری نہیں ہے۔ اس کی شوگر بھی کنٹرول میں ہے اور بلڈ پریشر بھی اور میں بیمار ہوکر رہ گئی ہوں۔"

سترہ برس کی دلہن سے پایا ہے کیسا فیض
عمر رواں کو کیسی پذیرائی مل گئی
سوچا تھا کہ چل دیں گے وہ دو چار سال بعد
لیکن بڑے میاں کو توانائی مل گئی

میرا حسن مرجھا چکا ہے۔ میری صحت جواب دے گئی اور میں نے زندگی سے ابھی تک کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ اس کے لیے تو شاید موت آئے یا نہ آئے لیکن میں ضرور مرنے والی ہوں۔
میں نے اپنی کہانی اس لیے لکھوائی ہے کہ دوسری لڑکیاں دولت کی لالچ میں آکر اس قسم کا جوا نہ کھیلیں۔ کیونکہ اس میں اگر ہار ہوگئی تو پھر ساری زندگی کی ہار ہے۔

محترم مدیر
سلام تہنیت
کبھی کبھی انسان کو دل سے نہیں دماغ سے فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ غزالہ میرے دل کی ملکہ تھی مگر تب جب اس کی زندگی میرے لیے تھی مگر اب جب وہ کسی اور کی امانت بن گئی تو میرے لیے وہ اور بھی معتبر بن گئی۔ جب اس نے بتایا کہ اس کا شوہر اس پر تشدد کرتا ہے اور وہ اس سے نجات کے لیے خودکشی کرنے والی ہے۔ اسے زہر کی ضرورت ہے۔ تب میں نے اسے زہر کی شیشی دیتے ہوئے کہا، یہ زہر تمہارے شوہر کے لیے ہے، پھر جو کچھ ہوا وہ اپنے اندر سبق لیے ہوئے ہے۔ ہر قاری میرے اقدام کو سراہے گا۔

وسیم
(مظفر آباد)

وہ میرے پاس آکر رونے لگی۔ میں اس کے آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ ایک تو وہ اتنے دنوں کے بعد آئی تھی اوپر سے اس کے آنسو۔ یہ سب مجھ سے برداشت کہاں ہو سکتے تھے۔

”غزالہ، کیا ہوا ہے بھئی۔“ میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”تمہاری دعائیں رائیگاں جا رہی ہیں وسیم۔“ اس نے کہا۔ ”تم نے تو میری خوشیوں کی دعائیں مانگی تھیں لیکن خوشیاں میرے نصیب میں نہیں ہیں۔ ایک ایک پل ایسا ہے جیسے کانٹوں پر چل رہی ہوں۔“

میں اس کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ایسی ہی خوب صورت تھی جیسے شادی سے پہلے ہوا کرتی تھی لیکن اب اس کے چہرے پر دکھوں کے سائے بھی گہرے ہوتے جارہے ہیں۔

میں اور غزالہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ پتا نہیں آج کے دور میں اس لفظ کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں۔ لیکن ہم واقعی ایک دوسرے کو اتنا پسند کرتے تھے کہ کالج کے لڑکوں نے ہمیں رومیو جولیٹ قرار دے دیا تھا بلکہ کئی جگہ دیواروں پر بھی لکھ دیا تھا۔ ''وسیم اینڈ غزالہ رومیو اینڈ جولیٹ''

ہم دونوں اس قسم کے نوشتہ دیوار پڑھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑتے یا نظرانداز کرکے آگے بڑھ جاتے۔

اچھا لگتا تھا یہ سب۔ محبت نے ہمیں اپنے سحر میں گرفتار کررکھا تھا۔ جس دن وہ کالج نہیں آتی تو میں بے قرار رہتا اور جس دن میں نہیں آتا وہ بے چین رہتی۔

ہم اکثر باہر بھی ملا کرتے۔ مہینے میں کم از کم دو بار، ہم سلور مون میں جاکر لنچ ضرور کرتے تھے۔ پھر آیندہ آنے والے خوب صورت دنوں کی پلاننگ کی جاتی۔

غزالہ کو گھر کی سجاوٹ کا بہت شوق تھا۔ اس کے ذہن میں نئے نئے آئیڈیاز آتے تھے۔ کبھی کبھی ہم دونوں کے درمیان پردوں کے رنگوں پر بحث بھی ہو جاتی تھی۔ غزالہ کو کوکنگ کا بالکل بھی شوق نہیں تھا۔ وہ کہا کرتی۔ ''وسیم صاحب! یہ بات ابھی سے جان لیں کہ میں کھانا بالکل نہیں بناؤں گی۔''

''کیا مجھے بھوکا مار دو گی؟''

''نہیں ہم کوئی کک رکھ لیں گے اور اگر ڈھنگ کا کک نہ ملا تو باہر سے منگوالیا کریں گے۔''

''یار یہ تو زیادتی ہوگی۔ اچھا یہ بتاؤ چائے وغیرہ تو بنا دیا کروگی نا؟''

''ہاں اتنا تو کرہی لوں گی۔ اس کے علاوہ ہاف فرائی آملیٹ وغیرہ بھی بنادیا کروں گی۔''

''چلو اتنا ہی کافی ہوگا باقی میں خود سنبھال لوں گا۔''

تو ہم دونوں کے درمیان اس قسم کی باتیں ہوا کرتیں۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ ہم ایک ہونے جارہے ہیں۔ اس کے گھر والوں نے بھی مجھے پسند کرلیا تھا۔

میرے سامنے اگرچہ کوئی شاندار مستقبل تو نہیں تھا لیکن اس بات کا یقین ضرور تھا کہ غزالہ اور میں دونوں ایک خوب صورت اور پُرسکون زندگی کا آغاز ضرور کریں گے۔

غزالہ کا تعلق خوش حال گھرانے سے تھا۔ دو بھائی تھے۔ دونوں کا اپنا بزنس تھا۔ والد کسی زمانے میں سرکاری آفیسر رہ چکے تھے۔ اب وہ ریٹائر ہوکر سکون والی پنشن یافتہ زندگی گزار رہے تھے۔

جب کہ میرے ساتھ صورتِ حال بالکل الگ تھی۔ ایک متوسط گھرانے سے تعلق تھا۔ والد صاحب نہیں تھے۔ والدہ اور دو بہنیں تھیں۔ جواب پڑھ رہی تھیں۔ گھر کے اخراجات اس طرح پورے ہوتے کہ میں کالج کے بعد ایک جگہ ملازمت کرتا تھا لیکن امید یہی تھی کہ ایم بی اے کے بعد حالات بدل جائیں گے۔

ایک بار غزالہ نے خطرے کی گھنٹی بجادی۔ ''وسیم میرے لیے حالات کچھ دوسرے ہوتے جارہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ بالکل بگڑ جائیں۔ تم میرے گھر والوں سے منگنی کی بات کرلو۔''

''کیا مطلب؟'' میں پریشان ہوگیا تھا۔

''بابا کے ایک دوست کا بیٹا جرمنی سے آیا ہے۔ اس کے حالات بہت اچھے ہیں اور یہاں کاروبار سیٹ کرنے کے بعد اور بھی بہتر ہوجائیں گے۔''

''لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تمہارے والدین تو مجھے پسندیدگی کا عندیہ دے چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اب تک یہ بات صرف اشاروں تک ہے نا۔ اس لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ تم جاکر کنفرم کروالو۔''

غزالہ کی بات سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے غزالہ کی امی سے خود ہی اس موضوع پر بات کرلی تھی۔ انہوں نے انتہائی خشک لہجے میں جواب دیا تھا۔ ''بیٹا! میں تم کو بہت پسند کرتی ہوں۔ تم ہر لحاظ سے بہت اچھے ہو لیکن ابھی ہم نے غزالہ کے لیے کچھ سوچا نہیں ہے۔''

غزالہ کا خدشہ سچ ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ مختصر یہ کہ غزالہ میری نہیں ہوسکی اور اس کی شادی اس شخص سے ہو گئی۔

اس کا نام سلطان تھا۔ اس کے گھر میں اس کی ماں بھی رہتی تھی، دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔ والد جرمنی میں تھے۔

سلطان نے یہاں آکر اپنا کاروبار سیٹ کرلیا تھا۔ ایک بہت بڑا اسپر اسٹور بنایا تھا جس کا نام اس نے غزالہ سپر

اسٹور رکھا تھا۔

اس اسٹور کا افتتاح بھی بہت زور و شور سے ہوا تھا۔ غزالہ نے مجھے بھی مدعو کیا تھا لیکن میں کیسے جا سکتا تھا۔ میں بس اس کے خوش رہنے کی دعا کر سکتا تھا۔

میں نے ایک دو بار غزالہ اور سلطان کو ایک ساتھ مختلف مقامات پر دیکھا۔ دونوں بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ میں سوائے دعا دینے کے اور کیا کر سکتا تھا۔

بہت دنوں کے بعد غزالہ کا فون آیا۔ اس کا فون سن کر میں سرشار ہو گیا تھا۔ ''ارے کیسی ہو تم؟''

''وسیم شکر ہے کہ تمہارا موبائل نمبر وہی پرانا والا ہے۔ تم نے بدلا نہیں۔''

''میں اسے بدل ہی نہیں سکتا تھا۔''

''وہ کیوں؟''

''صرف اس لیے کہ کبھی تو تمہارا فون آئے گا۔'' میں نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ آج آ گیا۔''

''وسیم میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس کی آواز میں پریشانی شامل تھی۔

''ضرور ملو لیکن یہ بتاؤ ویسے تو سب خیریت ہے نا؟''

''ہاں خیریت ہی سمجھو۔ تم سے مل کر بتاؤں گی۔''

''تو پھر آجاؤ۔''

وہ ایک گھنٹے کے بعد میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ میں اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

''خدا کے لیے غزالہ اتنا مت روؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔''

''تم نے ہمیشہ میری خوشیوں کی خواہش کی ہے نا وسیم۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔

''ظاہر ہے۔ میرے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو گی۔''

''تو اتنا جان لو کہ میں ہرگز خوش نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔

''وہ تو تمہارے آنسوؤں نے بتا دیا ہے کہ تم خوش نہیں ہو لیکن ہوا کیا ہے؟''

''میرا شوہر۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔ ''اس نے میری زندگی خراب کر دی ہے ایسے ایسے دکھ دے رہا ہے وسیم کہ تم کو یقین نہیں آ سکتا۔ زندگی میرے لیے عذاب بن کر رہ گئی ہے۔''

''لیکن کیوں! وہ تو اچھا خاصا پڑھا لکھا انسان ہے۔''

''پڑھا لکھا تو ہو سکتا ہے لیکن وہ انسان نہیں ہے۔'' غزالہ نے کہا۔ ''خدا کی پناہ اس کی زبان۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ زہریلے سانپ کی طرح پھنکار رہا ہو۔ ذرا ذرا سی بات پر تشدد کرنے لگتا ہے۔''

''کیا!'' مجھے یہ سن کر شاک سا لگا تھا۔ ''وہ تم پر تشدد بھی کرتا ہے؟''

''کئی بار۔'' اس نے اپنی آستینیں اٹھا دیں۔ اس کے بازوؤں پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ ''میرے پورے بدن کا یہی حال ہے۔''

وہ پھر رونے لگی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسی زندگی تھی کہ غزالہ جیسی بے فکری، خوش باش، ذہین اور خوب صورت لڑکی کے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

''خدا کے لیے وسیم کچھ کرو۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' اس نے کہا۔ ''کسی طرح میری جان بچا لو۔ میں بہت پریشان اور مجبور ہو کر تمہارے پاس آئی ہوں۔''

''پریشان نہ ہو۔ میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالتا ہوں۔''

''جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ ورنہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھا لوں گی۔''

''خدا کے لیے غزالہ کوئی حماقت مت کر بیٹھنا۔''

''بے فکر رہو۔ میں اپنے آپ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں اسی کو جان سے مار دوں گی جس کی وجہ سے یہ سب ہو رہا ہے۔ خون کر دوں گی اس کا، گھر میں ریوالور رکھا ہوا ہے، گولیاں بھی ہیں۔ بس تھوڑی سی ہمت ہی کرنی ہو گی نا۔ کہانی ختم ہو جائے گی میری بھی اور اس کی بھی۔''

''نہیں غزالہ یہ سب مت کرنا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ تمہارا شوہر تمہارے لیے بے رحم ثابت ہو رہا ہے لیکن اب تمہاری قسمت اس سے وابستہ کر دی گئی ہے۔ اب اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی کوشش کرو اور اگر بہت حالات خراب ہو گئے ہیں تو اس سے علیحدہ ہو جاؤ، خلع لے لو اس سے۔''

''میں یہ دھمکی دے کر دیکھ چکی ہوں۔ وہ ایک جنونی انسان ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے اگر خلع وغیرہ کی بات کی تو وہ میری جان لے لے گا۔ وہ طلاق بھی نہیں دے گا مجھے۔ اپنے ساتھ اٹکا کر رکھے گا تاکہ مجھ پر ٹارچر کرتا

رہے۔ خدا جانے کس جرم کی سزا دے رہا ہے۔''
''دیکھو میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالتا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''کیا راستہ نکالو گے؟'' وہ بھڑک کر بولی۔ ''اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ میں اسے گولی مار کر یہ کہانی ہی ختم کردوں۔''
''یہ تمہاری حماقت ہوگی غزالہ۔ فرض کرو تم نے اگر اسے مار بھی دیا تو کیا خود بچ جاؤ گی! نہیں تم قانون کی گرفت میں آجاؤ گی۔ پورے ملک میں اس کا چرچا ہوگا۔ تمہارا خاندان بدنام ہوکر رہ جائے گا۔''
''تو پھر کیا کروں میں، بتاؤ کیا کروں؟''
''سوچنے دو مجھے۔ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکلے گا۔''
''راستہ۔'' وہ تلخی سے ہنس پڑی۔ ''راستہ بس وہی ہے جو میں کہہ چکی ہوں۔ ویسے تم کہتے ہو تو کچھ دن انتظار کر کے دیکھ لیتی ہوں اگر وہ پھر بھی نہیں بدلا تو پھر تم یہ خبر سن لینا۔''
وہ سوالات کھڑا کر کے چلی گئی۔
میں اس کا دکھ دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اس کو اپنے شوہر کا قتل کرتا ہوا دیکھوں یا سنوں۔ یہ انتہائی خطرناک بات ہوتی۔ دوسری طرف میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کا گھر برباد ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ میری نہیں ہوسکی تھی لیکن اب وہ ایک شادی شدہ زندگی گزار رہی تھی۔ بہت سے لوگ اس سے وابستہ تھے۔ میرے لیے تو یہی بہت تھا کہ وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ لیکن کیسے؟
میں کیسے گوارا کرسکتا تھا کہ وہ اپنے شوہر کو گولی مار دے۔ اس میں خود اس کا نقصان تھا۔ گرفتاری، عدالت، مقدمہ، سزا، جیلیں، کیسے کیسے شرمناک مرحلے۔
دو چار دنوں کے بعد اس کا فون آیا۔ اب اس کے صبر کا پیمانہ تقریباً لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اب انتہائی قدم اٹھانے کے لیے تلی بیٹھی تھی۔
''نہیں غزالہ ایسا مت کرو۔'' میں نے کہا۔ ''بلکہ ایسا کرو تم میرے پاس آجاؤ میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہارے لیے ایک دوسرا راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔''
''کوئی راستہ نہیں ہے وسیم بلکہ قدرت نے میرے لیے کچھ آسانی پیدا کردی ہے۔'' اس نے بتایا۔
''کیسی آسانی۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''یہ میں تمہارے پاس آکر بتاؤں گی۔''

وہ جب آئی تو پریشانیاں اور گہری ہوگئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ آتے ہی پھٹ پڑی۔ ''بس اب بہت ہوگیا۔ جو کچھ ہے نا قابلِ برداشت ہے۔ اس حالت میں بھی اس کو چین نہیں ہے۔''
''کیسی حالت!''
''اوہ! میں نے شاید تم کو بتایا نہیں تھا۔'' اس نے کہا۔ ''پچھلے ہفتے اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ ٹانگ میں فریکچر ہے۔ چل پھر نہیں سکتا۔ لیکن زبان تو چل رہی ہے نا، اس کی تلخ باتوں کے تیر تو مسلسل چل رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ اب کچھ دنوں سے مجھ پر جسمانی تشدد کرنے کے قابل نہیں رہا ہے لیکن اس کی زبان کو کون روک سکتا ہے۔ وہ جو گالیاں دیتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔''
''کیا تم اس کی دیکھ بھال کرتی ہو؟''
''دیکھ بھال!'' اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ میری کوئی انا نہیں ہے۔ کیا میں اتنی گئی گزری ہوں کہ وہ مجھے جوتے مارتا رہے اور میں اس کی خوشامد میں لگی رہوں۔''
''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔''
''تم بتاؤ تم نے کیا سوچا ہے۔'' اس نے پوچھا۔
''میں تمہیں یہ بتادوں کہ میں اب مصالحت وغیرہ نہیں کرنا چاہتی۔ موت اس کی موت یا پھر میری موت۔''
''غزالہ اب ذرا دھیان سے سنو۔'' میں نے کہا۔
''اگر تم نے موت ہی جیسا کوئی فیصلہ کرلیا ہے تو پھر ایسا کیوں نہ ہو کہ تم پر بھی کوئی آنچ نہ آئے اور اس کا بھی کام ہو جائے۔''
''وہ کیسے!''
''سلو پوائزن۔'' میں نے کہا۔ ''اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں ہے۔''
''سلو پوائزن!''
''ہاں، دیکھو اس میں ہوگا یہ کہ وہ آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھتا جائے گا اور اس کی موت جب ہوگی تو میڈیکل رپورٹ بھی یہی بتائے گی کہ اس کا ہارٹ فیل ہوگیا ہے۔ نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری والی بات ہوگی۔ تم پر بھی کوئی الزام نہیں آئے گا اور اس کی کہانی بھی ختم ہوجائے گی۔''
''لیکن یہ ہوگا کیسے؟''
''بہت آسانی سے۔'' میں نے بتایا۔ ''میرا ایک گہرا دوست دواؤں کی فیکٹری میں ہے۔ وہ دنیا بھر کے زہروں

پر اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ مجھے ایسی کوئی چیز دے دے گا لیکن......!

''لیکن کیا!'' غزالہ یہ سب سن کر پُرجوش ہوگئی تھی۔ ''تم نے تو مجھے نئی امید دلا دی ہے۔ بتاؤ کیا کرنا ہوگا۔''

''بہت رازداری سے کام لینا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ خدانہ کرے اگر یہ راز کھل گیا تو تمہارے ساتھ میں بھی جیل چلا جاؤں گا۔ بلکہ اس کیس کو ایک اور رنگ دے دیا جائے گا۔''

''وہ کیا۔''

''اس قسم کی خبریں روزانہ آتی رہتی ہیں کہ فلاں عورت نے اپنے آشنا کے ساتھ مل کر شوہر کا خون کردیا۔ خود سوچو پھر ہم کہاں کھڑے ہوں گے، کہیں بھی نہیں۔''

''وہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کرنا کیا ہوگا؟''

''بہت خاموشی اور رازداری سے کام لینا ہوگا۔''

''یہ تو ہوجائے گا لیکن کب؟''

''میں کل ہی اس کے پاس جاکر اس سے بات کر کے کچھ لے آتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم اب اطمینان رکھو۔ یہ کچھ دنوں کی سختیاں ہیں جو تمہیں برداشت کرنی ہیں۔ اس کے بعد تمہارا راستہ صاف ہوجائے گا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

دوچار دنوں کے بعد جب وہ میرے پاس آئی تو زہر کی شیشی تیار تھی۔ ''دیکھو غزالہ میں اب بھی جھجک رہا ہوں کہ کہیں تم سے کوئی بے پروائی نہ ہوجائے۔ پھر ہم سب پھنس جائیں گے۔ ہمارے چکر میں میرا وہ بے چارہ دوست بھی پھنس جائے گا جس نے یہ پوائزن دیا ہے۔''

''اوہو، تم میری بے پروائی کی تو بات ہی مت کرو۔ یہ میری زندگی کا سب سے اہم مشن ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اگر میں اس میں ناکام ہوگئی تو پھر میری زندگی میں کچھ نہیں رہے گا۔ صرف یہی ہوگا کہ میں خودکشی کرلوں۔ تم یہ بتاؤ کہ یہ کس طرح استعمال کرانا ہوگا۔''

''روزانہ دودھ میں ڈال کر۔ صرف چار قطرے رات کو سوتے وقت۔''

''ہاں۔'' اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''میرے لیے یہ بہت آسان ہوگا کیونکہ اس کو سوتے وقت دودھ پینے کی عادت بھی ہے۔''

''دوسری بات یہ ہے کہ اس کی تمام تر باتوں کے باوجود تمہیں اس کے ساتھ بہت نرم رویہ رکھنا ہوگا۔ اگر تم

جاریہ رضی اللہ عنہ بن قدامہ

صحابیؓ، ابوایوب کنیت اور الحرق لقب تھا۔ ان کا سلسلہ بن زہیر، بن الحصین بن رزاح بن ربیعہ۔ حضرت علیؓ کے زبردست حامیوں میں سے تھے اور یہی ان کی شہرت کا سبب ہے۔ جب حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر کے لشکر بصرے میں داخل ہوئے تو جاریہ ان دنوں یہیں موجود تھے۔ جنگ جمل میں انہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا۔ جنگ صفین میں بصرے کے قبائل سعد اور رباب کی سرداری انہی کو سونپی گئی تھی۔ انہوں نے اس معرکے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ واقعہ تحکیم کے بعد بھی حضرت علیؓ کے وفادار رہے اور خوارج کے ساتھ لڑائیوں میں حضرت علی کے مددگار رہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے جس لشکر کو خوارج سے جنگ کے لیے بصرہ بھیجا تھا۔ جاریہؓ اس لشکر کے سردار تھے۔ پھر جب حضرت امیر معاویہؓ نے مصر فتح کرلیا تو بصرے کی اس صورت حال کے پیشِ نظر کہ وہاں حضرت علیؓ کے حمایتی قلیل تعداد میں تھے حضرت جاریہ نے اس شہر کو اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کی۔ حضرت معاویہ نے عبداللہ ابن عامر الحضرمی کو اپنا سفیر بنا کر بصرے بھیجا تا کہ بنوتمیم کی تالیف قلب کرے چنانچہ اسے ایک حد تک ان کی حمایت حاصل بھی ہوگئی۔ تو زیاد بن ابیہ نے جو بصرے کا نائب عامل تھا۔ حضرت علیؓ کو لکھا کہ جاریہؓ بن قدامہ کو بصرے بھیجیں کیونکہ ان کی اپنے قبیلے میں بہت زیادہ عزت ہے۔ جاریہ جنگجوؤں کا ایک دستہ لے کر بصرے پہنچے۔ بنی تمیم کی تالیف قلب کرکے انہیں اپنے ساتھ ملایا اور پھر ابن الحضرمی کے لشکر پر حملہ کیا۔ اور بصرے میں حضرت علیؓ کی حکومت قائم ہوگئی۔ جاریہؓ نے حضرت علیؓ کے عہد حکومت میں آخری لڑائی بسر بن ارطاۃ کے خلاف 40ھ میں لڑی تھی۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے حضرت حسنؓ کے لیے مدینہ منورہ میں لوگوں سے بیعت لی۔ انہوں نے بصرے میں وفات پائی۔

مرسلہ: محمد علی شاہد، دبئی یو اے ای

نے اس کی باتوں کا جواب سختی سے دیا تو ہوسکتا ہے کہ وہ کھٹک جائے اور تمہارے دیئے ہوئے دودھ کا گلاس نہ پیے۔ اس لیے اس کو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ بہت ہوشیاری سے کام لینا ہے۔''

''ہاں اتنا تو میں بھی سمجھتی ہوں۔''

''اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ یہ پولیس والے بال کی کھال نکال لیتے ہیں۔ اس لیے اس دوران نہ تم مجھ سے ملو گی اور نہ ہی موبائل پر رابطہ کرو گی۔ موبائل نمبر سے ہی بندہ ٹریس ہوجاتا ہے۔''

''بہت مشکل امتحان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے اپنے دل پر جبر کر کے اس سے نرمی کا سلوک کرنا پڑے گا۔''

''ہاں صرف دو مہینے۔'' میں نے کہا۔ ''دو مہینوں میں تو یہ آہستہ آہستہ کام کرتا ہوا دل کی شریانوں تک پہنچ جائے گا۔ اس کے لیے ایک دن اچانک اس کا ہارٹ فیل ہو چکا ہو گا اور دوسری بات یہ ہے کہ بہت ہی سختی کے ساتھ اس کے دودھ پی لینے کے بعد گلاس کو خوب اچھی طرح دھو کر رکھنا ہو گا اور کام ہو جانے کے بعد گلاس اور شیشی دونوں کو ضائع کر دینا ہوگا۔''

''میں اس سے چھٹکارے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''

''بس تو یہ شیشی لے جاؤ اور خدا کے لیے اپنی اور میری عزت بچالینا۔ انتہائی ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔''

''ایک بات بتاؤ اگر کبھی تمہیں حالات بتانے کی ضرورت ہو تو کیسے رابطہ کروں گی۔''

''کسی بھی حال میں اپنے موبائل کے ذریعے نہیں۔ بلکہ کسی کال آفس جا کر مجھے فون کر سکتی ہو۔''

''ہاں یہ ہوسکتا ہے۔'' اس نے گردن ہلا دی۔ ''تو اب میں جاؤں؟''

''ہاں جاؤ لیکن جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر سختی سے عمل کرنا۔ ورنہ مصیبت ہوجائے گی۔''

غزالہ چلی گئی۔

میں سوچتا ہی رہ گیا۔ وقت کیسا ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کو حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے کو پانے کے مرحلے میں آگئے تھے۔ زندگی ہم پر مہربان تھی۔ محبت کا حصول صرف ایک قدم کے فاصلے پر تھا کہ اچانک سب کچھ بدل گیا۔ جیسے اسکرین پر منظر بدل جائے۔

اب وہ میری دسترس سے کتنی دور ہوگئی تھی۔ کسی اور کی ہوگئی۔ لیکن میرے دل کے کتنے قریب تھی۔ اس کے آنسو آج بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ محبت صرف کسی کے حصول کا نام نہیں ہے بلکہ ایک احساس کا نام ہے۔ احساس زندہ رہتا ہے تو محبت زندہ رہتی ہے۔

خیر تو میں آج بھی اس کے لیے اتنا ہی بے قرار تھا جتنا پہلے ہوا کرتا تھا۔ وہ میرے پاس روتی ہوئی آئی اور میں نے اس کی خوشیوں کا ایک راستہ ڈھونڈ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میری پلاننگ کامیاب رہی تو اس کو پھر سے سکون مل جائے گا۔

میں نے اسے فون کرنے سے منع کر دیا تھا اور نہ ہی خود میں اسے فون کر سکتا تھا۔ صرف یہ ہوسکتا تھا کہ وہ میرے مشورے کے مطابق کسی دن کال آفس سے فون کرلے۔

اور ایک دن کال آفس سے اس کا فون آہی گیا۔ وہ مجھے صورت حال بتا رہی تھی۔ ''میں بڑی ہوشیاری سے تمہاری پلاننگ پر عمل کر رہی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''روزانہ رات کے دودھ میں چار قطرے ملا دیتی ہوں اس کو احساس بھی نہیں ہوتا۔''

''گڈ! اور یہ بتاؤ کہ تم خود اپنا رویہ کیسا رکھتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا بتاؤں، بس دل پر جبر کر کے اس کے ساتھ نرم ہوگئی ہوں۔ وہ بکواس کرتا رہتا ہے لیکن میں دھیان ہی نہیں دیتی۔''

''شاباش! میں یہی چاہتا ہوں کہ اس کو کوئی شک نہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''کوشش تو میری بھی یہی ہے لیکن کبھی کبھی اس کی الٹی سیدھی باتیں سن کر دل چاہتا ہے کہ اس کا منہ نوچ لوں یا پھر اپنی پلاننگ پر عمل کر جاؤں۔''

''نہیں......نہیں ایسا کبھی مت کرنا۔ جہاں دس بارہ دن گزار لیے ہیں وہاں کچھ دن اور سہی۔'' میں نے کہا۔ ''صبر کرتی رہو اور اپنا کام کرتی رہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''او کے۔ میں تمہیں پھر کچھ دنوں کے بعد فون کروں گی۔''

کچھ دنوں کے بعد اس کا پھر فون آگیا۔ یہ فون بھی

اس نے کال آفس سے کیا تھا۔ ''وسیم! اب تک سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔ کسی کو شبہ نہیں ہو سکا ہے۔''

''اور تمہارا رویہ۔'' میں نے پوچھا۔

''تم میرے رویے کو چھوڑو۔ میں تمہیں مزے کی بات بتاتی ہوں۔ خود اس کا رویہ بدلنے لگا ہے۔ اس کی الٹی سیدھی باتیں بہت کم بلکہ ختم ہو گئی ہیں۔ اب وہ ویسا ہی ہوتا جارہا ہے جیسا شادی سے پہلے ہوا کرتا تھا اور ہاں اب وہ تھوڑا تھوڑا چلنے بھی لگا ہے۔''

''چلو یہ تو اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا خاک اچھی بات ہے۔ اگر وہ مکمل ٹھیک ہو گیا تو پھر کیا ہوگا؟''

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''تم بس اپنا کام کرتی رہو اور اپنا وہی نرم رویہ رکھنا۔ اگر اس اسٹیج پر وہ اکھڑ گیا تو پھر کیس کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔''

''یہ تو ہے۔ یہی سوچ کر میں اپنا کام کیے جارہی ہوں۔''

پھر بہت دنوں تک اس کا فون نہیں آیا اور ایک دن آیا تو وہ فوری طور پر مجھ سے ملنا چاہ رہی تھی۔ وہ میرے پاس آنا چاہ رہی تھی۔

''نہیں غزالہ میرے پاس مت آؤ، ہمیں ہر حال میں احتیاط کرنا ہے۔''

''وسیم! یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔ ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔'' اس نے کہا۔

''او کے اگر ایسی بات ہے تو آجاؤ۔''

وہ میرے پاس پہنچ گئی۔ آج اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن بہت گھبرائی ہوئی اور پریشان تھی۔

''کیا ہوا غزالہ خیریت تو ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''خدا کے لیے وسیم کچھ کرو۔'' اس نے کہا۔ ''اپنے اس دوست کے پاس جاؤ جس نے تم کو یہ زہر دیا تھا۔''

''کیا اور چاہیے۔''

''نہیں، اس کا اینٹی ڈوز چاہیے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''کوئی تو ایسی دوا ہو گی جو اس کے اثرات کو ختم کردے۔ کوئی نہ کوئی دوا ضرور ہو گی۔ پلیز مجھ پر یہ احسان کر جاؤ۔''

''غزالہ تم مجھے اور کتنے امتحانوں میں ڈالو گی۔'' میں نے کہا۔

''پلیز وسیم بس یہ احسان کر دو۔ اس کے بعد میں تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گی۔''

''لیکن ہوا کیا۔ تم نے اپنا ذہن کیوں بدل دیا۔''

''اس لیے کہ میں...... میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔'' اس نے کہا۔ ''وہ میرا شوہر ہے۔ میری خوشیاں اس سے وابستہ ہیں، تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ اس دوران ہم دونوں ایک دوسرے کے کتنے قریب آچکے ہیں۔ وہ اب میرا ذرا ذرا سی بات پر خیال رکھتا ہے۔ میری ہر بات مانتا ہے۔ میری اداسی اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ پلیز وسیم کسی طرح اس زہر کا توڑ لے آؤ۔ کسی طرح بھی۔ ورنہ میں خود مر جاؤں گی۔''

''غزالہ تم کس زہر کس بات کر رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں نے تو تمہیں کوئی زہر نہیں دیا۔''

''تو پھر وہ کیا تھا۔''

''ملٹی وٹامن سیرپ۔ تاکہ اس کی صحت تیزی سے بحال ہو جائے۔''

''کیا! تو پھر وہ مشورے وہ احتیاط۔''

''وہ صرف اس لیے تھا کہ تم اس کو نجات کا ذریعہ سمجھو اور اس کو روزانہ وہ سیرپ دیتی رہو۔''

''وسیم تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''بے وقوف میں تمہاری خوشیاں لوٹانا چاہتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے تم سے محبت کی ہے اور محبت کرنے والے اپنے محبوب کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے میں مشورہ دیتا رہا کہ تم اس کا خیال رکھو۔ اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن تمہاری طرف لوٹ آئے گا اور دیکھو وہی ہوا۔ فرض کرو اگر وہ واقعی زہر ہوتا اور میں اس کا اینٹی ڈوز نہیں لاسکتا تو پھر کیا ہوتا؟ تم تو اپنے شوہر سے محروم ہو جاتیں نا؟''

''وسیم۔'' غزالہ کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ وہ پھر رو رہی تھی لیکن اس بار اس کے آنسو دکھوں کے نہیں تھے بلکہ خوشی کے تھے۔ محبت کے تھے میری احسان مندی کے تھے۔

اس نے کھڑے ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا اور میری ہتھیلیوں پر بوسے دے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

برسوں گزر گئے ہیں۔ اب اس کے دو بچے ہیں۔ وہ بہت اچھی زندگی گزار رہی ہے اور جہاں تک میرا سوال ہے تو میری ہتھیلی کی پشت پر اس کے بوسے کی حرارت آج بھی اس کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

محترم معراج رسول

السلام علیکم۔

اپنی خودنوشت بھیج رہی ہوں گو کہ میری زندگی میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے جس پر میں کہوں کہ میری زندگی بہت اعلیٰ گزری ہے یا غم و الم سے بھرپور گزری ہے۔ بس ایک سیدھی سادی زندگی گزاری ہے لیکن ایک ایسا واقعہ ہے جس نے میری زندگی میں انقلاب برپا کیا ہے۔ اسی واقعے کو کہانی کی شکل میں لکھ دیا ہے تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔

فرح

(کراچی)

میں نے اس ادھیڑ عمر بدصورت سے شخص کی طرف دیکھا۔

اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید اب سے دو چار سال پہلے کی بات ہوتی تو میں گھبرا جاتی۔ مجھے پسینے آجاتے لیکن اب میں کچھ اور ہو چکی تھی۔

''قبلہ۔'' میں نے اسے تیز اور تلخ لہجے میں مخاطب کیا۔ ''اگر آپ مجھے گھورنے سے فارغ ہو چکے ہوں تو کچھ کام کی بات کریں۔''

وہ سٹ پٹا گیا تھا۔ ”نہیں تو۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”تم کیسی بات کر رہی ہو۔ میں تو یوں ہی۔“

”خیر چھوڑیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”آپ یہ بتائیں مجھے جاب دے رہے ہیں یا نہیں، اگر میں یہاں کام کرنے لگی تو آیندہ بھی آپ کو گھورنے کے مواقع ملتے رہیں گے۔ جی بھر کر گھورتے رہیے گا۔“

”لاحول ولا۔ تم کیسی لڑکی ہو۔ یہ سب کیا کہہ رہی ہو۔“

”میں صرف یہ پوچھ رہی ہوں کہ مجھے جاب ملے گی یا نہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، میں تم جیسی کسی لڑکی کو اپنے دفتر میں نہیں رکھ سکتا۔ تم تو سب کے اخلاق خراب کر دوگی۔“

”او ہو اور آپ تو شاید سب کے اخلاق سنوارنے کی ڈیوٹی پر ہیں۔“ میں نے سامنے سے اپنی فائل اٹھالی۔ ”اور ہاں ایک بات اور بتا دوں کسی خوب صورت لڑکی کو اس طرح دیکھنے سے پہلے ایک بار آئینے میں خود کو بھی دیکھ لیا کریں۔“

وہ تلملا کر رہ گیا ہوگا۔ میں نے اپنی فائل اٹھائی اور اس کے کمرے سے باہر آگئی۔ اس طرح کے واقعات تو میرے ساتھ ہوا ہی کرتے تھے۔ اب یہ کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔

یہ صرف دو سال پہلے کی بات ہے۔

ابا کی موت ہوئی تو میں اس بے رحم دنیا میں کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح تھی۔ سہمی سہمی، خود اپنے سائے سے ڈرنے والی لڑکی۔

ابا نے مرنے سے پہلے اتنا احسان ضرور کر دیا تھا کہ کسی طرح تین کمروں کا ایک چھوٹا سا گھر بنوا لیا تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

گھر میں ماں تھیں اور مجھ سے چھوٹی دو بہنیں اور ایک بھائی۔ یہی ہمارے گھر کے اثاثے تھے اور کچھ بھی نہیں تھا میرے پاس۔ میں بی اے سال دوم کی طالبہ تھی۔ کمپیوٹر جانتی تھی۔ میرے بھائی بہن بھی زیر تعلیم تھے۔ ابا کی پنشن اتنی قلیل تھی کہ گیس اور بجلی کے بل میں ہی نکل جاتی۔ اس کے بعد پھر وہی شب و روز کی آفتیں۔

ابا کی زندگی میں بھی زندگی کوئی اتنی آسان نہیں تھی لیکن وہ شفیق انسان ہماری طرف آنے والی ہر پریشانی کے آگے ڈھال بن جایا کرتے تھے۔ انہوں نے گرم و سرد کا احساس بھی نہیں ہونے دیا تھا۔ دنیا اس وقت بہت مہربان اور نرم دل دکھائی دیا کرتی۔

لیکن ان کی موت کے بعد ایسا ہوا جیسے ہمیں بند کمرے سے نکال کر میدان میں لا کھڑا کر دیا گیا ہو اور اس وقت احساس ہوا کہ دنیا تو اس کے بالکل برعکس ہے جیسا ہم نے سمجھا تھا۔

یہ تو بہت بے رحم، خود غرض اور مکار معاشرہ ہے۔ چاروں طرف درندے گھومتے پھرتے ہیں۔ وحشیوں کا راج ہے۔

جینا مردوں کے لیے اگر دشوار ہے تو عورت یا لڑکی کے لیے دشوار ترین ہے۔

میرے خدا یہاں جینا کتنا دشوار ہے۔ کتنے نوکیلے اور تیز پنجے ہیں لوگوں کے۔ جو ذرا سی دیر میں چیر پھاڑ کر برابر کر دیتے ہیں۔

میرے ابا اور امی دونوں بہت خوش شکل تھے۔ وہی خوبی ہم سبھوں میں آئی تھی۔ خاص طور پر میں، جو بھی مجھے دیکھتا اس کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو کر رہ جاتیں۔

اسی لیے مجھے ڈر لگتا تھا۔ ٹی وی کی خبریں دیکھ دیکھ کر خوف محسوس ہوا کرتا۔ میرا آنا جانا بھی کہیں نہیں تھا۔ بس گھر سے چادر لپیٹے ہوئے نکلی اور کالج پہنچ گئی وہاں سے سیدھے گھر۔ یا کبھی کبھی ابا امی کے ساتھ ہم سب سیر کے لیے چلے گئے۔ اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اس لیے جب گھر سے باہر نکلتی تو سہمی سہمی سی، گھبرائی گھبرائی سی۔ ہر ایک سے خوف محسوس ہوتا۔ یہاں تک ہوتا کہ اگر محلے کا کوئی لڑکا مجھے گہری نگاہوں سے دیکھ بھی لیتا تو گھر آ کر رونے لگتی تھی۔

آپ خود اندازہ لگالیں کہ جب ایسی کسی لڑکی کے سر سے اچانک باپ کا سایہ ہٹ جائے تو پھر اس کا کیا حال ہوا ہوگا۔

مجھے اپنے آپ کو مضبوط کرنا تھا لیکن کس طرح' میری تو پرورش ہی کسی اور انداز سے ہوئی تھی۔ محلے میں دو چار لڑکیاں ایسی بھی تھیں جو جاب کیا کرتیں۔ میں ان کی خود اعتمادی کو دیکھ کر حیران ہو جایا کرتی۔ وہ لڑکیاں کسی اور دنیا کی باسی معلوم ہوتیں۔

وہ ان کا سویرے سویرے اپنے اپنے گھر سے نکلنا، خوب صورت ڈریسنگ، میک اپ، قیمتی پرس لٹکائے ہوئے، کمپنی کی گاڑیاں ان کو لینے کے لیے آئی ہوئی ہوتیں۔

وہ ان میں بیٹھ کر آرام سے روانہ ہو جاتیں۔

اور میں یہ سوچ کر رہ جاتی کہ آخر میں ان جیسی کیوں نہیں ہوں۔ اتنی کمزور کیوں ہوں۔

پھر جب ابا کی موت ہوئی تو مجھے گھر سے نکلنا پڑا۔ زندگی کی گاڑی کو کھینچنے اور مسائل کے انبار کو کم کرنے کے لیے گھر سے جانا پڑا۔ اس کا مشورہ بھی محلے کی ایک لڑکی زرینہ نے دیا تھا جو کسی کمپنی میں کام کرتی تھی۔ زرینہ میری دل جوئی کے لیے میرے پاس آیا کرتی تھی۔

ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''فرح! یہ بتاؤ تم نے کیا سوچا ہے۔''

''گھر کے حالات ابا کے بعد خراب ہوتے جا رہے ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''اس لیے جاب کرنے کا ارادہ کر رہی ہوں، لیکن......!''

''لیکن کیا؟''

''ڈر لگتا ہے مجھے۔'' میں نے کہا۔ ''باہر کی دنیا سے ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر کی کیا بات ہے۔ فیس تو کرنا ہے نا اور جب مسائل کا سامنا ہی کرنا ہے تو کیوں نہ بہادری سے کروں۔ جھٹک دو اپنی بزدلی کو ورنہ یہ دنیا پھاڑ کھائے گی۔''

''تو پھر تم ہی مشورہ دو میں کیا کروں۔''

''جاب کی کوشش کرو۔'' اس نے کہا۔ ''کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی اگر کہو تو میں اپنی کمپنی میں بات کر کے دیکھوں۔''

میں نے اس سے ہاں کر دی۔ ایک ہفتے کے اندر ہی اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ اس کی کمپنی والوں نے مجھے انٹرویو کے لیے بلایا ہے۔

اس موقع پر بھی اس نے مجھے سمجھایا۔ ''دیکھو بے دھڑک ہو کر جانا۔ بہادری اور خود اعتمادی کے ساتھ سامنا کرنا۔ ایسا ظاہر مت کرنا کہ تم بہت زیادہ ضرورت مند ہو۔ اپنے انداز اور رویے سے بے پرواہی ظاہر کرتی رہنا۔ یوں سمجھ لو جیسے تمہیں اس کمپنی میں جاب کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے بلکہ کمپنی کو تمہاری ضرورت ہے۔ ورنہ یہ کمینے قسم کے لوگ مجبور لڑکیوں کو بلیک میل کرنے لگتے ہیں۔''

زرینہ نے امی سے بھی بات کر لی۔ امی نے گویا سینے پر پتھر رکھ کر مجھے جاب کی اجازت دے دی تھی۔ انہیں بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔

میں انٹرویو کے لیے زرینہ کے ساتھ ہی گئی تھی۔

حالانکہ وہ میرے ساتھ تھی اس کے باوجود میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

''بے وقوف سنبھالو اپنے آپ کو۔'' زرینہ نے کہا۔ ''کوئی یہاں شیر نہیں بیٹھا ہے۔''

لیکن میرے لیے وہ کم بخت مینیجر تو شیر ہی ثابت ہو رہا تھا۔ پہلے تو مجھے دیکھ کر وہ دنگ سا رہ گیا۔

میں یہ بتا چکی ہوں کہ میں کتنی خوب صورت تھی۔ اس کے بعد اس کو میری گھبراہٹ اور معصومیت بہت پسند آئی تھی۔

زرینہ تو اس سے میرا تعارف کروا کے کمرے سے باہر چلی گئی تھی جب کہ میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔

''فرح! تمہارے لیے اس کمپنی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ سمجھو کہ تمہاری جاب ہو گئی۔''

''سر! آپ نے میرا انٹرویو تو لیا ہی نہیں ہے۔'' میں نے بمشکل کہا۔

''ارے چھوڑو انٹرویو کو۔'' وہ بے تکلفی سے بولا۔ ''تمہارا آنا ہی انٹرویو ہے۔ تم کو میں اپنی سیکریٹری اپائنٹ کر رہا ہوں۔''

''لیکن مجھے تو ایسا کوئی تجربہ نہیں ہے سر۔''

''تجربہ بھی ہو جائے گا۔ پہلے تم ذہنی طور پر تیار تو ہو جاؤ۔ تمہاری سیلری بہت ہینڈسم کروا دوں گا۔''

''آپ کی مہربانی ہو گی سر۔''

''چلو ٹھیک ہے کل سے تم اپنی ڈیوٹی سنبھال لو۔'' اس نے کہا۔

میں اس کے کمرے سے باہر آ گئی۔ زرینہ باہر ہی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے میرے پاس آ گئی۔ ''ہاں بتاؤ کیا ہوا۔'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

میں نے اپنی اور مینیجر کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

''اوہ۔'' اس نے اپنے ہونٹ سکیڑے۔ ''تو اس کم بخت نے تم پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔''

''کیا مطلب۔''

''یار میں یہ سمجھی تھی کہ باس کی تنبیہ کے بعد اس کو عقل آ گئی ہو گی۔'' زرینہ نے بتایا۔ ''وہ پہلے بھی ایسی حرکتیں کر چکا ہے۔''

''اس کے باوجود تم نے مجھے اس کے پاس بھیج دیا۔''

''یار سوری میں یہ سمجھی تھی کہ شاید وہ سدھر گیا ہو گا۔

بہر حال میں کوشش کرتی ہوں کہ کسی اور جگہ تمہاری جاب ہو جائے۔''

میں دل برداشتہ سی ہو کر گھر واپس آ گئی۔ امی نے میرے اترے ہوئے چہرے سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں ناکام ہو کر واپس آئی ہوں۔

اس کے بعد اور بھی کئی جگہ انٹرویو کے لیے جانا ہوا لیکن ہر جگہ اسی قسم کی صورتِ حال ہوتی رہی۔ نگاہیں نیزوں کی طرح جسم کے پار ہوتی رہیں اور ہوس زدہ باتیں خون کے آنسو رلاتی رہیں۔

میرا وہی حال تھا وہی سہمی سہمی سی لڑکی۔ خود اپنے سائے سے بھی خوف کھاتی ہوئی۔ شاید اس لیے میری جاب نہیں ہوتی ہے کہ ہوس زدہ لوگوں کو تو ایسی بے باک لڑکیاں چاہئیں جو ان کے کام آ سکیں۔ یہاں حجاب میں لپٹی ہوئی لڑکی کو کون پسند کرتا ہے۔

محلے میں ایک نیا خاندان کرائے دار کے طور پر آیا تھا۔

ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ شاہدہ اور راشدہ۔ شاہدہ شاید کسی دفتر میں کام کرتی تھی جب کہ راشدہ کالج جایا کرتی۔

شاہدہ کچھ بے باک قسم کی لڑکی تھی۔ اس کی ڈریسنگ بھی بہت ماڈرن ہوا کرتی اور گفتگو بھی بے دھڑک ہو کر کر لیا کرتی تھی۔

اس کے ماں باپ سیدھے سادے لوگ تھے۔ باپ ریٹائر ہو چکا تھا۔ ماں گھر سنبھالا کرتی۔ عام سا گھر تھا۔ جیسا ہمارے یہاں ہوا کرتا ہے۔

ایک بار شاہدہ مجھے رستے میں مل گئی۔ اس کا گھر میرے گھر سے پانچ چھ گھر آگے تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ بہت ہی دوستانہ مسکراہٹ تھی اس کی۔

اس نے کہا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''فرح۔'' میں نے بتایا۔ ''اور تم؟''

''میں شاہدہ ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''تمہارے محلے میں نئی نئی آئی ہوں لیکن یہاں سب اترے ہوئے بے زار سے چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تم فریش فریش سی لگی ہو۔ اسی لیے تم سے ہیلو ہائے کر لی۔''

اس کی باتیں دلچسپ معلوم ہوئیں۔ اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک کھلے دل کی فرینک سی لڑکی ہے۔ ''کیا مشغلہ ہے تمہارا؟'' اس نے پوچھا۔

''مشغلہ ہی تو تلاش کر رہی ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''کئی جگہ انٹرویو کے لیے بھی جا چکی ہوں۔ لیکن......!!''

''لیکن کیا۔'' اس نے پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ شاید میں تمہارے کسی کام آ سکوں۔ بلکہ ایسا کرو۔ میرا گھر وہ سامنے ہے اگر تم شام کو وقت نکال کر آ سکتی ہو تو آ جاؤ۔ میرے گھر میں میرے باپ ماں کے علاوہ صرف ہم دو بہنیں ہیں۔''

''ہاں معلوم ہے مجھے۔''

''واہ۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''اس قسم کے محلے کا یہی فائدہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے، ضرور آنا۔''

''ہاں میں آؤں گی۔'' میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔

دو چار دنوں کے بعد میں اس سے پھر ملی۔ یہ ملاقات محلے ہی میں ہوئی تھی۔ وہ مجھے زبردستی اپنے گھر لے گئی۔ سلیقے کا گھر تھا۔ گھر والے بھی خوش اخلاق تھے۔ اس نے مجھے اپنے کمرے میں لے جا کر بٹھایا تھا۔ پھر میرے لیے جوس کا گلاس لے آئی تھی۔

''ہاں اب بتاؤ تم میرے پاس آئی کیوں نہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''شاہدہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ڈر! کیسا ڈر؟''

''مردوں سے۔'' میں نے بتایا۔ ''گھورتی ہوئی نگاہوں سے۔ ان کے تیز جملوں سے ان کی نیت سے اس لیے اپنے سائے سے بھی ڈرتی رہتی ہوں۔''

''بے وقوف ہو تم۔'' اس نے کہا۔ ''اس طرح تو تم کہیں کی نہیں رہو گی۔ پرابلم یہ ہے کہ عورت نے اپنے آپ کو کمزور اور مظلوم سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اگر اس دھوکے سے باہر نکل آئے تو پھر کسی مرد کی کیا مجال کہ وہ اس کو بری نگاہوں سے دیکھ سکے۔ دو منٹ میں آنکھیں نکال کر رکھ سکتی ہے۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہمت سے اور بلند حوصلے سے کام لو۔'' شاہدہ نے کہا۔ ''ٹھوکروں میں رکھو سب کو۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اس جملے نے ہمیں برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ مت کرو، لوگ کیا کہیں گے۔ وہاں مت جاؤ لوگ کیا کہیں گے۔ لعنت ہو پرواہ مت کرو کسی کی۔ پھر سب کچھ خود بہ خود ٹھیک ہو جائے گا۔ لڑنے کا حوصلہ پیدا کر لو۔ میں تمہیں سکھاؤں گی۔ گر بتاؤں گی۔ اتنا بولڈ بنا دوں گی کہ تم بلا

جھجک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکو۔''
اس کی باتوں نے مجھ میں واقعی حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ میری خود اعتمادی پروان چڑھنے لگی تھی۔ میں اس کے پاس آتی جاتی رہی۔ اس نے مجھے بہت سے طریقے بتائے۔ بلکہ یہاں تک ہوا کہ وہ مجھے ایک کراٹے سینٹر میں لے گئی۔ جہاں سے اس نے خود کراٹے سیکھے تھے۔ (اس کا یہ ہنر مجھے بعد میں پتا چلا تھا)۔

کراٹے کی تربیت نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا۔

میں وہ لڑکی جو اپنے سائے سے بھی خوفزدہ رہا کرتی تھی۔ اب عزم و ہمت کی مثال بن گئی تھی۔ ایک بار شاہدہ کے کہنے پر میں نے اس کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

وہ دو لوفر قسم کے نوجوان تھے۔ جو اس وقت ہمارے پیچھے پڑ گئے تھے۔ جب ہم ایک شاپنگ سینٹر سے پیدل ہی گھر کی طرف واپس جا رہے تھے۔ یعنی میں اور شاہدہ۔

شام کا وقت تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہی ہمیں احساس ہو گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ کم بخت طرح طرح کی آوازیں کستے ہوئے ہمارے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

''شاہدہ!'' میں نے شاہدہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''ہم سامنے والے راستے سے واپس جائیں گے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس طرف لوگ ہوتے ہیں۔ دکانیں بھی ہیں۔ یہ لوفر ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔''

''نہیں، ہم تو پچھلے گیٹ سے نکلیں گے۔'' شاہدہ نے کہا۔

''اس طرف تو بڑا سناٹا ہوتا ہے۔''

''اس لیے تو ادھر سے جائیں گے۔ تاکہ ان دونوں لوفرز کے ساتھ تسلی سے نمٹا جائے۔'' شاہدہ نے کہا۔ ''اور ان کی ٹھکائی تم کرو گی۔''

''میں......!''

''ہاں تم، تم نے ٹریننگ لی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ آج تمہارا ٹرائل ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر کوئی گڑبڑ ہونے لگی تو میں تمہاری مدد کے لیے آ جاؤں گی۔'' شاہدہ سے مجھے حوصلہ مل چکا تھا۔ یعنی وہ مشکل گھڑی میں میرے ساتھ ہوتی۔

ہم پچھلے گیٹ سے باہر آ گئے۔ یہ ایک ویران سا راستہ تھا۔ رونقیں سامنے والے گیٹ کی طرف تھیں۔ وہ کمرشل ایریا تھا اور یہ رہائشی علاقہ تھا۔ اس لیے یہاں بہت کم لوگ دکھائی دیتے تھے۔

دونوں لوفرز ابھی تک ہمارے تعاقب میں تھے۔ شاید ان کے لیے یہ بہت بڑا چانس تھا کہ ہم نے ایک سناٹے والا راستہ پسند کیا تھا۔

اس لیے ان کی ہمت اور بڑھ گئی۔ طرح طرح کے جملے سننے کو ملنے لگے۔ گندے غلیظ لوگ، گندے غلیظ جملے، رگوں میں چیونٹیاں سی چلنے لگی تھیں۔

''ہوشیار'' شاہدہ نے چلتے چلتے کہا۔ ''میں اپنی

اسپیڈ تیز کر رہی ہوں۔ تم جان بوجھ کر آہستہ آہستہ چلنا۔“
اس وقت پھر میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔ شاہدہ نے حوصلہ دیا۔ ”بے وقوف لڑکی اسی طرح گھبراتی رہی تو یہ بدمعاش تمہارے اعصاب پر حاوی ہو جائیں گے۔ دو چار گہری گہری سانسیں لو اور بھڑ جاؤ ان سے۔ میں آگے چلی۔“
شاہدہ نے اپنے قدم تیز کر لیے اور میری رفتار سست ہو گئی۔ اس وقت وہ دونوں لوفر میرے پاس پہنچ گئے۔
”کیا بات ہے جانِ من تمہاری سہیلی نے تمہیں ہمارے لیے چھوڑ دیا ہے۔“
”اسی لیے وہ آگے نکل گئی ہے۔“ دوسرے نے کہا۔
”اچھا ہی ہوا ویسے بھی ہم تو تمہارے چاہنے والے ہیں۔“
اور اس وقت وہ سارے سبق یاد آگئے جو میں نے ٹریننگ کے دوران سیکھے تھے۔ اس کے علاوہ برسوں کا دبا ہوا غصہ اور طوفان بھی سامنے آگیا تھا۔
میں نے ذرا سی دیر میں ان دونوں کو دھنک کر رکھ دیا۔ ایسے ایسے ہاتھ دکھائے کہ ان کی ساری مردانگی ہوا ہو گئی۔
میں نے انہیں ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔
ان کی چیخ و پکار سن کر کچھ لوگ بھی آگئے تھے۔ اس دوران زرینہ بھی میرے پاس آگئی تھی۔ اس نے لوگوں کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔
”واہ بہت اچھے اور مارو کم بختوں کو۔“
”میرا خیال ہے اتنی سزا کافی ہے۔“ میں نے کہا۔
”آئندہ سے یہ ہر لڑکی کو اپنی ماں بہن سمجھیں گے۔“
وہ دن میری زندگی کا بریک تھرو تھا۔ مجھ جیسی لڑکی ایسا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ذرا سی دیر میں برسوں کا جما ہوا خوف موم کی صورت پگھل گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میری خود اعتمادی بڑھتی چلی گئی۔ اب سارے مرد مجھے کھلونے محسوس ہونے لگے۔ برسوں کی جھجک ختم ہو گئی تھی۔
اور یہ سب کچھ زرینہ کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ اس لڑکی نے مجھے بہادری کے ساتھ جینے کا ہنر سکھا دیا تھا۔
میں نے اپنی کہانی کے آغاز میں جو واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ اس وقت میرے کام آیا تھا جب میں اچھی طرح خود اعتماد ہو چکی تھی۔ اب مرد میرے لیے خوف کا باعث نہیں بلکہ میں ان کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ اس کے بعد مجھے ایک اچھے سے دفتر میں ایک اچھی سی جاب بھی مل گئی۔
اس دفتر کے سب لوگ واقعی مہذب تھے۔ نام نہاد مہذب نہیں بلکہ کلچرڈ لوگ تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے۔
اور اس دفتر میں مجھ پر زندگی کے سب سے خوب صورت تجربے کے دروازے کھلنے لگے تھے۔ یہ دروازہ تھا بخت کا۔
ذیشان اس دفتر میں ایک اچھی پوسٹ پر تھا۔ کمپنی کی طرف سے اسے گاڑی بھی ملی ہوئی تھی۔ وہ ایک مہذب نوجوان تھا اور اس سے مل کر اور اسے دیکھ کر یقین ہو جاتا تھا کہ وہ آگے چل کر بہت ترقی کرے گا۔
ہم دونوں کے درمیان دوستی اسی طرح ہوئی جس طرح ایک ہی دفتر میں ایک ساتھ کام کرنے والوں کے درمیان ہوا کرتی ہے۔
ایک دوسرے سے رسمی باتیں۔ پھر ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنا۔ پسند ناپسند کی معلومات حاصل کرنا۔ پھر آگے جا کر تحفے تحائف وغیرہ۔
میں اور ذیشان بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ اس کے گھر کے حالات بھی میرے گھر کے حالات سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ وہی زندگی کی بھاگ دوڑ وہی خوابوں کا تسلسل۔ سب کچھ ایک ہی جیسا تھا۔ اس لیے ہم میں بہت بے تکلفی سی ہو گئی تھی۔
کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ یہی ہم دونوں کے ساتھ ہوا۔ پورے دفتر کو ہماری انسیت کا پتا چل گیا تھا۔
دفتر کی لڑکیاں اور لڑکے ہمیں چھیڑا کرتے اور مبارک بادیوں کا سلسلہ بھی جاری رہا تھا۔ گویا بہت ہی خوشگوار صورتِ حال تھی۔
ہم دونوں کے گھر والوں کی طرف سے بھی کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ یعنی ہماری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہم بہت آسانی سے ایک دوسرے کے ہو سکتے تھے۔
میں نے ذیشان کے بارے میں زرینہ کو بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ بھی خوش ہو گئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ نصیحت بھی کی تھی کہ مکمل طور پر کسی مرد کے سامنے سرینڈر مت کرنا۔ اس کو پرکھنا، کیونکہ تم مردوں کے رویے دیکھ چکی ہو۔
”تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میں نے یہ قدم بہت سوچ سمجھ

کر اٹھایا ہے۔ میں ذیشان کو کئی بار پرکھ چکی ہوں۔ وہ اعتماد کے میزان پر پورا اترا ہے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

''سنو تم ایسا کرو۔ میں تمہیں ذیشان سے ملوا دیتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں کیا کروں گی مل کر۔''

''تم اس کو اپنے پوائنٹ آف ویو سے جانچ لو گی اور تمہیں یہ اطمینان بھی ہو جائے گا کہ تمہاری دوست نے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا ہے۔''

ذیشان بھی ملنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے ایک شام ذیشان کو شاہدہ سے ملوا ہی دیا اور یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

شروع شروع میں تو اس کا احساس نہیں ہو سکا تھا لیکن جب میں نے ذیشان کے رویے کو بدلتے ہوئے دیکھا تو کھٹک گئی۔

پہلے ہر دوسرے تیسرے دن وہ میرے ساتھ ہی دفتر سے نکلا کرتا۔ اپنی گاڑی پر مجھے ڈراپ کر دیتا۔ ہم راستے میں کسی ریستوران میں بیٹھ جایا کرتے۔ ہنستے رہتے، ایک دوسرے کو مزے مزے کی باتیں سنایا کرتے۔

اب وہ کام کا بہانہ کر کے دفتر میں ہی بیٹھا رہتا اور مجھ سے معذرت کر لیتا۔ مجبوراً مجھے اکیلے آنا پڑتا۔ میں نے اس کے رویے کو اس وقت تک خاص اہمیت نہیں دی۔ جب تک میں نے اسے شاہدہ کے ساتھ نہیں دیکھ لیا۔

میں نے اتفاقاً ان دونوں کو ایک شاپنگ مال سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ مجھ پر تو جیسے بجلی سی گر پڑی تھی۔

یہ کیا تماشا تھا۔ یہ دونوں کس طرح ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے۔ کیا ربط تھا دونوں کے درمیان۔

میرے خدا میں نے تو ان دونوں کی ملاقات کروا کے اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی تھی۔ مجھے ان دونوں ہی سے ایسی امید نہیں تھی۔

کیا ہوا تھا ذیشان کو اور کیا ہوا تھا زرینہ کو۔ وہ میری خوشیوں کی قاتل کیوں بنتی جا رہی تھی۔ وہ تو اچھی طرح جانتی تھی کہ میں ذیشان سے کتنی محبت کرتی ہوں۔

ایک دن دفتر میں ذیشان کے کمرے میں جا کر میں پھٹ پڑی۔ ''ذیشان صاحب مجھے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ آج کل آپ کا رویہ اجنبی جیسا ہو گیا ہے۔''

''اوہ!'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''کیا اندازہ ہوا ہے۔''

''شاہدہ نے تم کو ٹریپ کر لیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں اپنی آنکھوں سے تم دونوں کو دیکھ چکی ہوں۔''

وہ خاموش رہ کر میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

''بتاؤ کیوں کیا ہے ایسا۔'' میں نے پوچھا۔ ''میری محبت میں کیا کمی رہ گئی تھی؟''

''میں تمہارے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔'' وہ خشک لہجے میں بولا۔ ''بہتر یہی ہے کہ تم خود اپنی دوست سے جا کر پوچھ لو وہ تمہیں بتا دے گی۔''

میں دفتر سے سیدھی شاہدہ کے پاس چلی گئی تھی۔

''او ہو آؤ آؤ بہت دنوں کے بعد آئی ہو۔''

''شاہدہ تم ایک باکمال لڑکی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے کیا دوستی نبھائی ہے میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس طرح ذیشان کو مجھ سے چھین کر لے جاؤ گی۔''

''دیکھو تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''یہ مت کہو ایسا ہی ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ذیشان نے خود اس کا اعتراف کر لیا ہے۔ میں سمجھ نہیں سکی اس نے ایسا کیوں کیا۔ کیا کمی تھی مجھ میں۔''

''اب اگر بات کھل ہی گئی ہے تو میں یہ بتا دوں کہ تم میں کیا کمی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''تم میں اس ہنر کی کمی ہے مرد جس کی تلاش میں رہتے ہیں۔ تم گرم جوش نہیں ہو۔ تم میں خوب صورتی کے باوجود پھیکا پن ہے اس لیے مرد ابتدا میں تو تمہاری خوب صورتی سے متاثر ہو جائیں گے لیکن پھر وہ تم سے بور ہونے لگیں گے۔ جس طرح ذیشان ہوا ہے۔''

''شاہدہ۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے جہاں مجھے بہت کچھ سکھایا ہے وہاں یہ سب کیوں نہیں سکھایا۔''

''فرح اب جاؤ کسی اور کو تلاش کرو۔ ذیشان اب تمہاری طرف واپس نہیں آئے گا۔ ہم بہت جلد منگنی کر رہے ہیں۔''

میں بہت دل شکستہ سی شاہدہ کے گھر سے باہر آ گئی۔ اس نے ایک ہنر اپنے پاس رکھا تھا۔ جس طرح بلی نے شیر کو سب کچھ سکھا دیا ما سوائے ایک ہنر کے۔

❋❋

زہر کا پیالہ

مدیر محترم
سلام تہنیت
ایک سچ بیانی ارسال کررہا ہوں گو کہ اسے میں نے سچ بیانی کے انداز میں نہیں لکھا ہے، بالکل فلمی انداز میں واقعات لکھے ہیں لیکن قارئین کو یہ انداز بھی پسند آئے گا۔

تفسیر عباس بابر
(چیچہ وطنی، ساہیوال)

دونوں حریف مقابلے کے لیے تیار تھے۔ یہ کوئی عام نہیں، موت کا مقابلہ تھا۔ جو ہارتا اس کی موت یقینی تھی۔ یہی پنچائیت کے بڑوں نے صدیوں سے اس علاقے میں چل رہی رسم کے مطابق طے کیا تھا۔ دونوں حریف کڑیل جوان تھے۔ ایک کا نام شہباز تھا، اور دوسرا شہزاد۔ دونوں کے بیچ کوئی سیاسی یا مذہبی مخاصمت نہیں تھی۔ بس رقابت تھی۔

گاؤں سے کچھ فاصلے پر ملک نور کے کھیتوں میں میدان سجا دیا گیا تھا۔ لوگ جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ کچھ متجسس تھے، کچھ افسردہ، سچ تو یہ ہے کہ تماشائی بہت کم تھے کیونکہ اس اکھاڑے میں ایک کی موت یقینی تھی۔ شہزاد یا شہباز میں سے ایک کو مرنا تھا، زندہ رہنے والے کو گوہر مقصود ملنا تھا۔ جوں جوں مقابلے کا وقت قریب آرہا تھا، دلوں کی دھڑکنیں تیز اور بے ترتیب ہورہی تھیں۔ سب کے چہرے ملول وافسردہ تھے۔ دونوں حریف گاؤں بھر میں مقبول تھے۔ ان کی ذات اور کردار سے کسی کو تکلیف یا شکایت نہیں تھی۔ بالآخر خونی مقابلے کا وقت آن پہنچا۔ ملک نور اپنے حواریوں کے ساتھ مونڈھے پر براجمان تھا۔ وہ حقے کی نے دانتوں تلے دبائے گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ میدان کے چاروں اطراف گول دائرے کی صورت میں رسا باندھ دیا گیا تھا۔ بچے بوڑھے جوان اور متعدد بوڑھی عورتیں، دائرے کی شکل میں مقابلے کے منتظر تھے۔ دونوں نہتے حریف مدمقابل ہوئے تو دلوں کی دھڑکنیں بھرپور احتجاج کرنے لگیں۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو تول رہے تھے۔ ملک نور کے سامنے چھوٹی سی میز پر ایک پیالہ رکھا ہوا تھا۔ اس میں سریع الاثر زہر تھا، اور وہ ہارنے والے کو اپنے ہاتھوں سے پینا تھا۔ یہی اس بستی کی رسم تھی۔ ملک نور گاؤں کا کرتا دھرتا تھا، اس کا فیصلہ گویا عدالت کا آخری فیصلہ ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کی جانب بڑھتے ہوئے دونوں حریف ایک لمحے کے لیے رکے اور مونڈھے پر پڑے ہوئے زہر کے پیالے کو دیکھنے لگے۔ دونوں پس وپیش اور تذبذب سے دوچار تھے۔ ”مقابلہ شروع کیا جائے“ ایک بھاری آواز گونجی۔ ”مقابلے کا وقت پندرہ منٹ ہے۔ ہارنے والے کو فوراً سے پہلے زہر کا پیالہ پینا ہوگا۔“

مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ شہزاد اور شہباز آمنے سامنے کھڑے تھے۔

”کہا تھا ناں! تم ہی دستبردار ہوجاتے۔“ شہباز نے سرگوشی کی۔

”دستبردار ہوتا، تو بھی مرجاتا“ شہزاد نے مقابلے سے پہلے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور جب مرنا ہی ہے تو پھر پشیمانی کیسی؟ سقراط نے بھی زہر کا پیالہ پیا تھا۔“

موسم سرما کے ابتدائی ایام تھے، تاہم دن کے اوقات میں قدرے گرمی کا احساس ہوتا تھا۔ شہزاد اور شہباز کی پیشانیوں پر پسینے کے قطرے نمودار ہورہے تھے۔ اغلب امکان یہی ہے کہ یہ موت کا پسینا تھا، یا ہار کر گوہر مقصود کو کھودینے کا، لیکن یہ طے ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی موت سے خوف زدہ نہیں تھا۔ دونوں نے ہاتھوں میں ہاتھ

ڈالے تو ان کے توانا بازوؤں کی مچھلیاں ابھر آئیں۔ دونوں صحت مند اور کسرتی جسم کے مالک تھے۔ شہباز والی بال کھیلتا تھا، اور شہزاد کبڈی کا ابھرتا ہوا کھلاڑی، لیکن اس مقابلے میں لڑائی کی شرائط لاگو نہیں تھیں۔ بس کسی بھی طرح، حریف کو زہر کے پیالے تک پہنچانا تھا۔ اور دونوں سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ دونوں باقاعدہ متحرک ہوتے۔ اچانک ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ دونوں نے ٹھٹک کر مجمع کی طرف دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون بمشکل رسا پھلانگتی ہوئی، ملک نور کی جانب بھاگتے ہوئے بڑھنے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ اس کے روبرو کھڑی تھی۔

''ہمیں کچھ نہیں چاہیے ملک نور'' وہ التجائیہ انداز میں بولی۔ ''میرے بیٹے شہباز کو میرے ساتھ جانے دیں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔''

''میدان چھوڑنے سے مرجانا بہتر ہے اماں۔'' دور سے شہباز بولا۔ ''تو بیچ میں مت آ۔''

''یہی مقابلے کا اصول ہے صغریٰ بہن۔'' ملک نور نرمی سے بولا۔ ''ورنہ یہ چپقلش اور مخاصمت زندگی بھر ہوتی رہے گی۔''

''ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ بہت دور۔'' وہ رونے لگی۔ ''بس مجھے میرا بیٹا دے دو۔''

شہزاد کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے استہزائیہ نظروں سے شہباز کی طرف دیکھا، اور بولا۔ ''اپنی بوڑھی ماں کا خیال کرو یار، دستبردار ہو جاؤ۔''

''نہیں شہزاد، اب تو عزت اور مردانگی کا مسئلہ بن گیا ہے۔ میں اس میدان میں مر تو سکتا ہوں، چھوڑ نہیں سکتا۔''

''نہیں بی بی، تو پنچایت کے فیصلے میں دخل مت دے۔'' ملک نور بولا۔ ''ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ مقابلہ ملتوی ہوا ہو۔''

صغریٰ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ بن پانی کے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی، لیکن اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ چند بزرگ افراد نے آگے بڑھ کر اسے میدان سے باہر نکال دیا۔ وہ چیختی چلاتی بیہوش ہو چکی تھی۔

☆......☆

ملک کو آزاد ہوئے 18 سال ہو چکے تھے، کہ جنگ کا غلغلہ اٹھا۔ دونوں ممالک کی فوجیں کمر کسنے لگیں۔ ہتھیار تیار

ہونے لگے۔نوجوانوں کو جنگی تربیت اور داؤپیچ سکھائے جانے لگے۔یہ دونوں بھی جنگی تربیت حاصل کررہے تھے۔شہزاد اور شہباز، دونوں بہت اچھے دوست اور بھائیوں کی طرح تھے۔ایک ہی گاؤں کے رہنے والے،ایک ہی محلہ حتیٰ کہ دونوں کے گھروں کی دیوار بھی مشترک تھی۔بس گھروں کے در جدا جدا تھے،لیکن یہ بڑی بات نہیں تھی۔ایک دوجے کے گھروں میں بلاجھجک آنا جانا تھا۔شہباز کے ابا تقسیم کے وقت بلوائیوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے تھے جبکہ شہزاد کے ابا کچھ سال پہلے طبعی موت مرے تھے۔دونوں ملک پور گاؤں کے کھاتے پیتے گھرانوں کے چشم وچراغ تھے۔دونوں دراز قامت سرخ وسپید اور خوبرو تھے،ہم عمر بھی تھے اور قابل تعریف کردار کے حامل بھی۔ملک پور ساہیوال کا ایک پسماندہ ترین گاؤں تھا۔ان دنوں ساہیوال کو منٹگمری کہا جاتا تھا۔ہڑپہ کے کھنڈرات کے قریب سے ایک کچی سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی،ملک پور کی طرف جاتی تھی۔بمشکل تانگا دستیاب ہوتا تو قسمت،ورنہ عمومی طور پر لوگ پیدل سفر کرنے کے عادی تھے۔ملک پور میں قانون کی بالادستی کا تصور بھی محال تھا۔اگر کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آجاتا تو فیصلہ پنچائیت کے بڑے بزرگ کرتے اور وہ فیصلہ حتمی اور اٹل ہوتا۔گاؤں کے بڑوں میں سب سے معتبر اور معزز نام ملک نور کا تھا۔شکل وصورت اور قد وقامت سے ہی وہ ایک انتہائی اثر انگیز اور سخت شخصیت کا حامل نظر آتا تھا۔بڑی بڑی مونچھیں،اور بڑی بڑی آنکھیں اسے ممتاز کرتی تھیں۔تاحدنگاہ اسی کی زمین تھی۔اس کے اہل وعیال میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں،جو کہ اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ان کی بیگم کو ایک سال پہلے ہارٹ اٹیک ہوا،اور وہ راہی ملک عدم ہوگئیں۔یہ ایک تپتی ہوئی دوپہر کا واقعہ ہے،جب فصلوں کو پانی دینے کی باری پر عبدالغنی اور خورشید خان میں جھگڑا ہوگیا۔یہ دونوں ملک پور کے رہائشی اور چھوٹے زمیندار تھے۔عبدالغنی نے عین اس وقت پانی کا ناکہ اپنے کھیتوں کی طرف کھول دیا،جب رشید خان نے اپنی فصلوں کو پانی دینا تھا۔اسی لمحے رشید خان وہاں پہنچ گیا،اس کے تیور اچھے نہیں تھے۔

”عبدالغنی کوئی شرم حیا بھی ہوتی ہے۔“ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔”تمہیں پتا بھی ہے آج میری باری ہے۔“

”باری ہے تو کون سی قیامت آگئی ہے۔“ عبدالغنی بھی بھتے سے اکھڑ گیا۔”دیکھو تو میری فصلیں سوکھ رہی ہیں۔“

”ہاں ہاں میری فصلیں تو تمہیں ہری بھری نظر آرہی ہیں۔“ رشید نے درشتگی سے کہا۔”تم جتنے موٹے ہو،تمہاری عقل بھی اتنی ہی موٹی ہے،اس لیے عقل کے اندھے بھی ہو۔“

عبدالغنی نے کسّی کے دستے پر اپنا ہاتھ مضبوطی سے جمایا،اور غرا کر بولا۔”دیکھو رشید،بدزبانی اور گالی گلوچ سے مجھے بڑی چڑ ہے،منہ سنبھال اور یہاں سے چلتا پھرتا نظر آ،ورنہ......“

”ورنہ......ورنہ کیا؟“ رشید دھاڑا۔”کیا کرے گا تو،دھمکی دیتا ہے؟ مجھے کسّی مارے گا؟“

”ہاں،میں مار بھی دوں گا۔“ وہ بھی دہاڑ کر بولا۔

”چل اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو مار۔“ رشید کو بھی طیش آگیا۔دوسرے ہی لمحے عبدالغنی کی ”کسّی“ اس کے سر میں اتر گئی۔چہرہ لہو میں تر ہوا،تو منظر دھندلانے لگے۔وہ نیم جاں ہوکر پگڈنڈی پر گر گیا۔اس کا لہو بہتے ہوئے پانی میں شامل ہوکر فصلوں کو سیراب کرنے لگا۔ضرب کاری تھی،کسّی کی تیز دھار نے دماغ تک رسائی حاصل کی اور اسے تڑپنے کا موقع تک نہیں ملا۔عبدالغنی نے کسّی پھینکی اور کماد کی فصلوں میں غائب ہوگیا۔بالآخر یہ فیصلہ بھی پنچائیت تک پہنچا۔عبدالغنی پکڑا گیا اور اس نے اقرار جرم بھی کرلیا۔اس سے پہلے کہ فیصلہ سنایا جاتا،رشید کی جواں سال خوبرو بیٹی رملا نے عین فیصلے کے وقت تیز دھار کلہاڑی عبدالغنی کے سر میں اتار دی۔پنچائیت کے بڑے اور گاؤں کے دیگر لوگ انگشت بدنداں تھے کہ ایک نازک اندام لڑکی نے بھری پنچائیت میں قتل کردیا۔

”اب اس کا کیا ہوگا ملک نور؟“ پنچائیت کا بزرگ ملک اللہ یار متفکر لہجے میں بولا۔

”کیا تو اس نے غلط ہی ہے ملک جی،پروہ اس کا باپ تھا۔اس کا باپ کے سوا کوئی نہیں تھا۔اسلام میں بھی ضرب کا بدلہ ضرب اور قتل کا بدلہ قتل ہے۔“ ملک نور نے دلیل دے کر گویا اپنا فیصلہ سنادیا۔

ملک نور تفہیمی انداز میں سر ہلاتا ہوا اٹھا تو لوگ منتشر ہونے لگے۔

”اب یہ کہاں جائے گی ملک صاحب۔“ ایک اور بزرگ نے غصے اور خوف کی شدت سے نیم بیہوش رملا کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ اب میری پاس میری بیٹی بن کر رہے گی۔“

یہ فیصلہ بھی اٹل تھا۔وقت گزرا تو رملا بھی سنبھل

گئی۔اس کے شب و روز ملک نور کی حویلی میں گزرنے لگے۔عبدالغنی کی بیوی اور بیٹی بھی اس فیصلے پر خاموش نہیں، کیونکہ یہاں یہی ہوتا تھا۔لوگ ناخواندہ مگر انصاف کے قائل تھے۔رملا کبھی کبھار گھر سے باہر نکل جاتی تھی۔کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے آنکھ بھر کے دیکھتا،ایک تو عبدالغنی کاتل،اور اوپر سے ملک نور کی سرپرستی، وہ سب کے لیے قابل احترام تھی۔اس کے حسن میں کوئی کلام نہیں تھا۔جو اسے دیکھتا اسے پلک جھپکنے کا خیال کم ہی آتا تھا،لیکن گاؤں کے نوجوان اس سے خائف تھے،اور اس سے زیادہ خوف انہیں ملک نور کا تھا۔

"ملک بابا!" میں بھی میلے میں جاؤں گی۔" اس نے اتنے پیار اور معصومیت سے کہا کہ ملک نور بیساختہ مسکرا دیا اور بولا۔"دھی رانی، تمہیں روکا کس نے ہے۔تم بلا جھجک جا سکتی ہو۔ویسے بھی کس مائی کے لال میں اتنی جرأت ہے کہ میرے شیر پتر کو آنکھ اٹھا کر دیکھے۔" اس نے اپنا مضبوط ہاتھ رملا کے سر پر رکھا تو اسے باپ کی شفقت یاد آنے لگی۔اس سے پہلے کہ اس کے نیم گرم آنسو پلکوں کی سرحد عبور کرتے وہ بولا۔"پر پتر اپنے ساتھ ثریا کو لے جانا۔"

"جی بابا۔" اس نے ضبط کے بند کو باندھا،اور ملک پور کے قدیمی میلے میں جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔

☆......☆

وہ میلے میں کیا آئی اس نے تو میلہ ہی لوٹ لیا۔ہر نظر اس پر نچھاور تھی، ہر ایک تہہ دل سے اس پر فریفتہ ہو رہا تھا۔سیاہ رنگ لباس میں اس کی سرخ و سفید رنگت جیسے بادلوں کی اوٹ سے چاند جھلک رہا ہو۔وہ کھلکھلا کر ہنستی تو میلے کا رنگ دوبالا ہو جاتا۔ثریا اس کے ساتھ سائے کی طرح چپکی ہوئی تھی کہ مبادا اسے کوئی اٹھا کر بھاگ نہ جائے۔ثریا بھی جواں سال اور خوش شکل تھی۔دونوں کھلکھلا کر ہنستی ہوئی میلے میں گھوم پھر رہی تھیں۔زرق برق ملبوسات میں آس پاس کے گاؤں سے آئی ہوئی لڑکیاں ادھیڑ عمر عورتیں اور بچے بھی میلے میں شریک تھے۔یہ بازار صرف خواتین اور بچوں کے لیے مختص تھا۔اس طرف مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔قطار در قطار سجی ہوئی دکانیں جلیبیوں کے تھال، پکوڑوں سموسوں کی اشتہا انگیز خوشبو اور بچوں کے کھلونوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔بازار کے اختتام پر جھولے نصب تھے جنہیں ایک ادھیڑ عمر مدقوق صورت آدمی ہاتھ سے چلا رہا تھا۔اِدھر جھولے کی رفتار ذرا سی تیز ہوئی اُدھر جھولا جھولتی لڑکیوں کی سریلی چیخیں کانوں میں جل ترنگ بجانے لگتیں۔وہ چوڑیوں کی ایک دکان پر آئی اور رنگ برنگی چوڑیوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔"ثریا! تمہیں کون سا رنگ پسند ہے؟"

"جو تمہیں پسند ہو وہی لے لو۔" ثریا بھی چوڑیوں پر نظر جماتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولی۔

"مجھے تو یہ پسند ہیں۔" اس نے سیاہ رنگ کی چوڑیوں پر اپنا مرمریں ہاتھ رکھ دیا۔اس نے اپنے اور ثریا کے لیے مختلف رنگ کی چوڑیاں خریدیں اور جھولے کی طرف دیکھنے لگی۔اسی لمحے جھولے کے قریب اسے خوبرو اور جواں سال شہباز دکھائی دیا۔وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی کیونکہ اس طرف مرد حضرات کا داخلہ قطعی ممنوع تھا۔معاً شہباز کی سرسری نظر اس پر پڑی۔چند لمحوں کے لیے وہ مبہوت سا ہوا۔پھر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی دونالی بندوق کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔وہ اسے میلے کے ہجوم میں غائب ہوتے دیکھتی رہی۔وہ اس کی مردانہ وجاہت سے متاثر نہیں ہوئی کیونکہ وہ اس مزاج کی حامل ہی نہیں تھی۔اسے تو حیرت نے ادھر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔شہباز نے سفید رنگ کے پاجامے کے ساتھ نیلے رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا۔پاؤں میں موچی کے ہاتھ کا بنا ہوا بیش قیمت سنہری کھسہ، گھنگریالے لمبے اور سیاہ بال، چھوٹی سی داڑھی اور لبوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ۔بلاشبہ وہ ایک اثر انگیز سراپا کا مالک تھا لیکن یہ بھی کم نہ تھی۔اپنے حسن بیکراں کی مملکت کی ملکہ عالیہ ہے،اس نے اسے سرسری نظر سے دیکھا تھا،یہ بات رملا کو بھی کھٹکی تھی لیکن اس نے زیادہ سوچنا ضروری نہیں سمجھا۔

"ہونہہ......یہ ڈشکرا یہاں کیا کر رہا ہے؟" وہ بڑبڑائی تو ثریا کا قہقہہ بلند ہوا۔وہ اسے مصنوعی خفگی سے گھورتے ہوئے بولی۔

"یہ تمہارے دانت کیوں نکل رہے ہیں؟"

"وہ ڈشکرا......" وہ بات مکمل نہ کر پائی اور پھر ہنسنے لگی۔

"تو اور کیا؟ ڈشکرا ہی تو ہے،ملک بابا سے پوچھوں گی یہ ادھر کیا کر رہا تھا۔"

ثریا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔"اگر وہ اس طرف آیا ہے تو ملک صاحب کے علم میں ضرور ہوگا کیونکہ یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے انہی کی مرضی سے ہوتا ہے۔"

"کیوں ایسا کیا ہے؟" وہ مستفسر ہوئی۔

"شاید تمہیں معلوم نہیں ملک نور کی پڑوسی گاؤں کے ملک خدابخش سے پرانی دشمنی چلی آ رہی ہے۔" وہ دونوں

باتیں کرتی ہوئی مست سرکار کے دربار کی طرف بڑھ رہی تھیں۔مست سرکار یہاں مدتوں پہلے آکر آباد ہوئے اور یہیں ان کی موت ہوئی تھی۔ملک پور کا میلہ انہی سے منسوب تھا۔دربار کا عقبی حصہ قبرستان کے لیے مختص کردیا گیا تھا۔وہ دونوں دربار کے احاطے میں داخل ہوگئیں۔رملا کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔اس نے دربار کے مرکزی دروازے کے باہر ایک اور مسلح خوبرو نوجوان کو دیکھا۔وہ چاق وچوبند کھڑا تھا اور اس کی عقابی نگاہیں چاروں اطراف کے جائزے میں مصروف عمل تھیں۔ایک لمحے کے لیے اس کی نظر رملا پر پڑی۔اس کی آنکھوں اور چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔دوسرے ہی لمحے وہ اپنی ذمہ داری میں مگن ہوگیا۔غیر ارادی طور پر رملا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔اسے متعدد اسلحہ بردار نظر آئے۔اسے ثریا کی بات پر یقین ہونے لگا۔جو دشمنی چل رہی ہے اسی خطرے کے پیش نظر یہ انتظام ہے۔دشمنی کی وجہ کیا ہے یہ اسے پتا نہ تھا اسی لیے وہ متجسس لہجے میں بولی۔

''ملک بابا اور ملک خدا بخش کی دشمنی کی وجہ کیا ہے؟''

ثریا بولی۔''یہ بڑی لمبی بات ہے۔یہ دونوں چچیرے بھائی بھی ہیں اور ایک دوسرے کے جانی دشمن بھی۔''وہ دربار کی کوتاہ قامت دیوار سے لگ کر باتیں کررہی تھیں۔لمحاتی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔''ابا کہتا ہے کہ ملک نور کو ملک خدا بخش کے گاؤں مہراب پور میں غضب کا عشق ہوا تھا لیکن وہ لڑکی خدا بخش کی منگیتر تھی۔کہتے ہیں عشق اور مشک کبھی نہیں چھپتے۔جب یہ عشق کی کہانی زبان زدعام ہوئی تو ملک خدا بخش نے اپنی منگیتر کو اٹھوالیا اور اسے خوب مارا۔''

''ہائے اللہ،ایسا تھوڑی ناں ہوتا ہے؟''رملا نے تحیر آمیز لہجے میں آنکھیں پھیلائیں۔

''ایسا ہی ہوا تھا۔''وہ بولی۔''برادری کے بڑوں نے اس ہاجرہ نامی لڑکی کو ملک خدا بخش سے بازیاب کروایا اور جب اس سے اس کی مرضی پوچھی گئی تو اس نے ملک خدا بخش سے شادی کرنے سے صاف انکار کردیا۔''

''پھر؟''

''پھر وہی ہوا جو یہاں کا رواج ہے۔ملک خدا بخش تو مرنے مارنے پر تل گیا تھا۔پنچائیت نے فیصلہ کیا کہ دونوں آپس میں مقابلہ کرلیں،جو جیتے گا حاجرہ اس کی ہوجائے گی اور جو ہار جائے گا اسے بھرے میدان میں زہر کا پیالہ پینا ہوگا۔''

''ہائے اللہ،زہر کا پیالہ؟پھر مقابلہ ہوا؟''

''نہیں،جسمانی لحاظ سے ملک خدا بخش،ملک نور کی نسبت کمزور تھا۔لہٰذا وہ موت کے مقابلے کی بجائے حاجرہ سے دستبردار ہوگیا۔تب سے اب تک دشمنی چلی آرہی ہے۔''

''اور ہاجرہ بی بی کا کیا ہوا؟''رملا کی دلچسپی فزوں تر تھی۔

''لے دس،تمہیں یہ بھی نہیں پتا،وڈی ملکانی ہاجرہ بی بی ہی تو تھیں،پچھلے سال ہارٹ اٹیک نے ان کی جان لے لی۔''

''اچھا،مجھے معلوم نہیں تھا،کیونکہ انہیں سب وڈی ملکانی کے نام سے ہی جانتے تھے۔''

مذکورہ کہانی کی تفصیلات میں ان دونوں کو وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ساون بھادوں کے حبس زدہ ایام تھے۔جسم پسینے میں شرابور ہوئے تو انہیں گرمی کی شدت کا احساس ہوا۔دونوں نے مست سرکار کے دربار پر حاضری دی،اور اپنی اپنی منتیں مانیں۔وہ دربار کے در سے باہر نکلیں تو وہی دو آنکھیں ایک لمحے کے لیے رملا کے دلکش چہرے پر مرتکز ہوئیں۔اس کی نسوانی حس نے اسے خبردار کیا کہ دو آنکھوں کی گرماہٹ اس کے وجود کا طواف کررہی ہیں۔

''اب یہ کون ہے۔''اس نے ثریا سے استفسار کیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔''یہ بھی ڈشکرا ہے۔''اور پھر دونوں کی چوڑیوں کی کھنک اور سریلے قہقہوں کا جلترنگ بج اٹھا۔

''اس کا نام شہزاد ہے۔اپنے ہی گاؤں میں رہتا ہے''ثریا بتانے لگی۔''شہباز اور شہزاد اپنے ملک صاحب کے بہت چہیتے ہیں۔دونوں انتہائی نڈر اور بہادر ہیں۔سنا ہے حکومت نے انہیں جنگی خدمات کے لیے تربیت دی ہے،لیکن فی الحال جنگ کا خطرہ ٹل گیا ہے،اس لیے اب ملک صاحب کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔''

''چل،ہمیں کیا لینا ایسی باتوں سے؟میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔''رملا نے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔مرکزی دروازے کے سامنے برگد کے درخت کے نیچے کھڑے شہباز اور شہزاد باتیں کررہے تھے۔معاً شہباز کی ستائشی نظر نے رملا کی دید کی سعی کی۔اس کے ہونٹوں پر وہی دل آویز مسکراہٹ تھی۔

''ہونہہ ڈشکرا۔''وہ ناک سکوڑ کر بولی اور ثریا کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی۔دیکھتے ہی دیکھتے موسم نے بغاوت کا اعلان کردیا۔چلچلاتی دھوپ کو سیاہ بادلوں کی دبیز تہہ نے پسپا کردیا۔اچانک ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں،اور پھر ان تیز وتند

ہواؤں نے شدت اختیار کرلی۔ گھنے سیاہ بادل آسمان کے کشادہ سینے پر پھیلنے لگے، یہ تیز و تند ہواؤں کی کارستانی تھی۔

''ہائے اللہ، اب کیا ہوگا۔'' رملا نے ثریا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا، لیکن افراتفری میں ان دونوں کے ہاتھوں کا بندھن ٹوٹ گیا۔ گردوغبار نے مناظر کو دھندلا دیا اور ثریا اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ عین اسی وقت اس نے ثریا کی چیخ سنی۔ گردوغبار اور تیز و تند ہواؤں نے میلے کو تہس نہس کرنا شروع کردیا۔ اب جس کا جدھر منہ اٹھا وہ اندھا دھند اسی طرف بھاگتا چلا گیا۔ بچوں لڑکیوں اور عورتوں کی چیخ و پکار، مردوں کی تنبیہی آوازیں۔

عجیب ماحول بنا گئے۔ ہوا نے طوفانی انداز اختیار کرلیا۔ دھندلی آنکھوں سے اس نے ایک منظر دیکھا۔ دو تجیم شجیم آدمی ثریا کو پکڑ کر گھسیٹ رہے تھے۔ وہ بلا ارادہ اس کی طرف بھاگی۔ ہوا کے تیز تھپیڑے نے اسے اٹھا کر کئی فٹ پیچھے پھینک دیا۔ اس کی آنکھیں مٹی اور پانی سے بھر گئیں۔ ثریا کی چیخیں معدوم ہونے لگیں۔ اسے احساس ہوا کہ وہ جلیبیوں کے ایک تھال میں گری ہے۔ اسے اپنے جسم پر میٹھے کی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ برق رفتاری سے نیچے کودی اور کسی سمت کا تعین کیے بغیر سرپٹ بھاگنے لگی۔ کوئی سمت تھی بھی نہیں، ہواؤں کی بغاوت عروج پر تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی کئی لوگوں سے ٹکرائی۔ اس کے سر کا دوپٹا ہواؤں کی گستاخی نے چھین لیا تھا۔ بے سمت بھاگتی ہوئی اچانک وہ کسی آہنی چیز سے ٹکرائی۔ اس کی چیخ ہواؤں کے شور میں تحلیل ہوگئی۔ اسے اپنی پیشانی پر شدید چوٹ کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ زخم خاصا گہرا تھا اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ہوا کے تھپیڑے نے دوبارہ اسے اس آہنی چیز کی طرف پھینکا۔ اس بار اس نے ہمت مجتمع کی اور اس آہنی چیز کو تھام لیا۔ یہ بچوں کا جھولا تھا، جس پر کچھ دیر پہلے لڑکیاں جھولے لیتی ہوئی خوشی سے چیخ رہی تھیں۔ چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں لیکن انداز بدل گیا تھا۔ اب ہواؤں کی سنسناہٹ میں خوفزدہ چیخوں کا شور تھا۔ اس نے جھولے کو کس کر پکڑ لیا۔ ہوا کی شدت میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ جتنی بھی بہادر اور نڈر صحیح مگر تھی تو ایک نازک اندام لڑکی، عالم خوف میں اس کے ہاتھ سے جھولا چھوٹ گیا۔ وہ غیر متوازن ہوکر لڑکھڑائی اس سے پہلے کہ وہ نیچے گرتی دو مضبوط ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔

☆......☆

وہ دونوں سر جھکائے ملک خدا بخش کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ رعونت زدہ انداز میں سرکنڈوں کے موڑھے سے ٹیک لگائے بیٹھا انہیں قہر بار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے دیگر حواریوں کی نگاہیں بھی اُن دونوں پر جمی ہوئی تھیں لیکن کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔

شہر سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر یہ ملک خدا بخش کا ڈیرہ تھا۔ جہاں ہر برائی پنپتی تھی۔ ہر ظلم پروان چڑھتا تھا۔ دن کے پچھلے پہر طوفانی بارش کے بعد کا حبس جان لیوا تھا۔ ایک مریل سا لمبا تڑنگا آدمی اس کے دائیں جانب کھڑا ایک بڑا سا دستی پنکھا مسلسل ہلا رہا تھا۔ پنکھا کھجور کے پتوں سے تیار کرکے اس کے اوپر نیلے رنگ کا کپڑا چڑھا دیا گیا تھا۔ پنکھے کے ساتھ اس کی سرخ جھالر تواتر کے ساتھ متحرک تھی۔ پنکھا بردار ذرا سا سست پڑتا تو ملک کی سرخ غصیلی آنکھیں ناگواری سے اس کی طرف اٹھ جاتیں اور اسی لمحے پنکھا بردار کے ہاتھوں میں تیزی آجاتی۔ قطار در قطار موٹے بان کی چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے اس کے کارندے شکلوں سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ ٹاہلی کے گھنے درخت کے نیچے گویا عدالت لگی ہوئی تھی۔ چند فرلانگ کے فاصلے پر پختہ اور چوڑی اینٹوں سے تیار شدہ چار کمرے تھے۔ ڈیرے کا مرکزی گیٹ بند کرکے زنجیر چڑھا دی گئی تھی۔ توت کے درخت کے نیچے دو بل ٹیریئر کتوں کی خوفناک آنکھیں چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''دل تو کرتا ہے تمہیں ان کتوں کے آگے ڈال دوں'' ملک خدا بخش اپنی نوک دار مونچھ کو مروڑتے ہوئے غرایا۔ ''بالکل نکمے ہو، کسی کام کے نہیں ہو تم دونوں۔''

''وہ جی...... شرفو نے کہا تھا کہ یہی رملا بی بی ہے۔'' شرفو کے ساتھ کھڑا ہوا رمضان منمنایا۔ ''اور ملک جی اوپر سے طوفان نے تو اندھا کرکے رکھ دیا تھا۔''

شرفو ہمت کرکے بولا۔ ''ملک جی اگر طوفان نہ آتا تو ہم تو دونوں کو ہی اٹھانے والے تھے۔''

''بکواس بند کر، طوفان تو اب آئے گا جب تیرے پیو ملک نور کو شک پڑے گا کہ یہ سب ہمارا کیا دھرا ہے۔'' وہ دہاڑ کر بولا۔ ''اٹھانے رملا کو گئے تھے اور لے آئے اس کی نوکرانی کو۔''

''ملک جی غلطی ہوگئی۔'' رمضان آہستگی سے بولا۔

''غلطی نہیں، بیوقوفی کہو، اب وہ چوکنے ہوجائیں گے اور ہمیں موقع نہیں ملے گا۔''

''ملک جی ایک موقع اور دے دیں'' شرفو بولا۔ ''بس

کچھ ہی دنوں میں رملا آپ کے قدموں میں ہوگی۔"
وہ غرا کر اٹھا اور ایک زناٹے دار تھپڑ شرفو کے گال پر رسید کرتے ہوئے بولا۔ "تمہیں کتنی بار کہا ہے اسے رملا بی بی کہا کر خنزیر کی اولاد اور اب دفع ہو جاؤ، غائب کر اس مصیبت کو جسے اٹھا لایا ہے۔ بڑا آیا موقع مانگنے والا، تمہیں اندازہ نہیں وہ ملک نور کے چیلے کیا نام ہے ان کا؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔
"جی شہباز اور شہزاد" چارپائی پر بیٹھا ہوا شوکا بولا۔
"ہاں وہ شہباز اور شہزاد۔ ٹوٹے کر دیں گے تمہارے، اب دفع ہو جا اور اسے غائب کرو۔" وہ تلملاتا ہوا دوبارہ مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں تیزی سے حرکت میں آ گئے۔ ان کا رخ سامنے والے کمرے کی طرف تھا۔ جس کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ رمضو نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور شرفو کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں کھاد کی بوریاں اور زرعی سپرے کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک جھلنگا سی چارپائی پر پسینے میں شرابور ثریا اوندھے منہ پڑی تھی۔ دھینگا مشتی میں جگہ جگہ سے اس کا لباس پھٹ گیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں نے کلائیوں کو رنگین کر دیا تھا۔ وہ نیم بیہوشی کے عالم میں کراہ رہی تھی۔
"اب کیا کرنا ہے اس کا؟" شرفو نے پوچھا۔
"کرنا کیا ہے؟ مار کر دریا میں پھینک آئیں گے رات کو۔" رمضو نے سفاک لہجے میں کہا۔
اسی لمحے لکڑی کا دروازہ چرچرایا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا۔ ان کے سامنے شوکا کھڑا حریصانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔
"ملک کہیں چلا گیا ہے۔ تم بھی جاؤ آرام کرو۔ اسے میں سنبھال لوں گا۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "اور ہاں رمضو اس کے ہاتھ کھول دے۔" اس نے اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔
"کرنا کیا چاہتے ہو تم؟" رمضو اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
"کوئی بے غیرتی نہ کرنا پہلے ہی معاملہ بہت خراب ہو گیا ہے۔"
"زیادہ ٹر ٹر نہ کر، تیری بے بے لگتی ہے؟ اور ویسے بھی مدعا تو غائب کرنا ہی ہے۔ اگر مدعے کے ساتھ کچھ ہو بھی گیا تو کیا فرق پڑے گا۔" وہ بولا تو اس کے منہ سے شراب کی بو آنے لگی۔ "کیا خیال ہے شرفو؟" اس نے آنکھ دبائی تو شرفو کے اندر بھی ابلیس نے انگڑائی لی۔

"بات تو ٹھیک ہے یار۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ کر ثریا کے ہاتھ کھول دیے۔ ثریا ایک بھرپور اور جوان عورت تھی۔ پینتیس کی عمر میں بھی نوجوان دکھائی دیتی تھی۔ یہ ملک نور کے شفیق رویے اور اس کے گھر کی بہترین غذا کا کمال تھا۔ کچھ عرصہ قبل اس کی شادی ہوئی تھی۔ کئی سال تک اس کی گود ہری نہ ہوئی تو اس کی ساس نے اپنے بیٹے کو ورغلا کر اس کی شادی کہیں اور کر دی، مجبوراً ثریا نے طلاق لے لی اور اپنے باپ کے ساتھ رہنے لگی۔ اس کا باپ خادم علی ملک نور کا منشی تھا۔ وڈی ملکانی کے کہنے پر اسے ملک کی حویلی میں چھوڑ دیا گیا۔ ملک نور نے ہمیشہ اسے بیٹی کی نظر سے دیکھا اور جب رملا حویلی میں آئی تو وہ دونوں کی طرف سے بے فکر ہو گیا۔ اگرچہ وہ گھر کے کام کاج کرتی تھی لیکن رویہ روایتی مالکوں جیسا نہیں تھا۔
"میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔" رمضو فیصلہ کن لہجے میں بولا۔
"تنگ نہ کر یار۔" شوکا استہزائیہ انداز میں بولا اور ایک قدم آگے بڑھ کر رمضو کو گھورنے لگا۔ معاً اس کے چہرے پر سفاکی در آئی۔ دوسرے لمحے ایک تیز دھار خنجر رمضو کے سینے میں اتر گیا۔ خنجر عین دل کے مقام پر لگا تھا۔ اسے تڑپنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ وہ دھڑام سے نیچے گرا اور ساکت ہو گیا۔ کچی زمین پر اس کا خون پھیل رہا تھا۔
"یہ کیا کیا تم نے؟" شرفو گھبراہٹ زدہ انداز میں بولا۔
"کچھ نہیں، یہ کئی دنوں سے میری نظر میں تھا۔ ملک سے کہنا اسے اس لڑکی نے مارا ہے۔ بدنیت ہو رہا تھا۔ چل اسے اٹھا دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔"
"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" اچانک ثریا پھنکارتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور غرا کر بولی۔ "میں جانتی ہوں تم لوگ کون ہو اور یہ حرکت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔"
اس کے دونوں ہاتھ پشت کے پیچھے تھے۔ وہ بکھرے بالوں اور سرخ آنکھوں کے ساتھ شوکے کو گھور رہی تھی۔
وہ پھنکار کر بولا۔ "تم یہ تو جانتی ہو کہ ہم کون ہیں پر یہ نہیں جانتی کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔" وہ مکروہ قہقہہ لگا کر اس پر جھپٹا اور یہی اس کی غلطی تھی۔ اچانک پوری قوت کے ساتھ ثریا کے ہاتھ میں دبا ہوا سریا اس کے سر کے وسط میں لگا۔ سریا اسے بوریوں کے پاس پڑا ہوا ملا تھا جسے اس نے پھرتی سے اٹھا لیا تھا۔ وہ ڈکرا کر نیچے گرا اور لوٹ پوٹ

ہونے لگا۔ وہ دہاڑتی ہوئی شرفو کی طرف بڑھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتی۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹا اور دروازہ کھول کر سرپٹ دوڑنے لگا۔ اس کے لیے یہی بہترین موقع تھا۔ اس نے دروازہ عبور کیا۔ ڈیرے میں سوائے کتوں کے کوئی ذی نفس نہیں تھا۔ شرفو کتوں کی طرف بھاگا اور وہ مرکزی گیٹ کی طرف دوڑنے لگی۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر اس نے زنجیر میں ہاتھ ڈالا اسی لمحے شرفو نے کتوں کو آزاد کر دیا۔ کتے غراتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ اس دوران ثریا دروازہ کھول چکی تھی۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے باہر نکلی اور اس نے گیٹ بند کر دیا۔ بپھرے ہوئے کتے آزاد تھے اور ان کے سامنے شرفو تھا۔ کتوں کے لیے وہ اجنبی تھا۔ چند ساعتوں میں کتوں نے اسے چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔ اس کی دلخراش چیخیں حویلی میں گونج رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد چیخیں معدوم ہو گئیں۔ کتے مسلسل غرا رہے تھے۔ ثریا چیختی چلاتی ایک ایک پگڈنڈی پر بھاگتی چلی جا رہی تھی۔

☆......☆

دھیرے دھیرے رملا بیہوش ہو رہی تھی۔ شاید یہ پیشانی میں لگنے والی گہری چوٹ کا نتیجہ تھا۔ خون کا اخراج قدرے کم تو ہوا تاہم رکا نہیں۔ شہباز نے اس کی پیشانی پر کس کر کپڑا باندھ دیا تھا۔ جونہی موسم کے تیور بدلے وہ رملا کے پیچھے بھاگ پڑا تھا، لیکن موسم کی سنگینی نے پھر بھی کافی دیر کر دی۔ وہ آہنی جھولے سے ٹکرا کر گرتی تو زیادہ نقصان کا احتمال تھا۔ شہباز نے بروقت اسے تھام لیا اور وہ اس کی بانہوں کے مضبوط حصار میں بے سدھ ہوتی جا رہی تھی۔ اسے بھی اندازہ تھا کہ وہ کسی ہمدرد اور خیر خواہ کے ہاتھوں میں ہے۔ تاہم اسے یہ قطعی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اسی کی بانہوں میں ہے جسے وہ کچھ دیر پہلے ٹھکرا کہہ کر اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ تیز و تند ہواؤں کی جارحیت بدستور جاری تھی۔ مستزاد یہ کہ طوفانی بارش بھی شروع ہو گئی۔ وہ دونوں بری طرح بھیگ رہے تھے۔ وہ کسی سمت کا تعین نہیں کر پایا، بس جدھر کو منہ آیا، جہاں سے راستہ ملا وہ رملا کو امانت سمجھ کر اٹھائے ہوئے چلتا چلا گیا۔ بھیگے بدن کا نسوانی لمس کسی زاہد خشک کو بھی متاثر کر سکتا ہے لیکن اس نے کسی منفی سوچ کو ذہن میں نہیں آنے دیا۔ وہ ملک نور کی امانت تھی جس کے تحفظ کی ذمہ داری کئی ماہ پہلے اسے اور شہزاد کو سونپ دی گئی تھی۔

وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی مغرور اور سخت دل بھی تھی۔

”لیکن ہے تو ایک عورت ہی ناں“ اس نے

سوچا۔ ''اس کے سینے میں بھی گوشت کا دل دھڑکتا ہے۔ یہ بھی سپنے دیکھتی ہوگی۔ عین ممکن ہے کسی کو پسند بھی کرتی ہو۔'' دفعتاً اسے کچھ دیر پہلے شہزاد سے ہونے والی گفتگو یاد آ گئی۔

''یار شہباز! سچ تو یہ ہے اس کے لیے جان بھی دی جا سکتی ہے۔'' اس کے لہجے میں جہاں بھر کی محبت در آئی۔

''ایسی بات مت کرو۔'' شہباز تنبیہی لہجے میں بولا۔ ''اب وہ ملک نور کی غیرت ہے۔''

''میں نے کوئی غلط بات نہیں کی اور مجھے پتا ہے تم بھی اسے پسند کرتے ہو۔'' اس نے ذومعنی لہجے میں کہا۔

''پسند کا تو پتا نہیں البتہ میں اس کی فکر ضرور کرتا ہوں۔''

یہ گفتگو طوفان سے چند لمحے پہلے ہوئی تھی اور اب وہی سوال سینہ تان کر اس کے سامنے کھڑا اس سے سوال کر رہا تھا۔

''کیا واقعی میں تم اسے چاہتے ہو؟'' اس نے غیر ارادی طور پر خود سے لپٹی ہوئی رملا کی طرف دیکھا۔ اس کی سفید پیشانی پر اس کے نیلے کرتے کی پٹی خوب جچ رہی تھی۔ تیز و تند ہواؤں میں لہراتے ہوئے ریشمی بال جیسے کوئی ناگن بین کے آگے ناچ رہی ہو۔ بے ساختہ اس کا دل خیانت کرنے کو چاہا۔ غیر ارادی طور پر اس نے مدہوش بدن کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ اک راحت افزا احساس اس کی رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ نہ جانے وہ کتنے دیر اسے اٹھائے چلتا رہا۔ اب اس کا جسم ٹھٹھرنے لگا تھا۔ یہ مسلسل بارش اور تیز ہوا کا شاخسانہ تھا۔ دفعتاً اس کی نظر اپنے سامنے برگد کے ایک وسیع و عریض درخت پر پڑی۔ یہ بہت گھنا اور بلند و بالا درخت تھا۔ چند لمحوں بعد وہ درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے سکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی وہ فوراً اٹھا اور اپنے جسم پر لپٹی ہوئی بوسیدہ سی چادر اتار کر زمین پر بچھاتے ہوئے بولا۔ ''اوہ..... تم دونوں بری طرح بھیگ گئے ہو اسے یہاں چادر پر لٹا دو۔'' اس نے یہی کیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔

رملا ذرا سی کسمسائی اور کراہنے لگی۔ ''یہ ہوش میں آ رہی ہے۔ کون ہے یہ اور تم؟''

ادھیڑ عمر آدمی نے سوالیہ انداز میں استفسار کرتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شہباز نے اسے مختصراً سب کچھ بتا دیا۔ وہ تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اچھا یہ ملک نور کی بیٹی ہے، طوفان کچھ کم ہو جائے تو کچھ کرتے ہیں، پریشان مت ہو۔ میں وید ہوں، میرا نام بلونت راٹھور ہے۔''

شہباز کو حیرت نہیں ہوئی کیونکہ ہندو مسلم سالہا سال سے اکٹھے رہ رہے تھے۔ تقسیم کے بعد بھی یہی صورتِ حال تھی۔ کچھ مسلمان ہندوستان میں رہ گئے، اسی طرح ہندوؤں میں سے کچھ پاکستان میں رہ گئے۔ برگد کے گھنے درخت کی وجہ سے یہاں بارش قدرے کم محسوس ہو رہی تھی۔ اب تو بپھری ہوئی ہواؤں کو بھی قرار آ رہا تھا۔ بلونت راٹھور نے رملا کی پیشانی سے پٹی اتار کر اس کے زخم کو دیکھا اور بولا۔ ''زخم گہرا نہیں ہے، شاید کوئی نوک دار چیز لگی ہے؟ اس لیے خون کا اخراج زیادہ ہوا ہے۔ تم اس کی ہتھیلیاں رگڑو، جسم میں گرماہٹ ہوئی تو خون متحرک ہو جائے گا۔ فی الوقت یہی علاج ممکن ہے۔ کیونکہ میرے پاس کوئی دوا موجود نہیں اور ویسے بھی زیادہ فکر والی کوئی بات نہیں۔'' بلونت نے نرم لہجے میں کہا اور وہ اس کی ہتھیلیاں رگڑنے لگا۔

''یہ داتا آباد گاؤں ہے'' بلونت بولا ''تمہیں شاید راستہ نہیں ملا اور نہ ملک پور یہاں کی نسبت نزدیک ہے۔''

''ہاں ایسا ہی ہوا ہے۔'' وہ رملا کی ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے بولا۔

''بھگوان کی کرپا ہوگی۔ جیسے ہی موسم ٹھیک ہوتا ہے تم میرے تانگے میں اپنے گاؤں چلے جانا بٹیا اب بھلی چنگی ہے۔''

اس نے رملا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ بارش رک چکی تھی اور ہوائیں بھی ستا رہی تھیں۔

اچانک وہ چیخ مار کر اٹھی اور بری طرح روتے ہوئے بولی۔ ''وہ ثریا کو لے گئے۔''

''کون لے گئے اسے؟'' شہباز نے فکر انگیز لہجے میں پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا وہ کون لوگ تھے۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں جو کچھ دیکھا تھا بتانے لگی۔ شہباز کے دل میں وسوسوں نے سر ابھارا۔ اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ کس کا کام ہے۔ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ''تم بے فکر ہو جاؤ اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' لیکن وہ بے فکر نہیں ہوئی۔ اسے ثریا کی فکر کھائے جا رہی تھی اور پھر وہ ہچکیاں باندھ کر رونے لگی۔

☆......☆

رملا کا حصول شہزاد کی زندگی کا اوّلین مقصد تھا۔ وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ ماں باپ بھی نہ رہے تو اکیلا ہی اُن کی جائیداد کا وارث بن گیا۔ مالی لحاظ سے آسودگی کے باوجود وہ ایک باتہذیب اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ اس نے اور شہباز نے ایک ساتھ ہی پرائمری تک پڑھا اور ہمیشہ ایک ساتھ ہی رہے۔ جب ملک نور نے انہیں اپنے ساتھ باعزت طور پر رہنے کی پیشکش کی تو وہ دونوں منع نہ کر پائے کیونکہ ایک شفیق و

خلیق بزرگ اور گاؤں کے بڑے ہونے کی حیثیت سے وہ اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور یہاں تو سوال رملا کی حفاظت کا تھا۔ دونوں کرب نارسائی کے کرب میں مبتلا تھے اور پھر قدرت کی جانب سے انہیں رملا کے قرب کا موقع مل گیا۔ اس قرب کی تمنا میں کوئی منفی پہلو کارفرما نہیں تھا۔ بس وہ چاہتے تھے کہ وہ ان کی نظروں کے حصار میں محصور رہے۔ البتہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ملک نور کو ایسا کیا خدشہ لاحق ہے یا پھر رملا سے اس کی کیا جذباتی وابستگی ہے کہ وہ اس کی حفاظت کے لیے ان دونوں کے علاوہ بھی کئی آدمی رکھ رہا ہے۔

"ملک چاچا، عبدالغنی کا تو آگے پیچھے کوئی ہے نہیں تو پھر رملا کو کس سے خطرہ ہے جو اس کے لیے اپنے آپ اتنے حفاظتی اقدامات کر رہے ہیں۔" ایک دن غیر متوقع طور پر شہزادے نے سوال کیا تھا تو ملک نور کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔

"یہ میری زندگی کا سب سے بڑا اور خطرناک راز ہے پتر" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "جس دن یہ راز آشکار ہوا سمجھو اس دن تمہارا چاچا زندگی کی بازی ہار جائے گا" لمحاتی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ "بس پتر اگر میری زندگی چاہتے ہو تو آئندہ یہ سوال مجھ سے دوبارہ مت پوچھنا۔ اس راز اور رملا کی حفاظت کے بدلے میں تم مجھ سے جو کچھ بھی مانگو گے وہ میں تمہیں دے دوں گا۔"

"چاچا ہو سکتا ہے میں آپ سے رملا ہی مانگ لوں۔"

اس نے دل میں کہا، لیکن یہ الفاظ ادا نہیں کر پایا۔ پھر وہ سائے کی طرح رملا کے آس پاس رہنے لگے، لیکن وہ ان معاملات سے قطعی بے خبر تھی، اور آج رملا کے اچانک غیاب نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ طوفان میں رملا کی حادثاتی طور پر گمشدگی کا قصوروار وہ خود کو ہی ٹھہرا رہا تھا۔ بس چند لمحوں کے لیے اس کی نظر محورِ حیات سے ہٹی تھی اور اس نے شاید اسے کھو دیا تھا۔ اب وہ دیوانہ وار اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ منہ زور ہواؤں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ رملا کے غیاب میں ملک خدا بخش کی مکروہ سازش بھی کارفرما ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ گھوڑی پر سوار قریہ قریہ گھوم رہا تھا۔ جب سورج نے رخصتی کے لیے رختِ سفر باندھا وہ مہراب پور کے قریبی باغ سے گزر رہا تھا۔ آموں کا یہ وسیع و عریض باغ ملک خدا بخش کے اثاثوں میں شامل تھا۔ وہ باغ کے قریب سے گزرتی ہوئی کچی سڑک سے ہوتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، جب اچانک ایک کرب انگیز کراہ اس کی سماعت میں اتری۔ وہ ٹھٹک گیا۔ دس بارہ فرلانگ کے فاصلے پر اسے ملک خدا بخش کا ڈیرہ نظر آیا۔ فطرتاً وہ ایک نڈر اور بہادر آدمی تھا۔ اس نے وہی کرب انگیز کراہ دوبارہ سنی، کوئی انتہائی تکلیف کے عالم تھا۔ اس نے بے خوف و خطر گھوڑی کا رخ باغ کی جانب کر دیا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا، کراہنے کی آوازیں قریب آتی گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ آم کے ایک بلند و بالا درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ ایک شخص اوندھے منہ پڑا لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس نے برق رفتاری سے زین چھوڑی اور چھلانگ مار کر زمین پر اترا۔ لہو میں لت پت شخص نے بدقت تمام سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی آنکھیں خوف و بے یقینی سے پھیلنے لگیں۔ وہ ملک خدا بخش کا خاص کارندہ شوکا تھا۔

"لگتا ہے آج کسی سوا سیر سے ٹکرا گئے ہو شوکے۔" وہ اس کے قریب پہنچتے ہوئے بولا۔ شوکے نے کچھ کہنا چاہا لیکن لفظ اس کی دسترس میں نہیں تھے۔ ثریا نے اس کے سر کے وسط میں پوری قوت سے سریا مارا تھا۔ اس کا سر درمیان سے پھٹ کر بری طرح مجروح ہوا تھا۔ گاڑھا خون اس کے چہرے گردن اور ہاتھوں کو رنگین کر گیا۔

"بول سکتے ہو تو بتاؤ، یہ کس ظلم کا بدلہ ہے۔" اس نے بے تاثر لہجے میں استفسار کیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ شوکا آخری دموں پر ہے۔ اس نے شوکے کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض ماند پڑ رہی تھی۔

"ش ش شہزادے" وہ بمشکل بولا۔ "مم مجھے..... مجھے بچا لو یار تمہیں اللہ کا واسطہ۔"

"تمہارے پاس اتنا وقت نہیں ہے، اور نہ ہی میرے پاس۔" وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ "تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے مجھے سچ سچ بتا دو، اور اگر یاد ہے تو کلمہ بھی پڑھ لو۔"

اس کی آنکھوں کی لو پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ زندگی تمام ہوتی، وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "مم ...... میرے سر میں ثریا نے سریا مارا ہے۔" اس کی گردن ایک طرف ڈھلک رہی تھی۔ مرنے سے پہلے اس نے سب کچھ من و عن بتا دیا۔ وہ کئی لمحوں تک بے یقینی کے بحر میں غوطہ زن رہا۔ اس نے جو کچھ سنا، اسے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ شوکے کی آخری ہچکی نے اسے تیزی سے متحرک کر دیا۔ وہ گھوڑی پر سوار ہوا اور کچی سڑک پر اسے سرپٹ دوڑانے لگا۔ وہ شوکے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی اسے اپنے اعمال کی سزا مل چکی تھی۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا خمیازہ بھی یہیں بھگت جاتا ہے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ باغ کی اختتامی حدود میں سرکنڈوں، سرو کے پودوں اور خودرو جھاڑیوں کی

بہتات تھی۔ بلا کی حبس نے اسے پسینے میں شرابور کر دیا۔ اس نے ہانپتی ہوئی گھوڑی کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ سستانے کا وقت نہیں تھا۔ گھوڑی سرپٹ بھاگ رہی تھی۔ وہ متلاشی نگاہوں سے چاروں اطراف دیکھنے لگا۔ معاً اسے خود رو جھاڑیوں کی آڑ میں ایک سرخ گٹھڑی نظر آئی۔ اسے یاد آ گیا کہ ثریا نے میلے میں گلابی سوٹ پہن رکھا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اس گٹھڑی کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑکا۔ اللہ کو کسی نے نہیں دیکھا لیکن وہ اپنی قدرتوں سے ہر جگہ نظر آ جاتا ہے۔ شوکے نے اسے جو کچھ بتایا وہ ناقابل یقین تھا۔ اسے ہوش آیا تو وہ کمرے سے باہر نکلا۔ خونخوار کتوں نے شرفو کو ہی نہیں ملک خدا بخش کو بھی چیر پھاڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں محو استراحت تھا، جب اسے شرفو کی چیخیں اور کتوں کی غراہٹیں سنائی دیں۔ اس نے دستی پنکھا ہلاتے ہوئے خادم علی کو رکنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکلا۔ یہی وہ وقت تھا جب کتے شرفو کی ضیافت سے فارغ ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ ملک خدا بخش سنبھلتا اسی کے پالتو کتے اس پر ٹوٹ پڑے۔ خادم علی دروازہ بند کر کے کھڑکی سے قدرت کے قہر کو دیکھتا رہا۔ شہزاد کو یہ باتیں بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ اس نے سرخ گٹھڑی سے کراہ کی آواز سنی تو خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ چھلانگ مار کر نیچے اترا۔ سرخ گٹھڑی کی صورت میں ثریا زمین پر پڑی تھی۔ اس نے بغور اسے دیکھا۔ وہ زندہ تھی۔ خدا کی قدرت نے اسے شکر کا موقع فراہم کیا۔ اس نے اسے اٹھایا اور گھوڑی پر بٹھا کر ملک پور کی طرف اسے سرپٹ دوڑانے لگا۔ ملک خدا بخش مکافات عمل کا شکار ہوا تھا۔ یہی ہوتا ہے۔ یہی ہوتا آیا ہے۔ زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے۔ وہ ڈیرے پر پہنچا، تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ شہباز اور بلونت راٹھور ملک نور کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے رملا کی بازیابی کی خبر بھی مل گئی۔ ثریا کو علاج کے لیے بلونت کے حوالے کر دیا گیا۔ ملک نور تشکر آمیز نگاہوں سے شہباز اور شہزاد کو دیکھ رہا تھا۔

☆......☆

"آج وقت آ گیا ہے کہ تم دونوں کو اپنی زندگی کے سب سے اہم راز اور تاریک پہلو سے آگاہ کر دوں۔" ملک نور نے بے دلی سے حقے کی نے ہونٹوں میں دبائی اور انہیں مجروح نظروں سے دیکھنے لگا۔ شہباز اور شہزاد اس کے سامنے چارپائی پر براجمان تھے۔ یہ اس کا خاص کمرا تھا۔ آج کے جدید دور میں اسے ڈرائنگ روم کہا جانے لگا ہے۔ انگریز ہمارا ملک تو چھوڑ گئے لیکن ان کا آدھا کلچر یہیں رہ گیا۔ امت مسلمہ نے اس کی تقلیدیں کی کہ انگریزوں کو بھی مات دے دی۔ خیر یہ بات تو برسبیل تذکرہ ہوئی۔ کمرے میں رنگین چارپائیاں نہایت قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ جن کے اوپر سیاہ اور سفید رنگ کے کھیس بچھے ہوئے تھے۔ آمنے سامنے رکھی ہوئی چارپائیوں میں ایک پر ملک نور تکیے سے ٹیک لگائے سوختہ ماضی کی راکھ کرید رہا تھا۔ اس کے سامنے والی چارپائی پر وہ دونوں پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھے جا رہے تھے۔ چائے کی خالی پیالیاں چارپائی کے ساتھ رکھی ہوئی میز پر پڑی تھیں۔ انہوں نے ابھی ابھی ناشتا کیا تھا۔ ثریا نے رو بہ صحت ہونے میں زیادہ وقت نہیں لیا، البتہ رملا کو شدید بخار ہو گیا تھا۔ وید بلونت راٹھور دلجمعی سے اس کا علاج کر کے لوٹ گیا تھا۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو شہزاد نے آہستگی سے کہا۔

"چاچا جی، ہم نے کب اصرار کیا کہ آپ اپنے ماضی سے ہمیں آگاہ کریں اگر آپ نہیں بتا پا رہے تو رہنے دیں۔"

"نہیں پتر۔" وہ سوچتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بوجھ میرے دل پر مدتوں سے ہے۔ پہلے زخم تھا اب ناسور بن گیا ہے۔ نہ بتایا تو بھی مر جاؤں گا اور ویسے بھی تمہارے لیے یہ جاننا انتہائی ضروری ہے۔"

وہ دونوں الجھی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ "جی چاچا جی بتائیں، ہم آپ کے راز کے امین ثابت ہوں گے۔" شہباز نے کہا تو ملک نور نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

"ملک خدا بخش شروع سے ہی مجھ سے عناد رکھتا تھا، لیکن مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ آخر اس کی بنیادی وجہ کیا تھی۔" لمحاتی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ "البتہ ایک یہ وجہ ضرور تھی کہ میری مردانہ وجاہت اس کے لیے سوہانِ روح تھی، کیونکہ وہ واجبی سی شکل و صورت رکھتا تھا۔ جب ہاجرہ بیگم نے اسے ٹھکرایا تو اس کے حسد کی آگ نارِ جہنم کی طرح اسے جلانے لگی۔ اس نے انتہائی گھٹیا چال چلی اور ہاجرہ بیگم کو اٹھوا لیا۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اک اذیتِ بیکراں کا پتا دے رہے تھے۔ شہباز نے سلور کے گلاس میں پانی ڈالا، اور اس کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے دو گھونٹ پیے اور گلاس واپس میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "گاؤں کے بڑوں نے ہاجرہ کو بازیاب تو کر لیا، لیکن وہ اپنی دوشیزگی کا سرمایہ لٹوا چکی تھی۔ اگر میں بھی شادی

سے انکار کر دیتا تو یقیناً وہ خودکشی کر لیتی۔‘‘ وہ دونوں ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا اور انتہائی اذیت ناک راز تھا جو اس کے سینے میں مدتوں سے مضمر تھا۔ وہ بولا۔ ’’میں نے پنچائیت کے فیصلے کے آگے سرِتسلیم خم تو کر دیا تھا لیکن میں کئی دنوں تک ہاجرہ کو وہ عزت اور مقام نہ دے سکا جو کہ ایک مشرقی اور باحیا بیوی چاہتی ہے۔ ایک مہینے تک میں نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اس دوران اس نے خودکشی کی کوشش کی۔ وید موہن سنگھ نے اسے بچا تو لیا، لیکن ایک زہریلا راز میری سماعتوں میں انڈیل دیا۔

’’مبارک ہو ملک صاحب آپ باپ بننے والے ہیں۔ اس نے گویا مجھے خوشخبری دی تھی۔ میں نے ایک زناٹے دار تھپیڑا اس کے گال پر رسید کیا اور ہاجرہ کو وہیں چھوڑ کر اس کے دواخانے سے واپس آگیا۔ وہ انتہائی تجربہ کار حکیم تھا۔ اس کڑے وقت میں رشید خان نے میرا بہت ساتھ دیا۔‘‘

وہ دونوں چونک کر ملک نور کو دیکھنے لگے۔

’’ہاں میں اسی رشید کی بات کر رہا ہوں جسے عبدالغنی نے قتل کر دیا تھا۔‘‘ اس نے ان کی سوالیہ نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے وضاحت کی۔ پھر بولا۔ ’’میں نے رات کے اندھیرے میں ہاجرہ بیگم، رشید اور اس کی بیوی کو لائل پور (موجودہ فیصل آباد) بھیج دیا۔ وہاں رشید کی بہن رہتی تھی۔ باقی آٹھ مہینے میں نے لوگوں اور رشتہ داروں کو کس طرح مطمئن کیا۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ بیچ بیچ میں، میں بھی وہاں جا کر رہ آتا تھا۔‘‘

اور پھر خاموشی کا ایک طویل وقفہ در آیا۔ وہ ماضی کی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا، اور وہ دونوں پتھر کے بت بنے اس کے سامنے بیٹھے رہے۔

’’چاچاجی، وہ بچہ کہاں گیا؟‘‘ شہزاد مستفسر ہوا۔

’’بچہ نہیں۔‘‘ وہ افسردگی سے بولا۔ ’’آٹھ ماہ بعد لائل پور میں ہاجرہ نے ایک بچی کو جنم دیا اور اسے میں نے فوراً رشید اور اس کی بیوی کے حوالے کر دیا۔ ان دونوں نے اس بچی کی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی۔‘‘

’’وہ بچی کون تھی؟‘‘ شہباز کے لہجے میں تجسس تھا۔

اسی لمحے ملک نور کے کمرے کا دروازہ کھلا، اور اندر داخل ہوتی ہوئی رملا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ’’وہ بچی میں تھی۔‘‘

وہ دونوں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ملک نور۔۔جھکائے چارپائی پر بدستور بیٹھا رہا۔ ’’مجھے میری ماں نے ر۔۔ سے پہلے بتا دیا تھا ملک بابا کہ میں ملک خدابخش کی ناجائز اولاد ہوں۔‘‘

وہ پتھر کی طرح بے حس وحرکت بیٹھا رہا۔ لفظ گنگ اور زبانیں منجمد تھیں۔ وہ زارو قطار روتے ہوئے بولی۔ ’’معاشرے میں میرا کیا مقام ہوگا۔ یہ مجھے اندازہ ہے۔ میں کسی کی بیوی بن سکتی ہوں نہ کسی کی بیٹی بن پائی۔‘‘

’’میں نے تمہیں بیٹی سے بڑھ کر محبت دی ہے پتر۔‘‘ ملک نور تڑپ کر بولا۔

’’اور میں تمہیں ایک معزز اور باحیا بیوی جیسا مقام دوں گا اگر تم مجھ سے شادی کر لو۔‘‘ شہزاد نے کہا اور اس کی طرف پُرامید نظروں سے دیکھنے لگا۔

’’نہیں، تمہاری شادی صرف اور صرف مجھ سے ہوگی۔‘‘ شہباز نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

’’اس کا فیصلہ تم دونوں نہیں، ملک بابا کریں گے۔‘‘ رملا آہستگی سے بولی۔

’’نہیں پتر، اس کا فیصلہ زہر کا پیالہ کرے گا۔ جو جیتے گا میں تمہیں اس کی دلہن بنا دوں گا۔‘‘

وہ تینوں چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ وقت جیسے تھم گیا تھا۔ دلوں کی دھڑکنیں ملک نور کے کمرے میں دھمال ڈال رہی تھیں۔

’’ہمیں منظور ہے۔‘‘ وہ دونوں بیک آواز بولے تو وہ روتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ ملک نور نے تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کیونکہ اسی میں رملا کی بھلائی تھی۔ دونوں اس کی چاہت میں مبتلا تھے جسے وہ مل جاتی وہ تو شکر گزار ہوتا لیکن جسے نہ ملتی وہ اپنے دل میں کڑھتا رہتا اور حسد کی آگ اس کی زبان کھول دیتی انہیں خاموش کرانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ اس نے راز سے بے وجہ پردہ اٹھایا تھا، اب اس غلطی کو سدھارنا بھی اسی کو تھا۔ اسی لیے اس نے مقابلے کا کہا تھا۔ تین دن بعد موت کا مقابلہ تھا۔

☆......☆

ہر متحیر و متجسس اور افسردہ آنکھ ان دونوں پر جمی ہوئی تھی۔ یہ رسم یہاں مدتوں سے چلی آرہی تھی۔ جب ملک نور نے دیگر بزرگوں سے مشاورت کی تو انہوں بھی اس کے فیصلے کی تائید کی۔ رملا اس دن سے خاموش تھی، جیسے کوما میں چلی گئی ہو۔

’’ملک صاحب، آپ شہباز یا شہزاد سے جو کہتے، وہ قطعی انکار نہ کرتے، اس موت کے مقابلے کی کیا ضرورت تھی؟‘‘ ثریا نے ڈرتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

وہ بولا۔ ”یہی تو میری مجبوری تھی ثریا پتر۔“
ثریا گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ شہباز کی ماں کا واویلا بھی بے سود ٹھہرا۔ ان دونوں میں سے اگر کوئی مقابلے سے دستبردار ہوجاتا تو لوگ تاعمر لعن طعن کرتے۔
بہر حال اعلان اور وقت کے عین مطابق مقابلہ شروع ہوگیا۔ شہباز اور شہزاد آمنے سامنے تھے۔ دونوں نے جنگی تربیت لے رکھی تھی اور لڑائی کے داؤ پیچ بھی جانتے تھے۔ لوگوں کا جم غفیر تھا۔ ملک نور اپنے مونڈھے پر براجمان کسی غیر مرئی نکتے کو گھور رہا تھا، گویا اسے مقابلے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ دونوں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے تو دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔
”مجھے معاف کرنا میرے دوست۔“ شہباز تاسف سے بولا۔ ”اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔“
”کوئی بات نہیں شہباز، محبت قربانیاں مانگتی ہے اور مجھے کوئی افسوس نہیں۔“
”مجھے بھی۔“ وہ آہستگی سے بولا اور اپنی دائیں ٹانگ کی زوردار ٹھوکر اس کی پنڈلی پر ماری۔ یہ غیر متوقع وار تھا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ شہزاد نے مضبوط بازو کی گرفت میں اس کی گردن جکڑ لی۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا لیکن گرفت بجائے ڈھیلی ہونے کے مضبوط ہوتی جارہی تھی۔
مجمعے کی آنکھیں گویا پھٹ رہی تھیں۔ کسی کی سانس تک کی آواز نہیں آرہی تھی۔ ملک نور نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی حقے کی نے دانتوں تلے دبالی۔ یہ اضطرابی کیفیت کا اظہار تھا۔ اس نے ان دونوں کو بیٹوں کی طرح رکھا تھا۔ آج ایک بیٹا، دوسرے کے ہاتھوں مرنے جارہا تھا۔ کیا عجیب کشمکش تھی۔ اک روح فرسا پس وپیش درپیش تھا۔ بارہا اس کے دل نے چاہا کہ مقابلہ روک دیا جائے لیکن اسے ڈر تھا کہ اگر ایسا ہوا تو باقی تمام عمر یہ مخاصمت، اور مخالفت چلتی رہے گی۔
”جیسے کہ میری اور ملک خدا بخش کی مخالفت تھی۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔
”مقابلہ تو ملتوی ہوسکتا ہے ملک نور لیکن رملا کا کیا کروگے؟“ اس کے ضمیر نے صدا دی تو بیساختہ اس کی نگاہیں سریع الاثر زہر کے پیالے پر جم گئیں۔ اسی لمحے شہباز کا داؤ کام کرگیا۔ اس نے پوری قوت سے داہنی کہنی شہزاد کی پسلیوں میں ماری۔ وہ ”ادغ“ کی آواز کے ساتھ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ دوسرے ہی لمحے کہنی کی دوسری ضرب اس کی پسلیوں میں عین اسی جگہ پر پڑی جہاں پہلی ضرب پڑی تھی۔ غیر ارادی طور

پر اس کی ہلکی سی چیخ بلند ہوکر معدوم ہوگئی اور پھر کہنی کی ضربوں کا تسلسل نہیں ٹوٹا۔ اس کی پسلیوں میں شدید درد ہونے لگا۔ اتنا کہ اسے سانس لینے میں بھی دشواری ہورہی تھی۔ جسم پسینے میں شرابور ہوئے تو چکناہٹ پیدا ہونے لگی۔ پسینے کی نمی اور تازہ مٹی سے ہاتھ پھسل رہے تھے۔ شہزاد نے ہمت مجتمع کی اور زوردار گھونسا شہباز کے جبڑے پر جڑدیا۔ یہ گھونسا کام کرگیا۔ اس کے منہ سے خون نکلا اور شہباز کے چہرے پر بدوضع سے نقش ونگار بنا گیا۔ وہ کئی قدم پیچھے ہٹا اور پشت کے بل نیچے گرتے گرتے کھڑا ہوگیا۔ اب وہ دونوں پھر آمنے سامنے تھے۔ اسی لمحے اچانک مجمع متحرک ہوا اور آوازوں کا شور اٹھنے لگا۔ انہوں نے مجمعے کی طرف دیکھا۔ لوگوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی رملا رسا پھلانگ کر میدان میں کود پڑی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ان دونوں پر مرتکز تھیں۔ وہ بولی تو اس کی آواز میں جذبات کی لرزش اور آنسوؤں کی نمی تھی۔
”تم میں سے جو مقابلے سے دستبردار ہوجائے گا میں اسے اپنا جیون ساتھی تسلیم کرلوں گی۔ ابھی اسی وقت اسی جگہ۔“
وہ آنکھیں پھاڑے اسے گھورنے لگے۔ مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ملک نور نے ایک جھٹکے سے مونڈھا چھوڑا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا بزرگ ملک اللہ یار غصیلے لہجے میں بولا۔ ”یہ کیا مذاق ہے لڑکی اب تمہاری کوئی بھی بات اور پیشکش ناقابل قبول ہوگی۔ جو دستبردار ہوگا وہ مرے گا، یہی ریت ہے، رواج ہے، اصول ہے۔“
ملک نور دوبارہ مونڈھے پر ڈھے سا گیا۔ رملا ملک اللہ یار کو گھورتی ہوئی زہر کے پیالے کی طرف بڑھی اور پھر جو کچھ ہوا کسی کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا۔ انتہائی پھرتی سے اس نے زہر سے بھرا ہوا پیالہ اٹھایا اور چند ہی لمحوں میں غٹاغٹ پی گئی۔
”میں نہیں چاہتی کہ کوئی میری وجہ سے مرے، کیا اس کے بعد میں چین سے جی پاتی؟“ اس نے کہا اور دھڑام سے نیچے آگری۔ سریع الاثر زہر نے اپنا کام شروع کردیا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ پہلے رنگ ہلدی کی طرح ہوا اور پھر نیلا پڑنے لگا۔ پھر اس کے منہ سے خون بھی نکلنے لگا۔ شہباز، شہزاد اور دوسرے لوگ انگشت بدنداں تھے۔ ملک نور نے اٹھنا چاہا لیکن مونڈھے سے اٹھ نہیں پایا۔ جب ملک اللہ یار نے اسے کاندھے سے پکڑ کر ہلایا تو اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ ادھر رملا نے جان کی بازی ہاری ادھر ملک نور نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔

محترم مدیر

سلام تہنیت

میں سیاست سے نفرت کرتا ہوں، کیوں؟ یہ اسی کیوں کا جواب ہے میری سچ بیانی۔ آپ کو اس میں وہ ساری باتیں مل جائیں گی جس کی وجہ سے میں سیاسی خبریں تک نہیں پڑھتا۔ گو کہ اس علاقے کو چھوڑے کئی سال ہوگئے ہیں لیکن وہاں کی باتیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں اسی لیے میں یہ سچ بیانی لکھ رہا ہوں۔

عبداللہ

(مظفر گڑھ)

ہمارے قصبے کا نام بکسر تھا۔ بکسر کیوں تھا۔ مجھے اس کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم۔ اچھا خاصا چھوٹا سا شہر تھا۔ دو کالج تھے ایک لڑکیوں کے لیے، دوسرا لڑکوں کے لیے۔ ایک درجن کے قریب اسکول تھے۔ کئی بازار تھے۔

اچھا خاصا بڑا قصبہ تھا ہمارا۔ کم از کم چار پانچ لاکھ کی آبادی تھی۔ اگر آس پاس کے علاقوں کو شامل کرلیا جائے تو یہ آبادی سات آٹھ لاکھ تک پہنچ جاتی تھی۔

میں اپنے علاقے کا تفصیلی تعارف اس لیے کرا رہا ہوں کہ آپ کو یہ بتا سکوں کہ وہاں اچھی خاصی مصروف زندگی تھی۔

ایسی مصروف زندگی کے باوجود ایک بات بہت اہم تھی کہ قصبے میں کوئی واقعہ رونما ہو جائے تو پورے قصبے کو خبر ہو جاتی تھی۔

کس کے یہاں موت ہو گئی۔ کس کے یہاں پیدائش ہوئی یا کس کے یہاں اس قسم کا کوئی واقعہ ہو گیا۔ سب کو پتا چل جاتا تھا۔ یعنی کوئی خبر وہاں چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

اس لیے جب میں نے کسی شیخ کے بارے میں سنا کہ انہوں نے کہیں باہر سے آ کر اس قصبے میں اپنا ٹھکانا بنایا ہے تو بہت حیرت ہوئی۔

میرے ایک دوست واسع نے ان کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔ ''ارے بھائی کیا شخصیت ہے ان کی۔ اللہ کے خاص بندوں میں سے ہیں۔ نور ہی نور ہے ان کے چہرے پر۔''

''واسع! سچ تو یہ ہے کہ میں اب ایسی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔ ''میں اس قسم کے درجنوں باباؤں کو دیکھ چکا ہوں۔ ایک سے ایک فراڈ۔''

''لیکن یہ بے خود صاحب کوئی عام آدمی نہیں ہیں۔'' واسع نے بتایا۔

''بے خود سے کیا مراد ہے تمہاری؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا ان کا نام ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ ان کا تخلص ہے۔'' واسع نے بتایا۔ ''فارسی میں شاعری کرتے ہیں۔ نعتیں لکھتے ہیں۔''

''پھر تو کوئی اونچی چیز ہیں۔'' میں نے تبصرہ کیا۔

''یار تم ایک بار ان کے پاس چلے جاؤ۔ یوں ہی چلے جاؤ۔ اپنے لیے دعا کرانے۔ پھر دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔ تمہارے سارے شک ختم ہو جائیں گے۔''

''ضرور جاؤں گا۔ دیکھو تو سہی تمہارے یہ بے خود صاحب کتنے پانی میں ہیں۔''

میں نے واسع سے کہا تھا کہ میں اس قسم کے درجنوں باباؤں کو دیکھ چکا ہوں تو یہ کوئی غلط نہیں تھا۔ ہمارے قصبے سے ایک اخبار بھی نکلا کرتا تھا ''زندگی''۔ میں ہی اس اخبار کا ایڈیٹر تھا اور اس کے لیے رپورٹنگ بھی کیا کرتا۔ اس سلسلے میں، میں اب تک بہت سے نقلی اور جعلی عاملوں اور باباؤں سے نمٹ چکا تھا۔ میرا طریقہ واردات یہ ہوتا کہ میں خود ضرورت مند بن کر ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ پھر ان کی مکاریاں اور پینترے جب سمجھ آجاتے تو اپنے اخبار کے ذریعے ان کا کچا چھٹا کھول دیتا۔ اس طرح نہ جانے کتنے عامل اور کتنے بابا مجھے برا بھلا کہتے ہوئے میرے قصبے سے بوریا بستر لپیٹ کر جا چکے تھے۔

اب یہ بے خود صاحب آ گئے تھے۔ میرا اگلا شکار۔

بے خود نے عام آبادی سے ذرا ہٹ کر ایک عام سا مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ دو کمروں کے اس مکان کا احاطہ اچھا خاصا بڑا تھا۔

ایک کمرے میں بے خود کی رہائش تھی۔ جب کہ دوسرا کمرا آنے جانے والوں کے لیے تھا۔ مجھے اس دوسرے کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔ جس آدمی نے مجھے اس کمرے میں بٹھایا تھا وہ ایک معقول صورت مہذب انسان تھا۔ اس نے بتایا کہ بے خود صاحب بس دس منٹ میں آ جائیں گے۔

مجھے اس کمرے میں بیٹھ کر حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس کمرے کی چاروں دیواروں کے ساتھ کتابوں کے شیلف بنے تھے اور ان میں کتابیں بھری ہوئی تھیں اور کتابیں بھی کیسی تعویذ گنڈوں کی نہیں بلکہ احادیث کی، فلسفہ کی، نفسیات کی، مقدمہ ابن خلدون بھی تھا۔

اگر یہ کتابیں بے خود کے مطالعے میں رہتی تھیں پھر تو وہ واقعی ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ میں نے اب تک جتنے باباؤں کو دیکھا تھا ان میں سے کسی کو کتابوں کا شوق نہیں تھا بلکہ ان کے کمروں میں الٹی سیدھی چیزیں بھری رہتی تھیں۔ کھوپڑی، ہڈیاں، سانپ کی کینچلی اور نہ جانے کیا کیا لیکن اس بابا کے پاس تو کتابیں تھیں۔ یہ یقیناً ان سبھوں سے مختلف تھا۔

اور جب وہ اپنے کمرے سے نکل کر سامنے آیا تو وہ واقعی ایک مختلف انسان تھا۔ اس نے جبہ وبہ نہیں پہن رکھا تھا، چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی۔ عینک لگی ہوئی، بہت ہی مہذب سا لباس، دیکھنے میں وہ کوئی اسکالر معلوم ہوتا تھا۔

اس نے بہت ہی مہذب انداز میں میرے پاس آ کر معذرت کی۔ ''معاف کیجئے گا مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔''

''نہیں تو، ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔''

وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ ''فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''میں اپنی ایک پرابلم لے کر آپ کے پاس آیا

ہوں۔‘‘ میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہا۔
’’جی ضرور، فرمائیں کیا مسئلہ ہے؟‘‘
’’میرے ایک عزیز ہیں، وہ بے گناہ ایک مقدمے میں پھنس گئے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی جان چھوٹ جائے۔‘‘
’’کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ بے گناہ ہیں؟‘‘ بے خود نے پوچھا۔
’’جی ہاں جناب، ورنہ میں ان کے لیے کبھی نہیں آتا۔‘‘
’’ہوں۔‘‘ اس نے ایک ہنکاری لی۔ ’’نام کیا ہے ان کا؟‘‘
نام تو میں پہلے ہی سوچ کر گیا تھا۔ ’’شعیب عزیز۔ عزیز ان کے والد کا نام ہے۔‘‘
اس نے ایک کاغذ پر کچھ حساب کتاب کرنا شروع کر دیا۔ میں اس قسم کی کارروائیاں پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ یعنی وہ آہستہ آہستہ اپنے خول سے باہر آ رہا تھا۔
اس نے حساب کتاب کرنے کے بعد ایک دوسرے کاغذ پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ ’’یہ لیں اس سے کہیں کہ اس کا ورد کرتے رہیں۔‘‘
اس کاغذ پر یاقوی لکھا ہوا تھا۔ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام۔ میں نے وہ کاغذ اپنے پاس رکھ لیا۔
’’جناب! اس کا نذرانہ؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’نذرانہ! کس بات کا نذرانہ۔‘‘
’’یہی جو آپ نے لکھ کر دیا ہے۔‘‘
’’ارے نہیں بھائی۔ میں اللہ کے ناموں کا سودا نہیں کرتا اور میں نے کام ہی کیا ہے۔ بس علم جعفر کے لحاظ سے اس کے نام سے ایک نام مطابقت کرتا ہوا نکال دیا ہے۔‘‘
اس شخص کے اثرات مجھ پر گہرے ہوتے جا رہے تھے۔
’’کیوں آپ حیران ہو رہے ہیں۔‘‘ اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔
’’جی ہاں میں واقعی حیران ہو رہا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ورنہ دوسرے تو اس بات کے بدلے کچھ نہ کچھ ضرور لے لیتے۔‘‘
’’بھائی میں کوئی پیر فقیر یا عامل وغیرہ نہیں ہوں کہ لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان سے پیسے حاصل کروں۔ بس جو کچھ میں جانتا ہوں اس کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ خدا کرے کہ میری ذات سے کسی کو فائدہ پہنچ جائے۔ میں نے اب تک آپ کا نام نہیں پوچھا۔‘‘
’’عبید نام ہے میرا۔‘‘ میں نے بتایا۔
اس دوران وہ شخص اندر آیا جس نے مجھے اس کمرے میں لا کر بٹھایا تھا۔ ’’جناب! دو خواتین ملنا چاہ رہی ہیں۔‘‘ اس نے بتایا۔
’’وہ کیوں؟‘‘
’’کوئی مسئلہ ہے ان کا۔‘‘
’’ان سے کہو کہ کسی کاغذ پر لکھ کر دے دیں اور تم کو تو یہ معلوم ہے کہ میں عورتوں سے نہیں ملتا۔‘‘
’’جی جناب! جانتا ہوں میں لیکن وہ بضد تھیں۔‘‘
’’ان سے معذرت کر لو۔ بس ان کا مسئلہ لکھ لو۔ خدا بہتر کرے گا۔‘‘
اس آدمی کے جانے کے بعد بے خود نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ’’ایسا لگتا ہے کہ پریشانیاں کسی وبا کی طرح چاروں طرف پھیل گئی ہیں۔ مسائل تو پہلے بھی ہوتے تھے لیکن ان کی نوعیت بہت سادہ ہوتی تھی۔ کیونکہ زندگی بہت سادہ تھی۔ زندگی میں پیچیدگیاں مشینوں نے پیدا کی ہیں۔‘‘
میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ واقعی پڑھی لکھی بات کر رہا تھا۔
’’میں مسائل کو نفسیاتی اور سماجی تناظر میں دیکھتا ہوں۔‘‘ اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ’’میں نے کبھی کسی کو یہ نہیں کہا ہوگا کہ تم پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ یا کوئی جن آ گیا ہے۔ کیونکہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ خدا نے جو کچھ پیدا فرمایا ہے وہ اپنے اپنے دائرے میں کام کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک مخلوق دوسری مخلوق پر غالب آ جائے جیسے چاند اور سورج اپنے اپنے دائروں میں ہیں۔ نہ رات کی یہ مجال ہے کہ وہ دن پر غالب آ جائے اور نہ ہی دن کو اجازت ہے کہ وہ رات کو اپنے آپ میں سمو لے۔‘‘
میں جھوم اٹھا۔ اس شخص نے قرآن کی ایک آیت کا مفہوم بتا دیا تھا۔ وہ یقیناً ایک مختلف انسان تھا۔ اس کے بارے میں جو بتایا گیا تھا کہ وہ کوئی بابا یا عامل وغیرہ ہے تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ایک صاف ستھرا مہذب انسان تھا۔
میں اس سے اجازت لے کر اور اس سے متاثر ہو کر واپس آ گیا۔
میں اس پر بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ مجھے اپنے اخبار کے لیے ایک زبردست اسٹوری کی ضرورت تھی اور

یہاں کوئی اسٹوری ہی نہیں تھی بلکہ ایک سیدھا سادا معاملہ تھا۔
لیکن یہ خبر بھی کم نہیں تھی کہ ہمارے علاقے میں ایک بہت پڑھے لکھے اور مہذب شخص نے قیام کرلیا تھا۔ میں نے اپنے اخبار میں یہ خبر شائع کردی۔

اس کے لیے میں بے خود سے ملنے چلا گیا۔ مجھے وہ پہچان گیا تھا۔ اس بار وہ اس کمرے میں تھا جہاں وہ لوگوں سے ملاقات کیا کرتا۔

''تشریف لائیں جناب۔'' اس نے مہذب انداز میں کہا۔ ''فرمائیں کیا ہوا اس شخص کا جس کا مقدمہ چل رہا تھا۔''

''بے خود صاحب! سچ یہ ہے کہ ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونک گیا۔

''میں آپ کو پرکھنے کے لیے آیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''میں اس علاقے سے ہفت روزہ احتساب نکالتا ہوں۔''

''اوہ تو آپ ہی نے اپنے ہفت روزہ میں میری اتنی تعریفیں لکھی ہیں۔''

''جی ہاں کیونکہ میں آپ سے بہت متاثر ہوکر گیا تھا۔''

''ارے صاحب یہ آپ نے کیا کردیا۔ میں تو ایک عام سا آدمی ہوں بس چند کتابیں پڑھ لی ہیں۔ اس کے علاوہ تو مجھ میں اور کوئی خوبی نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں لوگ مجھے آسمان سے اترا ہوا سمجھنے لگے ہیں۔ یہ سب سن سن کر مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بس اب یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں۔ اپنا کام کہیں اور جاکر کرلوں گا۔''

''بے خود صاحب! پہلے تو یہ فرمائیں کہ آپ کا اشارہ کس کام کی طرف ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''میں طریقت اور شریعت کو جدید پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کررہا ہوں اور اس موضوع پر کتاب لکھ رہا ہوں۔''

''سبحان اللہ۔'' میں پھڑک اٹھا۔ ''کیا اچھا موضوع ہے۔''

''عبید صاحب! مسئلہ یہ ہے کہ اس قسم کے کاموں کے لیے سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے اس لیے آپ کے علاقے کا انتخاب کیا تھا لیکن ہوا یہ کہ یہاں کے کچھ لوگوں کو میرے بارے میں پتا چل گیا۔ انہوں نے میری پبلسٹی کردی اور اب رہی سہی کسر آپ نے پوری کردی ہے۔''

''بے خود صاحب! میری تو درخواست ہوگی کہ آپ یہاں سے نہ جائیں۔ بتا دیں لوگوں کو بلکہ اپنے وقت کو Manage کرلیں۔ کہہ دیں کہ آپ فلاں وقت سے فلاں وقت تو مل سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو زحمت نہ دی جائے۔ تو پھر دونوں کام ہوجائیں گے۔''

''ہاں یہ ہوسکتا ہے۔'' اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''یہی کرنا ہوگا۔ ورنہ میں کچھ بھی نہیں کرسکوں گا۔''

اس دن میں بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے اپنی شاعری بھی سنائی۔ وہ ایک اچھا شاعر تھا۔ نہ جانے ایسا آدمی اب تک اتنا چھپا ہوا کیوں تھا۔

ہمارے قصبے میں اس کی شہرت اور نیک نامی پھیلتی جارہی تھی۔ البتہ کچھ مولوی قسم کے لوگ اس کے خلاف تھے۔ ایک بار میرے اخبار کے دفتر میں ایک اسی قسم کے صاحب آگئے۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ ''عبید صاحب! یہ کیا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ کون ہے یہ آدمی؟''

''کس کی بات کررہے ہیں؟''

''وہی بے خود کی۔ آپ کا اخبار جس کی تعریف میں بھرا رہتا ہے۔''

''کرامت صاحب! وہ آدمی اسی قابل ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بہت پڑھا لکھا اور مہذب انسان ہے۔''

''لیکن آپ اس کا حلیہ تو دیکھیں۔ وہ تو پینٹ قمیص میں بھی نظر آتا ہے، شرعی حلیہ بھی نہیں ہے۔''

''یہی تو بہت سے لوگوں کی غلط فہمی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''شرعی لباس کیا ہوتا ہے کرامت صاحب؟ لباس کا تعلق علاقے کی شناخت سے ہوتا ہے۔ جیسے یہاں دھوتی باندھی جاتی ہے سرحد وغیرہ کی طرف شلوار قمیص پہنتے ہیں۔ اب بتائیں کیا دھوتی غیر شرعی ہے یا شلوار قمیص شرعی ہے۔''

''کچھ بھی ہو۔ وہ آدمی ایک فتنہ ہے۔''

''وہ اس لیے ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سے نام نہاد اور جھوٹے عاملوں کی ہوا اکھڑ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ان کے دھندے بند ہوگئے ہیں۔ اس لیے سبھوں نے بے خود صاحب کے خلاف محاذ بنالیا ہے۔''

لیکن کرامت صاحب کی سمجھ میں یہ سب باتیں کہاں سے آتیں۔ وہ اسی طرح بک بک کرتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ ہوگیا تھا کہ میں ہر دوسری یا تیسری شام کو اس کے پاس چلا جاتا۔ علاقے کے اور بھی پڑھے لکھے اور باذوق لوگ آنے لگے تھے۔

اچھی خاصی محفل جم جاتی تھی۔ اس میں ہر قسم کے موضوع پر بات ہوا کرتی اور قائل ہونا پڑتا کہ وہ ایک صاحب مطالعہ شخص ہے۔

ایک بار کرامت صاحب نے رازدارانہ انداز میں میرے دفتر آکر کہا۔ ''عبید صاحب آپ مانیں یا نہ مانیں وہ شخص اس قصبے پر کوئی آفت لے آئے گا۔''

''وہ کیسے؟''

''خود دیکھ لیں۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ کسی سے ایک پیسا نہیں لیتا۔ کوئی کام بھی نہیں کرتا۔ اس کی کھیتی باڑی بھی نہیں ہے۔ پھر اس کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے ہیں؟''

کرامت نے یہ ایک بہترین سوال اٹھایا تھا۔ واقعی بے خود کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے تھے اس کے اخراجات میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ہر وقت چائے کی دیگ چڑھی رہتی۔ کئی طرح کے کھانے بنتے۔ شام کے وقت جو محفل جمتی تو اس میں رات ہو جاتی۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ سب کو کھانا کھلا کر بھیجتا تھا اور کھانے بھی کئی طرح کے ہوا کرتے۔

کہاں سے ہوتے تھے یہ سب؟ اب یہ معلوم کرنا میرا جیسے فرض بن گیا تھا۔ میں یک طرفہ اس کی تعریف کیے جا رہا تھا۔ اس کی زندگی کے اس پہلو پر میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔

ایک شام جب اس کے کمرے میں میرے اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا تو میں نے یہ سوال کر دیا۔ ''بے خود صاحب! پوچھنا تو نہیں چاہیے تھا لیکن آپ کی طرف سے ایک بات کھٹکتی رہتی ہے۔''

''چلیں بھائی وہ بھی بتا دیں۔'' اس نے ہنس کر پوچھا۔

''آپ کے اخراجات کہاں سے چلتے ہیں۔ ماشاءاللہ چائے اور کھانوں کے لنگر چلتے ہی رہتے ہیں۔''

''بس اتنی سی بات۔'' وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ''ایک منٹ میں ابھی آپ کو ایک چیز دکھاتا ہوں۔''

وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جس میں وہ سویا کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عبید صاحب! میں ایک کھاتا پیتا خوش حال قسم کا انسان ہوں۔ میرے والد کی پلاسٹک کے سامان بنانے کی فیکٹری تھی جو اب میرے پاس ہے۔ اس کے علاوہ شہر میں میرا پورا ایک شاپنگ پلازہ ہے۔ جس کی دکانیں میں نے کرائے پر دے رکھی ہیں اور آپ کی دعا سے دو سے تین لاکھ صرف کرائے میں آجاتے ہیں۔ لہٰذا مجھے کسی سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے پاس خدا کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔''

میں یہ سوال پوچھ کر شرمندہ ہو گیا تھا۔

''میں شرمندہ ہوں کہ میں نے یہ بے تکی بات پوچھ لی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں بلکہ بہت اچھا کیا کہ آپ نے پوچھ لیا۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سوں کے ذہنوں میں میرے اخراجات کھٹک رہے ہوں۔ بلکہ میں تو یہ چاہوں گا کہ آپ اپنے اخبار میں بھی اس بات کی وضاحت کر دیں۔''

''اب تو میں ضرور کروں گا۔'' میں بھی پُرجوش ہو گیا تھا۔ ''لیکن بھائی ایک بات تو بتائیں۔ اتنی آرام و آسائش کو چھوڑ کر یہاں آکر اس طرح رہنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ہاں یہ آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور ہر سوچنے والے کو یہ سوال ضرور کرنا چاہیے۔ آخر کیوں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سے لوگ ابنارمل بھی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے مال و دولت زندگی گزارنے کا محض ایک اوزار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ آپ نے مہاتما بدھ کے بارے میں تو پڑھا ہی ہوگا۔ وہ ایک ریاست کے شہزادے تھے لیکن جب گیان کی تلاش میں نکلے تو انہوں نے اپنا راج پاٹ سب کچھ چھوڑ دیا۔ میں ان جیسا بڑا آدمی تو نہیں ہوں لیکن میں بھی گیان کی تلاش میں ہوں۔ دعا کریں مل جائے۔''

اب میرے دل میں اس کے لیے انسیت کے ساتھ ساتھ عقیدت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ایک بڑا آدمی تھا۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

میں نے اپنے اخبار میں اس پر پورا ایک مضمون لکھ دیا تھا۔ جس پر وہ زیادہ خوش نہیں ہوا تھا۔ ''عبید صاحب لگتا ہے کہ آپ یہاں نہیں رہنے دیں گے۔''

''اس کے برعکس میں تو یہی چاہوں گا کہ آپ ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جائیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ کبھی کبھی قصبے کے بازار کی طرف بھی نکل جاتا تھا۔ اس وقت تک پورا قصبہ اس کا احترام کرنے لگا تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر ادب سے رک جاتے۔ اس وقت اس کے چہرے سے ایسا لگتا ہے جیسے اسے یہ سب پسند نہ ہو۔ بے نیازی کی یہ کیفیت بھی میں نے کم ہی دیکھی ہوگی۔''

قصبے میں ایک واقعہ ہوا۔
سیلاب تو ہر سال آیا کرتا تھا لیکن اس بار کا سیلاب کچھ زیادہ شدید تھا۔ ہمارے قصبے کے ساتھ جو نہر بہتی تھی وہ پانی سے پوری طرح بھر کر ابل آئی تھی اور اس کے کنارے بنے ہوئے بہت سے کچے مکانات سیلاب میں بہہ گئے تھے۔
ہر وقت بارش ہی ہوتی رہتی تھی۔
اسی دوران ایک دن بے خود کا خاص آدمی رشید میرے دفتر آگیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو بے خود کے معاملات کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔
''عبید صاحب! صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ دو دنوں سے بیمار ہیں کہہ رہے تھے آ نہیں سکتے اس لیے آپ آجائیں۔''
یقیناً کوئی خاص بات ہوگی۔
''میں نے اپنی چھتری اٹھائی اور رشید کے ساتھ چل پڑا۔ بارش اس وقت بھی ہو رہی تھی۔ ان علاقوں میں بارش یا تو بہت کم ہوتی ہے یا بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس سال زیادہ ہی ہو رہی تھی۔ اس لیے یہ حال ہو رہا تھا۔
بے خود کے پاس پہنچا تو وہ واقعی بیمار تھا۔ بخار سے اس کا چہرہ تپ رہا تھا۔ رشید فوراً میرے لیے چائے بنانے چلا گیا تھا۔
بے خود نے کہا۔ ''عبید صاحب اس وقت آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ آپ سے زیادہ ذمے دار شخص مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ یا میں کسی سے واقف نہیں ہوں۔''
''فرمائیں بے خود صاحب میرے لیے کیا حکم ہے۔''
میں جو کچھ کہوں گا اس کے لیے وضع داری کی شرط ہے۔ ورنہ میں شرمندہ ہوتا رہوں گا۔''
''آپ فرمائیں تو سہی۔''
''میں آپ کو پچیس لاکھ روپے دے رہا ہوں۔ یہ میں نے اپنے اکاؤنٹ سے منگوائے ہیں۔''
''پچیس لاکھ روپے؟'' میں حیران رہ گیا تھا۔ ''وہ کیوں؟''
''میں کل خود دیکھ کر آیا ہوں نہر کے کنارے غریبوں کے کچے پکے گھر تباہ ہو گئے ہیں۔ آپ سے یہ درخواست ہے کہ اپنی نگرانی میں ان گھروں کی مرمت کروادیں۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کہیں میرا نام نہ آئے کسی کو نہ معلوم ہو کہ یہ کام میں نے کیا ہے۔''
''بے خود صاحب آپ کیا ہیں آخر؟'' میں نے عقیدت سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اتنا بڑا کام اور وہ بھی یوں ہی۔ بغیر کسی لالچ کے۔''
''ایک لالچ تو ہے نا۔'' وہ مسکرادیا۔ ''اور وہ ہے اپنے خدا سے اس کا اجر پانے کا۔''
''بے شک...... بے شک......'' میں اس شخص کے سامنے کچھ بول تو نہیں پار ہا تھا۔
رشید اس دوران چائے بنا کر لے آیا، بے خود اپنے دوسرے کمرے سے ایک بڑا سا لفافہ لے آیا تھا جس میں پچیس لاکھ روپے تھے۔ ''یہ لیں عبید صاحب! پورے پچیس لاکھ ہیں جائیں اور اللہ کا نام لے کر ان غریبوں کے گھر بنوادیں۔''
بارش کا زور ختم ہو گیا۔ سیلاب بھی اتر گیا تھا۔ اس وقت سے میری ذمے داری شروع ہو گئی۔
میں نے اپنی نگرانی میں گھروں کی مرمت کا کام شروع کرادیا۔
بے گھر ہو جانے والے لوگ جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں دے رہے تھے لیکن مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے اپنے ہفت روزہ میں ساری کہانی شائع کردی۔
اس کے بعد کیا تھا۔
بے خود پورے علاقے کے لیے ایک دیوتا بن کر رہ گیا۔ ہر شخص کی زبان پر بے خود تھا جب کہ خود اس کا یہ حال تھا کہ مجھ سے سخت ناراض ہو گیا تھا۔
''عبید صاحب یہ آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں نے تو آپ سے وعدہ بھی لیا تھا کہ میرا نام ظاہر نہیں کریں گے۔ لیکن آپ نے وعدہ خلافی کردی۔''
''وعدہ خلافی تو ہے لیکن یہ ضروری بھی تھا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ وہ دور ہے جب نیکی کے کام کے لیے ترغیب کی ضرورت ہونے لگی ہے۔ خود سوچیں جب کوئی جرم ہوتا ہے یا کوئی بڑا جرم پکڑا جاتا ہے تو دنیا بھر کے ٹی وی چینلز اس کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر اسے ہیرو بنا دیتے ہیں اور جو کوئی بے چارہ نیکی کرے اس کا ذکر تک نہیں ہوتا۔ اس لیے لوگوں میں نیکی کی تحریک پیدا نہیں ہوتی۔''
بے خود منہ ہی منہ میں کچھ بول کر رہ گئے۔ اس سے اس شخص کے ظرف کا اندازہ ہو رہا تھا۔ پچیس لاکھ کی رقم معمولی نہیں ہوتی لیکن اس نے سوچے بغیر غریبوں کو دے دیئے تھے۔
کئی مہینے گزر گئے۔ بے خود کے یہاں میرا آنا جانا لگا

رہتا تھا۔ میں جب بھی جاتا لوگوں کی بھیڑ اس کے دروازے پر ہوتی۔ وہ سب ایک نجات دہندہ جان کر اس کے پاس آیا کرتے۔ وہ کسی کو کوئی وظیفہ بتا دیتا۔ کسی کی پیسوں سے مدد کر دیتا۔

سیلاب والے واقعے کے بعد اس نے قصبے میں صفائی کی مہم کا بھی آغاز کر دیا تھا۔ اس مہم میں بھی لوگ اس کا پوری طرح ساتھ دے رہے تھے۔

اس ایک شخص کی وجہ سے پورا علاقہ بدل کر رہ گیا تھا۔

پھر اسی دوران الیکشن کے دن آ گئے۔

ہمارے حلقے سے ایک ایم این اے اور چار ایم پی اے ہوا کرتے تھے۔

حسب دستور پھر وہی بلند و بانگ دعوے۔ وعدے تقدیر بدل کر رکھ دیں گے اور نہ جانے کیا کیا۔

آزمائے ہوئے مہرے پھر بے وقوف بنانے آ گئے تھے۔ یہ سب مشہور سیاسی پارٹیوں کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑ رہے تھے۔

ایسے میں میرے ذہن میں نہ جانے کیوں ایک خیال آ گیا۔

کیوں نہ بے خود صاحب کو ایم این اے کے لیے کھڑا کر دیا جائے۔ ان تمام بدمعاش امیدواروں کی بھیڑ میں وہ تنہا اچھے بندہ تھے۔

میں نے بے خود صاحب سے ذکر کیا تو وہ بھڑک اٹھے۔ ''کیا ہو گیا ہے عبید صاحب، مجھے کس کیچڑ میں دھکیل رہے ہو۔''

''دیکھیں بے خود صاحب سیاست ان لوگوں کے لیے کیچڑ ہے جو اس کیچڑ کا حصہ بن جانا چاہتے ہیں اور یہ لوگ خدمت کے لیے نہیں آتے ہیں ان کے لیے سیاست کاروبار کی طرح ہے۔''

''یہاں ایک سے ایک لوگ الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ میں ان کے سامنے کیا ہوں۔''

''آپ ان کے سامنے بہت کچھ ہیں، بلکہ آپ ہی ہیں۔ اس علاقے میں اور کوئی نہیں ہے۔''

''دیکھو بھائی میرا تعلق کسی پارٹی وارٹی سے نہیں ہے۔''

''کوئی بھی پارٹی آپ کے لیے بہت چھوٹی چیز ہے۔ بے خود صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑنا ہے۔''

انہوں نے خوف کو بچانے کی کوشش کی لیکن میں نے ایک نہ سنی پھر جب یہ خبر باہر نکلی تو پورے قصبے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

ہم لوگوں نے اپنے طور پر ان کے کاغذات جمع کرا دیئے تھے۔

الیکشن ابھی دور تھا بے خود صاحب کے دروازے پر جشن کا سماں رہتا تھا۔ لوگ مٹھائیاں اور تحفے لے لے کر آ رہے تھے۔

ہر ایک کو یقین تھا کہ سوائے بے خود صاحب کے اور کوئی جیت ہی نہیں سکتا اور ہوا بھی یہی۔ بڑے بڑے ناموں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔

ہر ایک نے ان پر کھل کر بھروسا کیا تھا۔

ان کی جیت کے بعد پورے قصبے میں جشن کا سماں تھا۔

یہ بات بھی بتا دوں کہ اس جشن کے لیے بے خود صاحب نے انہیں جیب سے پیسے دیئے تھے۔

انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ ''نہیں عبید صاحب بے چارے غریب لوگ میری محبت میں سرشار تو ہو رہے ہیں لیکن میں ان پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ ان کو خوش ہونے دو۔''

وہ بے خود صاحب نے منتخب ہونے کے بعد انٹرویو بھی بہت زبردست دیا تھا۔ وہی ان کی کھری اور درد بھری باتیں۔ میرا خیال ہے کہ جس نے مختلف چینلز پر ان کے انٹرویوز دیکھے ہوں گے۔ وہ ان سے ضرور متاثر ہوا ہوگا۔''

دو مہینے کے بعد قومی اسمبلی کا سیشن ہوا۔ حلف برداری کی تقریب ہوئی اور بے خود صاحب اسلام آباد چلے گئے۔

اس کے بعد بے خود صاحب کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے جیتنے والی سیاسی جماعت نے انہیں اپنی پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی بلکہ ایک اہم عہدہ یعنی وزیر اطلاعات کا شعبہ بھی ان کے حوالے کر دیا۔ یہ خبر بھی قصبے والوں کے لیے جشن کا سبب بن گئی۔

ہمارے قصبے کا ہر دل عزیز انسان پورے ملک کا وزیر اطلاعات بن گیا تھا۔

لیکن اس کے بعد ہوا یہ کہ بے خود صاحب دوبارہ ہمارے قصبے کی طرف نہیں آئے۔ ان کی کتابیں اور دیگر سامان بھی چلا گیا تھا۔

قصبے والے ان کی طرف سے مایوس ہوتے جا رہے تھے۔

''عبید صاحب یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم نے سمجھا تھا

کہ بے خود صاحب وزیر بن گئے ہیں ہمارے قصبے کی قسمت بدل جائے گی لیکن وہ تو اسلام آباد جاکر ہمیں بھول ہی گئے۔

''دیکھو بھائی۔'' میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ تم نہیں جانتے کہ جو عہدہ ان کو دیا گیا ہے۔ کتنا اہم ہے۔ ان کو تو ایک لمحہ کی فرصت نہیں ملتی ہوگی۔''

''پھر بھی ایسا بھی کیا۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ اسلام آباد جاکر ان کو یاد دلائیں۔''

''ہاں عبید صاحب! آپ اسلام آباد چلے جائیں۔ آپ کے تو ان سے بہت اچھے تعلقات رہے ہیں بلکہ یہاں تک پہنچانے میں آپ ہی کا ہاتھ ہے۔''

''یہ تو ہے۔''

''تو پھر چلے جائیں بھائی۔ قصبے کی حالت کچھ تو بدلے۔''

میں اسلام آباد کے لیے روانہ ہوگیا۔ خدا کی پناہ یہاں کے کسی وزیر سے ملنا کتنا بڑا خواب ہے میرا خیال ہے کہ یورپ کے کسی سربراہ سے بھی آپ یوں ہی ملاقات کرسکتے ہیں لیکن کسی پاکستانی وزیر تک آپ کے لیے رسائی ناممکن ہے۔

خدا بھلا کرے میرے پریس کے کارڈ کا اس کی وجہ سے آسانی ہوگئی اور میں بے خود تک پہنچ گیا۔ میں نے اس کی سواری دیکھی۔

واہ کیا پروٹوکول تھا، پولیس کی دو موبائلز پھر بے خود کی شاندار گاڑی جس پر پاکستان کا قومی پرچم لگا ہوا تھا۔

گاڑی سے اتر کر وہ اندر جانے ہی والا تھا کہ میں نے آواز دی۔ ''بے خود صاحب۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اپنے ساتھ چلنے والے ایک شخص سے کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے آئے۔

اس کا کمرا الگ سے بنا ہوا تھا۔ کیا شاندار کمرا تھا۔

اس نے اپنے سیکریٹری سے کہا کہ وہ باہر جائے۔ پھر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''جی عبید صاحب فرمائیں کیسے زحمت کی۔''

میں اس کے سرد لہجے کو سن کر اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

''بے خود صاحب آپ تو ہم لوگوں کو بھول ہی گئے۔'' میں نے کہا۔

''عبید صاحب آپ تو جانتے ہیں کہ مجھے ایک لمحے کی فرصت نہیں ملتی۔''

''لیکن بے خود صاحب جس علاقے کے لوگوں نے آپ کو اس مقام تک پہنچایا ہے ان کا تو آپ پر حق بنتا ہے ناں؟''

''حق!'' بے خود ہنس پڑا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے کہ میں بس یوں ہی اس عہدے تک پہنچا ہوں۔ جی نہیں پوری پلاننگ تھی میری ذہانت مجھے یہاں تک لے کر آئی ہے۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

''ارے بھائی حاتم طائی والا زمانہ گزر گیا۔ اب اگر ایک روپیا خرچ کیا جاتا ہے تو یہ اُمید ہوتی ہے کہ اس کے بدلے ستر ملیں گے۔ آپ نے خود میری ذہانت دیکھ لی۔ میں نے پہلے اپنی ساکھ بنائی۔ آپ کے علاقے والوں کو اپنے حق میں کیا۔ ایک خاص پلاننگ کے تحت پچیس لاکھ خرچ کردیئے۔ اس کے بعد الیکشن میں کھڑا ہوگیا۔''

''اور ہم سب بے وقوف بن کر آپ کا ساتھ دیتے رہے۔'' میرا لہجہ تلخ ہوگیا تھا۔

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے یار، اس ملک کا عام آدمی اسی طرح بے وقوف بن رہا ہے۔ اب ہمیں دیکھیں کہ میں نے اس وقت سارے دانے کھول دیئے ہیں لیکن کیا ہوگا کچھ بھی نہیں۔ آپ کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت ہی نہیں ہوگا۔ آپ چاہیں لاکھ میرے خلاف اپنے اخبار میں لکھتے رہیں میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔''

سچ کہا تھا اس نے واقعی ہم یہاں کسی کرپٹ شخص کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے۔ کیونکہ ان کے خلاف ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔

''ویسے عبید صاحب اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو انفرادی طور پر فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔''

''وہ کس طرح؟''

''میں آپ کے اخبار کے لیے کاغذ کا کوٹہ دے سکتا ہوں۔ آپ اسے بیچ کر لاکھوں کما سکتے ہیں۔''

''بہت بہت شکریہ بے خود صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''میں ایک عام سا انسان ہوں اور مجھے ویسا ہی رہنے دیں۔''

میں اس وزیر کے کمرے سے باہر آگیا۔

اور اب مجھے کسی پر کوئی بھروسا نہیں رہا۔ چاہے وہ کتنا ہی پارسا بن کر سامنے آجائے۔ آپ سے بس یہی کہنا ہے کہ آپ بھی کسی پر بھروسا نہ کریں۔ اپنے آپ پر بھی نہیں۔

تیزاب

محترم و مکرم
السلام علیکم
یہ میں جو کچھ بھیج رہی ہوں یہ میرا اظہاریہ ہے۔ اعتراف ہے میں نے جو گناہ کیا یا جس کی سزا عدالت نے سنائی ہے کیا واقعی یہ میرا جرم ہے؟ آپ بھی پڑھیں۔

رافعہ
(ملتان)

اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔

کیونکہ ایک تو میں سر سے پاؤں تک برقع میں تھی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنا چہرہ بھی چھپا رکھا تھا۔ صرف میری آنکھیں ہی دکھائی دیا کرتیں۔

گزشتہ دو برسوں سے میں اسی طرح باہر نکلتی، اسی لیے وہ مجھے پہچان نہیں سکا تھا اور میں چاہتی بھی نہیں تھی کہ کوئی مجھے پہچانے۔

بڑے فائدے بھی مل رہے تھے۔ پردہ عورتوں کے لیے کتنا ضروری ہے اس کا احساس اب ہو رہا تھا۔ عورت اپنے آپ کو ایک مضبوط حصار میں محسوس کرنے لگتی ہے۔

میں بھی دو برسوں سے مضبوط حصار میں تھی۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ میں ایک سپر اسٹور میں اس کے بالکل برابر جا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے باوجود وہ مجھے پہچان نہیں سکا۔

اس نے بس ایک سرسری نظر مجھ پر ڈالی پھر کسی اور طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے اپنے آپ کو مبارک باد دی کہ اس کی نگاہوں سے خود کو چھپانے میں کامیاب رہی تھی۔

لیکن دو برس پہلے ایسا نہیں تھا۔
اس وقت نہ تو میں برقع پہنتی اور نہ ہی حجاب میں رہتی تھی۔ اس لیے دنیا بھر کی ہوس زدہ نگاہیں میرے اردگرد طواف کیا کرتیں۔
پتا نہیں کیسا شوق ہوا کرتا ہے اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھتے۔ یہ میرا مشاہدہ تھا کہ جتنا بدصورت مرد ہوگا وہ اتنی ہی خوب صورت عورتوں کے چکر میں ہوگا۔ شاید یہ اس کی کسی قسم کی احساس کمتری ہوتی ہے۔
تو اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں اپنی دوست کے ساتھ ایک مارکیٹ میں تھی۔ گرمیوں کے نئے پرنٹس آئے ہوئے تھے۔ میں وہی لینے گئی تھی۔ میری دوست نے اچانک مجھے متوجہ کیا۔ ”رافعہ ایک بندہ تجھے بری طرح گھور رہا ہے۔“
”ارے جانے دے، اس قسم کے بندے ہر مارکیٹ میں ملتے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”یہ کچھ خاص معلوم ہوتا ہے۔“ میری دوست نے کہا۔
”ایک نمبر کا غنڈہ اور لوفر۔“
”کہاں ہے؟“
”آہستہ سے اپنی گردن گھما کر دیکھ لے۔“ دوست نے کہا۔ ”لال قمیص پہن رکھی ہے۔ توبہ۔“
میں نے اپنی دوست کے کہنے پر آہستہ سے گردن گھمائی اور وہ مجھے دکھائی دے گیا۔ سرخ قمیص اور جینز میں اس نے اپنے گلے میں سونے کی زنجیر ڈال رکھی تھی۔ اتنے فاصلے کے باوجود اس کی آنکھوں میں دہکتی ہوئی ہوس صاف محسوس ہو رہی تھی۔
میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹائی اور دکاندار کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اب کسی قسم کی خریداری میں دل نہیں لگ رہا تھا۔
ہم نے جلدی جلدی دکاندار کو پیسے دیے اور مارکیٹ سے باہر آگئے۔
وہ کم بخت اب ہمارا تعاقب کرنے لگا تھا۔
”یار! یہ تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔“ میری دوست نے کہا۔
”یہ سب تیرا قصور ہے۔“
”کیوں میرا کیا قصور ہوا؟“
”اتنی پیاری صورت کیوں پائی ہے جو دیکھتا ہے لٹو ہو جاتا ہے۔ اس بے چارے کا بھی کوئی خاص قصور نہیں ہے۔“
”اچھا اچھا رکشا پکڑ لے اور یہاں سے نکلنے کی سوچ۔“ میں نے کہا۔
ہم دونوں نے رکشا کر لیا۔ اتفاق سے بھموت ہو گئے...

ہی محلہ تھا اور ہم برسوں سے ساتھ رہ رہے تھے۔ ہم نے بچپن اسی محلے میں ایک دوسرے کے ساتھ ہنستے کھیلتے ہوئے گزارا تھا۔
ناظمہ ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ جس طرح کی قبول صورت لڑکیاں ہوا کرتی ہیں لیکن میری بات کچھ اور تھی۔ خدا نے مجھے حسن کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔
گورا رنگ، دل کش قامت، نازک چھریرا جسم اور اس پر میری آنکھیں۔ سب یہی کہا کرتے کہ یہ آنکھیں جادو جگاتی ہیں۔
ان سب کے باوجود میں کبھی اِدھر اُدھر نہیں بھٹکی۔ مجھے ہمیشہ اپنے غریب والدین کا خیال رہا۔ ابو ایک بڑے سپر اسٹور میں کیشیئر تھے۔ ماں گھریلو عورت تھیں۔ ایک بڑا بھائی تھا جو کسی کمپنی میں کام کیا کرتا تھا۔ میں تھی اور میرے بعد دو اور بہنیں جو ابھی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔
میں کالج میں تھی لیکن بہنیں اسکول میں تھیں، گھر کا گزارا کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا تھا۔ میرے لیے رشتے بھی آیا کرتے لیکن ابھی میرا ارادہ شادی کا نہیں تھا۔
میں یہ چاہتی تھی کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایسے حالات پیدا کردوں کہ گھر میں تھوڑی سی خوش حالی آجائے۔ اس کے بعد شادی دیکھی جائے گی۔
رشتے آیا کرتے تھے لیکن میں سلیقے سے ٹال دیا کرتی۔
اس معاملے میں گھر والوں نے مجھے اپنی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔
ناظمہ بھی میرے ہی محلے میں رہا کرتی تھی۔ ہر شام یا تو میں اس کے گھر چلی جاتی یا وہ میرے پاس آجایا کرتی۔ ہم دونوں کا ایک ہی شوق تھا۔ کہانیاں پڑھنے کا۔ ناظمہ اور میں اکثر خواتین کے ڈائجسٹ لے آیا کرتیں اور ہم کہانیاں پڑھ پڑھ کر ان پر تبصرے کرتے رہتے۔
ہمیں کہانیوں کا ماحول بہت اچھا لگتا تھا، چمکتی دمکتی ہیروئن دل کو بھاتی تو تھی لیکن ہم اپنی حد میں رہنا جانتے تھے۔ ہم دونوں کو اپنے گھر اور خاندان کی عزت کا خیال رہا کرتا تھا۔
ایک شام جب ناظمہ میرے پاس آئی تو وہ کچھ پریشان سی تھی۔ میں اسے لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔
”کیا بات ہے ناظمہ، خیر تو ہے نا۔“
”یار وہ لوفر تیرا پتا کر کے یہاں تک آچکا ہے۔“ ناظمہ

ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "میں نے اس لوفر کو تیرے گھر کے سامنے دیکھا ہے۔"

"میرے خدا۔" میں بھی پریشان ہو گئی تھی۔ "لیکن اسے میرے گھر کا پتا کیسے چلا؟"

"لگتا ہے کمینے نے مارکیٹ ہی سے ہمارا پیچھا کیا ہو گا۔" ناظمہ نے کہا۔ "ہم رکشے پر تھے۔ اسی لیے ہمیں پتا نہیں چلا۔ ایسے لوگ قبر سے بھی بندے کو تلاش کر کے لے آتے ہیں۔"

"یار یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔" میں واقعی پریشان ہو گئی تھی۔ "اب بتاؤ کیا ہو گا۔"

"ایسے لوگوں کو اگر چھیڑا جائے یا پلٹ کر جواب دیا جائے تو بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔" ناظمہ نے کہا۔ "جنونی قسم کے ہوتے ہیں ناں، اس کے لیے سب سے بہتر یہی ہے کہ نظر انداز کر دیا جائے۔ بالکل ان کی طرف توجہ نہ دی جائے۔ پھر یہ خود ہی سیدھے ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں، کم از کم ہم یہ تو کر ہی سکتے ہیں۔"

ہم پھر اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ہم دونوں نے ایک ہفتے قبل ایک کہانی پڑھی تھی۔ اب ہم اس پر گفتگو کرنے لگے تھے۔

دو دن بعد ایک شام وہ لوفر مجھے بھی دکھائی دیا۔ میں کچھ فاصلے پر ایک گھر میں ٹیوشن پڑھانے گئی ہوئی تھی۔ ہاں میں نے یہ بتایا نہیں کہ میں ٹیوشن بھی پڑھایا کرتی تھی۔ اس طرح میں کسی حد تک خود اپنا خرچ نکال لیتی تھی، تو جب میں ٹیوشن سے واپس آ رہی تھی تو میں نے اس لوفر کو اپنے گھر کے سامنے دیکھ لیا۔

میں نے اس کی نگاہ سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہوس زدہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

اس نے ایک لوفرانہ انداز سے مجھے سلام کیا لیکن میں برا سا منہ بنا کر اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی۔ وہ یقیناً تلملا کر رہ گیا ہو گا۔

لیکن کیا یہ کافی تھا؟ کیا وہ میرا پیچھا چھوڑ دینے والا تھا۔ وہ ان میں سے نہیں معلوم ہوتا تھا جن کو کوئی لڑکی اگر ایک بار لفٹ نہ دے تو دوبارہ اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں تھے۔ بہرحال اب مجھے بہت احتیاط کرنی تھی۔

مسئلہ یہ تھا کہ میں اس کے بارے میں اپنے ابا اور بھائی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ دونوں پریشان ہو جاتے اگر پولیس میں رپورٹ کرواتے بھی تو اس کا پہلا سوال یہ ہو گا کہ اس نے کیا کیا ہے اور ابھی تک تو اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ صرف دیکھا کرتا تھا اور یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ جس پر پولیس کوئی ایکشن لے۔ یہ اخلاقی جرم تو ہو سکتا تھا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

پتا نہیں یہ کیسا دستور ہے۔

قانون اس وقت حرکت میں آتا ہے جب کسی کی زندگی تباہ ہو چکی ہو۔ کوئی سنگین واردات ہو چکی ہو۔ ہمارے یہاں ہمیشہ یہی رواج رہا ہے۔

ایک دن اس نے راستے میں مجھے روک لیا۔ کیسی جرأت تھی اس کی۔ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ میں ہنگامہ کھڑا کر دوں لیکن خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

اس نے میرا راستہ روک کر کہا تھا۔ "آخر تم مجھ سے اتنا کتراتی کیوں ہو۔"

"کیا مطلب۔" میں نے غصے سے پوچھا۔ "کون ہو تم۔"

"بندے کو سکندر خان کہتے ہیں۔" اس نے اپنا نام بتایا۔

"تو پھر میں کیا کروں۔"

"مجھ سے دوستی کر لو۔ بہت فائدے میں رہو گی۔"

"شٹ اپ بدتمیز انسان۔"

"یاد رکھو سکندر خان کو شٹ اپ کہنے والے کی خیر نہیں ہوتی۔"

"تم جاتے ہو یا میں لوگوں کو بلاؤں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تو جا رہا ہوں لیکن اب اس طرح آؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گی۔"

وہ ایک طرف چلا گیا۔ میں کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔ میرے ساتھ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے اتنی بدتمیزی سے بات کی تھی، جب کہ مجھ سے فری اور پیار سے بات کرنے والے بہت تھے۔

میں شام کے وقت ناظمہ کے پاس چلی گئی۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ ناظمہ بھی یہ سن کر پریشان ہو گئی تھی۔

"کیسا بے شرم انسان ہے۔ ایسے لوگوں سے تو اللہ ہی سمجھے۔"

"ناظمہ مجھے تو اب اس سے ڈر لگنے لگا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ مجھے دھمکی دے کر گیا ہے۔"

''اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ تم اپنے گھر والوں کو اس کے بارے میں بتا دو۔''

''یار میرے گھر والے پریشان ہو کر رہ جائیں گے۔'' میں نے کہا۔'' کیونکہ وہ غریب لوگ ہیں اور غربت سب سے بڑا جرم، سب سے بڑی کمزوری ہوا کرتی ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے۔''

''کچھ نہیں، میں کچھ دنوں کے لیے کالج نہیں جاؤں گی۔'' میں نے بتایا۔''اس کے بعد دیکھا جائے گا کیا ہوتا ہے۔''

یہی ہوا اور میں نے کالج فون کر کے بتا دیا تھا کہ میں کچھ بیمار ہو گئی ہوں اور ایک ہفتے تک کالج نہیں آسکوں گی۔

لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ایک ہفتہ اتنے دنوں پر محیط ہو جائے گا۔

ایک ہفتے تک وہ گلی میں دکھائی نہیں دیا۔ یہ رپورٹ ناظمہ سے ملتی رہی تھی۔ وہ نگرانی کرتی رہی تھی اور جب وہ ایک ہفتے تک دکھائی نہیں دیا تو اس نے کہا۔''رافعہ ایسا لگتا ہے کہ اس نے مایوس ہو کر تمہارا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہوا ہو۔''

میں یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئی تھی کہ وہ اب میری طرف نہیں آئے گا لیکن اس اذیت ناک دن جب میں کالج سے واپس آرہی تھی اس نے راستے میں مجھے گھیر لیا۔ وہ اپنی بائیک پر تھا اس کے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل تھی۔ اس نے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے میرے چہرے پر تیزاب ڈال دیا۔

میرے خدا! کیا میں اس اذیت کو بیان کر سکتی ہوں۔ شاید کبھی نہیں۔ ایک طرف کا چہرہ اور گردن جھلس گئی۔ میں پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لوفر کو یہ عمل کرتے ہوئے محلے کے کچھ لوگوں نے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے فون کر کے ایمبولینس منگوالی تھی۔

اس کے بعد وہی سب کچھ ہوا جو ایسے مرحلوں میں ہوا کرتا ہے۔

مجھے ایک سرکاری اسپتال میں تین مہینوں تک رہنا پڑا تھا۔ وہ لوفر گرفتار ہو گیا تھا۔ محلے والے اسے پہچانتے تھے۔ انہوں نے اس کے خلاف ایف آئی آر کٹوادی تھی۔

لیکن اس سے کیا ہوا صرف تین سال کی سزا۔ کسی خوب صورت چہرے کو بدصورت کرنے اور اس کی زندگی برباد کرنے کی سزا صرف تین سال۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خود اس کے چہرے پر بھی تیزاب ڈال دیا جاتا تاکہ وہ اس اذیت کو خود بھی برداشت کرتا رہے۔

خدا کی پناہ میں آئینے میں اپنا بدصورت اور جھلسا ہوا چہرہ دیکھ کر کتنا روئی تھی۔ میرے ساتھ پورا گھر رو رہا تھا کیونکہ اب میں کہیں کی نہیں رہی تھی۔ وہ لوگ جو پہلے مجھے دیکھ کر آہیں بھرا کرتے تھے اب اس طرح پیچھے ہٹ جاتے جیسے میں کوئی بدروح ہوں اور وہ میرے سائے سے بھی بچنا چاہتے ہوں۔

محلے کے بچوں نے میرا نام ہی چڑیل رکھ دیا تھا۔ جب میں ان کے سامنے آتی تو وہ چیخ کر بھاگ جاتے، دور جا کر چڑیل چڑیل کہتے۔ اس وقت میرا کرب سوا ہو جاتا۔ دل خون کے آنسو روتا رہتا۔ صرف ناظمہ تھی جو اب تک میرا ساتھ دے رہی تھی۔ میں نے تو کہیں آنا جانا ہی چھوڑ دیا تھا اگر کہیں جاتی بھی تو نقاب میں اور وہ بھی اس طرح کہ صرف میری آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ چہرہ تو اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ اسے کوئی دیکھ سکتا۔

کچھ مہینے گزرے تھے کہ ناظمہ نے ایک خبر سنائی۔

''رافعہ وہ لوفر جیل سے باہر آگیا ہے۔''

''باہر آگیا ہے۔ وہ کیسے؟ اس کو تو تین سال کی سزا ہوئی تھی۔ ابھی تو صرف تین مہینے ہوئے ہیں۔''

''اب کیا بتایا جائے۔ سفارش اور رشوت دو ایسی چیزیں ہیں جن سے پورا قانون بدل جاتا ہے۔''

''لیکن یہ تو بہت بڑی ناانصافی ہے ناظمہ۔''

''میری جان ناانصافی تو اسی وقت ہو گئی تھی جب اتنے بڑے جرم کی سزا تین سال ہوئی تھی۔ اس کے مددگاروں نے پہلے پولیس ریکارڈ میں تبدیلی کرائی اور ہائی کورٹ میں اپیل کر دی۔ عدالت ثبوت پر فیصلے کرتی ہے۔ تمام ثبوت مٹا دیئے گئے تھے اس لیے فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا۔

وہ رات میں نے روتے اور بلکتے ہوئے گزاری تھی۔ اس خبر نے مجھے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ کیسا دستور تھا۔ کسی کی زندگی برباد کرنے والے کو صرف چند مہینوں کے بعد باعزت بری کر دیا جائے۔

صبح ہوتے ہوتے میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔

میں نے ناظمہ کو بتایا۔'' ناظمہ قانون نے تو اسے کوئی سزا نہیں دی لیکن میں اس سے اپنی زندگی کا بدلہ ضرور لوں گی کیونکہ اس نے میرا مرڈر کیا ہے، خون کیا ہے میرا اور میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔''

''لیکن تم کر بھی کیا سکتی ہو۔''

''یہ تو میں نے ابھی نہیں سوچا ہے لیکن اتنا ضرور سوچ لیا ہے کہ بدلہ ضرور لینا ہے۔''

''رافعہ تم ایک کمزور سی لڑکی ہو۔''

''یہ خیال ذہن سے جھٹک دو تو ہمت خود بخود آجاتی ہے۔ میں خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق برابری کا انصاف چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ خدا ضرور میری مدد کرے گا۔''

ناظمہ نے بھی زیادہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ میرے جذبات سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں کس کرب میں ہوں اور میرے وجود میں کیسی آگ لگی ہوئی ہے۔

میں نے اس لوفر کا ایڈریس معلوم کرلیا۔ وہ ہمارے محلے سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔

ایک بار میں نے اسے ایک اسٹور میں دیکھ لیا۔ جس کا ذکر میں اپنی کہانی کی ابتدا میں کر چکی ہوں۔ وہ میرے پاس ہی کھڑا تھا لیکن وہ مجھے پہچان نہیں سکا کیونکہ میرا چہرہ پوری طرح چھپا ہوا تھا۔ صرف میری آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ اسٹور سے اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کر باہر نکل ہی رہا تھا کہ میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ ''ایک منٹ ذرا بات سنیں۔''

''جی۔'' وہ حیران ہو کر رک گیا۔ ''کیا مجھ سے کچھ کہا؟''

''کیا آپ میرا ساتھ دے سکتے ہیں؟'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ انداز ایسا تھا جیسے میں کسی سے خوفزدہ ہوں۔ ''پلیز! ایک لڑکی کا تو گھر سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''آخر بات کیا ہے؟''

''میں کچھ خریدنے کے لیے آئی تھی کہ دو غنڈے میرے پیچھے پڑ گئے۔'' میں نے بتایا۔ ''بڑی مشکلوں سے ان سے بچ کر اس طرف آئی ہوں۔''

مجھے اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ وہ آواز سے بھی میری شناخت نہیں کر پا رہا تھا۔ ویسے بھی اس حادثے کے بعد چہرے کے ساتھ ساتھ میری آواز بھی بدل گئی تھی۔ صرف آنکھیں زندہ اور جادو بھری تھیں اور شاید ان ہی آنکھوں کے سحر نے اسے گرفتار بھی کرلیا ہو۔

''بتاؤ کہاں ہیں وہ غنڈے۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں نہیں پلیز میں کوئی جھگڑا نہیں چاہتی۔ بس اپنے ساتھ مجھے لے جا کر اسٹاپ تک پہنچا دیں تاکہ وہ غنڈے اگر دیکھیں تو انہیں پتا چلے کہ میرے ساتھ کوئی ہے۔''

''تم رہتی کہاں ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''حبیب کالونی۔'' میں نے مختلف ڈائریکشن کا پتا بتا دیا۔ جہاں میری ایک خالہ رہتی تھیں۔

''لیکن تم نے مجھ پر کیوں بھروسا کرلیا۔ میں بھی تو ویسا ہی ہوسکتا ہوں۔''

''پتا نہیں کیوں، آپ پر بھروسا کرنے کو دل چاہا اسی لیے میں آپ کے پاس آگئی ورنہ یہاں اور بہت سے لوگ گھوم رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پلیز جلدی مجھے یہاں سے نکال لے چلیں۔''

''اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمہیں بائیک پر تمہارے گھر تک پہنچا دوں؟'' اس نے کہا۔

''ارے نہیں آپ کو زحمت ہوگی۔ میں بس سے چلی جاؤں گی۔''

''کوئی زحمت نہیں۔ تمہارے کام آکر مجھے خوشی ہوگی آؤ میرے ساتھ۔''

میں اس کے ساتھ اس کی بائیک پر بیٹھ کر حبیب کالونی تک آگئی۔ اترتے ہوئے میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

''کیا میں اُمید رکھوں کہ تم سے پھر ملاقات ہوگی۔'' اس نے اپنی فطرت کے مطابق پھر پوچھا۔

''آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے میں آپ سے ضرور ملوں گی۔'' میں نے کہا۔

''تم مناسب سمجھو تو میرا موبائل نمبر نوٹ کرلو۔''

''مجھے موبائل استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر کیسے ملوگی؟''

''میں ہفتے میں ایک دن اس اسٹور پر آیا کرتی ہوں۔ یعنی آج کے دن۔ آپ کو ملنا ہو تو وہیں آجایا کریں۔''

''کس وقت!''

''یہی کوئی چار پانچ کے درمیان۔ ٹھنڈے ٹائم۔'' میں نے کہا۔ ''خدا حافظ۔''

میں تیزی سے اس گلی میں داخل ہوگئی جس میں خالہ کا گھر تھا۔ میں نے پہلا قدم اٹھا لیا تھا۔ اب اس کو بہت ہوشیاری کے ساتھ انجام تک پہنچانا تھا۔

میں بہت دیر تک خالہ کے گھر بیٹھی رہی۔ وہ بھی یہ دیکھ کر خوش ہوگئی تھیں کہ میں ان کے گھر آئی ہوں۔ کچھ دیر وہاں

رہ کر میں اپنے گھر واپس آگئی۔

میں نے ناظمہ کو بھی صورتِ حال بتادی تھی۔ وہ یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ ''تو نے تو کمال کردیا۔ کیا تجھے یہ ڈر نہیں تھا کہ وہ تجھے پہچان لے گا۔''

''میرا پورا چہرہ نقاب میں تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''صرف میری آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں اور تو یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ میری آواز تک بدل گئی ہے۔''

''یہ بات تو ہے۔ اب کیا ارادے ہیں۔''

''میں نے اس پر ڈورے تو ڈال دی ہے اب اس کو اچھی طرح اپنے جال میں پھنسا کر وہاں لے جانا ہے جہاں میں اس سے اپنا حساب لے سکوں۔''

''کہاں لے جائے گی۔''

''یہ ابھی نہیں سوچا ہے لیکن مدیحہ کا نام ذہن میں آرہا ہے۔''

''اور یہ مدیحہ کون ہے؟''

''میرے کالج کی دوست۔ اپنے فلیٹ میں اکیلی رہتی ہے گھر والے لاہور میں ہیں۔ ایڈونچر پسند قسم کی لڑکی ہے۔ دو دفعہ اس حادثے کے بعد مجھ سے ملنے آچکی ہے۔ وہ خود بھی یہی کہتی رہی ہے کہ اس کمینے سے بدلہ ضرور لینا ہے۔''

میں دوسری شام مدیحہ کے فلیٹ پہنچ گئی۔ مجھے دیکھ کر اس نے گلے سے لگالیا تھا۔ ''یار! میں تو یہ سمجھی تھی کہ تو نے بن باس لے لیا ہے۔''

''تو کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''اب جو بھی ہے اس کا سامنا تو کرنا چاہیے نا۔''

''اس لیے تو تیرے پاس آئی ہوں کہ مجھے سامنا کرنا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ بتاؤ کیا میرا ساتھ دوگی۔ گھبراؤ گی تو نہیں؟''

''تو بتا تو سہی۔ تیرے لیے جو ہوسکتا ہے وہ کرنے کو تیار ہوں۔''

''میں اس کمینے کو گھیر کر تیرے فلیٹ میں لانا چاہتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن وہ تیرے ساتھ کیوں آنے لگا۔''

''میں نے اس کا بندوبست کردیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس پر اپنا جال ڈال چکی ہوں اور اس نے مجھے پہچانا بھی نہیں ہے کیونکہ میں مکمل نقاب میں تھی۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا۔''

''اس کے بعد وہی ہوگا جو اس نے میرے ساتھ کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم گھبرا رہی ہو تو پھر رہنے دو۔ میں کسی اور جگہ کا بندوبست کرلیتی ہوں۔''

''ارے نہیں، تو کیسی بات کررہی ہے۔'' مدیحہ بولی۔ ''میں ہر حال میں تیرے ساتھ ہوں۔ میں تو خود ایسے کمینوں کی تلاش میں رہتی ہوں بس اس کو گھیر کر لے آ۔ لیکن کیسے لائے گی؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ میرے سحر سے بچ کر جا نہیں سکتا۔''

پروگرام کے مطابق میں نے اس لوفر سے ملاقات کی۔ سکندر پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے شاید اسی ملاقات کے لیے نیا سوٹ بنوایا ہوگا۔ خوب پرفیوم میں بسا ہوا ان سب کے باوجود اس کے اندر کی خباثت اس کے چہرے سے برس کر اسے اور بھی بدنما کررہی تھی۔

''واہ! تم تو وقت کی بہت پابند نکلیں۔'' اس نے مجھ سے ملنے کے بعد کہا۔

''ظاہر ہے تم کو وقت جو دیا تھا۔''

''اس دن میں تمہارا نام نہیں پوچھ سکا تھا۔ یا تم نے نہیں بتایا تھا۔''

''یاسمین نام ہے میرا۔''

''یاسمین بہت خوب صورت نام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم یاسمین کے پھول کی طرح خوب صورت ہوگی۔''

''پتا نہیں۔ گھر والے تو یہی کہتے ہیں۔''

''میں بھی اگر تمہارا چہرہ دیکھ لوں تو شاید یہی کہنے لگوں۔''

میں ہنس پڑی۔ ''مردوں کے ساتھ یہی پرابلم ہوتی ہے کہ وہ ہر کام میں جلدی چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''جلد بازی ٹھیک نہیں ہوتی۔ یہ ہماری دوسری ملاقات ہے۔ پلیز اس بات پر مجبور نہ کریں۔''

''اچھا اچھا ناراض نہ ہو۔ یہ بتاؤ وہ غنڈے پھر تو نہیں ملے۔''

''نہیں اس دن کے بعد سے نظر نہیں آئے۔''

''چلو چل کر کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے جی بھر کر باتیں کریں گے۔''

میں اتنی جلدی اس کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ وغیرہ جانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس لیے میں نے خوش اسلوبی سے اسے ٹال دیا۔

اگلی ملاقات اگلے ہفتے طے پائی تھی۔ وہ اپنی بائیک پر مجھے حبیب کالونی تک لایا تھا لیکن اس دفعہ میں خالہ کے گھر نہیں گئی بلکہ بہت دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد اپنے گھر واپس آگئی۔

ایک اور ملاقات ہوئی۔

اس بار ہم ایک ریسٹوران میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔ اصل فنکاری مجھے وہاں دکھانی تھی۔ میری فرمائش پر اس نے کولڈ ڈرنک منگوالی لیکن مجھے کولڈ ڈرنک اس طرح پینی تھی کہ میرا چہرہ اس کے سامنے نہ آئے۔

اس نے دائیں بائیں سے جھانکنے کی کوشش بھی کی لیکن میں نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ کھسیا کر بولنے لگا۔ ''یار اب ایسا بھی کیا۔ جب ہمارے درمیان دوستی ہو چکی ہے تو پھر اتنا پردہ کیوں۔''

''نہیں سکندر، پلیز اس کے لیے مجھے مجبور نہ کرو۔'' میں نے کہا۔ ''میں اپنی خاندانی اصول کو نہیں چھوڑ سکتی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے وقت آنے دو میں خود ہی اپنا نقاب ہٹا دوں گی۔''

''اچھا بابا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''مجھے اس وقت کا انتظار رہے گا۔''

تیسری یا چوتھی ملاقات میں اس نے کہا۔ ''یار یاسمین اس طرح کی ملاقاتوں میں مزہ نہیں آرہا۔''

''تو پھر کیا کیا جائے۔'' میں نے پوچھا۔

''چلو میرے ساتھ میں تمہیں اپنا گھر دکھا دیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں تمہارے گھر نہیں اگر اطمینان سے بیٹھنا ہے تو میرے ساتھ چلو۔''

''اوہو! تمہارے پاس بھی کوئی ایسی جگہ ہے۔''

''تم مجھے غلط مت سمجھو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ میری دوست کا گھر ہے۔ وہ کسی فیکٹری میں اچھے عہدے پر کام کرتی ہے اس کے فلیٹ کی ایک چابی میرے پاس بھی رہتی ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''اسٹڈی کے لیے۔'' میرے پاس جواب تیار تھا۔ ''جب گھر پر پڑھنے کا موقع نہیں ملتا تو میں اس کے فلیٹ میں جا کر بیٹھ جاتی ہوں۔''

''واہ یہ تو بہت زبردست بات ہوئی۔'' وہ اندر سے نہال ہوا جا رہا تھا۔

میں نے مدیحہ سے کہہ رکھا تھا کہ کسی طرح آج میں اس کمینے کو لانے کی کوشش کروں گی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس کے ہوشیار ہو جانے سے پہلے پہلے بہت کچھ کر لینا تھا۔

وہ مجھے اپنی بائیک پر مدیحہ کے اپارٹمنٹ تک لے آیا۔

ایک بات اور کہ مدیحہ اس اپارٹمنٹ میں صرف دو تین روز رہنے والی تھی۔ اس نے اپنا زیادہ تر سامان دوسرے اپارٹمنٹ میں شفٹ کر دیا تھا۔

اس کام کے انجام پاتے ہی وہ اپنا بوریا بستر باندھ کر وہاں سے روانہ ہو جاتی۔ ہم نے یہ احتیاطی تدابیر پہلے سے اختیار کر رکھی تھیں۔

''واہ۔'' سکندر نے ستائشی نگاہوں سے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری دوست تو بہت شاندار بلڈنگ میں رہتی ہے۔''

''ہاں اس کی پوسٹ بھی تو اچھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اپنی کمپنی میں مینیجر کا عہدہ ہے اس کا۔ ڈیڑھ لاکھ روپے سیلری ہے اس کی۔''

''کیا اس وقت وہ نہیں ہوگی۔''

''نہیں، وہ اپنی ڈیوٹی پر گئی ہوگی۔''

میں اسے لفٹ کے ذریعے مدیحہ کے اپارٹمنٹ تک لے آئی۔ جو چھٹی منزل پر تھا۔

ڈرائنگ روم میں صوفے اور کرسیاں وغیرہ رکھی تھیں۔ اس لیے اسے کوئی شک نہیں ہوا کہ یہ فلیٹ خالی ہونے والا ہے۔ مدیحہ میری ہدایت کے مطابق دوسرے کمرے میں چھپی ہوئی تھی۔

''اب تو یہ نقاب اتار دو۔''

''اوہو آرام سے بیٹھ تو جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''میں چائے نہیں پیتا۔''

''کیا میرے ہاتھ کی بھی نہیں پیو گے۔'' میں نے ایک لگاوٹ سے پوچھا۔

''اچھا یار۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''تم بھی کیا یاد کرو گی۔ جاؤ لے آؤ۔''

سب کچھ پہلے سے تیار تھا۔ صرف چائے بنانی تھی اور اس میں خواب آور سفوف ڈال دینا تھا۔ جب میں اس کے لیے چائے لے کر آئی تو وہ اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ نقاب ہٹا دو گی۔''

''ہاں مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ تم چائے پیو۔ میں اپنا

ڈریس چینج کر کے آتی ہوں۔ آج پہلی بار تمہارے سامنے آ رہی ہوں تو اپنے آپ کو ذرا ٹھیک تو کر لوں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ ہنس پڑا۔ "محبوب کے سامنے محبوبہ کو بالکل فٹ فاٹ رہنا چاہیے۔"

میں اس کمرے میں آئی جس میں مدیحہ بیٹھی ہوئی تھی۔

"اب تک سب ٹھیک چل رہا ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔ "تم پریشان مت ہونا۔"

پانچ منٹ کے بعد جب میں اس کمرے میں پہنچی تو وہ کمینہ مدہوش ہو چکا تھا۔ میں نے عام طور پر یہی سنا ہے کہ جو اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو بہت پوز بھی کرتے ہیں وہ عام طور پر عورت کے چکر میں آ کر بے وقوف بن جاتے ہیں۔

ان کی ساری طرم خانی دھری رہ جاتی ہے۔ جس طرح اس کے ساتھ ہوا تھا۔ میری دوستی کے شوق میں وہ خود اس جال میں آ کر پھنس چکا تھا۔

میں نے مدیحہ کو دوسرے کمرے سے بلوا لیا۔ میں نے ابھی تک اپنا برقع اور نقاب نہیں اتارا تھا۔ مدیحہ ڈوریاں لے آئی تھی۔ ہم دونوں نے اسے کس کر کرسی سے باندھ دیا اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگیں۔

اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے کچھ دیر بعد وہ کسمسا کر ہوش میں آ گیا تھا۔ کچھ دیر تک تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے کس حال میں ہے۔

مدیحہ نے میرے کہنے پر اپنے چہرے پر اس طرح نقاب ڈال رکھی تھی کہ اس کا چہرہ دکھائی نہ دے۔ سکندر نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن بندھے ہونے کی وجہ سے پھنس کر رہ گیا۔

"کیا ہے۔" وہ حلق پھاڑ کر چلّایا۔ "کون ہو تم دونوں کیوں باندھ رکھا ہے دھوکے باز عورت۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ "تو نے مجھے کیا پلا دیا تھا۔ کون ہو تم۔"

"میں وہی ہوں جس کا چہرہ دیکھنے کے لیے تو مرا جا رہا ہے۔" میں نے اپنا نقاب اتار دیا۔

مجھے دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گیا تھا۔ "کک......کون ہو تم؟"

"میں وہی ہوں، جس کے خوب صورت چہرے کو تو نے اس حال کو پہنچا دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "یاد ہے کہ بھول گیا۔"

"مع......معاف کر دو مجھے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔ "مجھے اس کی سزا تو ہو گئی۔"

"سزا کسی کی زندگی برباد کرنے کی سزا صرف تین مہینے۔ نہیں تیری سزا بھی وہی ہونی چاہیے جو تو نے میرے ساتھ کیا ہے۔"

میرے اشارے پر مدیحہ تیزاب کی بوتل اور ماسکنگ ٹیپ لے آئی تھی۔

"یہ سب کیا ہے۔" اس نے بوتل کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تیزاب۔" میں بے رحم ہو کر بولی۔ "ویسا ہی تیزاب جیسا تو نے میرے چہرے پر ڈالا تھا۔ اب ذرا تو بھی اس کی اذیت برداشت کر۔"

"نہیں تو میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی۔" وہ چلّانے لگا۔

میں نے اور مدیحہ نے اس کے منہ پر ماسکنگ ٹیپ لگا دی تھی۔ جس میں اس کی چیخیں گھٹنے لگی تھیں پھر ہم نے وہی کیا جو سوچ رکھا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دیا۔ اس کا تڑپنا خوں خوں کرنا یہ سب اچھی طرح یاد ہے مجھے۔

انتہائی کرب میں اس نے اپنی گردن ایک طرف ڈال دی۔ وہ یا تو مر چکا تھا یا بے ہوش ہو گیا تھا۔

پھر ہم اس فلیٹ سے نکل آئے۔ میں ایسی کوئی چیز چھوڑ کر نہیں آئی تھی جو مدیحہ پر روشنی ڈال سکتی۔ یا وہ کسی طرح پھنس جاتی۔

اور جہاں تک میرا سوال تھا تو میں تو اس کے سامنے تھی۔

وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا تھا۔ اس کی اطلاع دو دنوں بعد اس وقت ہوئی جب اس فلیٹ کو کھولا گیا۔ مدیحہ ٹریس کر لی گئی۔ لیکن میں نے صاف بتا دیا کہ اس جرم میں مدیحہ کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اس فلیٹ کی چابی میرے پاس رہتی تھی اور میں ہی سکندر کو گھیر کر وہاں تک لے گئی تھی۔ مدیحہ بے چاری کو تو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ اس کے فلیٹ میں کیا ہو رہا ہے۔

میرے بیان نے مدیحہ کو صاف بچا لیا تھا۔

لیکن مجھ سزا ہو گئی تھی۔ کیونکہ میں نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔

اب میرا پورے معاشرے سے ایک ہی سوال ہے کہ کیا میں نے کوئی غلطی کی ہے، کیا کسی لڑکی کی زندگی برباد کرنے والے کو ایسی ہی سزا نہیں ملنی چاہیے؟

محترم مدیر
سلام مسنون
ایک ایسی سچ بیانی ارسال کررہا ہوں جو کئی معنوں میں بالکل الگ انداز کی ہے۔ پوری دنیا کے لیے پیغام ہے۔ ماں بچوں کو کتنا چاہتی ہے اس کا بیان ہے۔ اُمید ہے قارئین کو پسند آئے گی۔

حسیب اشرف
(سیالکوٹ)

''السلام علیکم امی جان۔'' وہ کھانے کی میز پر آیا تو امی میز پر کھانا لگارہی تھیں۔
''وعلیکم السلام کیسا ہے میرا بچہ۔'' امی نے پیار سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

''امی جان میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں آپ صبح سویرے اٹھتی ہیں نماز پڑھتی ہیں اور پھر ہمارے لیے کھانا بنانے میں مصروف ہو جاتی ہیں اس کے بعد ہم سب تو نکل جاتے ہیں لیکن آپ پھر سے گھر کے کاموں میں مصروف ہو

جاتی ہیں۔ سارا دن کام کرنے کے بعد بھی نہ کبھی چہرے پر تھکن نظر آتی ہے اور نہ ہی زبان پر کوئی شکوہ جبکہ ہم تو صرف آٹھ گھنٹے کام کرتے ہیں پھر بھی تھک جاتے ہیں۔"

"بیٹا تم لوگ کام کرتے ہو اور میں اپنا فرض نبھاتی ہوں، انسان کام کرتے ہوئے تھک سکتا ہے لیکن فرض کبھی اسے تھکاتا نہیں بلکہ اسے اور ہمت دیتا ہے تاکہ وہ مزید اچھے طریقے سے اسے نبھا سکے۔" انہوں نے جگ سے جوس گلاس میں انڈیلا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امی لیکن آپ کو نہیں لگتا کہ اب آپ کی عمر ہو چکی ہے گویا وقت آ گیا ہے کہ آپ کھانا پکانے کی ذمے داری کسی اور کے حوالے کردیں۔"

"ہاں، تمہارے بابا نے کتنی بار کہا ہے کہ کک ہائیر کر لیتے ہیں لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ تم لوگوں کے لیے کوئی اور کھانا بنائے۔"

"میری پیاری امی جان میں کک کے بارے میں بات نہیں کر رہا بلکہ میں تو......"

سیڑھیوں سے آتے ہوئے عمار نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "واٹس اپ برو...... مجھے تو سمجھ ہی نہیں آتی کہ آپ دونوں اتنی جلدی کیسے اٹھ جاتے ہیں۔"

"لو آ گیا انگریز کہیں کا......" امی کو اس کی انگلش سے چڑ تھی۔

"سو مسٹر عمار آپ نے آج پھر نماز نہیں پڑھی۔" اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"یار بھائی کیا کروں لاکھ کوشش کے باوجود فجر کے وقت آنکھ نہیں کھلتی۔" عمار نے کندھے اچکا کر کہا۔

"آنکھ تب کھلے گی نا جب رات کو ٹائم پر سوؤ گے ساری ساری رات تو تم موبائل پر لگے رہتے ہو۔" امی کو اس کی یہ عادت بہت بری لگتی تھی۔

"ماما موبائل پر نہیں لگا رہتا بلکہ پڑھائی میں مصروف رہتا ہوں! آپ تو جانتی ہیں کہ اگلے مہینے میرے امتحان شروع ہونے والے ہیں اور رہی بات کل رات کی وہ تو میں مہوش بھابی سے بات کر رہا تھا۔"

"بیٹا اتنی بات تو تمہارا بھائی بھی اپنی منگیتر سے نہیں کرتا جتنی تم اس سے کرتے ہو۔"

"ارے ماما میں نے تو ایک اڑتی اڑتی خبر سنی تھی بس کنفرم کرنے کے لیے بھابی کو فون کیا تھا۔"

"کون سی خبر۔" محب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"علیزے بتا رہی تھی کہ آج شام ماما اور بابا مہوش بھابی کے گھر جانے والے ہیں شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے۔"

"یہ علیزے بھی نا، مجھے بہن کم اور نیوز کاسٹر زیادہ لگتی ہے۔"

"امی کیا واقعی آپ شادی کی بات کرنے والی ہیں؟" محب نے سوالیہ نگاہوں سے امی کی طرف دیکھا۔

"ہاں بیٹا، عون بھائی چاہتے ہیں کہ وہ اب بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں اور ویسے بھی اب ایک سال ہو گیا ہے تم دونوں کی منگنی کو اس لیے مزید دیر کرنا مناسب نہیں۔"

"ارے امی جان ابھی تو ایک مہینا ہوا ہے بھائی کو بابا کا بزنس جوائن کیے ہوئے۔ ابھی انہیں سیٹ ہو لینے دیں شادی ایک دو سال بعد ہو جائے گی۔" عمار نے محب کو چڑانے کی کوشش کی۔

"بیٹا کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن وہ کیا ہے کہ اب میں بوڑھی ہو گئی ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ مجھے اپنے تمام فرائض کسی اور کے حوالے کر دینے چاہیے۔" امی نے بھی اسی انداز میں کہا تو اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور آفس کے لیے نکل گیا۔

☆......☆......☆

"ہاں تم صرف پانچ منٹ انتظار کرو میں بس پہنچ رہا ہوں۔" وہ کان پر موبائل لگائے اپنے کیبن سے نکل کر مرکزی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"محب بیٹا کہاں جا رہے ہو، ہماری اتنی اہم میٹنگ ہونے والی ہے۔" بابا نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔

"جی بابا مجھے عمار کے کالج کی فیس ادا کرنی ہے، یہ بہت ضروری ہے، آپ پلیز میٹنگ اکیلے ہی دیکھ لیں۔" اس نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

"وہ اب بچہ تو نہیں ہے اپنا کام خود بھی کر سکتا ہے۔"

"اصل میں بابا مجھے اس کے پرنسپل سے بھی ملنا ہے تاکہ پتا چل سکے کہ وہ کالج میں پڑھائی بھی کرتا ہے یا بس کھیل کود میں ہی مصروف رہتا ہے۔" اس نے پھر سے بہانہ بنایا۔

"تو پرنسپل سے ملنے کی کیا ضرورت ہے تم مہوش سے پتا کر لو وہ بھی تو اسی کالج میں پڑھتی ہے۔"

"جی بابا مہوش سے بھی پتا کر لوں گا لیکن فی الحال پرنسپل صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں اس لیے مجھے اجازت

دیں۔ ''ایک جھوٹ چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔

''ٹھیک ہے جاؤ لیکن جلدی واپس آنا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' انہوں نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

''جی بابا......'' وہ جلدی سے اپنی گاڑی کی طرف لپکا۔

☆......☆......☆

اس نے ریسٹورنٹ میں داخل ہوکر ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ کونے کی میز پر بیٹھی تھی۔ اس نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''سوری سوری دیر سے آنے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔''

''اگر اتنے ہی مصروف تھے تو پہلے ہی بتا دیتے میں تھوڑی لیٹ آجاتی۔''

''میں تو کب کا آفس سے نکلنے کا سوچ رہا تھا لیکن کام کی وجہ سے وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور اب جب وقت ملا تو بابا نے روک لیا بڑی مشکل سے بہانہ بنایا کہ عمار کے کالج کی فیس ادا کرنی ہے۔''

''تو اب آپ کو میری وجہ سے بابا کے سامنے جھوٹ بھی بولنا پڑ رہا ہے۔'' اسے اس کا یوں جھوٹ بولنا ناگوار گزرا تھا۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں ان سے کہتا کہ میں ایک انتہائی ضروری میٹنگ چھوڑ کر مہوش سے ملنے جا رہا ہوں تو کیا وہ مجھے آنے دیتے۔''

''ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی جھوٹ بولنا بھی تو اچھی بات نہیں۔'' وہ جھوٹ کی وجہ سے افسردہ تھی۔

''تم فکر نہ کرو اب مزید جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ آج شام کو امی اور بابا تمہارے گھر جا رہے ہیں شادی کی تاریخ لینے کے لیے۔'' اس نے موڈ تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ خبر پہلے ہی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم نے تو میرے گھر میں تین تین جاسوس چھوڑے ہوئے ہیں جو تمہیں پل پل کی خبر دیتے ہیں۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''جاسوس نہیں، بہن بھائی ہیں میرے۔''

''آرڈر کیا ہے، مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

''ہاں کر دیا ہے آتا ہی ہوگا۔''

''Your order sir''۔ ویٹر نے کھانا میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''جزاک اللہ۔'' اس نے شکریہ ادا کیا۔

''بابا سوچ رہے ہیں کہ ایف ایس سی کے بعد عمار اور علیزے کو میڈیکل میں داخلہ دلوا دیں تمہارا کیا خیال ہے۔''

''اچھا ہے علیزے تو پڑھائی میں کافی انٹرسٹڈ ہے لیکن عمار کا کچھ پتا نہیں، میں نے کئی بار پوچھا اس سے لیکن وہ ہر بار ایک ہی جواب دیتا ہے کہ جو بھی کرنا ہے ایف ایس سی کے بعد ہی سوچوں گا۔'' اس نے کھانا پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ وہ چاہتا کیا ہے اپنے مستقبل کی تو اسے کوئی فکر ہی...... آہ......'' بات کرتے کرتے اچانک وہ کراہ اٹھا تھا۔

''کیا ہوا محب تم ٹھیک تو ہو۔''

''ہاں ٹھیک ہوں پتا نہیں ایک عجیب سا درد اٹھا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی کے نیچے تھوڑا دائیں طرف۔'' اس نے درد کی جگہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

''چلو اٹھو...... ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں اب...... تم بیٹھو کھانا کھاؤ۔''

''کیا واقعی تم ٹھیک ہو۔'' اس نے تسلی کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں یار ٹھیک ہوں تم بیٹھو کھانا کھاؤ۔'' اس نے درد کے مقام سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور کھانا کھانے لگا۔

☆......☆......☆

''تو آپ ہی بتایئے عون بھائی آپ کے خیال میں شادی کی کیا تاریخ رکھنی چاہیے۔'' مسز راحت نے پوچھا۔

''ارے بھابی میں نے کیا کہنا ہے، مہوش آپ ہی کی تو بیٹی ہے، آپ جب چاہیں اسے اپنے گھر لے جائیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' انہوں نے سامنے پڑی ٹرے میں سے چائے کا کپ اٹھایا۔

''تو پھر ٹھیک ہے میرے خیال سے اگلے مہینے کی دس تاریخ کو نکاح کی تقریب رکھ لیتے ہیں اور اس جمعہ چھوٹی سی تقریب کر لیتے ہیں۔'' راحت صاحب نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

''جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' عون صاحب نے بھی ان کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے کہا۔

''عون، مہوش کی شادی کے بعد تم بالکل اکیلے ہو جاؤ

گے اس لیے میری مانو تو تم بھی ہمارے ساتھ اسی گھر میں شفٹ ہو جاؤ۔"

"نہیں بھائی میں بھلا اپنی بیٹی کے گھر میں کیسے رہ سکتا ہوں۔" انہیں دنیا والوں کی بھی فکر تھی۔

"تمہارے بھائی کا گھر ہے۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے بھائی لیکن میں یہیں ٹھیک ہوں اور ویسے بھی اس گھر میں مہوش کی ماں کی بہت ساری یادیں ہیں اور میں ان کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔" انہوں نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور سامنے والی دیوار پر لگی تصویر کے پاس آ گئے۔

"پندرہ سال گزر چکے ہیں لیکن مریم کے لیے تمہاری یہ چاہت اور تڑپ ذرا بھی کم نہیں ہوئی۔" راحت صاحب بھی اٹھ کر ان کے پاس آ گئے۔

"آپ نہیں جانتے بھائی کیسے گزارے ہیں میں نے یہ پندرہ سال، مریم کی موت کے بعد تو ایسا لگتا تھا جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو، وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ بھابی نے مہوش کو سنبھال لیا ورنہ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالوں یا مہوش کو...... آپ لوگوں نے مشکل وقت میں نہ صرف اسے سنبھالا بلکہ آج اسے اپنے گھر کی بہو بھی بنا رہے ہیں اس لیے میں ہمیشہ آپ لوگوں کا احسان مند رہوں گا۔" انہوں نے مشکور نگاہوں سے بھابی کی طرف دیکھا۔

"کیسی غیروں والی باتیں کر رہے ہو، مہوش تمہاری ہی نہیں بلکہ ہماری بھی بیٹی ہے۔ ہم نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ یہ تو ہمارا فرض تھا۔" راحت صاحب نے کہا۔

"عون بھائی آپ ان سب باتوں کو چھوڑیں اور اب مہوش کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں ایک مہینا کیسے گزر جائے گا پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی میں کل سے ہی تیاریاں شروع کر دیتا ہوں۔" انہوں نے واپس صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں میری بات کو مذاق میں مت اڑا دینا۔ تم ہمارے ساتھ شفٹ ہو جاؤ۔" راحت صاحب نے ایک بار پھر سے انہیں منانے کی کوشش کی۔

"جی بھائی آپ فکر نہ کریں میں اس بارے میں ضرور سوچوں گا۔" عون صاحب نے سرسری سے انداز میں کہا اور پھر سے کپ اٹھا کر چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔

☆......☆......☆

امی بغیر دروازے پر دستک دیئے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ پیٹھ کے نیچے دائیں طرف ہاتھ رکھے درد سے ہانپ رہا تھا۔

"محب بیٹا کیا ہوا تم اس طرح ہانپ کیوں رہے ہو۔" وہ اسے اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"پتا نہیں امی عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے، درد کی ایک لہر سی اٹھ رہی ہے۔"

"تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا...... کب سے درد ہو رہا ہے۔"

"کبھی کبھی، ہلکا سا درد تو کافی پہلے سے ہوتا تھا لیکن کچھ دیر بعد اپنے آپ ہی ٹھیک ہو جاتا تھا اس لیے کبھی میں نے زیادہ ٹینشن نہیں لی لیکن آج تو ایسا لگ رہا ہے جیسے درد کا مقام پھٹنے والا ہے۔" درد کی شدت کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"اللہ نہ کرے بیٹا...... تم فکر مت کرو ہم ابھی اسپتال چلتے ہیں۔" انہوں نے اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"عمار...... عمار۔" انہوں نے بلند آواز میں پکارا پھر دروازے کی طرف.... چہرہ موڑ کر بولیں۔ "مجھے تو تمہارے بابا کہہ گئے تھے کہ محب رات کو دیر تک آفس میں کام کرتا رہا ہے اس لیے آج اسے ڈسٹرب نہ کرنا جب اٹھے گا تو آفس آ جائے گا اسی لیے میں تمہارے کمرے میں نہیں آئی لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ تمہاری اتنی طبیعت خراب ہے۔" وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئیں۔

"کیا ہوا ماما......" اریشہ بھاگتی ہوئی آئی۔

"اریشہ، عمار سے کہو گاڑی نکالے محب کی طبیعت خراب ہے، اسے اسپتال لے کر جانا ہے اور علیرے تم اپنے بابا کو فون کرو کہ وہ بھی جلدی سے اسپتال پہنچ جائیں۔"

"کیا ہوا بھائی آپ ٹھیک تو ہیں۔" عمار بھاگتا ہوا آیا۔

"فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو جلدی سے اسپتال چلو۔"

"ٹھیک ہے امی چلیں۔" عمار نے اسے سہارا دیا اور باہر لا کر گاڑی میں بٹھایا پھر وہ اسپتال کی طرف چل دیئے۔

☆......☆......☆

"بھابی کیا ہوا محب کو...... کیسی طبیعت ہے محب کی۔" مہوش اور اس کے بابا بھی اسپتال پہنچ چکے تھے۔

"پتا نہیں بھائی کیا ہوا، میں جب کمرے میں گئی تو وہ

کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا اسے بے چینی سی ہو رہی تھی۔ ''وہ نم آنکھوں سے اس کا حال بتا رہی تھیں۔

''فکر نہ کرو کچھ الٹا سیدھا کھا لیا ہوگا۔'' بابا نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اللہ کرے میرا بچہ جلدی سے صحت یاب ہو جائے۔''

''آپ فکر نہ کریں بھابی......انشاء اللہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔'' عون صاحب نے ان کی ہمت بندھائی۔

ڈاکٹر ایمرجنسی سے باہر آئے تو سب ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔

''اس وقت وہ ٹھیک ہیں ابھی ہم انہیں وارڈ میں شفٹ کر رہے ہیں پھر آپ لوگ ان سے مل سکتے ہیں۔''

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

''جی ڈاکٹر صاحب کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔'' راحت اور عون صاحب ڈاکٹر کے پاس آ گئے۔

''دیکھیں ہم نے تمام ضروری ٹیسٹ کر لیے ہیں انشاء اللہ جلد رپورٹ مل جائے گی جب تک رپورٹس نہیں آ جاتی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن میرے خیال سے محبت صاحب کو کڈنی کا ہی مسئلہ ہے۔'' انہوں نے اپنے تجربے کی بنا پر اندازہ لگایا۔

''لیکن ڈاکٹر ابھی کل تک تو وہ بالکل ٹھیک تھا پھر اچانک ایک رات میں ہی کڈنی کا مسئلہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' راحت صاحب کو ڈاکٹر کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اللہ کرے کہ یہ میرا وہم ہی ہو فی الحال باقی رپورٹس آنے کے بعد ہی پتا چلے گا کہ کیا مسئلہ ہے۔''

''جی ٹھیک ہے ہم رپورٹس کا انتظار کر لیتے ہیں۔'' عون صاحب نے ڈاکٹر سے کہا۔

☆......☆......☆

''جی ڈاکٹر صاحب آپ نے بلایا۔'' انہوں نے دروازے پر دستک دے کر اجازت طلب کی۔

''آیئے راحت صاحب میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ محبت کی رپورٹس آ گئی ہیں۔''

''جی ڈاکٹر صاحب سب خیریت تو ہے، کوئی مسئلہ تو نہیں۔''

''راحت صاحب مجھے یہ کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا لیکن کیا کریں حقائق بتانا ہمارا فرض ہے۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔'' ڈاکٹر کی باتیں ان کو پریشان کر رہی تھیں۔

''رپورٹس سے پتا چلا ہے کہ محبت کو کڈنی کا ہی مسئلہ ہے۔''

''کیا......یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر......'' انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''معاف کیجیے گا لیکن میں وہی کہہ رہا ہوں جو ان رپورٹس میں ہے۔'' ڈاکٹر نے پھر سے اپنی بات دہرائی۔

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کل تک تو وہ بالکل ٹھیک تھا پھر آج اچانک کڈنی کی بیماری......''

''میں نے آپ کو بتانے سے پہلے کئی بار رپورٹس کو چیک کیا ہے بلکہ دوسرے ڈاکٹرز سے بھی تصدیق کروائی ہے اور ان کا بھی یہی کہنا ہے۔''

''تو اب کیا حل ہے اس بیماری کا۔'' بالآخر انہوں نے محبت کی بیماری کو قبول کر لیا۔

''راحت صاحب......اس بیماری کا ٹرانسپلانٹ کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے اور ہمیں جتنی جلدی ہو سکے محبت کا ٹرانسپلانٹ کرنا ہوگا ورنہ......اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔''

''کڈنی ٹرانسپلانٹ......لیکن کیسے۔''

''ہمیں کسی ایسے ڈونر کو ڈھونڈنا ہوگا جو کڈنی دینے کو تیار ہو پھر اس کے گھر والوں سے اجازت لے کر ہم اس کا گردہ محبت کو لگا سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے سارا طریقہ کار سمجھایا۔

''کیا آپ کی نظر میں ایسا کوئی شخص ہے؟''

''اس وقت تو نہیں لیکن میں کوشش کر رہا ہوں آپ بھی کوشش کریں باقی جو اللہ کو منظور۔'' ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر......کیا میں......محبت کو گھر لے جا سکتا ہوں۔'' ان کی آواز رندھ چکی تھی۔

''جی فی الحال آپ اسے لے جا سکتے ہیں میں نے کچھ دوائیاں لکھ دی ہیں آپ وہ ٹائم پر دیتے رہیں اور اسے ریگولر چیک اپ کے لیے بھی آنا ہوگا۔''

''جی......ٹھیک ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے لڑکھڑا گئے۔

''راحت صاحب حوصلہ کیجیے آپ کمزور ہو گئے تو محبت کو کون سنبھالے گا۔'' ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر انہیں سنبھالنے کی کوشش کی۔

''شکریہ......میں ٹھیک ہوں۔'' وہ ڈگمگاتے قدموں سے کیبن سے باہر نکل آئے۔

☆......☆......☆

''گڈ مارننگ......تو جناب ابھی تک سو رہے ہیں۔'' وہ کمرے میں آئی تو وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔

''گڈ مارننگ......اچھا ہوا مہوش تم آ گئیں، میں تو بور ہو گیا ہوں آرام کر کر کے۔''

''طبیعت کیسی ہے۔'' اس نے کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹایا۔

''ٹھیک ہوں چلو نا کہیں باہر چلتے ہیں۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ناشتا کر لیا۔''

''باہر ہی کر لیں گے۔'' اس نے بستر سے نیچے اترنے کی کوشش کی۔

''ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے کہ باہر کی کوئی چیز نہیں کھانی اس لیے ناشتا کر لو پھر کچھ دیر کے لیے باہر چلتے ہیں۔''

''یار نہ تم لوگ مجھے باہر جانے دیتے ہو نہ کوئی چیز کھانے دیتے ہو جیسے کوئی بہت بڑی بیماری ہو گئی ہو۔ معمولی سا درد ہی تو ہے۔''

''جانتی ہوں معمولی سا درد ہے لیکن ابھی ٹھیک تو نہیں ہوا نا جب ٹھیک ہو جائے گا پھر جو دل کرے وہی کرنا لیکن تب تک ہماری مان لو۔''

''مہوش تم لوگ مجھے ایسے کیوں ٹریٹ کر رہے ہو، کہیں کوئی سیریس بات تو نہیں ہے۔'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

''نہیں......کوئی سیریس بات نہیں ہے۔''

''تم سچ کہہ رہی ہو۔'' اس کی نگاہوں میں بدستور حیرت تھی۔

''پہلے کبھی تم سے جھوٹ بولا ہے......تم فریش ہو جاؤ میں ناشتا لے کر آتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

☆......☆......☆

راحت صاحب آفس سے آتے ہی صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئے۔

''اب کیسی طبیعت ہے محب کی۔''

''بظاہر تو ٹھیک ہے لیکن ہر وقت یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے اس لیے میں اسے کہیں باہر بھی نہیں جانے دیتی......پتا نہیں ہمارا یہ ڈر کب ختم ہوگا۔'' فاطمہ بیگم بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

''جب تک اس کا ٹرانسپلانٹ نہیں ہو جاتا۔''

''تو کب ہوگا یہ ٹرانسپلانٹ؟''

''جب تک کسی ڈونر کا انتظام نہیں ہو جاتا۔'' راحت صاحب نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے کہیں پتا بھی کیا ہے یا صرف ڈاکٹروں کے بھروسے ہی بیٹھے ہیں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو فاطمہ، کیا مجھے اپنے بیٹے کی زندگی پیاری نہیں ہے۔'' وہ اس بات سے زچ ہو گئے تھے۔

''تو پھر ابھی تک آپ نے کچھ کیا کیوں نہیں۔''

''کیا کروں کچھ سمجھ نہیں آرہا ہر جگہ سے پتا کر لیا ہے لیکن اس وقت کوئی بھی ڈونر موجود نہیں ہے۔''

''تو...... اس کا مطلب...... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔'' انہوں نے نم آنکھوں سے راحت صاحب کی طرف دیکھا۔

''اللہ تعالیٰ سے دعا کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اگلے مہینے......اس کی شادی......''

''میں عون سے بات کر لوں گا ابھی کچھ وقت کے لیے شادی والے معاملے کو بھول جانا ہی بہتر ہے۔'' راحت صاحب نے ان کی بات کاٹ کر اپنا فیصلہ سنایا۔

☆......☆......☆

''علیزے......کیا ہوا تم آج اسکول نہیں گئیں۔'' عمار اپنے کمرے سے باہر آیا تو وہ ہال میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

''نہیں گھر میں جو حالات ہیں ان کی وجہ سے پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔'' علیزے نے ریموٹ سے ٹی وی بند کرتے ہوئے کہا۔

''اچھے برے حالات تو زندگی کا حصہ ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم لوگ اپنے روزمرہ کے کام چھوڑ دیں۔'' عمار نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ چھین کر دوبارہ ٹی وی آن کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو عمار لیکن ہمارے دماغ میں ہر وقت محب بھائی کا خیال رہتا ہے، کتنے خوش تھے ہم لوگ ان کی شادی کی خبر سن کر مگر اچانک یہ مرض لاحق ہو گیا ہے۔''

''علیزے......تمہیں تو یہ سمجھ ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آزمائشوں کے ذریعے اپنے پیارے بندوں کا امتحان لیتا ہے اور اگر وہ ایک مصیبت میں ڈالتا ہے تو اس سے نکلنے کے لیے ہزار راستے بھی کھول دیتا ہے اس لیے اب یوں اداس بیٹھنے کی بجائے پڑھائی پر توجہ دو۔'' عمار نے اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر کہا۔

''عمار بھائی ٹھیک تو ہو جائیں گے؟''

''انشاء اللہ بہت جلد لیکن جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتے تب تک ہمیں ان کا بہت خیال رکھنا ہے اس لیے تم جاؤ اور محبّ بھائی کے پاس بیٹھو تب تک میں مہوش بھابی کو ان کے گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔''

''بھائی خوش قسمت ہیں جو انہیں مہوش جیسی بیوی مل رہی ہے، کتنا خیال رکھتی ہے وہ بھائی کا۔''

''ہاں یہ بات تو ہے وہ واقعی بھائی کا بہت خیال رکھ رہی ہیں۔'' عمار نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اللہ ان کی یہ محبت ہمیشہ سلامت رکھے۔'' عملیز نے ان دونوں کو دعا دیتے ہوئے کہا۔

''آمین۔''

☆......☆......☆

''مہوش پہلے تو جب ہم اس پارک میں آتے تھے تمہیں بہت اچھا لگتا تھا پھر آج کیا ہوا تم اتنی پریشان کیوں ہو......؟'' اس کے چہرے پر چھائی ہوئی اداسی دیکھ کر اس سے پوچھے بنا رہا نہ گیا۔

''کل بڑے پاپا کا فون آیا تھا بابا کو کہ وہ ہماری شادی کو پوسپونڈ کر رہے ہیں۔''

''ہاں یہ تو بہت ہی اچھا ہے......اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔'' محبّ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟''

''مہوش تم اچھی طرح جانتی ہو یار کہ اس وقت مجھے کڈنی کا مسئلہ ہے پتا نہیں میں ٹھیک ہو بھی سکتا ہوں یا......''

مہوش نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ ''اللہ سے اچھی امید رکھو معمولی سا درد ہے اور تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔''

''اب تم لوگوں کو مزید جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے میں نے اپنی رپورٹس اپنے دوست جو کہ ایک اسپیشلسٹ ہے اس کو دکھائی ہے اس نے مجھے بتا دیا ہے کہ ٹرانسپلانٹ کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔'' محبّ کے منہ سے یہ سب سن کر اس نے اپنا سر شرم سے جھکا دیا۔

''تمہیں تو جھوٹ سے سخت نفرت تھی پھر بھی پچھلے کتنے دنوں سے تم اتنی صفائی سے جھوٹ بول رہی تھیں کیوں......؟''

''سوری لیکن میں تو یہ سب تمہارے لیے کر رہی تھی۔''

''ایک بیمار شخص سے بھی جھوٹ بولنا اتنی ہی غلط بات ہے جتنی ایک تندرست انسان سے۔''

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے اس لیے مہوش نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

''اگر تم جھوٹ بولنے کی بجائے مجھے یہ کہہ دیتیں کہ میں مرنے والا......'' اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ کہتا مہوش نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

''اللہ نہ کرے کہ تمہیں کچھ ہو......انشاء اللہ بہت جلد ڈونر ارینج ہو جائے گا۔''

''سچ بتاؤ مجھے کیوں نہیں بتایا۔'' اس نے معنی خیز نظروں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

''کیونکہ میں یہ جانتی تھی کہ اگر تمہیں یہ سب پتا چل گیا تو پھر تم بھی شادی کی تاریخ کو آگے بڑھانے کا کہو گے۔''

''فرض کرو کہ شادی ہو جاتی ہے پھر اگر کڈنی کا ارینج نہیں ہوا تو......''

''تم ہمیشہ منفی کیوں سوچتے ہو۔'' اس نے جائزہ لینے والی نگاہوں سے محبّ کی طرف دیکھا۔

''میں صرف وہی سوچ رہا ہوں جو نظر آ رہا ہے۔''

''تم کیا سوچتے ہو مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا میں نے تو بابا سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ شادی مقررہ تاریخ پر ہی ہوگی اور وہ آج شام کو تمہارے گھر آ رہے ہیں بڑی امی اور بڑے پاپا سے اسی سلسلے میں بات کرنے۔'' اس نے اپنا فیصلہ سنایا اور گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھیک ہے پھر گھر چلتے ہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' محبّ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور وہ دونوں باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

☆......☆......☆

''راحت صاحب محبّ کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' اس وقت ڈاکٹر راحت صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے وہ راحت صاحب کے قریبی دوستوں میں تھے اس لیے وہ ہر روز آ کر محبّ کو چیک کر لیتے تھے۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ڈاکٹر۔''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں راحت صاحب اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے جلد سے جلد محبّ کا ٹرانسپلانٹ ہو جانا چاہیے ورنہ ہم اسے نہیں بچا سکیں گے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''میں کیا کروں ڈاکٹر میں ہر جگہ پتا کر چکا ہوں لیکن کوئی ارینج نہیں ہو رہا۔'' راحت صاحب کے لہجے سے ان کی بے بسی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

''میں نے بھی کافی جگہ رابطہ کیا ہے اور میرے ایک دوست کے اسپتال میں ایک ایسا مریض ہے لیکن اس کے گھر والے نہیں مان رہے۔''

''تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے ڈاکٹر کس طریقے سے ہم اس کے گھر والوں کو منا سکتے ہیں۔''

''وہ لوگ کافی غریب ہیں تو اگر ہم اس کے گھر والوں کو دو تین لاکھ روپے دے دیں تو اُمید ہے کہ وہ راضی ہو جائیں گے۔'' ڈاکٹر نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''دو تین لاکھ تو کیا میں دس لاکھ دینے کے لیے بھی تیار ہوں آپ انہیں ہر حال میں راضی کریں ڈاکٹر۔'' راحت صاحب نے کہا۔

''میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا راحت صاحب آپ بےفکر رہیے۔''

''السلام علیکم۔'' عون صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' ڈاکٹر اور راحت صاحب نے ایک ساتھ جواب دیا۔

''آؤ عون سب خیریت تو ہے۔'' راحت صاحب نے اس وقت آنے کی وجہ دریافت کی۔

''جی بھائی سب خیریت ہے مجھے آپ سے اور بھابی سے ایک ضروری بات کرنی ہے اسی سلسلے میں آیا ہوں۔''

''ہاں ٹھیک ہے میں ڈاکٹر صاحب کو دروازے تک چھوڑ کر آتا ہوں تب تک تم بیٹھو۔''

''نہیں شکریہ راحت صاحب آپ اپنے مہمانوں کو اٹینڈ کریں میں چلتا ہوں۔''

''شکریہ ڈاکٹر صاحب۔'' راحت صاحب نے ڈاکٹر کو رخصت کرتے ہوئے کہا پھر مڑ کر بولے۔ ''آؤ بیٹھو عون سب خیریت تو ہے۔''

''جی بھائی سب خیریت ہے آپ یہ بتایئے کڈنی کا کوئی انتظام ہوا؟'' انہوں نے راحت صاحب کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں ابھی تک تو کچھ نہیں لیکن ڈاکٹر نے ایک جگہ بات کی ہوئی ہے اُمید ہے کہ انشاء اللہ ضرور وہاں سے ڈونر مل جائے گا۔''

''چلیں اللہ کرے کہ سب کچھ جلد سے جلد ٹھیک ہو جائے۔''

''السلام علیکم ......عون بھائی۔'' مسز راحت نے سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام بھابی اچھا ہوا آپ بھی آگئیں اصل میں مجھے آپ دونوں سے محب اور مہوش کی شادی کے بارے میں بات کرنی ہے۔'' انہوں نے اپنے آنے کی اصل وجہ بیان کی۔

''یار میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ جب تک ٹرانسپلانٹ نہیں ہو جاتا شادی نہیں ہوگی۔''

''بھائی سب چاہتے ہیں کہ شادی اپنے مقررہ وقت پر ہی ہو۔''

''عون تم جانتے ہو کہ اس وقت گھر میں جو ماحول ہے اس میں کوئی بھی اس شادی کو انجوائے نہیں کر پائے گا اس لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے اور فرض کرو کہ اللہ نہ کرے اگر کڈنی کا ارینج نہ ہوا اور ہم محب کو نہ......'' وہ کہتے کہتے رُک گئے تھے۔

''اللہ نہ کرے......یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔'' اس طرح کی بات سن کر مسز راحت کا دل دہل گیا تھا۔

''بھابی مہوش کا کہنا ہے کہ وہ ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار ہے۔''

''حد ہوتی ہے پاگل پن کی اور مجھے تو اس سے زیادہ تم پر غصہ آرہا ہے تم اسے سمجھانے کی بجائے یہاں آگئے ہو مجھے اس کا فیصلہ سنانے۔'' راحت صاحب غصے سے بولے۔

''جب میں نے کہہ دیا ہے کہ یہ شادی ٹرانسپلانٹ کے بعد ہی ہوگی تو بس بعد میں ہی ہوگی اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور جا کر بتا دینا مہوش کو کہ اس گھر میں پہلے بھی فیصلے میں ہی کرتا تھا اور آگے بھی میں ہی کروں گا۔'' راحت صاحب نے سخت لہجے میں کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

☆......☆......☆

وہ ایک ضروری میٹنگ میں موجود تھے لیکن موبائل اسکرین پر چمکتا ہوا نمبر دیکھ کر انہوں نے میٹنگ روک دی اور فون کو اپنے کان سے لگا لیا۔

''جی ڈاکٹر صاحب میں آپ کے ہی فون کا انتظار کر رہا تھا۔'' انہوں نے جلدی سے کہا۔

''جی مجھے بہت افسوس ہے راحت صاحب ......لیکن اس ڈونر کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''تو کیا آپ نے اس کا......'' انہوں نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں راحت صاحب اس کے گھر والے ڈونیٹ کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوئے۔''

''تو کیا آپ نے انہیں پیسوں کی آفر نہیں کی تھی......؟''

''جی میرے دوست نے پیسوں کی بات کی تھی لیکن ان لوگوں نے ڈونیٹ کی اجازت نہیں دی اور میت کو دفن کر دیا۔'' ڈاکٹر نے تمام تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اب ہم کیا کریں گے ڈاکٹر صاحب......''

''میں معذرت خواہ ہوں راحت صاحب لیکن اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے دعا کریں کہ جلد سے جلد کڈنی کا انتظام ہو جائے۔''

''کیا ہوا بھائی آپ کس سے بات کر رہے تھے اور اتنے پریشان کیوں ہیں......؟'' منیجر صاحب نے ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر پوچھا۔

''ڈاکٹر کا فون تھا۔'' انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''اچھا تو پھر......کیا کہا ڈاکٹر نے؟''

''وہ کہہ رہا تھا کہ جس شخص کی کڈنی ہم محب کو لگانے والے تھے اس کا انتقال ہو گیا ہے۔'' انہوں نے کرسی پر تھکے ہوئے شخص کی طرح بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا......تو اب......ہم کیا کریں گے؟''

''دعا کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔'' انہوں نے چہرہ چھت کی طرف کر لیا اور آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

''السلام علیکم۔'' وہ کمرے میں داخل ہوئی تو مسز راحت الماری سے کپڑے نکال رہی تھیں۔

''وعلیکم السلام......آؤ مہوش خیریت تو ہے تم اتنی صبح صبح۔''

''جی بڑی امی مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''ہاں تو کہو تمہیں بات کرنے کے لیے کب سے اجازت لینے کی ضرورت پڑ گئی۔'' انہوں نے الماری بند کر دی اور قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''بڑی امی آپ پلیز بڑے پاپا کو ہماری شادی کے لیے راضی کریں۔'' اس نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور منت سماجت کرنے لگی۔

''مہوش، عون بھائی بھی ان سے اس بارے میں بات کر چکے ہیں لیکن انہوں نے صاف صاف منع کر دیا ہے کہ جب تک ٹرانسپلانٹ نہیں ہو جاتا یہ شادی نہیں ہوگی۔'' انہوں نے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

''میں جانتی ہوں کہ بڑے پاپا نے بابا کی بات نہیں مانی پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ آپ انہیں راضی کریں۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''مہوش بیٹا تم تو اپنے بڑے پاپا کو جانتی ہو کہ جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر وہ کسی کی نہیں سنتے اور ویسے بھی اب کیا بات کرنی ہے مقررہ وقت میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔''

''بڑی امی ایک ہفتے میں سارا انتظام ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں۔''

''مہوش بیٹا ضد نہ کرو تمہیں اس وقت سمجھ نہیں آ رہی لیکن اسی میں تمہاری بہتری ہے۔''

''لیکن جو میں کہہ رہی ہوں اسی میں میری خوشی ہے اور کیا آپ میری خوشی کے لیے میری اتنی سی بات نہیں مان سکتیں۔'' بالآخر اس نے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری خوشی کے لیے تمہاری زندگی برباد نہیں کر سکتی شاید تمہیں پتا نہیں ہے کہ جس ڈونر کا گردہ ہم محب کو لگانے والے تھے اس کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ اب تو ڈاکٹر نے بھی صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر اس مہینے میں محب کا آپریشن نہ ہوا تو ہم......'' وہ کہتی کہتی رُک گئی تھیں۔

''میں جانتی ہوں اور میں آپ کو یہی بتانے آئی تھی کہ میں نے محب کے لیے ڈونر کا انتظام کر لیا ہے۔''

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو کون ہے وہ ڈونر......؟'' یہ سن کر اداس چہرے پر عجیب سی خوشی چھا گئی تھی۔

''یہ میں آپ کو ابھی نہیں بتا سکتی اگر آپ چاہتی ہیں کہ محب کو ڈونر ملے تو آپ کو میری بات ماننی ہوگی۔''

''مہوش......تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔'' انہوں نے اس کی خاموشی سے اندازہ لگا لیا تھا۔

''پاگل نہیں ہوں بڑی امی......دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''

''مہوش تمہیں ہوش بھی ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔'' انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

''بڑی امی میں پورے ہوش میں ہوں، محب کے آپریشن میں ایک مہینا ہے اور میں اس ایک مہینے میں اپنی پوری زندگی اس کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں اس کے بعد مجھے موت کا بھی کوئی غم نہیں۔'' اس نے دیوانگی کی حد کر دی تھی۔

''اگر تم اپنی کڈنی دے کر اسے بچا بھی لو تو بھی وہ تمہاری قربانی کا سن کر مر جائے گا۔''

’’مجھے یقین ہے کہ آپ اسے سنبھال لیں گی۔‘‘ اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

’’مہوش تم ہمت کیوں ہار رہی ہو انشاء اللہ جلد ہی کچھ ہو جائے گا۔‘‘ مسز راحت کو دیوانگی کی یہ باتیں سمجھ نہیں آرہی تھیں۔

’’بڑی امی کب تک آپ جھوٹی آس لگا کہ بیٹھی رہیں گی ہر گزرتا ہوا لمحہ محب کو موت کے قریب لے جا رہا ہے اور میں اسے یوں اپنی نظروں کے سامنے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔‘‘

’’کچھ نہیں ہوگا محب کو اور نہ ہی تمہیں کچھ ہوگا اگر اللہ نے چاہا تو میرے سب بچے ایک ساتھ خوشحال زندگی گزاریں گے۔‘‘ انہوں نے اسے گلے سے لگا کر حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

☆......☆......☆

’’آپ سوئے نہیں ابھی تک۔‘‘

’’کب سے کوشش کر رہا ہوں لیکن نیند ہی نہیں آتی۔‘‘ انہوں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

’’محب کی وجہ سے۔‘‘ انہوں نے پریشانی کی وجہ سے اندازہ لگا لیا تھا۔

’’بیگم تم جانتی ہو کہ ایک ماں کی محبت اور ایک باپ کی محبت میں کیا فرق ہوتا ہے؟‘‘

’’ماں باپ اپنی اولاد سے ایک جیسا ہی پیار کرتے ہیں بھلا فرق کیسے ہو سکتا ہے۔‘‘

’’ہوتا ہے بیگم فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک ماں اپنی محبت کا اظہار کر لیتی ہے لیکن باپ اپنی محبت کو اپنے غصے میں چھپائے رہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا یہ غصہ ہے جو اس کی اولاد کو غلط راہ پر چلنے سے بچائے گا۔‘‘ انہوں نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دے دیا۔

’’ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ واقعی جب کوئی بچہ غلطی کرتا ہے تو اس کی ماں کہتی ہے کہ آلینے دو تمہارے پاپا کو پھر دیکھنا وہ کیسے تمہاری خبر لیتے ہیں۔‘‘ انہوں نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

’’باپ کا یہی ڈر ہوتا ہے جو بچے کے دماغ میں رہتا ہے اور پھر جب بھی وہ کوئی غلط کام کرنے لگتا تو یہی ڈر اسے روکتا ہے لیکن افسوس کہ اپنا ڈر قائم رکھتے رکھتے اسے کبھی اپنی اولاد سے محبت کا اظہار کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا اور اس کے سارے جذبات اس کے دل میں ہی رہ جاتے ہیں۔‘‘

’’آپ نے اظہار نہ بھی کیا ہو لیکن آپ کے بچے پھر بھی جانتے ہیں کہ آپ ان سے کتنی محبت کرتے ہیں۔‘‘ انہوں نے راحت صاحب کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

’’بیگم میں نے بھی یہ سوچا تھا کہ جو وقت میں محب کے ساتھ نہیں گزار سکا انشاء اللہ وہ اس کے بچوں کے ساتھ گزاروں گا لیکن افسوس......‘‘ راحت صاحب کی آنکھوں سے اچانک آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

’’یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو...... جتنا میں آپ کو جانتی ہوں چاہے جیسے بھی حالات آئے ہوں آپ تو ہمیشہ باہمت رہے ہیں پھر آج یوں بچوں کی طرح کیوں رو رہے ہیں۔‘‘ یہ حالت دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئی تھیں۔

’’بیگم میں نے ساری زندگی بہت سے مشکل حالات دیکھے ہیں اور بہت ہی ہمت سے ان کا سامنا بھی کیا ہے لیکن اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس عمر میں اپنے جوان بیٹے کی موت دیکھوں۔‘‘

’’انشاء اللہ آپ یہ غم نہیں دیکھیں گے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے وہ اگر ایک دروازہ بند کرتا ہے تو سو اور دروازے کھول بھی دیتا ہے۔‘‘

’’راحت اب یوں رونا بند کیجیے محب کے لیے کڈنی کا ارینج ہو گیا ہے۔‘‘

’’کیا، یہ تم سچ کہہ رہی ہو؟‘‘ راحت صاحب کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

’’جی میں سچ کہہ رہی ہوں میں نے محب کے لیے اپنی ایک فرینڈ سے بات کی تھی اس کے بھائی ایک بڑے اسپتال میں ڈاکٹر ہیں اور وہاں ایک مریض ہے جس کی کڈنی محب کے کام آسکتی ہے۔‘‘ مسز راحت نے تمام تفصیل بتا دی تھی جسے سُن کر راحت صاحب کو بھی حوصلہ ملا تھا۔

’’بقول ڈاکٹر ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کا وقت ہے۔‘‘

’’آپ پریشان نہ ہوں آپ کو ایک مہینے سے پہلے پہلے گردہ مل جائے گا بس آپ ڈاکٹر سے کہہ دیں کہ وہ اپنی تیاری پوری رکھے کسی بھی وقت آپریشن کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔‘‘

’’اللہ تیرا شکر ہے۔‘‘ راحت صاحب نے چھت کی طرف نگاہیں کر کے دعا مانگنے کے سے انداز میں کہا۔

’’کیا آپ میری ایک بات مانیں گے۔‘‘

’’بیگم تم نے جو خبر سنائی ہے اس کے بدلے چاہے جان مانگ لو۔‘‘ راحت صاحب نے کہا۔

''اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ محب اور مہوش کی شادی کی جو تاریخ ہم نے رکھی تھی اسی تاریخ پران دونوں کی شادی کردی جائے۔'' مسز راحت نے بھی موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بات منوانی چاہی۔

''یہ بات تو ہم پہلے بھی کر چکے ہیں اور میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ جب تک ٹرانسپلانٹ نہیں ہو جاتا یہ شادی نہیں ہوگی۔'' راحت صاحب اپنی ضد پر قائم تھے۔

''پہلے کی بات اور تھی لیکن اب تو ڈونر بھی مل گیا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد محب کا ٹرانسپلانٹ بھی ہو جائے گا اور آپریشن کے بعد اسے کافی ٹائم لگ جائے گا دوبارہ سے صحت مند ہونے میں اور ایسی صورت میں اس کی بیوی اس کا بہتر خیال رکھ سکتی ہے۔''

''یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن آج تین تاریخ ہے اور دس تاریخ کو شادی اتنی ساری تیاریاں اتنے کم دنوں میں تم یہ سب کیسے کروگی؟'' انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے مسز راحت کی طرف دیکھا۔

''آپ اس کی فکر نہ کریں آپ اور عون بھائی مہمانوں اور کارڈ وغیرہ کا انتظام کرلیں باقی شاپنگ اور گھر کی تیاریاں میں اور میرے بچے مل کر کرلیں گے اور ویسے بھی پچھلے کچھ دنوں سے وہ سب بہت پریشان ہیں اسی بہانے بچے بھی خوش ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' بالآخر انہوں نے اجازت دے ہی دی۔

''شکریہ۔'' مسز راحت نے تشکر بھری نگاہوں سے راحت صاحب کی طرف دیکھا۔

''شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے آج تمہاری وجہ سے میں کتنے دنوں بعد چین کی نیند سو سکوں گا۔''

''ٹھیک ہے آپ سو جائیں، رات کافی ہوگئی ہے صبح جلدی اٹھنا ہے۔'' انہوں نے لائٹ بند کردی اور سونے کے لیے تیار ہوگئے۔

☆......☆......☆

''ارے تم دونوں ابھی تک سو رہی ہو گھر میں اتنے سارے کام ہیں کرنے والے۔''

''کیا ہے عمار اتنی صبح صبح کیوں تنگ کر رہے ہو جاؤ یہاں سے سونے دو ہمیں۔''

''کیا بات ہے یہ تو کمال ہو گیا ہمارے گھر کی نیوز کاسٹر جس کو پورے گھر کی خبر سب سے پہلے ہوتی تھی آج

ابن حسن جارچوی

ممتاز عالم دین۔ ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ایم اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے اور بی ٹی کی ڈگری علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ 1930ء میں سکھر میں جو شیعہ کانفرنس منعقد ہوئی اس میں انہوں نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس کی صدارت شمس العلماء مرزا خلیج بیگ نے کی تھی۔ علامہ جارچوی 1931ء سے 1938ء تک جامعہ ملیہ دہلی میں استاد رہے۔ 1938ء میں انہیں راجا محمود آباد کو دینی تعلیم دینے کا فریضہ سونپا گیا۔ بعدازاں وہ شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ 1945ء کرپس مشن کے سامنے پیش ہوئے تاکہ برصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے نظریے کی وضاحت کرسکیں۔ 1951ء میں بھارت سے پاکستان چلے آئے۔ ان کی کوششوں سے کراچی میں انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ ریسرچ بھی قائم ہوا۔ ایک درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔

ناصر حسین زیدی، کراچی

اسے اتنی بڑی خبر کا پتا ہی نہیں چلا۔''

''کون سی خبر......'' اس نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

''گھر میں محب بھائی کی شادی کی تیاریاں چل رہی ہیں۔''

''کیا......'' یہ سن کر اس کی آنکھیں فٹ سے کھل گئی تھیں۔ ''لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے بابا نے تو منع کردیا تھا کہ جب تک بھائی کا آپریشن نہیں ہو جاتا شادی بھی نہیں ہوگی اور ابھی تو کوئی ڈونر بھی نہیں ملا۔'' اسے عمار کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''ڈونر مل گیا ہے اسی لیے تو بابا نے شادی کی اجازت دے دی ہے۔''

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو کہاں سے ملا ڈونر۔'' یہ سن کر وہ بھی خوش ہوگئی۔

''امی کی کوئی فرینڈ ہے ان کے بھائی کے اسپتال میں کوئی مریض ہے جس کی کڈنی بھائی کو لگے گی۔'' اس نے تمام تر تفصیل بتادی تھی۔

''لیکن بھائی وہ مریض اپنی کڈنی بھائی کو کیوں دے گا۔'' اریشہ نے بھی معصومیت بھرے انداز میں سوال کیا۔

''اریشہ میری پیاری سی ڈول......'' اس نے بہن کو اٹھا

کر اپنی بانہوں میں بھرلیا۔ ''ہم سب کو کس نے پیدا کیا ہے۔''
''اللہ تعالیٰ نے۔''
''زندگی اور موت کس کے ہاتھ میں ہے۔''
''اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں۔'' وہ بھی تیز تیز جواب دے رہی تھی۔
''تو بس یوں سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے محب بھائی کی زندگی کا فیصلہ کیا ہے۔ ابھی تم دونوں فریش ہو کر نیچے آجاؤ امی ناشتے کے لیے تم دونوں کا انتظار کر رہی ہیں۔''

☆......☆......☆

''السلام علیکم امی جان......'' اس نے احتراماً ہاتھ چوم کر کہا۔
''وعلیکم السلام......آج کتنے دنوں بعد تم سب سے پہلے ناشتے کے لیے آئے ہو۔''
''یہ میں کیا سن رہا ہوں بابا نے شادی کے لیے اجازت دے دی۔'' محب نے ناشتے کے لیے بیٹھنے سے پہلے ہی سوال داغ دیا۔
''ہاں......سن تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن لگتا ہے کہ تمہیں یہ جان کر خوشی نہیں ہوئی۔'' انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے محب کی طرف دیکھا۔
''ایسی بات نہیں ہے لیکن مجھے بس تجسس ہو رہا تھا کہ راتوں رات ایسا کیا ہو گیا کہ بابا نے اپنا فیصلہ ہی تبدیل کر دیا۔'' محب نے کرسی پیچھے کی طرف کھینچی اور اس پر براجمان ہو گیا۔
''بس سمجھ لو کہ میں نے ان سے درخواست کی اور وہ مان گئے۔'' انہوں نے جوس گلاس میں ڈال کر اسے پیش کیا۔
''اور یقیناً یہ درخواست آپ نے مہوش کے کہنے پر ہی کی ہوگی۔'' اب کی بار سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے کی اس کی باری تھی۔
''ایسی بات نہیں ہے بیٹا اصل میں پچھلے کچھ دنوں سے گھر کا ماحول کچھ ڈسٹرب تھا اور میرے خیال سے یہ موقع ہے دوبارہ سے خوشیاں بکھیرنے کا۔''
''ٹھیک ہے امی جان اگر آپ کو ایسا لگتا ہے تو یہی سہی۔'' اس نے جوس کا سپ بھرتے ہوئے کہا۔
''مبارک ہو بھائی جان۔'' عمار نے پیچھے سے آکر اس کی کمر پر ہاتھ مارا۔
''کیا بات ہے آج تو عمار صاحب بھی اتنی صبح صبح اٹھ گئے ہیں۔''
''میں ہی کیا آج تو سب جلدی اٹھ گئے ہیں۔''
''اچھا......کیوں؟''
''کیونکہ آپ کی شادی کی تیاریاں بھی تو کرنی ہیں۔'' کمرے میں داخل ہوتی علیزے نے کہا۔
''لیکن اس سے پہلے آج پارٹی ہوگی۔'' اریشہ نے محب کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''کوئی پارٹی نہیں ہوگی......یہ پارٹی شارٹی بھائی کے آپریشن کے بعد ہوگی ابھی چپ چاپ ناشتا کرو اور اسکول جاؤ اور علیزے تم مہوش کو فون کر دو تم دونوں میرے ساتھ چلو گی بہت ساری شاپنگ کرنی ہے اور عمار تم بھی ساتھ چلے جانا۔'' انہوں نے ایک ہی سانس میں سب کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔
''بھائی مجھے اسکول نہیں جانا بلکہ آپ کے ساتھ جانا ہے۔'' اریشہ نے عمار کے کان میں سرگوشی کی۔
''امی جان اریشہ کو بھی جانے دیں ہمارے ساتھ وہ بھی کچھ شاپنگ کر لے گی۔''
''ٹھیک ہے لیکن زیادہ تنگ نہیں کرنا بھائی کو......'' انہوں نے اریشہ کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔
''نہیں کروں گی......'' اس نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔
''چلو باتیں بعد میں کر لینا ناشتا شروع کرو۔''

☆......☆......☆

آج کے دن سب لوگ پریشانیاں بھول کر شادی کے ماحول سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔
شادی کے لیے خوب تیاریاں کی گئی تھیں پورے شہر کے نامور لوگ شادی میں شرکت کے لیے موجود تھے۔
''کتنے خوش لگ رہے ہیں دونوں ایک ساتھ۔'' امی نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''وہ تو خوش لگ ہی رہے ہیں لیکن ان سے زیادہ تو تم خوش لگ رہی ہو۔'' راحت صاحب نے شوخی بھری نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''خوش کیوں نہیں ہوں گی میرے بیٹے کی شادی ہے۔'' انہوں نے بھی کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔
''تو کچھ خوشی دوسرے بچوں کے لیے بھی بچا کر رکھو کل کو ان کی بھی شادی کرنی ہے۔''
''آپ جانتے ہیں میں نے اس شادی کے لیے اتنی ساری تیاریاں کیوں کی ہیں وہ اس لیے کہ میں اپنے سارے

بچوں کی شادیوں کے ارمان آج ہی پورا کرنا چاہتی تھی کیا پتا کل ہو نہ ہو۔" انہوں نے حسرت بھری نگاہوں سے محبت اور مہوش کی طرف دیکھا۔

"بیگم یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو، اگر اللہ نے چاہا تو ہم دونوں ساتھ مل کر اپنے بچوں کی ہی کیا بلکہ ان کے بچوں کی بھی خوشیاں دیکھیں گے۔" راحت صاحب نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"امی جان بابا جان چلیں اسٹیج پر سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں فیملی فوٹو کے لیے۔" عقب سے علیزے نے آواز دی۔

"ہاں بھئی چلو......" بابا سے اجازت ملنے کی دیر تھی علیزے نے ان دونوں کے ہاتھ پکڑے اور اسٹیج کی طرف چل دی۔

☆......☆......☆

"صبح صبح اتنا تیار ہونے کی کیا ضرورت تھی میں تو پہلے ہی مریض ہوں اگر مجھے ہارٹ اٹیک ہو جاتا تو۔" وہ شیشے کے سامنے تیار ہو رہی تھی کہ محبت نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اس سے زیادہ تیار تو میں شادی والے دن ہوئی تھی اس دن اٹیک نہیں ہوا تو اب کیا ہوگا۔" مہوش نے کہا۔

"اچھا تو اس کا مطلب ہے مجھے اٹیک ہونے سے تمہیں خوشی ہوگی۔"

"یہ صبح صبح کس بات پہ بحث چل رہی ہے۔" امی نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"کچھ نہیں امی ہم نیچے ہی آرہے تھے۔"

"اچھا ٹھیک ہے آجاؤ ہم سب تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔" وہ مڑ کر جانے لگیں تو مہوش نے روک لیا۔

"محبت تم چلو مجھے بڑی امی سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔

"شکریہ بڑی امی......آپ نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی ہے۔" اس نے احتراماً ہاتھ چوم کر کہا۔

"اس میں شکریہ والی کون سی بات ہے یہ تو ہم سب ہی چاہتے تھے کہ تم ہمارے گھر کی بہو بنو۔"

"محبت سے شادی میرا خواب تھا جو پورا ہو گیا اب چاہے موت بھی آجائے کوئی غم نہیں۔"

"موت آئے تمہارے دشمنوں کو......اللہ تمہیں لمبی زندگی عطا کرے تاکہ تم اپنے شوہر کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار سکو۔" انہوں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھ کے پیالے میں بھر لیا۔

"میں صرف دس دن محبت کے ساتھ خوشی خوشی گزارنا چاہتی ہوں اس کے بعد آپ جب چاہیں آپریشن کے لیے ڈاکٹر سے بات کر سکتی ہیں۔" اس کی آنکھوں کی نمی اس کے رخسار پر آگئی تھی۔

"مہوش ایک بات تو بتاؤ؟"

"جی پوچھیے بڑی امی۔" اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یاد ہے تم کتنے سال کی تھیں جب مریم کی موت ہوئی تھی؟" انہوں نے جائزہ لینے والی نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

"مجھے تو کچھ یاد نہیں ہے لیکن پاپا بتاتے ہیں کہ میں پانچ سال کی تھی جب ماما کی وفات ہوئی تھی۔"

"تمہاری ماما کی وفات کے بعد تمہاری پرورش کس نے کی تھی؟"

"آپ نے بڑی امی اور کس نے......لیکن یہ سب آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔" اس سوال پر وہ چونک گئی تھی۔

"کیا تمہیں کبھی ایسا محسوس ہوا ہے کہ میں نے تم میں اور علیزے میں کوئی فرق کیا ہو۔" انہوں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں بڑی امی بلکہ میں تو دس سال کی عمر تک آپ کو ہی اپنی امی سمجھتی رہی تھی۔ وہ تو بعد میں بابا نے بتایا کہ آپ میری امی نہیں بلکہ بڑی امی ہیں۔"

"پھر تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے اپنی بیٹی کی جان قربان کردوں گی۔" اسے ساری بات کی سمجھ آگئی تھی اور اس نے شرمندگی سے اپنا سر جھکا لیا۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ ایسا نہیں کرنا چاہتیں ......لیکن اس کے علاوہ اور کوئی حل بھی تو نہیں ہے۔"

"ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔ وہ جب اپنے کسی بندے کو ایک مشکل میں ڈالتا ہے تو اس مشکل کے حل کے سو اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے لیکن وہ ہماری نظر کی کمزوری ہوتی ہے کہ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔"

"مجھے آپ کی باتوں سے ایسا لگ رہا ہے جیسے محبت کے لیے کڈنی مل گئی ہے میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ نے میری

ضد کی وجہ سے یہ بات کہی ہے۔"

"بچے ضد کرتے ہی ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا، تم نے چاہے مجھے اپنی ماں سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی بیٹی مانا ہے اور میں کوئی بھی ایسا فیصلہ نہیں کروں گی جس سے تمہیں کوئی تکلیف ہو۔" آج پہلی بار وہ اس لہجے میں مہوش سے بات کر رہی تھیں۔

"ایسی بات نہیں ہے میں نے ہمیشہ آپ کو اپنی امی ہی سمجھا ہے۔ وہ تو میں بس محب کی وجہ سے اس دن پتا نہیں کیا کہہ گئی۔ آپ پلیز مجھے معاف کر دیں۔" اس نے فوراً اپنی غلطی کی معافی مانگ لی۔

"جو ہونا تھا سو ہو گیا ابھی ان سب باتوں کے بارے میں مت سوچو اور اپنی زندگی کو انجوائے کرو۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بڑی امی آنے والے کل کی فکر میں ہمیں اپنا آج ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

"اچھا اب باتیں بہت ہو گئی ہیں جلدی سے نیچے چلو سب لوگ کھانے کی میز پر ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"جی چلیے......" اس نے جلدی سے اپنا حلیہ درست کیا اور ان کے ساتھ چل دی۔

☆......☆......☆

"امی جان آپ نے بلایا تھا۔" محب امی کے کمرے میں آیا تو وہ صوفے پر بیٹھ کر پرانی تصویریں دیکھ رہی تھیں۔

"آؤ محب بیٹا میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" انہوں نے البم بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"امی خیریت تو ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی؟" وہ ان کے سامنے دوزانوں ہو گیا۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا بس سر میں تھوڑا سا درد ہے۔" انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"امی آپ کی آنکھیں دیکھ کر لگتا ہے جیسے آپ رو رہی تھیں سب ٹھیک تو ہے۔" اس نے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں سب ٹھیک ہے وہ بس کل تم لوگ یہاں سے جا رہے ہو نا یہی سوچ کر آنکھ بھر آئی۔"

"ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں حیرت عیاں تھی۔

"محب تم تو جانتے ہو کہ ڈاکٹر کے بقول تمہارا آپریشن اسی مہینے میں ہونا ضروری ہے ورنہ اگلے مہینے سے تمہاری طبیعت خراب ہونا شروع ہو جائے گی اور ویسے میں نے بھی جہاں متبادل کڈنی کے لیے بات کی وہاں سے کسی وقت بھی فون آ سکتا ہے اس لیے کل ہی تم اور مہوش اسلام آباد والے گھر جا رہے ہو۔" انہوں نے ساری تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گی؟"

"نہیں بیٹا تم تو جانتے ہو مجھے اسپتال سے ویسے ہی گھبراہٹ ہوتی ہے اس لیے میں تو نہیں آ سکوں گی لیکن دو یا تین دن بعد تمہارے بابا وہاں آ جائیں گے۔"

"امی میری زندگی کا اتنا بڑا آپریشن ہونے جا رہا ہے مجھے وہاں آپ کی ضرورت پڑے گی۔" اس نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا۔

"تم پریشان نہ ہو میری دعائیں ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں۔" انہوں نے پیار سے اس کا ماتھا چوم کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

"لیکن پھر بھی اگر آپ وہاں ہوں گی تو مجھے بھی ہمت ملے گی۔"

"محب تم تو جانتے ہو کہ عمار کے امتحان ہونے والے ہیں اور علیزے اور اریشہ بھی کافی دنوں سے اسکول نہیں جا رہی ہیں اس لیے میرا یہاں رہنا زیادہ ضروری ہے اب ضد نہ کرو اور جاؤ جا کر تیاری کرو۔"

"ٹھیک ہے امی جیسا آپ کا حکم۔" اس نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور فرماں بردار بیٹے کی طرح حکم مان لیا۔

☆......☆......☆

"محب اور مہوش تو اسلام آباد پہنچ گئے ہیں لیکن آپ کب جا رہے ہیں؟" انہوں نے چائے کا کپ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کا کیا مطلب ہے کیا تم نہیں جا رہی میرے ساتھ۔" راحت صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"راحت صاحب صرف محب ہی نہیں بلکہ یہ تینوں بھی میرے ہی بچے ہیں اور ان کو بھی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔"

"ہاں تو ان کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔" راحت صاحب نے ایک آسان سا حل پیش کیا۔

"نہیں پہلے ہی ان کی پڑھائی کا بہت نقصان ہو گیا ہے اب مزید چھٹیاں مناسب نہیں اس لیے آپ چلے جائیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے......بیگم ویسے ابھی تک کسی کا فون

نہیں ہے۔" راحت صاحب نے چائے کا سپ بھرتے ہوئے کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں راحت صاحب آپ بے فکر ہو جائیے انشاء اللہ ایک دو دن تک کڈنی آپ کے پاس اسلام آباد پہنچ جائے گی۔" انہوں نے بھی چائے کا سپ بھرا۔

"یہ کون سی سہیلی ہے جس کی بات پر تمہیں اتنا پکا یقین ہے۔"

"میری بچپن کی دوست ہے خود بھی ڈاکٹر ہے اور وہ اسپتال بھی اس کے بھائی کا ہے جہاں محب کا آپریشن ہوگا۔"

"یہ تو بتاؤ اس ڈاکٹر کا۔" راحت صاحب نے ایک اور سپ بھرا۔

"میری سہیلی کا نام تو فریحہ ہے لیکن میرے خیال سے جو ڈاکٹر محب کا آپریشن کرے گا اس کا نام ڈاکٹر جہانگیر ہے۔" انہوں نے تمام تر تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں کل جاتے ہی اس سے مل لوں گا۔" انہوں نے جواب دیا اور پھر وہ دونوں چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔

☆......☆......☆

وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھیں کہ اچانک فون کی گھنٹی کی آواز سے گھبرا کر اٹھ گئی۔

"ہیلو......" انہوں نے فون اپنے کان سے لگایا۔

"بڑی امی میں مہوش..." دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ہاں مہوش بولو تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"بڑی امی اچانک درد شروع ہو گیا ہے ہم اسے اسپتال لے کر آئے ہیں ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ اب مزید دیر کیے بغیر محب کا آپریشن کرنا ہوگا ورنہ اس کی جان بچانا مشکل ہو جائے گی۔" اس نے روتے ہوئے تمام تفصیل بتائی۔

"تم پریشان مت ہو انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا میرے بیٹے کو۔"

"بڑی امی آپ اپنی دوست سے پتا کریں کہ ڈونر کی کیا صورت حال ہے اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔"

"ٹھیک ہے تم پریشان مت ہو میں اس سے رابطہ کرتی ہوں۔" انہوں نے کال بند کی اور موبائل سے نمبر ملا کر کان پر لگایا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆......☆......☆

"مہوش کیا تمہاری فاطمہ سے بات ہوئی ہے میں کب سے کال کر رہا ہوں لیکن وہ فون ہی نہیں اٹھا رہی۔" اسپتال

اگر ہوائی جہازوں کے ڈیزائن کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلے گا کہ 1950 اور 1954 تک ہوائی جہازوں کی کھڑکیاں گول نہیں بلکہ چوکور ہوتی تھیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پھر انہیں تبدیل کر کے گول کیوں کیا گیا؟ فیڈرل ایوی ایشن ایڈمنسٹریشن (ایف اے اے) اور جہاز بنانے والے انجینئرز اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ چوکور کھڑکیوں کی وجہ سے جہاں جہاز کی لمبائی میں اضافہ ہوتا ہے، وہیں ان کھڑکیوں سے جہاز میں ہوا کا دباؤ برقرار رکھنا مشکل بن جاتا ہے۔ ایف اے اے کی تحقیق کے مطابق 1953 اور 1954 میں برطانیہ سمیت دیگر ممالک کے طیاروں کے تباہ ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان کی کھڑکیاں چکور تھیں، جس وجہ سے طیاروں میں ہوا کے دباؤ کا توازن برقرار نہیں رہ سکا اور وہ حادثے کا شکار ہو گئے۔ جہاز بنانے والے انجینئرز نے 1954 کے آخر تک طیاروں کے ڈیزائن تبدیل کر کے ان میں گول کھڑکیاں لگانا شروع کر دیں، جن کے استعمال سے جہاں جہاز کی طوالت کم ہوئی، وہیں یہ کھڑکیاں ہوا کا دباؤ برقرار رکھنے میں بھی مددگار ثابت ہوئیں۔ ایف اے اے کے مطابق چکور کے مقابلے گول کھڑکیاں ہوائی جہاز کے لیے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں، ان کے گول ہونے کی وجہ سے یہ کمزور نہیں ہوتیں، اور جہاز کے اندر ہوا کا توازن برقرار رہتا ہے۔ جہاز کی گول کھڑکیوں میں ایک گول سیاہ لکیر ہوتی ہے، جو جہاز کے اندر ہوا کے توازن کو برقرار رکھنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔

مرسلہ: ثمینہ خانم۔ ملتان

کے کوریڈور میں کھڑے راحت صاحب نے موبائل پر کہا۔

"جی بڑے پاپا میری رات کو بات ہوئی تھی بڑی امی سے وہ اپنی فرینڈ کے اسپتال جانے والی تھیں۔"

"پتا نہیں کب آپریشن ہوگا۔"

"راحت صاحب مبارک ہو گردہ مل گیا ہے ابھی آپ اس پیپر پر اپنے دستخط کر دیں تاکہ ہم جلد سے جلد آپریشن شروع کر سکیں۔" ڈاکٹر جہانگیر نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیا......آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" ان

کا چہرہ ایک دم سے کھل گیا تھا۔
''جی میں سچ کہہ رہا ہوں آپ جلدی سے سائن کر دیں تا کہ ہم اپنا کام شروع کریں۔'' ڈاکٹر نے پھر سے اپنی بات دہرائی۔
''لیجیے میں نے سائن کر دیے ہیں۔'' انہوں نے سائن کر کے کاغذ لوٹا دیے۔
''بہت شکریہ......اب آپ لوگ دعا کریں انشاء اللہ اللہ نے چاہا تو ہم کامیاب ہوں گے۔''
''انشاء اللہ۔'' ڈاکٹر پہلے سے ہی تیار بیٹھے تھے اجازت ملتے ہی وہ آپریشن تھیٹر میں داخل ہو گئے اور آپریشن شروع کر دیا۔

☆......☆......☆

ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ ان کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں پچھلے پانچ گھنٹے سے ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں گھسے ہوئے تھے، انتظار کا ایک ایک لمحہ ان پر بھاری تھا۔
''مبارک ہو راحت صاحب اللہ تعالیٰ نے ہمیں کامیابی عطا فرمائی اور ہم محبت کے آپریشن میں کامیاب رہے۔'' ڈاکٹر جہانگیر کے چہرے سے فتح کے تاثرات واضح تھے۔
''بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔'' انہوں نے خوشی سے ڈاکٹر کو گلے لگا لیا۔
''میں ابھی یہ خوشخبری بڑی امی کو سناتی ہوں۔'' اس نے موبائل سے نمبر ملایا اور کان کے ساتھ لگا کر انتظار کرنے لگی لیکن دوسری طرف سے نمبر بند جا رہا تھا۔
''کیا ہوا......؟''
''پتا نہیں بڑے پاپا ابھی بھی نمبر بند جا رہا ہے۔''
''گھر والے نمبر پر کال کرو۔''
''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے پھر سے نمبر ملایا اور فون کان کے ساتھ لگا لیا۔
''السلام علیکم......'' دوسری طرف سے آنے والی مردانہ آواز سے صاف پتا چلتا تھا کہ فون عمار نے اٹھایا تھا۔
''وعلیکم السلام......عمار میں مہوش۔''
''جی بھابی کیسی ہیں آپ اور محبت بھائی کی طبیعت کیسی ہے۔''
''تمہارے لیے اچھی خبر ہے محبت کا آپریشن کامیاب ہو گیا ہے اور وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔''
''اللہ کا شکر ہے۔'' اس نے آسمان کی طرف نگاہیں کر کے بلند آواز میں کہا۔
''اچھا بڑی امی کہاں ہیں میں کب سے ان کا نمبر ملا رہی ہوں۔'' مہوش نے دیر کیے بغیر سوال کیا۔
''امی تو کل رات ہی اسلام آباد کے لیے نکل گئی تھیں میں نے ساتھ چلنے کو کہا تو کہنے لگیں کہ تم یہیں علیزے اور اریشہ کے پاس رکو۔''
''کیا......کل رات سے۔'' اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔
''کیوں کیا ہوا......کیا ابھی تک امی آپ سے نہیں ملیں۔''
''نہیں میں تو کل سے اسپتال میں ہی ہوں، اچھا میں سمجھ گئی بڑی امی کو اسپتال سے ڈر لگتا ہے نا اس لیے وہ گھر چلی گئی ہوں گی تم پریشان مت ہو میں گھر جا کر ان سے مل لیتی ہوں۔'' اس نے بات ختم کر دی۔
''ٹھیک ہے جب ان سے ملیں تو مجھے کال کر لینا اریشہ بار بار امی کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔''
''ٹھیک ہے اللہ حافظ۔'' اس نے موبائل بند کر کے بڑے پاپا کی طرف دیکھا۔
''میں گھر جا کر دیکھتا ہوں۔''
''بڑے پاپا رک جائیں بابا گھر پر ہی ہیں میں ان سے پوچھ لیتی ہوں۔'' جیسے ہی وہ مڑ کر جانے لگے تو مہوش نے پیچھے سے آواز دی۔
''ہاں ٹھیک ہے پھر جلدی سے رابطہ کرو۔''
''جی......'' اس نے پھر سے نمبر ملایا اور موبائل کان سے لگا کر انتظار کرنے لگی۔
''السلام علیکم......''
''بابا بڑی امی گھر پر ہیں کیا......'' اس نے سلام کے جواب کا انتظار کیے بغیر سوال پوچھا۔
''نہیں بیٹا میں تو صبح سے گھر پر ہی ہوں بھابی تو یہاں نہیں آئیں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔
''کیا اگر گھر پر بھی نہیں ہیں تو پھر کہاں جا سکتی ہیں؟'' اس نے پریشانی میں سر پکڑ لیا۔
''کیا ہوا سب خیریت تو ہے۔'' اس کی بات سن کر عون صاحب بھی پریشان ہو گئے تھے۔
''جی بابا بڑی امی کل رات گھر سے نکلی ہیں یہاں اسلام آباد آنے کے لیے لیکن ابھی تک یہاں نہیں پہنچیں۔''
''تو بھائی سے کہو کہ ڈرائیور کو کال کریں یقیناً بھائی

"بیٹے وہ ساتھ لے کر ہی گئی ہوں گی کیونکہ بھابی کو تو گاڑی چلانا نہیں آتی۔" عون صاحب نے اپنے خیال کے مطابق حل پیش کیا۔

"ٹھیک ہے بابا۔"

"بڑے پاپا ڈرائیور کو کال کریں......" اس نے فون بند کیا ساتھ ہی بڑے پاپا کو کال کرنے کا کہا۔

"ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو تم میں ابھی کال کرتا ہوں۔"

"ہیلو...... احمد کہاں ہو تم۔" پریشانی میں سلام دعا کا ہوش بھی نہیں تھا۔

"جی سر میں تو گھر پہ ہی ہوں۔"

"گھر پہ کیا کر رہے ہو تم تو فاطمہ کو لے کر اسلام آباد آنے والے تھے۔"

"جی سر میں تو گھر پر ہی ہوں اور مجھے کسی نے بھی اسلام آباد جانے کا نہیں کہا اور بیگم صاحبہ کو تو صبح سے میں نے دیکھا ہی نہیں۔" ڈرائیور نے ساری صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"گاڑی کہاں ہے؟"

"سر گاڑی تو یہیں گیراج میں کھڑی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے بے دلی سے فون بند کیا اور وہیں ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے۔

"بڑے پاپا کیا کہا ڈرائیور نے؟"

"وہ گاڑی لے کر نہیں گئی۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

تبھی موبائل پر ایک انجان نمبر سے آنے والی کال کو دیکھ کر انہوں نے موبائل کان سے لگایا۔

"کیا میں راحت صاحب سے بات کر سکتی ہوں۔" دوسری طرف سے آنے والی آواز کسی عورت کی تھی۔

"جی بول رہا ہوں۔"

"راحت صاحب میں ڈاکٹر فریحہ بات کر رہی ہوں ......فاطمہ کی دوست۔"

"جی ڈاکٹر صاحبہ کہیے۔" نام سنتے ہی انہوں نے پہچان لیا تھا۔

"راحت صاحب مجھے آپ سے فاطمہ کے بارے میں بات کرنی ہے" ڈاکٹر نے بھی مزید تعارف کی بجائے مدعے کی بات کی۔

"کیا فاطمہ کے بارے میں لیکن اس کا تو کچھ پتا نہیں کہاں ہے وہ......"

خواتین کا عالمی دن

1975ء میں میکسیکو میں عالمی خواتین کی جو پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں پہلی بار دنیا بھر کی منتخب خواتین کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ ایک جگہ پر اکٹھی ہو کر پوری دنیا میں عورتوں کے حقوق کی بات کر سکیں، چونکہ خواتین کا ایک اجتماع 8 مارچ کو ہوا تھا اس لیے اس نسبت سے دنیا بھر میں خواتین کا یہ عالمی دن منایا جاتا ہے۔

خواتین کانفرنس

ارکان اسمبلی کی دسمبر 2002ء کو اس وقت کے صدر مملکت جنرل پرویز مشرف نے خواتین ارکان اسمبلی کو قانون سازی اور اسمبلی کی کارروائی میں اپنا فعال کردار ادا کرنے کے حوالے سے خواتین کانفرنس کا اسلام آباد میں افتتاح کیا۔ اس کا اہتمام وزارت ترقی خواتین سماجی بہبود اور خصوصی تعلیم نے کیا۔ کانفرنس میں ملک بھر کی تمام سیاسی جماعتوں کی منتخب 72 ارکان قومی وصوبائی اسمبلیوں نے حصہ لیا۔ سابق صدر نے اس موقع پر کہا تھا کہ خواتین ارکان اسمبلی عورتوں کے متعلق قانون سازی کے وقت واچ ڈاگ کا فنکشن ادا کریں اور اس امر کو یقینی بنائیں کہ آئندہ پاکستان میں خواتین کے مفاد کے خلاف قانون نہیں بنے گا نیز وہ اسمبلی کے اندر اپنی طاقت کو مجتمع کریں اور اپنے حقوق کے لیے اکٹھی ہو کر لڑیں، دنیا کی پارلیمنٹس میں خواتین ارکان کی تعداد ساڑھے سترہ فیصد ہے لیکن پاکستان میں اوسطاً 20 فیصد خواتین رکن ہیں۔ اسی دور میں پاکستان آرمی کی تاریخ میں پہلی بار ایک خاتون ڈاکٹر میجر جنرل کے عہدے پر پہنچیں۔ عدالتوں میں زیادہ سے زیادہ خواتین ججز کو لایا گیا۔

مرسلہ: صادق بخاری، کوٹ ادو

''جی میں جانتی ہوں راحت صاحب آپ جتنی جلدی ہوسکے لاہور آجائیں مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''کیا فاطمہ لاہور میں ہے ہم سب تو اسے اسلام آباد میں ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''جی راحت صاحب فاطمہ یہی ہے میرے پاس لیکن جتنی جلدی ہوسکے آپ یہاں آجائیں۔''

''سب خیریت تو ہے ڈاکٹر۔'' انہیں ڈاکٹر کی باتوں سے پریشانی کا اندازہ ہوگیا تھا۔

جی فی الحال میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی آپ جتنی جلدی ہوسکے لاہور آجائیں۔ میں اسپتال کا ایڈریس آپ کو میسج کر رہی ہوں۔'' ڈاکٹر نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور راحت صاحب نے موبائل جیب میں رکھا اور جلدی سے گاڑی کی طرف ہولیے۔

☆......☆......☆

''جی سر کس سے ملنا ہے آپ کو۔'' جیسے ہی وہ اسپتال کے اندر داخل ہوئے تو ریسپشنسٹ نے ان سے سوال کیا۔

''مجھے ڈاکٹر فریحہ سے ملنا ہے۔'' بھاگتے ہوئے آنے کی وجہ سے وہ ہانپ رہے تھے۔

''آپ یہاں سے سیدھے چلے جائیں آگے جا کر دائیں طرف مڑتے ہی پہلا آفس ڈاکٹر فریحہ کا ہی ہے۔'' ریسپشنسٹ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے راستہ بتایا۔

ریسپشنسٹ کے بتائے ہوئے راستے سے گزرتے ہوئے جیسے ہی دروازے پر پہنچے تو دستک دیئے بغیر ہی اندر چلے گئے۔

''ڈاکٹر، فاطمہ کیسی ہے؟''

''آیئے راحت صاحب میں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی۔''

''فاطمہ کہاں ہے۔'' انہوں نے پھر سے اپنی بات کو دہرایا۔

''آیئے میرے ساتھ۔'' ڈاکٹر انہیں اپنے ساتھ لے کر اسپیشل وارڈ کی جانب چل پڑی۔

☆......☆......☆

''مہوش دو ہفتے ہوگئے ہیں میرے آپریشن کو لیکن ابھی تک اریشہ کے علاوہ گھر سے کوئی بھی مجھے ملنے نہیں آیا سب ٹھیک تو ہے۔'' اسے فکر ہونے لگی تھی۔

''ہاں سب ٹھیک ہے میری کچھ دیر پہلے ہی علیزے سے بات ہوئی ہے۔'' مہوش نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''اچھا تو تم ہی میری بات کروادو امی سے میرا بہت دل چاہ رہا ہے ان سے بات کرنے کا۔''

''امی تو یہاں نہیں ہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے نکل گیا۔

''کیا مطلب یہاں نہیں ہے۔'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

''میرا مطلب ہے کہ وہ پاکستان میں نہیں ہیں بلکہ لندن گئی ہوئی ہیں خالہ کے پاس۔''

''تو کیا وہ اریشہ کو ساتھ لے کر نہیں گئیں؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

''نہیں خالہ کی طبیعت زیادہ خراب تھی اس لیے بڑی امی اریشہ کو میرے پاس چھوڑ کر گئیں ہیں۔''

''میرے موبائل میں خالہ کا نمبر ہے تم ایسا کرو کہ میرے موبائل سے لندن فون کرو مجھے امی سے بات کرنی ہے۔'' وہ اپنی بات پر بضد تھا۔

''تمہارا موبائل تو کافی دنوں سے گھر پڑا ہوا ہے ابھی میں گھر جاؤں گی تو آتے وقت لے آؤں گی۔''

''مہوش مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو کیونکہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ اتنے دن گزر گئے ہوں اور امی نے مجھ سے ایک بار بھی بات نہ کی ہو۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو محب بڑی امی نے تو کافی بار فون کیا ہے لیکن تم سو رہے تھے اور ڈاکٹر نے تمہیں ڈسٹرب کرنے سے منع کیا تھا اس لیے تم سے بات نہیں ہو پائی۔'' وہ بھی اپنی بات پر ڈھٹائی سے قائم تھی۔

''اگر اب امی کا فون آئے تو بے شک میں سویا بھی ہوا ہوں تو مجھے اٹھا دینا۔'' بالآخر اس نے تھک ہار کر مان ہی لیا۔

''اچھا ٹھیک ہے اب زیادہ باتیں نہ کرو اور آرام کرو تمہارے اسٹیچز کچے ہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' اس نے آنکھیں بند کیں اور پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

''اریشہ کہاں ہے۔'' گھر آتے ہی اس نے اریشہ کے بارے میں پوچھا۔

''کل صبح ڈرائیور آیا تھا تو میں نے اریشہ کو اس کے ساتھ لاہور بھیج دیا تھا۔''

''اس کا مطلب کہ امی آگئیں ہیں لندن سے اسی لیے تو

ہمیں نے اریشہ کو واپس بلا لیا ہے۔'' اس نے خود سے ہی نتیجہ نکالیا۔

''ہوں۔'' اس نے کچھ نہ کہنا ہی مناسب سمجھا۔

''مہوش سامان پیک کرو ہم بھی گھر جا رہے ہیں۔'' اس نے چونک سے فیصلہ کیا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے ابھی تو اسپتال سے آئے ہیں۔''

''ایک مہینا ہو گیا ہے مجھے اسپتال میں پڑے ہوئے اور تم کہہ رہی ہو کہ جلدی کیا ہے۔'' وہ زچ ہو گیا تھا۔

''میں تو کہہ رہی ہوں کہ ایک مہینے سے آپ بستر پر رہے ہیں اس لیے ابھی کچھ دن گھومتے پھرتے ہیں تاکہ آپ کا موڈ بھی فریش ہو جائے گا۔''

''اس وقت میرا بالکل بھی سیر سپاٹے کا دل نہیں چاہ رہا میں بس اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔''

''لیکن محب......'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے مہوش کی بات کاٹ دی تھی۔

''مہوش سمجھنے کی کوشش کرو پچھلے ایک مہینے سے میں نے اپنی فیملی کو نہیں دیکھا میں ترس گیا ہوں ان کو دیکھنے کے لیے۔''

''اچھا ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ جان چکی تھی کہ اب بحث بیکار ہے۔

☆......☆......☆

وہ لوگ واپس لاہور آ رہے تھے سارے راستے وہ دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے، مہوش کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ محب سے کیا کہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اسے بعد میں پتا چلا تو اسے زیادہ دکھ ہوگا۔

''محب میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' جیسے ہی ڈرائیور نے گاڑی گھر کے سامنے روکی تو بالآخر اس نے ہمت جتائی۔

''بعد میں ابھی میں پہلے سب سے ملنا چاہتا ہوں۔'' وہ جلدی سے گاڑی سے اترا اور مرکزی دروازے کی طرف ہو لیا۔

''السلام علیکم......'' وہ مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوا تو علیزے کو اپنے سامنے دیکھ کر کہا۔

''محب بھائی۔'' علیزے کی نظر اس پر پڑی تو بھاگتی ہوئی اس سے لپٹ گئی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''کیا ہوا علیزے تم رو کیوں رہی ہو۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

حمیدہ بیگم (اکبر کی ماں)

مؤرخین انہیں مریم مکانی کے لقب سے یاد کرتے ہیں جو اکبر کی طرف سے انہیں عطا ہوا تھا۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں اس کے بڑے بڑے القابات لکھے ہیں۔ مثلاً قدوۃ طاہرات، اسوۃ زاہرات۔ حمیدہ بیگم خاموش طبیعت اور گوشہ نشین تھی۔ اس نے اکبر کے عروج کی بہاریں دیکھیں اور اکبر کی وفات سے چند سال قبل فوت ہوئیں۔ حمیدہ بیگم نے شہنشاہ وقت کی ماں کی حیثیت سے کبھی امور سلطنت میں مداخلت نہ کی۔ بلکہ حتی الامکان برد باری سے فتنے کو روکا کرتی تھی۔ ماثر الامراء جلد اوّل میں تحریر ہے کہ ملا عبدالنبی، اکبر کے استاد تھے۔ وہ اکبر سے اپنی جوتیاں سیدھی کروایا کرتے اور مسجد میں جھاڑو دلواتے، حمیدہ بیگم یہ سب دیکھتی لیکن مزاحمت نہ کرتی بلکہ ایک مرتبہ اکبر سالگرہ کی تقریب میں کپڑوں پر زعفران کا رنگ چھڑک کر دربار میں گیا تو ملا عبدالنبی نے اس کو ایک مشرکانہ فعل تصور کیا اور اس قدر برہم ہوئے کہ اپنے عصاء سے اس کو سر دربار مارا۔ اکبر کو ناگوار ہوا محل میں جا کر ماں سے شکایت کی کہ دربار میں اس طرح ذلیل کرنا مناسب نہ تھا۔ وہ خلوت میں جو چاہتے کرتے۔ نیک نفس ماں نے کہا کہ بیٹا دل پر میل مت لے یہ نجات اخروی کا سبب بنے گا۔ قیامت تک چرچا رہے گا کہ ایک مفلوک الحال ملا نے بادشاہ کے ساتھ یہ حرکت کی لیکن بادشاہ نے اپنی سعادت مندی سے اس کو برداشت کیا۔ البتہ بیرم خاں کے خلاف حمیدہ بیگم نے اپنے بیٹے اکبر کی حمایت ضرور کی لیکن اس کے بعد وہ امور سلطنت سے بالکل الگ تھلگ رہی۔

مرسلہ: اشفاق حسین، گجرات

''کچھ نہیں بھائی......بس آپ کو اتنی دیر بعد دیکھا اس لیے۔''

''اتنا ہی مس کر رہی تھی تو مجھے ملنے کیوں نہیں آئی؟'' اس نے شکایتی انداز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی اس نے خود سے ہی اندازہ لگا لیا۔

''سمجھ گیا امی نے آنے نہیں دیا ہوگا انہیں تم لوگوں کی پڑھائی کی بہت فکر ہے، اچھا باقی سب کہاں ہیں۔''

''اریشہ اسکول ہے اور عمار کالج اور بابا اپنے کمرے

میں......"

"اور امی؟"

"امی بھی ہیں۔"

"ارے محبت......بیٹا تم......کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" عقب سے بابا نے آواز دی۔

"بابا میں ٹھیک ہوں بس آپ لوگوں سے ملنے کا دل کر رہا تھا اس لیے یہاں آ گیا......امی کہاں ہیں۔"

"اچھا اب درد تو نہیں ہے؟" انہوں نے اس کو سینے سے لگا کر کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں بابا......امی کہاں ہیں۔" اس نے ایک بار پھر امی کے بارے میں پوچھا۔

"میں جانتا ہوں تم ٹھیک ہو لیکن پھر بھی میں ڈاکٹر کو بلا لیتا ہوں وہ تسلی کرلے گا کہ واقعی تم ٹھیک ہو یا نہیں۔"

"بابا میں آپ سے کیا پوچھ رہا ہوں اور آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ زچ ہو گیا تھا۔

"بیٹا......وہ یہیں ہے ہمارے ساتھ۔" بالآخر انہوں نے جواب دے ہی دیا تھا۔

"کیا مطلب یہیں ہیں......اگر یہیں ہیں تو نظر کیوں نہیں آرہیں۔"

"محبت ابھی تم اس سے مل نہیں سکتے۔"

"بابا یہ آپ کیسی پہیلیوں میں باتیں کر رہے ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" وہ پہیلیوں سے تنگ آ گیا تھا۔

"علیزے تم بتاؤ ماما کہاں ہیں......وہ نہ ہی مجھ سے ملنے اسلام آباد آئیں تھی ابھی یہاں آیا ہوں تو یہاں بھی نہیں ہیں آخر تم سب کیا چھپا رہے ہو مجھ سے۔"

"بھائی......امی۔" اس نے پہلے بابا کی طرف دیکھا اور پھر سے محبت کی طرف۔

"علیزے میں اس وقت پاگل ہو رہا ہوں مجھے سچ بتا دو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا دل پھٹ جائے اور میں......"

"بھائی امی کی طبیعت زیادہ خراب ہے اس لیے وہ کمرے کے باہر نہیں آئیں۔" بالآخر اس نے بتا ہی دیا۔

"انہیں کیا ہوا ہے؟" وہ روہانسا ہو گیا تھا۔

"مجھے معاف کر دو محبت لیکن یہ بڑی امی کا حکم ہے کہ جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے ہم تمہیں کچھ نہ بتائیں۔"

"آخر انہیں ہوا کیا ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ مہوش بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔

"تمہارے اندر جو کڈنی کام کر رہی ہے وہ بڑی امی کی ہی ہے۔"

"کیا......لیکن کیوں......؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

"کیونکہ وہ ماں تھیں بھائی......" علیزے نے بھی اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

"جب کہیں سے ڈونر نہ ملا تو انہوں نے نہایت خاموشی سے اتنا بڑا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت وہ خود بھی خطرے میں ہیں اس لیے تم ابھی حوصلہ رکھو۔ ان سے کچھ نہ کہنا۔ صرف اپنا چہرہ دکھا کر لوٹ آنا۔"

وہ کانپتے قدموں سے امی کے کمرے میں داخل ہوا۔ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ ان کے سینے سے جا لگا۔

"محبت میرے بچے مجھے بہت خوشی ہے کہ تم ٹھیک ہو گئے ہو اللہ تمہیں لمبی زندگی عطا کرے اور تمہیں دنیا جہان کی ساری خوشیاں عطا کرے۔" انہوں نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"امی آپ نے ایسا کیوں کیا؟" اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

"میں نے ایسا کیوں کیا تو اس سوال کا جواب تمہیں اس وقت ملے گا جب تم خود باپ بن جاؤ گے۔ بیٹا اللہ تعالی قرآن پاک میں فرماتا ہے کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزماتا ہے اور اس نے مجھے اولاد کے ذریعے آزمایا اور مجھے اس وقت جو ٹھیک لگا میں نے وہی کیا۔ دیکھا جائے تو اس دنیا میں ماں باپ اولاد کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتے کچھ لوگوں کی اولاد ہی انہیں خود سے دور کر دیتی ہے اور کچھ کو موت ان سے جدا کر دیتی ہے لیکن دیکھو میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی، تمہارے جسم کا حصہ بن کر۔"

▲▲▲

شمارہ ستمبر 2017ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆اول: ٹھکرائی ہوئی لڑکی......سیما (فیصل آباد)

☆دوم: گدھ......وسیم بن اشرف (ملتان)

☆سوم: فرشتہ انکل......شرجیل (ملتان)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے